اسرار شریعت

جلد دوم

مؤلفہ

مولوی محمد فضل خانؒ

فضلی بکس

فہرست مضامین

کتاب الصوم

مرتب کتاب

منیرالدین احمد

مولوی محمد فضل خان کے فرزند راجہ عبد الرؤف خان (۱۸۹۹ء۔ ۱۹۶۶ء) کے بیٹے ہیں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور (مولوی فاضل، بی۔اے) اور ہمبرگ یونیورسٹی جرمنی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کے فارغ التحصیل ہیں۔ آپ ۱۹۶۰ء سے جرمنی میں مقیم ہیں، جہاں پر آپ جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو اور ہمبرگ یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے کے بعد دسمبر ۱۹۹۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جو اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور جرمن زبان میں شائع شدہ ہیں۔ آپ اردو ادب میں بطور افسانہ نگار اور جرمن ادب کے مترجم کے جانے جاتے ہیں۔

اسرار شریعت

جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الصوم

ادویہ واحکام الٰہی یعنی خدا کے کام وکلام کا مقابلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَ مُا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ وَالصَّلوٰۃُ وِ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی وَ اَحْمَدِ نِ الْمُجْتَبٰی وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ جَمِیْعِ خُلَفَائِہِ الرَّاشِدِیْنَ . **اما بعد** واضح ہو کہ قبل اس کے جو ہم احکام الٰہی کے اسرار لکھنا شروع کریں اس بات کا ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جیسا افعال وخواص الادویہ متعدد ہوتے ہیں، ایسا ہی احکام الٰہی کے اغراض و مقاصد متعدد ہیں اور جیسا کہ خداتعالےٰ کی بنائی ہوئی ہر ایک دوا میں کئی کئی امراض کو دفع کرنے کے خواص پائے جاتے ہیں، بعینہٖ اس کے ہر ایک حکم میں کئی کئی حکمتیں اور مقاصد مودّع ہیں۔ادویہ میں سے کسی ایک ہی کے خواص وافعال کو گننے لگو تو بیشمار نکلیں گے۔مثلاً ایک زنجبیل (سونٹھ) ہی کو دیکھو کہ وہ حافظہ وہاضمہ ومعدہ اور جگر کو قوت دیتی اور جگر کے سدّے کو کھولتی اور باہ کو زیادہ اور انتڑیوں اور معدہ کی ریاح غلیظ کو تحلیل اور تمام بلغموں اور رطوبتوں کو جو معدہ وانتڑیوں سے چسپاں ہوں قطع کرتی اور طبیعت کو نرمی بخشتی اور دماغ اور حلق اور اعصاب کی غلیظ (گاڑھی) خلطوں کو نکال نکال دیتی ہے۔علاوہ ازیں اس کے اور بھی بے شمار افعال وخواص ہیں۔پس جب کہ خدا تعالیٰ کے دست قدرت سے بنی ہوئی اشیاء یعنی اس کے کام میں ایسے امور وتجربہ ومشاہدہ کر چکے ہیں،تو بالضرور شریعت الٰہی یعنی

اس کا کلام بھی کئی کئی مصلحتوں وحکمتوں پر مبنی ہوگا۔لہٰذا اس کتاب کے ناظرین پر واضح رہے کہ یہ جو بعض احکام الٰہی کے تحت میں وجہات متعددہ واغراض متفرقہ اس کتاب میں لکھے گئے ہیں ان سے یہ مراد ہے کہ یہ سب مصلحتیں وحکمتیں اور مقاصد ان احکام میں مودّع (سپرد۔امانت) ہیں۔

ایں ہمہ صنعش کتاب کار اوست　　بے نہایت اندریں اسرار اوست

ایں کتابے پیش چشم ما نہاد　　تا از و راہ ہدیٰ دارم یاد

(ترجمہ۔یعنی یہ سب کاریگری اس کے کام کی ہے۔اس میں بے شمار اسرار ہیں۔خدا نے اپنی صنعت کی کتاب ہماری انکھوں کے آگے رکھ دی ہے،تا کہ ہم اس سے ہدایت کا راستہ پائیں)

معنے لفظ صوم

صـــوم عربی زبان کا لفظ ہے،جس کے معنے ہماری اردو بولی میں رکنے،خاموش وقائم ہونے اور بلندی کے ہیں (لسان العرب۔صراح)۔اسلامی شریعت کی اصطلاح میں بہ نیّت عبادت الٰہی کھانے،پینے،مباشرت اور تمام فضول باتوں سے رکنے کو عربی میں **صـــوم** اور اردو فارسی میں روزہ اور سنسکرت میں برت اور انگریزی میں Fast کہتے ہیں۔

وجہ تسمیہ صوم

(۱) روزہ دار خدا تعالیٰ کے فرمان کے موجب سارے امور ممنوعہ سے جو روزہ کے ناقض ہوں، رک جاتا ہے۔اس لئے اس فعل کا نام صوم ہوا۔

(۲) روزہ ساری عبادات سے درجہ میں بلندی رکھتا ہے،اس لئے اس کا نام صوم ہوا۔امراء القیس کہتا ہے۔**صام النہار و ھجر**۔یعنے دن بلند اور معتدل ہے۔

(۳) روزہ ساری عبادات الٰہیہ سے بے نظیر و بے مثل ہونے کی وجہ سے بلندی کا استحقاق رکھتا ہے۔اس لئے اس کا نام صوم ہوا۔نسائی میں ہے۔ **عَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. فَقُلْتُ مُرْنِیْ بِاَمْرٍ آخُذُہ' عَنْکَ قَالَ عَلَیْکَ بِالصَّوْمِ فَاِنَّہ' لَامِثْلَ لَہ'**۔یعنی ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتا ہے کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ مجھے آپ کوئی ایسی بات بتائیں کہ میں آپ سے سن کر اس پر عمل کروں۔فرمایا روزہ رکھا کرو،کیونکہ (بلندی درجہ میں) روزہ کی مثل کوئی عبادت نہیں ہے۔

(۴) روزہ دار تمام فضول اور لا طائل کاموں اور سبّ وشتم سے خاموشی اختیار کرتا ہے۔اس

لئے اس فعل کا نام صوم ہوا۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت مریم کے قصہ میں اس قسم کی خاموشی کو صوم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ۔ پس اگر تو دیکھے کسی آدمی کو تو اس کو کہو کہ میں نے خدا کے لئے روزہء خاموشی کی نذر مانی ہے۔ پس میں آج کسی انسان سے بات نہ کروں گی۔

ایسا ہی احادیث نبویہ ؐ میں مذکور ہے۔ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ روزہ صرف کھانے پینے سے علیحدہ رہنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ روزہ لغو اور بے ہودہ امور سے باز رہنے کا نام بھی ہے۔ لہٰذا اگر تم کو کوئی برا کہے یا تم سے جہالت کی بات کرے، تو اسکو کہہ دو کہ میں روزہ دار ہوں۔ ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ جسنے جھوٹ بولنا اور جھوٹ کے مطابق عمل کرنے کو نہ چھوڑا، خدا کو اسکے کھانے پینے کے ترک کر دینے سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ ہر ایک بات جو رذائل کی طرف کھینچے اور فضائل سے روکے اس کو چھوڑ دے، ورنہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ذیل کا مصداق ہوگا۔ کَمْ مِنْ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صَوْمِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ ۔ (کتنے ہی روزہ دار ہیں، جنکا روزہ سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ بھی نہیں)۔

واضح ہو کہ یہ جو صوم کے معنے خاموشی کے بھی لکھے گئے ہیں، تو اس سے ہر ایک امر بالمعروف اور اچھی باتوں سے خاموشی مراد نہیں ہے، بلکہ لایعنی اور بے ہودہ و لاطائل امور سے خاموشی مراد ہے، بلکہ روزہ میں مطلق خاموشی سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مسند صفحہ ۲۵۴ میں حدیث ذیل اس امر کے متعلق آئی ہے۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللہِ صَلّٰی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ الصُّمْتِ وَ صَوْمِ الْوِصَالِ ۔ یعنی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے روزہء خاموشی اور روزہء وصال رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا روزہ کچھ افراد اختیار کر لیں، تو ان کی تقلید عام ہو جائے گی اور جب ایسی خاموشی امر معروف سے بھی کسی زمانہ میں عالمگیر ہو جائے، تو انتظام عالم میں خلل واقع ہوتا ہے اور یہ بات خدا تعالےٰ کو پسند نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے منع کیا گیا۔

روزہ رکھنے سے جسم کو کاہش و پژمردگی و نحافت لاحق ہونے پر اعتراض کا جواب

سوال۔ روزہ رکھنے سے جسم کو پژمردگی و نحافت لاحق ہوتی اور چہرہ کی رونق و تازگی چلی جاتی اور بھوک سے آنتوں میں درد اور شدت پیاس سے دل میں جلن اور حلق و زبان میں خشکی و درشتی محسوس ہوتی ہے۔ پس ایسی تکلیفات و مضرّات کا دیدہ و دانستہ روزہ رکھ کر اپنی جان پر وارد کرنے میں کیا حکمت و مصلحت ہے؟

جواب۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ مہتمم بالشان امور کی سرانجام دہی کے لئے جب تک کما حقہ محنت و مشقت نہ اٹھائی جائے اور اس سے جسم و جان پر کوفت نہ واقع ہو، کامیابی کا منہ دیکھنا محال ہے۔ مزدوروں اور حمّالوں کو دیکھو کہ وہ محض چند پیسوں کی خاطر اپنی جان پر کیا کیا سختیاں اور رنج وارد کر لیتے ہیں۔ بالآخر وہ سب رنج مبدل بگنج ہو جاتے ہیں اور سب کوفتیں آرام کی شکل دکھائی دیتی ہیں۔ پس روزہ کی شدّتوں و تکالیف میں بھی یہی راز مضمر ہے۔

چوں اساس خانہ نو افگنند — اولیں بنیاد را بر مے کنند
گل بر آرند اول از قعر زمیں — تا بآخر بر کشی ماء معین
از حجامت کودکاں گریند زار — کہ نمے دانند ایشاں سِرّ کار
مرد خود زرمے دہد حجام را — مے نواز دیش خوں آشام را
مے دود حمال زیں بار گراں — مے رباید بار را از دیگراں
جنگ حمالاں برائے کار بیں — ایں چنیں است اجتہاد کار بیں
چوں گرانیہا اساس راحت است — تلخہا ہم پیشوائے نعمت است
حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِمَكْرُوْهَاتِنَا — حُفَّتِ النِّيْرَانُ مِنْ شَهَوَاتِنَا

ترجمہ۔ جب نئے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں تو پہلی بنیاد کو اکھیڑ دیتے ہیں۔ زمین کے نیچے سے مٹی نکالتے ہیں، تا کہ تم صاف پانی نکال کر پیو۔ پچھنے سے بچے زار زار روتے ہیں، کیونکہ وہ انجام کار کے بھید سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور بچوں کے والدین حجام کو نقد مزدوری دیتے اور اس خون پینے والے پر مہربانی کرتے ہیں۔ پانڈی یعنی بوجھ اٹھانے والا بھاری بوجھ کے نیچے دوڑتا اور دوسروں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ بوجھ اٹھانے والوں کا جھگڑا کام کے لئے ہوتا ہے، کام کی کوشش ایسی ہی ہوتی ہے۔ سارے بوجھ آرام کی بنیاد ہوتے ہیں اور ساری تلخیاں نعمت کی پیشوا ہوتی ہیں۔ بہشت کو ہماری مکروہات کے ساتھ گھیرا گیا ہے اور دوزخ کو ہماری خواہشات نفسانیہ کے ساتھ احاطہ کیا گیا۔

انسان کے لئے روزہ مقرر ہونے کی حکمتیں

انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی عقل کو نفس پر غلبہ و تسلّط دائمی حاصل رہے۔ مگر بباعث بشریت بسا اوقات نفس پر عقل غالب آ جاتی ہے۔ لہٰذا تہذیب و تزکیۂ نفس کے لئے اسلام نے روزہ کو اصول میں سے ٹھیرایا ہے۔

ا۔ روزہ سے انسان کی عقل کو نفس پر پورا پورا تسلط و غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

۲۔ روزہ سے خشیت اور تقویٰ کی صفت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ اس

بارے میں فرماتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ یعنی روزہ تم پر اسلئے مقرر ہوا کہ تم متقی بن کر خدا کے عذاب سے بچ جاؤ اور روزہ تمہاری سپر ہو جاوے۔ اسی وجہ سے حدیث شریف میں روزہ کو ڈھال کہا گیا ہے۔ فرمایا۔ اَلصِّیَامُ جُنَّۃٌ۔ یعنی ماہ رمضان کے روزے انسان کیلئے عذاب دوزخ سے بچانے کیلئے ڈھال ہیں۔

۳۔ روزہ رکھنے سے انسان کو اپنی عاجزی و مسکنت دکھائی دیتی ہے اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے۔

۴۔ روزہ رکھنے سے چشم بصیرت کھلتی ہے اور دور اندیشی کے خیالات پیدا ہوتے اور کشف حقائق الاشیاء ہوتا ہے۔

۵۔ روزہ رکھنے سے درندگی و بہیمیّت سے دوری پیدا ہوتی اور ملائکہ الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ روزہ رکھنے سے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گذاری کا موقعہ ملتا ہے۔

۷۔ روزہ رکھنے سے انسانی ہمدردی کا دل میں ابھار پیدا ہوتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جس نے بھوک و پیاس محسوس نہ کی ہو، وہ بھوکوں اور پیاسوں کے حال سے کیونکہ واقف ہوسکتا ہے اور رزاق مطلق کی نعمتوں کا شکریہ علیٰ وجہ الحقیقت کب ادا کرسکتا ہے۔ اگرچہ زبان سے شکر کرے، مگر جب تک اس کے معدہ میں بھوک و پیاس کا اثر اور اس کی رگوں و پٹھوں میں ضعف و ناتوانی کا احساس نہ ہو، وہ نعمائے الٰہی کا کماحقہا شکر گذار نہیں بن سکتا۔ کیونکہ جب کسی کی کوئی محبوب و مرغوب و مالوف چیز کچھ زمانہ کے لئے گم ہو جاوے، تو اس کے فراق سے اس کے دل کو اس چیز کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ قدر عافیت کسے داند کہ مصیبتے گرفتار آید۔

۸۔ روزہ موجب صحت جسم و روح ہے۔ چنانچہ قلت اکل و شرب کو اطباء نے صحت جسم کے لئے اور صوفیائے کرام نے صفائی دل کے لئے مفید لکھا ہے۔

۹۔ روزہ محبت الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہو کر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور بیوی کے تعلقات بھی اس کو بھول جاتے ہیں۔ پس روزہ رکھنا کیا ہے، گویا کہ روزہ دار خدا کی محبت میں سرشار ہو کر اس حالت کو ظاہر کرتا ہے۔

علاوہ فوائد مذکورہ روزہ انسان کے لئے ایک روحانی غذا ہے، جو آئندہ جہان میں انسان کے لئے غذا بن جائے گی۔ جنہوں نے اس غذا کو ساتھ نہیں لیا، وہ اس جہان میں بھوکے پیاسے ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی غذا کو ساتھ نہیں لیا۔ اور یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ جب کہ کھانے پینے کی تمام

اشیاء خداتعالیٰ ہی کے خزانہء رحمت سے انسان کو ملتی ہیں، تو جن اشیاء کو وہ یہاں چھوڑتا ہے، ان کا معاوضہ وہاں پر ضرور ملے گا، جو یہاں سے بہتر اور افضل ہوگا۔

وجہ تسمیہ رمضان

ا۔ رمضان عربی زبان میں سورج کی تپش کو کہتے ہیں۔ رمضان میں چونکہ انسان اکل وشُرب اور تمام جسمانی لذتوں پر صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے دل میں ایک حرارت اور جوش پیدا کرتا ہے، اس لئے روحانی اور جسمانی حرارت اور تپش مل کر رمضان ہوا۔ اہل لغت میں سے جو کسی نے لکھا ہے کہ گرمی کے مہینے میں آیا، اس لئے رمضان کہلایا۔ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ عرب کے لئے یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی۔ روحانی رمضان سے مراد روحانی ذوق وشوق اور حرارت دینی ہوتی ہے۔ اور رمضان اس حرارت کو بھی کہتے ہیں، جس سے پتھر وغیرہ گرم ہوتے ہیں۔ رمضان دعا کا مہینہ ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانُ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ۔ ترجمہ۔ یعنے مہینہ رمضان کا جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس سے ماہ رمضان کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام نے اس مہینہ کو تنویر القلب کے لئے مفید لکھا ہے۔ اس مہینے میں کثرت سے مکاشفات ہوتے ہیں۔ نماز تزکیہء نفس کرتی ہے اور روزہ سے تجلّی قلب ہوتی ہے۔ تزکیہء نفس سے یہ مراد ہے کہ نفس امّارہ کی شہوات سے بُعد حاصل ہو جاتا ہے اور تجلّی قلب سے مکاشفات ہوتے ہیں، جن سے مؤمن خداتعالےٰ کو دیکھ لیتا ہے۔ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ میں یہی اشارہ ہے۔ روزہ کا اجر عظیم ہے مگر امراض واغراض اس نعمت سے انسان کو محروم کر دیتے ہیں۔

۲۔ رمضان خداتعالےٰ کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے اور بر روایت حضرت ابی ہریرہؓ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حدیث ذیل بھی اس امر کے متعلق شاہد ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلّٰی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ لَاتَقُوْلُوْا رَمَضَانَ فَاِنَّ رَمَضَانَ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ ترجمہ۔ یعنی اس مہینہ کا نام بغیر اضافت نہ لیا کرو، بلکہ کہو ماہ رمضان یعنی خداتعالےٰ کا مہینہ۔ کیونکہ رمضان خداتعالےٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداتعالےٰ نے قرآن کریم میں شَهْرُ رَمَضَان یعنی ماہ رمضان فرمایا ہے اور مطلق کہیں نہیں فرمایا۔ اور پھر فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ۔ ترجمہ یعنی جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو پائے۔ اور یوں نہیں فرمایا کہ جو رمضان کو پائے۔ خداتعالےٰ کی یہ قدیمی سنت ہے کہ وہ بعض اوقات اور اشیاء وامکنہ کو بعض خاص خصوصیتوں کی وجہ سے اپنی طرف نسبت کر کے ظاہر فرما دیتا ہے کہ ان میں میری تجلیات وبرکات کثیرہ کا نزول ہوتا ہے۔ چنانچہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک ماہ رمضان کی نسبت فرمایا کہ یہ خدا کا مہینہ ہے۔ ایسا ہی ہفتہ کے دنوں میں سے ایک دن جمعہ کے متعلق فرمایا کہ یہ

میرا یوم ہے۔اور سالوں میں سے ہر صدی کے سرے کو اپنی طرف نسبت فرمائی اور روزمرّہ اوقات شب و روز میں سے ایک وقت آخری حصہء شب کے متعلق فرمایا کہ اس میں الٰہی نزول ہوتا ہے۔یعنی تجلّیات الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے۔اور مکانات میں سے ایک مکان کعبہ کے متعلق بَیْتِیَ فرما کر ظاہر کیا کہ یہ میرا گھر ہے۔سو یہ اضافتیں بعض خصوصیتوں کی طرف ایما کرتی ہیں۔ ورنہ زمین و آسمان و مافیھا کی ساری مخلوقات خدا تعالیٰ ہی کی ہے اور اسی کی طرف ان ساری چیزوں کی اضافت و نسبت ہے۔مگر بعض اشیاء کو خدا تعالیٰ اپنی تجلیات و برکات کثیرہ کے ظہور کی وجہ سے اپنی طرف نسبت کر لیتا ہے۔جیسا کہ خدا تعالیٰ خانہ کعبہ کے لئے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما الصلوات والسلام کو فرماتا ہے وَعَهِدْنَا اِلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَ الْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ترجمہ یعنے ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما الصلوۃ والسلام کو کہہ دیا کہ پاک کر رکھو میرے گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

پس جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کعبہ کو اپنا گھر فرمایا۔ایسا ہی روزوں کے مہینہ کی نسبت اپنی طرف کر کے ایما فرمایا کہ اس میں میری خاص تجلیات و برکات کثیرہ کا نزول ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ روزہ کے متعلق حدیث قدسی میں وارد ہے اَلصَّوْمُ لِيْ وَ اَنَا اَجْزِيْ بِهٖ ۔ترجمہ یعنی روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا نزول بھی اسی مہینہ میں شروع ہوا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانُ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ ۔ترجمہ یعنی خدا تعالیٰ کی تجلیات کثیرہ و خیرات و برکات جزیلہ کے نازل ہونے کا وہ مہینہ ہے،جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔

تمام اقوام عالم میں رسم روزہ کا وجود پائے جانے کا راز

ایک رسم کا نیکی کے طور پر دنیا کی تمام اقوام میں بالاتفاق پایا جانا اس جانب مشیر ہے کہ اس کی تعلیم ان میں بذریعہ انبیاء من جانب اللہ ہوئی ہے اور ان میں انبیاء پیدا ہو چکے ہیں۔قرآن کریم بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔چنانچہ فرمایا و اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۔یعنی دنیا میں جو قوم بھی پائی جاتی ہے،اس میں ایک یا کئی نبی ہو گذرے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت انسانوں کی تربیت کے لئے ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی ربوبیت کسی ایک ہی قوم یا ایک ملک کے لئے مخصوص نہیں۔مثلاً جو جو انسانی طاقتیں اور قوتیں آریہ ورت کی قدیم قوموں کو دی گئی ہیں ، وہی تمام قوتیں عربوں اور فارسیوں اور شامیوں اور چینیوں اور جاپانیوں کو اور یورپ اور امریکہ کی قوموں کو بھی عطا کی گئی ہیں۔سب کے لئے خدا تعالیٰ کی

زمین فرش کا کام دیتی ہے اور سب کے لئے اس کا سورج اور چاند اور کئی ستارے روشن چراغ کا کام دے رہے ہیں اور دوسری خدمات بھی بجالاتے ہیں۔ اس کی پیدا کردہ عناصر یعنی ہوا۔ پانی۔ آگ اور خاک اور ایسا ہی اس کی دیگر تمام پیدا کردہ چیزوں اناج اور پھل اور ادویہ وغیرہ سے تمام قومیں یکساں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف پہلے اسی آیت سے شروع کیا ہے، جو سورہ ءفاتحہ ہے کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن**۔ یعنے تمام کامل اور پاک صفات خدا سے خاص ہیں، جو تمام عالم کا ربّ ہے۔ عالَم کے لفظ میں تمام مختلف قومیں اور مختلف زمانے اور مختلف ملک داخل ہیں۔ اور اس آیت سے جو قرآن شریف شروع کیا گیا، یہ درحقیقت ان قوموں کا ردّ ہے، جو خدا تعالیٰ کی عام ربوبیت اور فیض کو اپنی ہی قوم تک محدود رکھتے ہیں اور دوسری قوموں کو ایسا خیال کرتے ہیں کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کے بندے ہی نہیں اور گویا خدا نے ان کو پیدا کر کے پھر ردی کی طرح پھینک دیا ہے یا ان کو بھول گیا ہے اور یا (نعوذ باللہ) وہ اس کے پیدا کردہ ہی نہیں۔ جیسا کہ مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کا اب تک یہی خیال ہے کہ جس قدر خدا کے نبی اور رسول آئے ہیں وہ صرف یہود کے خاندان سے آئے ہیں اور خدا دوسری قوموں سے کچھ ایسا ناراض رہا ہے کہ ان کو گمراہی اور غفلت میں دیکھ کر بھی ان کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی مذہب ہے کہ تمام نبی اور رسول انہی کے خاندان سے آتے رہے ہیں اور انہی کے خاندان میں خدا کی کتابیں اترتی رہی ہیں۔ اور پھر بموجب عقیدہ عیسائیوں کے وہ سلسلہ الہام اور وحی کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ اور خدا کے الہام پر مہر لگ گئی۔ انہیں خیالات کے پابند آریہ صاحبان بھی پائے جاتے ہیں۔ یعنے جیسے یہود اور عیسائی نبوت اور الہام کو اسرائیلی خاندان تک ہی محدود رکھتے ہیں اور دوسری تمام قوموں کو الہام پانے کے فخر سے جواب دے رہے ہیں۔ یہی عقیدہ نوع انسان کی بدقسمتی سے آریہ صاحبان نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ یعنی وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی وحی اور الہام کا سلسلہ آریہ ورت کی چاردیواری سے کبھی باہر نہیں گیا۔ ہمیشہ اسی ملک سے چار رشی منتخب کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ وید ہی بار بار نازل ہوتا ہے اور ہمیشہ ویدک سنسکرت ہی اس الہام کے لئے خاص کی گئی ہے۔ غرض یہ دونوں قومیں خدا تعالیٰ کو رب العالمین نہیں سمجھتیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس حالت میں خدا رب العالمین کہلاتا ہے، نہ صرف رب اسرائیلیاں یا رب آریاں تو وہ ایک خاص قوم سے کیوں ایسا دائمی تعلق پیدا کرتا ہے، جس میں صریح طور پر طرفداری پائی جاتی ہے۔ پس ان عقائد کے ردّ کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو اسی آیت سے شروع کیا کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن**۔ اور جابجا اس نے قرآن شریف میں صاف صاف بتلا دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ کسی

خاص قوم یا ملک میں خدا کے نبی آتے رہتے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے کسی قوم اور کسی ملک کو فراموش نہیں کیا۔ اور قرآن شریف میں طرح طرح کی مثالوں سے بتلایا گیا ہے کہ جیسا کہ خدا ہر ایک ملک کے باشندوں کے لئے ان کے مناسب حال ان کی جسمانی تربیت کرتا آیا ہے، ایسا ہی اس نے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو روحانی تربیت سے بھی فیضیاب کیا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں ایک جگہ پر فرماتا ہے وَ اِنَّ مِنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ۔ یعنی کوئی ایسی قوم نہیں، جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا۔

سو یہ بات بغیر کسی بحث کے قبول کرنے کے لائق ہے کہ وہ سچا اور کامل خدا، جس پر ایمان لانا ہر ایک بندہ کا فرض ہے، وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود نہیں اور نہ کسی خاص زمانہ تک، بلکہ وہ سب قوموں کا رب ہے اور تمام زمانوں کا رب ہے اور تمام مکانوں کا رب ہے اور تمام ملکوں کا وہی رب ہے اور تمام فیضوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ اور ہر ایک جسمانی اور روحانی طاقت اسی سے ہے اور اسی سے تمام موجودات پرورش پاتی ہیں اور ہر ایک وجود کا وہی سہارا ہے۔

خدا کا فیض عام ہے جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے۔ یہ اس لئے ہوا تا کہ کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے اور یہ نہ کہیں کہ خدا نے فلاں فلاں قوم پر احسان کیا، مگر ہم پر نہ کیا یا فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی، تا وہ اس سے ہدایت پاویں، مگر ہمیں نہ ملی۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام اقوام عالم میں انبیاء آتے رہے ہیں اور ان تمام اقوام میں روزہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں روزہ کو صوم اور سنسکرت میں برت اور انگریزی میں فاسٹ اور اردو و فارسی میں روزہ کہتے ہیں۔ پس ان تمام اقوام میں ایک امر کا بالاتفاق پایا جانا اس کے منجانب الٰہی ہونے پر دلیل ہے، جس کی تعلیم بذریعہ انبیاء علیہم الصلوات والسلام اقوام مختلفہ و ازمنہ متفرقہ میں نازل ہوتی رہی اور قرآن کریم بھی الفاظ ذیل میں اس امر کی تصدیق کرتا ہے **کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ** ۔ترجمہ۔ یعنی حکم ہوا تم پر روزے کا جیسے یہ حکم ہوا تھا تم سے پہلی قوموں پر۔ پھر فرمایا روزہ رکھنے کا امر اس لئے نازل ہوا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ اس میں روزہ کی علت غائی بیان فرمائی کہ روزہ میں تقویٰ کے تمام پہلو و اوصاف مرکوز ہیں۔

ہر گرسنہ عاقبت قوت بیافت   آفتاب دولتے بر دے بتافت

ترجمہ۔ ہر بھوکا بالآخر قوت پاتا ہے۔ اور دولت کا سورج اس پر چمکتا ہے

ماہ رمضان میں روزے مقرر ہونے کی وجہ

ماہ رمضان کے اندر روزہ رکھنے کی وجہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرمائی ہے۔ شَهۡرُ

رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآن ۔ترجمہ۔یعنے ماہ رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے،جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ چونکہ رمضان میں قرآن کریم نازل ہوا،لہٰذا یہ مہینہ برکات الٰہیہ کے نزول کا موجب ہے۔ اس لئے وہ اصل غرض جو لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن (یعنی تا کہ تم متقی بنو) میں ہے حاصل ہوجاتی ہے۔

روزہ میں نیت شرط ہونے کی وجہ

اگرروزہ میں نیت شرط نہ ہوتی،تو روزہ رکھنا عبادت میں شمار نہ ہوتا اور نہ اس پرثواب ملتا۔ کیونکہ ثواب نیت کے بغیرنہیں ملتا۔لہٰذا نیت اس ترک اکل وشرب و جماع میں عبادت ہونے کی وجہ سے شرط ہےاور یہ بات روزہ ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ ہرترک عبادت نہیں ہوتی۔اور نہ اس پر بغیر نیت کچھ ثواب مل سکتا ہے۔قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَات ِ۔ترجمہ یعنے عملوں کی جزاوثواب نیت پر مترتب ہوتا ہے۔ اگرکسی شخص کو کھانے پینے کی اشیاء نہ ملنے واسباب جماع مہیا نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً صائم بننا پڑے،تو اس کو صائم نہیں کہا جاتا، کیونکہ اس کی نیت صائم ہونے کی نہ تھی ۔مگر مجبوراًاس کو بھوکا پیاسا رہنا پڑا۔

سیدالاعمال بالنیات گفت نیت خیرت بسے گلہا شگفت

یعنی ہمارے سردار نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ عملوں کی جزااورسزا نیت پر ملتی ہے۔اگرتمہاری نیت اچھی ہوگی،تو اس سےتمہاری جزا کے اچھے پھول کھلیں گے۔

خصوصیت برکات ماہ رمضان اوراسمیں ختم قرآن مسنون ہونیکی وجہ

کوئی ہیئت دان ومنجم اورعالم طبقات الارض اس امرسے انکارنہیں کرسکتا کہ آسمانی ستاروں کا اثر زمین کی تمام اشیاء پر پڑتا ہے۔حتیٰ کہ سمندروں کے پانیوں پر جومدّ وجزر اصغرواکبر ہوتے ہیں اوران کا مشاہدہ ہورہاہے وہ زیادہ ترکشش قمراورتاثیر شمس کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ جملہ حیوانات وبنی آدم کے خونوں کا بڑھنا ومرطوب ہونا اوراکثر نوع انسان کی انثیٰ کو ہر ماہ میں خون حیض آنا اسی قمری اثر کی برکت سے ہے۔اور نباتات پرقمر وغیرہ ستاروں کا اثر واقع ہوتا اورانکے انواع واصناف کو اپنے اپنے رنگ ملتے اور وہ پھولتے اور پکتے ہیں۔پس جبکہ ستاروں کے اثر کاظہور عالم جمادات ونباتات وحیوانات پراس طرح واقع ہوکر مشاہدہ میں آرہاہے،تو پھر یہ بات کیونکرنا قابل اعتبار ہوسکتی ہے کہ کسی خاص قمری ماہ کا اثر بنی آدم کی روحانیت پر پڑکر انکے لئے موجب نزول برکات وخیرات کثیرہ کا نہ ہو۔اہل اسلام کے سارے مہینے قمری ہیں اور ماہ رمضان میں خاص برکات کے نزول کے لئے بیان مذکورہ مؤید ہے۔

اس مہینہ میں قرآن کریم کا ختم کرنا اس وجہ سے مسنون ہے کہ قرآن کریم کا نزول اسی مہینہ میں ہوا ہے۔ پس جو شخص اس مہینہ میں قرآن کریم کو ختم کرتا ہے وہ ساری اصلی وظلی برکات کا وارث ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ ماہ رمضان ساری اسلامی برکات وخیرات کا جامع ہے۔ ہر ایک دینی برکت اور خیر، جو تمام سال میں کسی کو ملتی ہے، وہ اسی عظیم الشان ماہ کی برکات وخیرات کے راستہ سے آتی ہے۔ اس مہینہ کی جمعیت سارے سال کی جمعیت کا باعث ہوتی ہے اور اس مہینہ کا تفرقہ سارے سال کے تفرقہ کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ منبع خیرات و برکات عالم اصغر واکبر قرآن کریم کا قدوم میمنت لزوم ونزول اسی مہینہ میں ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآن ُ۔ ترجمہ یعنی رمضان خدا تعالیٰ کی برکات وخیرات کثیرہ کا وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن کریم اتارا گیا۔

شام کو تعجیل افطار روزہ و تاخیر سحر کی وجہ

ا۔ ہر عمل کو اپنے اپنے مناسب وقت وموقعہ پر بجالانا اعتدال ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء وانتہائے روزہ یعنی اس بابرکت عمل کی حد عملی بیان نہ فرماتے، تو بعض وہمی لوگ عشاء تک روزہ افطار نہ کرتے یا ابتدائے عمل کی حد کمتر رکھتے اور ان کی تقلید سے عام بندوں کا تکلیف پہنچتی۔

۲۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ابتدائی وآخری حد روزہ بیان فرمادی ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معلم الکتاب کی اس پر کوئی تشریح عملی صورت میں موجود ہو، تو نورٌ علی نور ہے اور قرآن کریم کی پیروی واتباع کی مؤید ہوگی۔ وہ قرآن کریم کی نقیض نہ ہوگی۔ کیونکہ انسان صورت عمل کی تقلید کا خوگر ہوتا ہے۔ اگر ہر حکم الٰہی کی عملی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا تعالیٰ کو دکھانی منظور نہ ہوتی، تو قرآن کریم کا نزول ایک ہی دن میں ہو جاتا۔ احادیث نبویہؐ اسی سنت نبویہ کی عملی صورت کو دکھاتی ہیں۔ وہ قرآن کریم سے کچھ زوائد بیان نہیں کرتی ہیں۔

۳۔ رات ودن کی جداگانہ تاثیرات معروف ومشہور ومشہود ہیں۔ اور روزہ رکھنا دن کے وقت مشروع ہوا ہے۔ لہٰذا دن کی برکات کے آثار علیحدہ ہیں اور جو خیرات وبرکات کے آثار اس ماہ کی رات سے وابستہ ہیں، وہ جدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے شام کے وقت کی تعجیل افطار روزہ اور تاخیر سحر کی روایت آتی ہے تاکہ دونوں وقتوں کے درمیان امتیاز حاصل ہو جائے۔ کیونکہ انسان کے ہر فعل کے ابتداء اور انتہا پر جو کچھ آثار مترتب ہوتے ہیں، ان کے حقائق بھی علیحدہ علیحدہ اور ان کی اجزا بھی علی حسب مناسبت علیحدہ صورتوں میں ہوگی۔

روزہ دار پر کھانا۔ پینا۔ جماع کرنا حرام ہونے کی وجہ

صوم کے معنے ترک کے ہیں اور ترک کی کوئی وجودی صفت نہیں ہوتی، جو حادث و پیدا ہو، کیونکہ ترک ایک سلبی صفت ہے اور کھانا اس کی ضد ہے۔ لہٰذا روزہ دار پر کسی چیز کا کھانا پینا حرام ہوا۔ کیونکہ یہ امر روزہ کے حکم کو زائل کرنے والا ہے۔ وجہ یہ کہ صوم کے معنے ترک کے ہیں اور کھانا پینا ترک کے برخلاف ہے۔

وجہ حرمت جماع۔ روزہ دار پر جماع کرنا اس لئے حرام ہوا کہ طرفین میں سے ہر ایک صاحب لذت (مباشرت) ہوتا ہے، جو ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ اس اجتماع میں ایک دوسرے کے مثل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اجتماع زوجین کے سبب اس فعل کا نام جماع ہوا۔ اور روزہ دار صفت روزہ یعنی بے مثل و ترک سے موصوف ہوتا ہے۔ لہٰذا روزہ دار پر جماع حرام ہوا۔ کیونکہ اس میں مثل موجود اور صفت سلبی زائل ہو جاتی ہے۔ یعنی جماع کرنے سے ترک کی صفت نہیں رہتی۔

ثبوت روزہ عہد عتیق و جدید میں

میں نے اہاوا کے دریا پر منادی کرائی کہ روزہ رکھیں اور خدا کے آگے دکھ کھینچیں اور اس سے دعا مانگیں تا کہ اپنی اور اپنی اولاد کے لئے سیدھی راہ پاویں۔ (عزرا۔ ۸ باب ۲۱)

مسیح کے شاگرد مسیح سے کہنے لگے ہم کیوں دیو نہ نکال سکے۔ تو آپ جواب میں ان کو فرماتے ہیں اپنی بے اعتقادی کے سبب۔ میں تمہیں سچ کہتا ہوں اگر تمہیں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوتا، تو پہاڑ کو یہاں سے وہاں چلا سکتے اور کوئی بات تم سے اَن ہونی نہ ہوتی۔ پر یہ جنس دعا اور روزے کے بغیر نہیں ملتی۔ (متی ۱۷ باب ۱۹۔ ۲۱)

نظم

هر آں کارے کہ گردد از دعائے محو جانانے — نہ شمشیرے کندآں کارنے بادے نہ بارانے
عجب دارد اثر دستے کہ دست عاشقش باشد — بگرداند جہانے را ز بہر کار گریانے
اگر جنبد لب مردے ز بہر آنکہ سرگرداں — خدا از آسماں پیدا کند ہر نوع سامانے
ز کار افتادہ را بر کارے آرد خدا زیں راہ — ہمیں باشد دلیل آنکہ ہست از خلق پنہانے
مگر باید کہ باشد طالب او صابر و صادق — نہ بیند روز نو میدی وفادار از دل و جانے

ترجمہ۔ وہ کام جو محو عاشق خدا کی دعا کے ذریعہ ہوتا ہے، وہ نہ کوئی تلوار اور نہ کوئی ہوا اور نہ کوئی بارش کر سکتی ہے۔

اس ہاتھ کی دعا کا اثر بڑا عجیب ہوتا ہے، جوخدا کے عاشق کے ہاتھ سے ہو۔ وہ اہل جہان کو ایک کام کے لئے رولا دیتا ہے۔ اگر اس مرد کے لبوں سے دعا نکلے، جوخدا کیئے سرگرداں ہوتا ہے، تو خدا تعالیٰ آسمان سے اس کی قبولیت کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کر دیتا ہے۔ بیکار کو بھی خدا تعالیٰ دعا کے ذریعہ کام پر لگا دیتا ہے۔ یہی دعا ہی اس ذات پروردگار کی ہستی کی دلیل ہے، جو لوگوں سے پوشیدہ ہے۔ مگر چاہئے کہ خدا کا طالب مستقل مزاج صابر و صادق ہو۔ جو شخص دل و جان سے خدا کا وفادار ہو وہ کبھی نومیدی کا دن نہیں دیکھتا۔

حاملہ و شیر خوار عورت پر روزہ واجب نہ ہونے کی وجہ

حاملہ و شیر خوار کو گرسنگی و کمزوری و ضعف لاحق ہو، تو سقوط جنین و ہلاکت بچہ کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر روزہ واجب نہیں ہوا۔ اور اگر وہ روزہ رکھ کر افطار کر دیں، تو پھر ان پر صرف قضا لازم آتی ہے کفارہ لازم نہیں آتا۔ دوسرے فقہاء بھی اسی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ ماتن ہدایہ لکھتا ہے۔ **وَالْحَامِلُ وَ الْمُرْضِعُ اِذَا خَافَتَا عَلٰی وَلَدَیْهِمَا اِفْطَرَتَا وَ قَضَا وَ لَا فِدْیَةَ عَلَیْهِمَا** ۔ترجمہ۔ یعنی حاملہ و شیر خوار کو اپنے بچے کی ہلاکت کا ڈر ہو اور وہ روزہ رکھ کر افطار کر دیں، تو ان پر قضائے روزہ آتی ہے اور کوئی فدیہ و کفارہ لازم نہیں ہوتا۔

تعبیرات روزہ

☆ جو شخص اپنے آپکو خواب میں روزہ دار دیکھے، تو اسکی تعبیر یہ ہے کہ وہ سلیم الدین اور لایعنی سے قلیل الکلام ہے۔

☆ اور جو اپنے آپکو بحالت روزہ خواب میں دیکھے کہ وہ ایسا کام کرتا ہے جو روزہ دار کو کرنا جائز نہیں، تو یہ امر اس کے نقص دین پر دال ہے۔

☆ اور جو شخص دیکھے کہ اس نے روزہ کو اپنے وقت پر افطار کیا، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کو دین و دنیا کی بھلائی و بہتری و رزق وسیع ملے گا اور اس کے ہموم و غموم رفع ہوں گے۔

☆ اور جو شخص خواب میں بے وقت روزہ افطار کرے، تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی غیبت کرتا اور جھوٹ بولتا ہے۔ بسا اوقات خواب میں افطار روزہ کی تعبیر بیماری و سفر پر دال ہوتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اٰخَر** ۔ترجمہ۔ یعنی جو شخص تم میں سے ماہ رمضان کو پائے، تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی ماہ رمضان میں بیمار یا سفر پر ہو، تو وہ روزہ نہ رکھے، بلکہ کسی ماہ میں بحالت صحت و اقامت اتنے دن روزے رکھ کر ان کی تعداد پوری کرے، جو اس نے بحالت سفر یا مرض روزے نہیں

رکھے۔حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خواب میں روزہ رکھنا دس وجہ پر دال ہے۔قدر۔ ریاست۔علوّ مرتبہ۔فتحمندی۔زیادتی نعمت۔حج۔عزت۔اولاد۔صحت وتوبہ۔

☆جس نے خواب میں جان بوجھ کر روزہ افطار کیا،اس کو سفر میں تکلیف ہوگی۔

☆جس نے خواب میں بھول کر روزہ افطار کیا،اس کی دلالت حصول رزق حلال پر ہے۔

☆اور جس نے خواب میں دو مہینے کے روزے رکھے،اس کی دلالت گناہوں سے تائب ہونے پر ہے۔

☆اور جو شخص خواب میں نفلی روزہ رکھے،وہ مرض سے صحت پائے گا۔بسا اوقات خواب میں روزہ کی تعبیر صحت پر دال ہوتی ہے۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔صُوْمُوْا تَصَحُّوْ۔ یعنی روزہ رکھو،تو صحت حاصل ہوگی۔

حقیقت روزہ وتاثیرات روزہ

جیسا کہ بہت سی ادویہ مفردہ جمع کر کے انسانی صحت کے واسطے ایک مرکب تیار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اسلامی احکام انسانی روح وجسم کی صحت وصفائی قائم رکھنے وحصول تہذیب کے لئے گویا کئی قسم کی مفردات کا خدا نے ایک مرکب تیار کیا ہے،جس کے استعمال سے انسان دارَین میں کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے۔پس یوں سمجھو کہ اسلام گویا انسانی اصلاح کے لئے مختلف مفردات کا ایک معجون مرکب ہے۔ اور روزہ بھی اسی مرکب کا ایک جزو اعظم ہے۔لہٰذا واضح ہو کہ اس جزو اسلام کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے انسان کا اخلاق مذمومہ مبدّل باخلاق حمیدہ ہو جاتے ہیں۔درنگی و بہیمیت مبدّل بصفت ملکیّت ہو جاتی ہے۔انسانی ہمدردی کا احساس ونعمائے الٰہی کی شکر گذاری کی طرف توجہ ہوتی ہے اور یہی امر انسان سے مطلوب ہیں۔لہٰذا کم کھانا اور بھوک برداشت کرنا تزکیۂ نفس انسانی کے واسطے ضروری ہے۔اس سے کشفی طاقت بڑھتی ہے۔انسان صرف روٹی کھانے سے نہیں جیتا۔بالکل ابدی زندگی کا خیال چھوڑ دینا اپنے اوپر قہر الٰہی کا نازل کرنا ہے۔مگر روزہ دار کو خیال رکھنا چاہیئے کہ روزے سے صرف یہ مطلوب نہیں ہے کہ انسان بھوکا رہے،بلکہ خدا کے ذکر میں بھی بہت مشغول رہنا چاہیئے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان شریف میں بہت عبادت کرتے تھے۔ماہ رمضان میں کھانے پینے کے خیالات سے فارغ ہو کر تبتّل الی اللہ کرنا چاہیئے۔بدنصیب ہے وہ شخص،جس کو جسمانی روٹی ملے،مگر اس نے روحانی روٹی کی پرواہ نہ کی۔جسمانی روٹی سے جسم کو قوّت ملتی ہے۔ایسا ہی روحانی روٹی روح کو قائم رکھتی ہے۔ اس سے روحانی قویٰ تیز ہوتے ہیں۔

حضرت خاتم اولیا (ابن عربیؒ) لکھتے ہیں کہ ایک بار ایام جوانی میں ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بزرگ معمّر مَلک صورت مجھ کو خواب میں دکھائی دیا اور اس نے یہ ذکر کر کے کہ کسقدر روزے انوار سماوی کی پیشوائی کے لئے رکھنا سنت خاندان نبوت ہے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میں اس سنت اہل بیت رسالت کو بجالاؤں۔ میں نے رؤیا مذکورہ کے موافق چھ ماہ تک برابر مخفی طور پر روزوں کا التزام کیا۔ اس اثناء میں عجیب عجیب مکاشفات مجھ پر کھلے۔ بعض گذشتہ نبیوں سے ملاقاتیں ہوئی۔ ایک دفعہ عین بیداری کی حالت میں جناب رسالتمآب علیہ الصلوۃ والسلام کو مع حسین وعلی و فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دیکھا اور یہ خواب نہ تھی۔ بلکہ بیداری کی ایک قسم تھی۔ غرض اس طرح پر کئی مقدس لوگوں کی ملاقاتیں ہوئیں، جن کا ذکر کرنا موجب تطویل ہے۔ اور علاوہ اس کے انوار روحانی تمثیلی طور پر برنگ سبز و سرخ ایسے دلکش ودلستاں طور پر نظر آتے تھے، جن کا بیان کرنا بالکل طاقت تحریر سے باہر ہے۔ وہ نورانی ستون جو سیدھے آسمان کی طرف گئے تھے، جن میں سے بعض چمکدار اور بعض سبز و سرخ تھے، ان کو دل سے ایسا تعلق تھا کہ ان کو دیکھ کر دل کو نہایت سرور پہونچتا تھا۔ اور دنیا میں کوئی ایسی لذات نہیں ہوتی، جیسا کہ ان کو دیکھ کر دل اور روح کو لذت آتی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ وہ ستون درحقیقت روزہ اور خدا تعالیٰ کی محبت کی ترکیب سے ایک تمثیلی صورت میں ظاہر کئے گئے تھے۔ یعنی وہ ایک نور تھا جو دل سے نکلا۔ اور دوسرا وہ نور تھا جو اوپر سے نازل ہوا۔ اور دونوں کے ملنے سے ایک ستون کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ روحانی امور ہیں کہ دنیا ان کو نہیں پہچان سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کی آنکھوں سے بہت دور ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے بھی ہیں، جن کو ان امور کی خبر ملتی ہے۔

فرماتے ہیں جب میں نے چھ ماہ کے روزے رکھے، تو ایک دفعہ ایک طائفہ انبیاء کا مجھے ملا اور انہوں نے کہا کہ تو نے کیوں اپنے نفس کو مشقت میں ڈالا ہوا ہے اس سے باہر نکل۔ اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو خدا کے واسطے مشقت میں ڈالتا ہے، تو وہ خود ماں باپ کی طرح رحم کر کے اسے کہتا ہے کہ تو کیوں مشقت میں پڑا ہے۔ مگر جو لوگ تکلف سے اپنے آپ کو مشقت سے محروم رکھتے ہیں، خدا ان کو دوسری مشقت میں ڈالتا ہے اور نکالتا نہیں۔ اور دوسرے جو خود مشقت میں پڑتے ہیں، ان کو وہ آپ نکالتا ہے۔ انسان کو واجب ہے کہ اپنے نفس پر آپ شفقت نہ کرے، بلکہ ایسا بنے کہ خدا اس کے نفس پر شفقت کرے، کیونکہ انسان کی شفقت اس کے نفس پر اس کے واسطے جہنم سوزاں ہے اور خدا کی شفقت جنت ہے۔ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے قصہ پر غور کرو کہ جو آگ میں خود گرنا چاہتا ہے، اسے تو خدا آگ سے بچاتا ہے اور جو خود آگ سے بچنا چاہتا ہے، وہ آگ میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہ اسلم

ہے اور یہ اسلام ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آوے اس کا انکار نہ کرے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عظمت کی فکر میں خود لگتے تو وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (یعنی خدا تعالیٰ تجھے لوگوں سے بچائے گا) کی آیت نازل نہ ہوتی۔ حفاظت الٰہی کا یہی سرّ ہے۔

روزے اور والدین میں مناسبت مغفرت الٰہی کی حکمت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ دو آدمی بڑے بدقسمت ہیں۔ ایک وہ جس نے ماہ رمضان پایا اور وہ گذر گیا لیکن اس کے گناہ نہ بخشے گئے۔ اور دوسرا وہ جس نے والدین کو پایا اور وہ گذر گئے اور اس کے گناہ نہ بخشے گئے۔ والدین کے سایہ میں جب بچہ ہوتا ہے، تو اس کے تمام ہمّ وغم والدین اٹھاتے ہیں اور اس کی غور و پرداخت کا بار انہی پر ہوتا ہے۔ جب انسان خود یہ بار اٹھاتا ہے تب اس کو والدین کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے والدہ کو مقدم رکھا ہے، کیونکہ والدہ بچے کے واسطے بہت دکھ اٹھاتی ہے۔ کیسی ہی متعدی بیماری بچہ کو لاحق ہو، چیچک ہو، ہیضہ ہو، طاعون ہو، ماں اس کو چھوڑ نہیں سکتی۔ ہماری لڑکی زینب کو طاعون کی بیماری ہوئی، تو ہمارے گھر سے اس کی والدہ ایک دم بھی اس سے جدا نہ ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مَیں منع کرتا رہا کہ یہ متعدی بیماری ہے۔ مگر اس کے مرنے تک اس کی والدہ اس کی چارپائی کے پاس بیٹھی رہی۔ ماں بہت تکالیف میں بچہ کے شریک ہوتی ہے۔ یہ طبعی محبت ہے، جس کے ساتھ کوئی دوسری محبت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

روزہ کو والدین سے یہ مناسبت ہے کہ جیسا کہ والدین کے ذریعہ انسان کی جسمانی پرورش و تربیت ہوتی ہے اسی مناسبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے اور والدین کا ایک ہی جگہ ذکر فرمایا۔ دیکھو پارہ دو رکوع ۶ جہاں خدا تعالیٰ نے انسان پر والدین کے لئے وصیت مال کا ذکر کیا ہے، وہاں اس کے اختتام کے بعد فرضیت روزہ کا ذکر شروع فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تربیت و تکمیل کے لئے روزے اور والدین کو بڑا تعلق ہے۔

آئینہ دیکھنا اور آنکھ میں سرمہ ڈالنا روزہ دار کیلئے منع نہ ہونیکی وجہ

روزہ میں یہ امر ہے کہ بول و براز یعنی عادی و غیر اختیاری امور کے سوا پیٹ سے باختیارِ خود وہ اشیاء نہ خارج اور نہ اس میں داخل کی جائیں، جن سے انسانی وجود کا قیام ہوتا ہے۔ مگر آئینہ دیکھنا اور آنکھ میں سرمہ ڈالنا یا سر میں تیل ڈالنا ایسے امور نہیں ہیں، جن کے ساتھ قیام وجود انسانی ہو سکے۔ اس لئے ان سے ممانعت نہیں ہے۔

صدقہ فطر غلّہ یا اسکے بدلہ نقد مقرر ہونے کی وجہ

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صدقہ فطر ایک صاع خالص جَو یا انگور یا گندم مقرر فرمائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مقدار شہروں و دیہات میں غالباً ایک کنبہ کی قوت کے لئے کافی ہو سکتی ہے، اس لئے یہ مقدار معین فرمائی اور امر کیا کہ جس مقدارِ خوراک سے لوگ اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ لہٰذا جس شہر میں لوگوں کی خوراک اور کوئی چیز ہو، تو ان پر اسی چیز کا ایک صاع دینا لازم آتا ہے۔ مثلاً باجرہ۔ مکّی۔ چاول۔ انجیر وغیرہ ہر قسم کے غلے۔ اور اگر کسی شہر میں لوگوں کی خوراک غلّے کے سوا اور اشیاء ہوں، مثلاً دودھ یا گوشت یا مچھلی، تو ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے قوت کے برابر ان اشیاء میں سے جو چیز رکھتے ہیں مساکین کو دیں۔ کیونکہ مقصود تو اس سے یہ ہے کہ عید کے دن مساکین کی حاجت براری ہو جائے اور ان کے ساتھ انسانی ہمدردی کا حق ادا ہو۔ اسی قیاس پر آرد یعنی آٹے کا صدقۂ فطر دینا جائز ہے۔ اور پکے ہوئے طعام کا صدقہ فطر دینا اگرچہ مساکین کے لئے زیادہ تر مفید ہے کہ اس میں ان کو کوئی محنت و مشقت اٹھانی نہیں پڑتی۔ مگر غلہ مساکین کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے، کیونکہ غلہ دیر پا ہوتا ہے اور جو بات غلہ سے حاصل ہوتی ہے وہ مساکین کو پکے ہوئے طعام کثیر سے حاصل نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب کہ پکا ہوا طعام مساکین کے پاس بکثرت جمع ہو جائے، تو وہ دیر تک رہنے سے باسی ہوتا اور بگڑ جاتا ہے اور کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اور اس کی حفاظت بھی ناممکن ہے۔ اور اگر ان کے لئے محض نقد دینے کا حکم ہوتا، تو بھی اس میں یہ نقص ہوتا کہ ہر ایک ملک کے سکے مختلف اور ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں بھی مساکین کی حاجت براری کماحقہٗ نہ ہو سکتی۔ اگر ایک خاص وزن کا صدقہ معین نہ ہوتا، تو لوگ اس میں کمی اور تساہل کرتے بلکہ نہ دیتے۔

عربی صاع ایک وزن ہے، جو خاص عرب کے لئے مخصوص ہے اور اسی کے حساب سے ہر کسی کو صدقہ دینا لازم ہوا۔ کیونکہ اسلامی احکام میں جہاں موازین کی قید کا حکم ہے، وہاں انہی موازین کا مقدار معتبر ہوگا، جو شاہ عرب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں نافذ ہونے کا حکم فرمایا۔ مگر عام کاروبار کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص سکہ یا وزن یا گز مقرر نہیں فرمایا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ جیسا کہ لوگوں کی تمدنی حالتوں کا تبدل ہوتا رہے گا، ایسا ہی ان کے قوانین تمدن کا بھی تبدل و تغیر ہوتا رہے گا۔ لہٰذا ان کے لئے کوئی سکہ یا گز یا وزن مخصوص معین نہیں فرمایا، کیونکہ یہ بات امت کے لئے تکلیف مالا یطاق ہو جاتی۔ دراصل اس یوم عظیم یعنی عید فطر کے دن مساکین کو سوال سے لاپرواہ کر دینا مقصود ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے

ہیں۔ اَغۡنُوۡھُمۡ فِیۡ ھٰذَا الۡیَوۡمِ عَنِ الۡمَسۡأَلَۃِ ۔ ترجمہ یعنی مساکین کو اس دن میں سوال کرنے سے غنی و لا پرواہ کردو۔ اور ان اجناس کا دینا اس لئے مقرر فرمایا کہ لوگ عید کے دن کھانے پکانے کے اس قدر عادی نہ تھے، بلکہ لوگوں کی قوت خوراک سارے ایام سال کی طرح معتاد و مقرر تھی۔ لہٰذا عید قربان کے دن قربانیوں کے گوشت کی خوراک و غذا مقرر ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا۔ اَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَالۡمُعۡتَرَّ. یعنی قربانیوں کے گوشت سوالی اور بھوکے کو دیدو اور کھلاؤ۔ اگر کسی گاؤں یا شہر یا کسی قوم میں لوگوں میں غیر معتاد کھانے پکانے کی عادت اور رواج ہو، تو ان کو جائز بلکہ مشروع ہے کہ مساکین کے ساتھ ہر طرح سے ہمدردی کریں اور کھانے کھلائیں۔

بوقت رات روزہ مقرر نہ ہونے کی وجہ

چونکہ رات کا وقت بالطبع ترک شہوات و لذات کا ہے۔ لہٰذا اگر رات کا وقت روزہ کے لئے قرار دیا جاتا، تو عبادت عادت سے اور حکم شرع مقتضائے طبع سے ممتاز نہ ہوتا۔ اسی واسطے نماز تہجد اور وقت تلاوت و مناجات شب کو قرار دیا گیا۔ (تشریحی نوٹ از مرتب۔ رات کے وقت روزہ رکھنے کا حکم ہوتا، تو لوگوں کو اس کی کچھ ایسی پرواہ نہ ہوتی، کیونکہ وہ اس بات کے عادی ہیں)

ہر سال میں ایک مہینہ روزوں کے لئے مخصوص ہونے کی وجہ

ا۔ چونکہ روزہ کی روزانہ پابندی ہمیشہ کے لئے تمام لوگوں سے باوجود تدابیر ضروریہ اور اموال و اہل کے ساتھ مصروف ہونے کے ممکن نہ تھی، لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ کچھ زمانہ کے بعد ہر مرتبہ ایک مقدار معین کا اہتمام و التزام کیا جائے، جس سے قوت مَلَکی کا ظہور اور اپنی خواہشوں کے پورا ہونے سے اس کا سرور معلوم ہو جائے۔ اور اس سے پیشتر جو کمی ہوئی ہے، وہ دور ہو جائے اور اس کا حال اس گھوڑے کا سا ہے، جس کی پچھاڑی اگاڑی میخ سے بندھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ دو چار بار ادھر ادھر لاتیں چلا کر اپنی اصلی حالت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہ بات ضروری ہے کہ روزہ کی ایک مقدار مقرر کی جائے تا کہ کوئی شخص اس میں افراط و تفریط نہ کر سکے۔ لہٰذا امور مذکورہ کے لحاظ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ ایک مہینے تک ہر دن برابر کھانے اور پینے اور جماع کرنے سے نفس کو باز رکھنے کے ساتھ روزی کا انضباط کیا جائے۔ کیونکہ ایک دن سے کم مقدار کا مقرر کرنا ایسا ہے کہ جیسے دو پہر کے کھانے کو کچھ دیر کر کے کھانا۔ اور اگر رات کو ان امور کے ترک کرنے کا حکم دیا جاتا، تو لوگ اس کے عادی ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کو کچھ پرواہ نہ ہوتی۔ اور ہفتہ اور دو

ہفتے ایسی قلیل مقدار ہے، جس کا نفس پر چنداں اثر نہیں ہوتا۔ اور دو مہینے کی ایسی مقدار ہے کہ اس میں آنکھیں گڑھ جاتی ہیں اور نفس تھک کر رہ جاتا ہے۔ اور ان امور کے لحاظ سے روزہ کے لئے یہ بات ضروری ہوئی کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک دن کا انضباط کیا جائے، کیونکہ عرب اسی کو دن شمار کرتے ہیں۔

۳۔ چونکہ روزہ تمام قسم کے نفسانی زہروں کے دفع کرنیکے واسطے ایک طرح کی تریاق ہے اور اس میں طبیعت کو تکلیف بھی ہوتی ہے، لہٰذا بقدر ضرورت اس کی ایک معین مقدار ہونی چاہیئے، جو کہ اتنی کم نہ ہو کہ جس سے کچھ فائدہ ہی نہ ہو اور نہ اس قدر افراط کر دی جائے کہ اعضاء میں ضعف آ جائے اور دلی فرحت جاتی رہے اور نفس کمزور ہو جائے اور انسان بالآخر اس محنت سے قبر میں ہی جلدی چلا جائے۔

کھانے پینے میں کمی کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غذا کی مقدار میں کمی کر دی جائے۔ یہ طریقہ عام قانون کی تحت میں بمشکل آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے مختلف درجے ہیں۔ کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی اس سے زیادہ کھاتا ہے۔ ایک یہ طریق ہے کہ کھانے کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے، وہ معمول سے زیادہ ہو۔ یہی طریقہ شریعت میں معتبر ہے کیونکہ تمام صحیح المزاج آدمیوں کا اس پر اتفاق ہے۔ لوگ عام طور سے صبح و شام دو مرتبہ کھاتے ہیں۔ یا دن رات میں ایک ہی بار کھاتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ روزانہ لوگوں کو کم کھانے کی تکلیف دی جائے۔ مثلاً کہا جائے کہ تم لوگ اس قدر کھایا کرو کہ حیوانیت مغلوب رہے۔ ایسا حکم دینا شریعت کے خلاف منشاء ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جو بھیڑیئے کو چرواہا بنائے، وہ خود ظالم ہے۔ ہاں مباحات میں ایسا کرنا مناسب نہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ فاصلہ اتنی دیر کا نہ ہو کہ نقصان پہنچے اور قوت استیصال ہو جائے۔ مثلاً تین رات دن برابر بھوکے رہنے کا نہ حکم ہو۔ اس لئے کہ شریعت کے خلاف منشاء ہے۔ اور ہر ایک کو اس کی تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ البتہ بھوکے پیاسے رہنے کے لئے بار بار کی بھی قید ہو، تا کہ عادت پڑ جائے اور اطاعت کا مادہ پیدا ہو، ورنہ ایک بار بھوکے رہنے سے، خواہ کیسی ہی قوی اور سخت بھوک ہو، کیا فائدہ ہوگا۔

ان مقدمات کے تسلیم کرنے پر ماننا پڑے گا کہ روزہ پورے دن بھر کا کامل ایک مہینے تک ہونا چاہئے۔ کیونکہ دن بھر سے کم تو ایسا ہی ہے کہ دن کا کھانا ایک ذرا تاخیر کر کے کھایا جائے۔ اور اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ رات کے کھانے کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ایک دو ہفتہ بہت تھوڑی مدت ہے، جس کا اثر نہیں ہوسکتا۔ اور دو دو مہینے تک روزہ رکھنے سے طبیعت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔

۴۔ چونکہ روزہ کے قانون کو عام ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اس میں سب کی اصلاح و تہذیب مراد

ہے۔لہٰذا ہر شخص اس بات کا مجاز نہ ہو کہ جس مہینے میں آسانی سمجھے روزہ رکھ لے۔اس لئے کہ اس میں باب معذرت کے وسیع ہو جانے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے انسداد اور اسلام کے ایک عظیم الشان جزو میں رخنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

۵۔مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کا ایک وقت میں کسی ایک چیز کی پابندی کرنے سے ایک دوسرے کو اس کام میں مدد ملے گی اور آسانی ہوگی۔اور کام کرنے کی جرات پیدا ہوگی۔

٦۔ایک کام کو ایک ہی وقت میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا بالاتفاق مل کر کرنا ان کے لئے باعث نزول رحمت الٰہی اور ان میں صورت اتفاق و اتحاد کے لئے مفید ہے۔یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے خدا تعالیٰ نے روزوں کا ایک ہی مہینہ معین و مشخص کیا ہے۔پس جو شخص اس نظام الٰہی کو بغیر عذر کے توڑتا ہے،اس پر بجائے رحمت کے لعنت کا نزول ہوتا ہے۔

یکم شوال کو روزہ رکھنا حرام ہونے کی وجہ

سوال۔یکم شوال کا روزہ حرام اور رمضان کا آخری روزہ فرض ہونے کا کیا راز ہے، باوجودیکہ دونوں یوم یکساں ہیں۔

جواب۔یہ دونوں یوم مرتبہ و درجہ میں برابر نہیں ہیں۔گو طلوع و غروب آفتاب میں یکساں ہیں، مگر حکم الٰہی میں یکساں نہیں ہیں۔کیونکہ ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس کے روزے رکھنا خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کئے ہیں۔اور یکم شوال لوگوں کی عید و سرور کا دن ہے، جس میں خدا تعالیٰ نے لوگوں پر کھانا پینا بطور شکر گذاری بندگان خود مباح کیا ہے۔اس لئے اس دن سب لوگ خدا تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں۔لہٰذا خدا تعالیٰ کے مہمان کو واجب ہے کہ اس کی دعوت و ضیافت کو قبول کرے۔یہ امر خدا تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے کہ اس دن کوئی شخص روزہ رکھ کر خدا تعالیٰ کی ضیافت و دعوت کو ردّ کرے۔ مہمان کے لوازم اور آداب میں سے یہ امر بھی ہے کہ روزہ رکھے تو صاحب خانہ یعنی میزبان کے اذن سے رکھے۔پس جب کہ شوال کو اہل اسلام خدا تعالیٰ کے خاص مہمان ہوتے ہیں، تو پھر اس دن کس کو روزہ رکھنا جائز ہوسکتا ہے۔یہ امر شریعت اسلامیہ کی خوبیوں میں سے ہے کہ خدا نے رمضان کا آخری روزہ رکھنا فرض کیا۔کیونکہ روزہ خدا تعالیٰ کے اِتمام امر نعمت و خاتمہ عمل کے لئے ہے اور شوال کی یکم کو روزہ رکھنا حرام ہوا، کیونکہ وہ ایسا دن ہے کہ اس میں تمام مسلمان اپنے پروردگار کے مہمان ہوتے ہیں۔ یوں تو تمام مخلوق خدا تعالیٰ کی دائمی مہمان ہے، مگر یہ دن اس کی ایک مخصوص مہمانی وضیافت کا ہے، جس کو ردّ کرنا گناہ عظیم ہے۔

وجہ کراہیت روزہ جنبی وحرمت روزہ حائض

عربی زبان میں جنابت بمعنے غربت بھی آیا ہے۔اور غربت میں دوری کی خاصیت ہے۔اور حیض کو خداتعالیٰ نے اذیٰ فرمایا ہے۔اوراذیٰ میں بھی دُوری کا مادہ موجود ہے۔ چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔اِنَّ الَّـذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللهُ ۔ترجمہ یعنی جولوگ خدااوررسول کوایذادیتے ہیں خداتعالیٰ ان پرلعنت کرتا ہے یعنی ان کواپنی رحمت وقرب سے دورڈال دیتا ہے۔کیونکہ لغت کے معنے بُعد ودُوری کے ہیں۔اوران پر یہ لعنت انکی ایذادہی کی وجہ سے پڑتی ہے۔لفظ اذیٰ کو خداتعالیٰ کے اسم قدوس سے دُوری ہے اورروزہ خداتعالیٰ بےمثل وبے مانند کےقرب کا باعث ہے۔کیونکہ روزہ کی مثل کوئی عبادت نہیں ہے۔پس جیسا کہ قرب اور بُعد ایک جگہ میں جمع نہیں ہوسکتے ،ایسا ہی روزہ وجنابت و اذیٰ کا اجتماع نہیں ہوسکتا، کیونکہ اجتماع اضدادمحالات میں سے ہے۔

ماہ رمضان کی راتوں میں تقرری نمازتراویح کی وجہ

ا۔رمضان کی راتوں میں نمازتراویح اس لئے مقرر ہوئی کہ طبعی خواہشوں کی کمال مخالفت ثابت ہو۔کیونکہ طبیعت روزہ کی سستی ومحنت ومشقت کودفع کرنے کے لئے استراحت وآرام چاہتی ہے۔لہٰذا اس میں ایسی عبادت کا تقرر ہوکہ جس سے عادت وعبادت میں امتیاز ہو۔

۲۔ ماہ رمضان نزول مزید برکات وانوار کے لئے مخصوص ہے۔لہٰذااس مہینہ کی راتوں میں بھی ایک ایسی عبادت کا تقرر ہوا۔کیونکہ اکثر برکات وانوارالٰہی کا نزول رات کوہی ہوتا ہے۔اورنزول برکات وانوار کامحل، جوانسان کا دل ہے، وہ جب ہی مستحق ان کا ہوسکتا ہے کہ ماہ رمضان کے شب وروز کا اکثر حصہ عبادت الٰہی میں گذارے اور بیدار وہوشیار رہو۔

سوال ۔بعض اشخاص نے حضرت عمررضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بعض مخفیات کا ذکرکر کے نمازتراویح کو بدعت عمری ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ جیسے بعض امور نادرہ دینیہ مثلاً جنبی کے لئے تیمّم کا جائز ہونا اور مجوس سے جزیہ لینااور حج کا تمتع جائز ہونا حضرت عمرؓ پرمخفی رہے اور حالانکہ یہ امور جائز تھے اور نبی علیہ السلام نے ان پرعمل درآمد کر کے دکھایا دیا تھا۔ایسا ہی مسئلہ تراویح کا نسخ حضرت عمرؓ پرمخفی رہا اور غلطی سے انہوں نے نمازتراویح کورواج دیا۔

جواب ۔ہم کہتے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ بعض صحابہ کرام سے بعض اجتہادی سہو ہوگیا ہو۔مگر خداتعالیٰ کا ان کوایسی غلطیوں وسہو پرقائم رکھنے کا ہرگز منشا نہ تھا۔اس لئے خداتعالیٰ ان کے سہو کو بہت

جلدی ان سے رفع کر دیتا تھا، کیونکہ وہی ستون دین تھے اور انہی کے ذریعہ اسلام دنیا میں پھیلا۔ اگر خلفائے راشدین کو ایسی باتوں پر قائم رکھا جاتا، جن کی اصل اسلام میں نہیں ہے، تو بڑی مشکل پڑتی۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات نبوی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے فوراً سمجھ گئے اور اس خیال سے رجوع کر لیا تھا۔ علی ھذا القیاس جن امور میں کبھی ان سے سہو ہوتا تھا وہ بہت جلدی اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ ان میں کوئی اڑ وضد نہ تھی۔ اور تراویح کا عمل سارے خلفائے راشدین کے زمانے میں رہا۔ اگر یہ عمل خدا تعالیٰ کو منظور نہ ہوتا تو صحابہ کے زمانہ میں اس کو دینی امر سمجھ کر بجا نہ لایا جاتا اور نہ اس پر عمل کیا جاتا۔ لہٰذا وہ امور دینیہ، جن پر صحابہ نے مداومت کی، وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک منظور ومقبول تھے۔ اور ایسے امور کی پیروی کی نسبت ان کو صحابہ کرام وتابعین وتبع تابعین نے رواج دیا خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی تاکید فرمائی تھی۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ۔ ترجمہ یعنی سبقت کرنے والے اسلام لانے میں پہلے مہاجرین میں سے اور انصار اور وہ لوگ، جنہوں نے پیروی کی انکی اچھی طرح سے، خدا تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ اس میں خدا تعالیٰ انکے اعمال کی قبولیت ظاہر فرماتا ہے۔

صحابہ کرام نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے گرد وپیش ایسے تھے، جیسا کہ آفتاب کے گرد ستارے ہیں۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے صحابہ کرام کے متعلق ایسا ہی فرمایا ہے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ۔ ترجمہ یعنی میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالمقابل صحابہ کرام کا وجود ایسا تھا کہ جیسا ایک بحر عظیم سے نالے اور نہریں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ پس جو ایسی نہر و نالے سے پانی پی لے، وہ بحر ہی سے درحقیقت پانی پیتا ہے۔

آب خواہ از جو بجو خواہ از سبو کایں سبورا ہم مدد باشد ز جو
نور خواہ از مہ طلب خواہی زخور نور مہ ہم زآفتاب است اے پسر
مقتبس شوزد وچوں یابی نجوم گفت پیغمبرؐ کہ اصحابی نجوم

ترجمہ۔ یعنی پانی خواہ نہر سے چاہو خواہ گھڑے سے لو۔ گھڑے کا پانی بھی نہر ہی سے آیا ہے۔ روشنی خواہ چاند سے خواہ آفتاب سے طلب کرو۔ چاند کی روشنی بھی آفتاب ہی سے آتی ہے۔ جب ستاروں کو پاؤ تو جلدی فائدہ طلب کرو۔ پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔

ماہ رمضان کے عشرہ اخیر میں مسجد کے اندر معتکف ہونے کی وجہ

لفظ اعتکاف عکف سے نکلا ہے جس کے معنے روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ چونکہ معتکف بحالت روزہ تمام حوائج دینویہّ واغراض نفسانیہ سے اپنے آپ کو بقصد عبادت الٰہی مسجد میں روک کر درِ الٰہی پر گرا دیتا ہے، اس لئے اس فعل کا نام اعتکاف ہوا۔

برروایت اُبی ابن کعب ابن ماجہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے عشرہء اخیر میں اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔

روزہ عاشقانہ رنگ میں ایک تصویری زبان کی دعا والحاح ہے۔ اور اعتکاف عاشق کا دروازہء معشوق پر اپنے آپ کو بحالت تضرع وزاری پیش کرنا ہے۔ گویا معتکف اپنے آپ کو درگاہ الٰہی میں ایسا مقید کرتا ہے جیسا کہ ایک الحاح کنندہ سائل کسی کے دروازے پر معتکف ہوجاتا ہے اور اپنی حاجت ومراد حاصل ہوئے بغیر نہیں ہٹتا۔ یہ کہ عاشق زار کی طرح اپنے معشوق کے دروازے پر بھوکا و پیاسا رہ کر اور دنیا کی تمام حوائج واغراض سے فارغ ولا ابالی ہوکر محض جلوہء محبوب ومعشوق کے لئے اسکے دروازے پر معتکف ہوجاتا ہے۔ اور جب تک اس کا معشوق اس کو اپنا منہ نہ دکھائے اس کے در سے نہیں ہٹتا اور اس کے شوق میں ساری لذات کو چھوڑ کر اسکے در پر آ کر سر رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعتکاف خانہ خدا یعنی مسجد کے بغیر کہیں جائز نہیں۔ کیونکہ عاشق طالب دیدار کو اپنے معشوق کے دروازے پر ہی گرنا چاہیئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بحالت اعتکاف معتکف کو رات میں بھی اپنی عورت سے مباشرت کرنی جائز نہیں۔ کیونکہ صادق عاشق کو ان باتوں کا کہاں خیال رہتا ہے۔ اور یہ جو ماہ رمضان کے عشرہ آخری میں لیلۃ القدر کا ظہور روایات میں مذکور ہے، وہ اسی تجلی کی طرف اشارہ ہے، جسکا ظہور عاشقان الٰہی پر ہوتا ہے۔

روزہ دار کے منہ کی بو قیامت میں کستوری سے زیادہ خوشبودار ہونیکی وجہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَخَلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ لَطَیَبُ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْکِ. ترجمہ۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے، جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ بیشک روزہ دار کے منہ کی بو خدا تعالیٰ کے نزدیک قیامت کو کستوری سے زیادہ خوشبو والی ہوگی۔

ا۔ یہ ایک معقول اور قابل قدر بات ہے کہ تحصیل کمالات کے لئے جو محنتیں ومشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں سب جانتے ہیں کہ پہلے جسم پر ان سے اتنی بڑی کوفتیں وتھکان واقع ہوتی ہے کہ وہ جسم کو ناگوار وبودار

معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ان کے آخری نتائج کی امیدیں انسان کو خوشگوار اور معطر نظر آتی ہیں اور بالآخر ایسا ہی ہوتا ہے اور ان محنتوں و مشقتوں کا بیابان فرحت افزا اور خوشبودار بستان سے مبدل ہو جاتا ہے۔

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست　　　مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ترجمہ۔ ہر ایک رونے کے بعد ہنسی کی نوبت بھی آتی ہے۔ دوراندیش انسان مبارک ہوتا ہے۔

۲۔ روزہ دار کے منہ کی بُو سانس سے معلوم ہوتی ہے، جس کو ہر سونگھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔ اور اس بُو کو خدا تعالیٰ کے نزدیک بوئے کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ٹھہرایا گیا ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم کے اعمال کے مکافات دوسری اشکال میں ہوں گے۔ دنیا میں اجسام کا ارواح پر غلبہ ہے اور آخرت میں ارواح کا غلبہ اجسام پر ہوگا۔ یہاں اعمال قالب و اشباح ہیں اور ان کے ثمرات ارواح ہیں۔ سو ہر کوئی جانتا ہے کہ قالب و روح کی صورت یکساں نہیں ہوتی۔ اصل اور اس کے نتیجہ میں کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔

شاخ اشگوفہ نماند دانہ را　　　نطفہ کے ماند تن مردانہ را

نیست مانندِ ہیولا با اثر　　　دانہ کے مانند باشد با شجر

نطفہ از نان است کے ماند بناں　　　مردم از نطفہ است کے باشد چناں

جنی از نار است کے ماند بنار　　　از بخار است ابر کے باشد بخار

از دم جبرئیل عیسےٰ شد پدید　　　کے بصورت ہمچو او شد ناپدید

آدم از خاک است کے ماند بخاک　　　ہیچ انگورے نمے ماند بتاک

ترجمہ۔ یعنے شگوفہ کی شاخ دانہ کی مانند نہیں ہوتی۔ نطفہ آدمی کے جسم کی مانند نہیں ہوتا۔ اثر اصل مادہ کی طرح نہیں ہوتا۔ دانہ درخت کی مانند نہیں ہوتا۔ نطفہ روٹی سے ہوتا ہے مگر وہ روٹی کی مانند نہیں ہوتا۔ آدمی نطفہ سے بنتا ہے مگر آدمی ایسا کب ہوتا ہے۔ جن آگ سے پیدا ہوتا ہے مگر وہ آگ کی مانند کب ہوتا ہے۔ بادل بخار سے ہوتا ہے مگر وہ بخار کی مانند کب ہوتا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام کی پھونک سے عیسےٰ علیہ السلام پیدا ہوئے مگر جبرئیل کی مانند صورت کے ساتھ وہ کب گم ہوئے۔ آدمی مٹی سے پیدا ہوتا ہے مگر وہ کب مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ کوئی انگور کا دانہ بیل کی طرح نہیں ہوتا۔

۳۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کا بیج، جو زمین میں بویا جاتا ہے، وہ مٹی اور پانی کی تراوت سے متعفن ہو کر بودار بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ اگتا ہے اور جب اس کو پھول و پھل لگتے ہیں، تو ان کا اور ہی ذائقہ اور بو ہوتی ہے۔ اور جب ان کو پکا کر کھایا جائے، تو کچھ اور ہی مزا آتا ہے۔ ایسا ہی روزہ دار کے منہ کی بُو بیج و اصل ہے اور قیامت میں اس کا کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ہونا اس کا نتیجہ و پھل ہوگا۔

رنج گنج آمد کہ رحمتہا دروست مغز تازہ شد چو بخراشید پوست

ترجمہ۔رنج بالآخر گنج کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔رنج میں بہت رحمتیں ہیں۔جب مغز پک جائے تو چھلکا اتر جاتا ہے۔

۴۔روزہ دار کے منہ کی بو خدا تعالیٰ کے نزدیک خوشبو ہے۔کیونکہ خدا تعالیٰ کے ہاں خوشبو کا محسوس کرنا ہماری طرح نہیں ہے۔ہمارے نزدیک تو وہ بو ہے،مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک کستوری سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ "فتوحات مکیّہ" میں اس امر کے متعلق ایک اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ میں موسیٰ بن محمدؑ مؤذن کے پاس حرم مکہ کے منارہ میں مقیم تھا۔اور مسجد میں اس نے کچھ کھانا رکھا ہوا تھا۔جس سے ہر کسی کو گھن آتی تھی۔میں بموجب حدیث نبویؐ جانتا تھا کہ جس چیز سے نبی آدم کو ایذا پہونچے،اس سے ملائکہ کو بھی ایذا پہونچتی ہے۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد میں تھوم اور پیاز وگندنا وغیرہ ایسی چیزوں کا رکھنا منع فرمایا ہے۔رات کو سونے کے وقت میرا ارادہ تھا کہ موسیٰ بن محمدؑ کو کہہ دوں کہ اس طعام کو مسجد سے نکال دے۔سو اسی حالت میں مجھ پر خواب کا غلبہ ہو گیا اور بحالت رؤیا میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا،تو خدا تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ اس کو اس طعام کی بابت کچھ مت کہو۔کیونکہ اس طعام کی بو جیسی تمہارے نزدیک ہے،ویسی ہمارے نزدیک نہیں ہے۔(یہ بات اس شخص کے علوّ مرتبت پر دال ہے) صبح کے وقت شخص مذکور بحسب عادت ہمارے پاس آیا،تو یہ واقع اس کے آگے بیان کیا گیا۔پس وہ وجد سے رو پڑا اور شکر گذاری کا سجدہ کیا۔پھر اس نے کہا باوجودِ ایں شریعت بنویہؐ کا پاس ادب بہتر ہے۔لہٰذا اس نے اس طعام کو مسجد سے نکال دیا۔

دنیا کی لذائذ ومرغوبات وطیبات،جن پر انسان محض انسانی خواہشات کے لئے ریجھا ہوا ہو،اور ان میں اس کا روئے حق نہ ہو،ان کی اخروی بدبو کا نمونہ اور اس جہان کی وہ اشیاء اور محبوبات،جن میں انسان کا روئے حق ہو،اس کی اُخروی خوشبو کی مہک اسی دنیا میں اسی جسم سے محسوس ہو سکتی ہے۔مگر یہ عام نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی عجائبات غیبیہ اور اس کی قدرت کا نمونہ ہے،جس کے لئے وہ چاہے اس کو اسی دنیا میں دکھاتا ہے اور محسوس کر دیتا ہے۔

خاکسار راقم الحروف کو اول وآخر الذکر ہر دو امور کا تجربہ ہو چکا ہے۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ غالباً عرصہ ۲۰ سال کا گذرا ہوگا کہ میں نے حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "احیاء علوم الدین" کی جلد چہارم میں جب یہ باتیں پڑھیں کہ جن انسانوں کے دل دنیا کے زخارف سے پیچیدہ ہوتے ہیں،ان کی نزع سخت ہوتی ہے۔اور مرتے وقت ان سے ایک بدبو نکلتی ہے،جس سے ملائکہ کو نفرت ہوتی ہے۔ان باتوں میں سے کسی میں مجھے تردّد تھا کہ ایک روز اس کو پڑھتے ہوئے مجھ پر نیند

غالب آ گئی۔ رؤیا کی حالت میں مجھے نمودار ہوا کہ مجھ پر حالت نزع طاری ہے۔ اور ایک فرشتہ دندانہ دار آری لے کر میرے حلق کو کاٹ رہا ہے، جس سے مجھے اتنی سخت تکلیف محسوس ہوئی کہ اس کا بیان میرے قلم ناتواں پر نہیں آ سکتا۔ الٰہی الاماں۔ پھر خروج روح کے وقت ایک سخت بدبو محسوس ہوئی اور مجھے اس طرف ایما ہوا کہ دنیا سے دل لگانے والوں کی یہ حالت ہوا کرتی ہے۔ اور اموال وزخارف دنیا، جن کے ساتھ دل کو چسپیدگی ہو، یہ ان کی بدبو ہے۔ اور غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کی یہ تفہیم ہے۔

دوسرے امر کے متعلق مجھے قدرت ایزدی کا نمونہ یہ مشہود و محسوس ہوا کہ بہت مدت نہیں گذری مجھے بعض اہل اللہ کے مقبرہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ جب میں اس مقبرہ کے اندر داخل ہوا، تو مجھے اس میں سے ایسی خوشبو آئی، جس کی نظیر اس دنیا میں مجھے کبھی اب تک محسوس نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس وقت اپنے دوسرے ساتھی کو بھی کہا کہ مجھے اس مقبرہ میں سے ایک نہایت عمدہ خوشبو آئی ہے۔ مگر اس نے اس بات کی تصدیق نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جس کے لئے خداتعالیٰ چاہے کسی وقت اس کی کسی حسّ کو تیز کر دیتا ہے اور اس کے ذریعہ کسی دور کی چیز کا اس کو احساس و مشاہدہ ہوتا یا آواز آجاتی ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اگر ایک چیز، جو بظاہر بعض اشخاص کو معیوب و مکروہ معلوم ہوتی ہے، جیسے روزہ و روزہ دار اور اس کے منہ کی بُو، اور بموجب خبر مخبر صادق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خداتعالیٰ کے نزدیک اس کا انجام و مآل اچھا بتایا گیا ہو، تو اس کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھنا چاہئے، بلکہ اس پر ایمان لانا چاہئے اور جن مرغوبات وطیبات ومعطرات کے نتائج وحقائق خداتعالیٰ کے نزدیک حسب فرمودہء نبویؐ بدبودار ٹھہر چکے ہیں، ان پر بہت ریجھنا نہ چاہئے۔

جواب اس سوال کا کہ کیا پچھنے لگانے سے روز ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال۔ کیا پچھنے لگانے سے روزہ ٹوٹنا خلاف عقل نہیں ہے۔ ابن ماجہ جلد اول میں لکھا ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلّٰی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْطَر الْحَاجِمُ وَ الْمَحْجُوْمُ۔ ترجمہ۔ یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پچھنے لگانے والا اور جس کو پچھنے لگائے جاتے ہیں، دونوں اس فعل سے روزہ کو افطار کر دیتے ہیں۔

جواب۔ بموجب صحت حدیث مذکور جن کے نزدیک پچھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، وہ اس کی تائید میں وجوہات ذیل پیش کرتے ہیں۔

ا۔ پچھنے سے روزہ کا ٹوٹنا مطابق قیاس عقل ہے۔ اور یہ بات اس قاعدہ منضبطہ سے معلوم ہو

جاتی ہے کہ شارع صوم، جس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ،اس نے روزہ کو اکمل و اقوم وجود پر مشروع کیا اوراس میں نہایت اعتدال کی تاکید فرمائی۔ یہاں تک کہ روزہ وصال سے منع فرمایا اور تعجیل افطار وتاخیر سحر کا امر فرمایا۔اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام کے روزہ کو معتدل تر وافضل تر ٹھہرایا۔

روزہ میں اعتدال کی یہ شرط ہے کہ انسان اپنے اندر اس چیز کو داخل نہ کرے،جس سے اس کی تقویت وقیام ہوتا ہے۔مثلاً کھانے و پینے کی چیز اپنے پیٹ میں داخل نہ کرے۔اور نہ کوئی چیز اپنے اندر سے باختیارِ خود نکالے،جس کے ساتھ انسان کا قیام ہوتا ہے۔مثلاً قئے واخراج منی۔اور پھر جن چیزوں سے انسان احتراز کرکے بچ سکے اور جن سے بچنا ناممکن ہو،ان کے درمیان فرق کرکے بتادیا کہ جوامور انسان کے اختیار سے باہر ہوں،ان سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔مثلاً احتلام اور خود بخود قے کے آنے اور گرد وغبار اُڑ کر منہ میں داخل ہونے اور وضو وغسل کرنے کے وقت پانی بے اختیار پیٹ کے اندر چلا جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اور حیض کو بوجہ درازی مدت اور کثرت خروج خون منافی روزہ ٹھہرایا۔اور پچھنے اور زخم کے خون میں فرق بتایا۔ پچھنے کو قے واخراج منی کی طرح قرار دیا اور حیض وزخم سے خون کے جاری ہونے اور نکسیر کے پھوٹنے کو استحاضہ اور احتلام اور خود بخود قے آنے کی مثل بتایا۔پس بدیں ادلّہ ساطعہ شریعت اسلام کو عقل سے مناسبت ومشابہت تام ہے۔

۲۔شریعت کا ایک یہ خاصہ بھی ہے کہ وہ ذوالمعارف والحقائق ہے اور اس میں کئی امور حقہ کی طرف ایما ہے۔لہٰذا بدیں وجہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کے اندر حاجم ومحجوم کے اس فعل کو ناپسند کیا،اس میں دو خاص شخصوں کی طرف اشارہ ہے، جو ایک دوسرے کی غیبت کرتے تھے۔لہٰذا فرمایا کہ غیبت سے ان کے روزہ کا اجر نہیں رہتا۔کیونکہ عالم مثال میں غیبت کرنے والے کو دیکھو،تو معلوم کرو گے کہ وہ جس کی غیبت کرتا ہے اس کے خون کو چوستا ہے اور اسکے گوشت کو کھاتا ہے۔اور اسی امر کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۔ترجمہ۔کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اور تم کو اس سے گھن آتی ہو۔

جب کسی کو پتا لگ جائے کہ فلاں شخص نے میری غیبت کی اور میری کوئی بدی بیان کی،تو اس کو ایک غم وہمّ شروع ہو جاتا ہے۔جس سے اس کا خون و گوشت کم ہوتا جاتا ہے۔اور پھر غیبت کرنے والے کی بدیوں کا اظہار وغیبت و بدگوئی شروع کر دیتا ہے اور اس طرح سے وہ دونوں ایک دوسرے کے حاجم و

مجوم ٹھہرتے ہیں۔

اس حدیث کی صحت میں بعض محدثین نے جرح کی ہے۔کیونکہ اس کے برخلاف احادیث بھی بیان کی گئی ہیں۔چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔اِحْتَجَمَ رَسُوْلَ اللہِ صَلّٰی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وَ ھُوَ صَائِمٌ مُحْرِمٌ۔ترجمہ۔یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے حالانکہ آپ نے بحالت احرام روزہ رکھا ہوا تھا۔اسی بیان پر فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ پچھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

حدیث مذکور کے جواب میں شارح سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پچھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ تھا، کیونکہ آنحضرت اس وقت سفر میں تھے یا یہ کہ آپ کا وہ روزہ نفلی تھا،جس کو افطار کرنا درست ہے۔اس لئے اس کو پچھنے سے آپ نے افطار فرمایا۔اور پھر یہ بھی آیا ہے کہ آپ اس وقت حج وداع میں تھے۔لہٰذا اس وقت آپ کا روزہ نفلی تھا، کیونکہ آپ اس وقت سفر میں تھے۔

راقم الحروف کے نزدیک اس میں کوئی اتنا بڑا اخفا نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ پچھنے لگوانا امتلائے خون وغیرہ کے باعث ہوتا ہے اور یہ ایک مرض ہے۔اور مریض پر خدا تعالیٰ نے فرضی روزہ بھی واجب نہیں کیا۔تو ایسی حالت میں جب کہ آپ پر سفر و مرض کی دونوں حالتیں تھیں،آپ نے اپنے اوپر روزہ نہ نفلی و نہ لازمی ٹھہرایا ہوگا۔(فضل)

ماہ رمضان میں مسافر ومریض پر روزہ واجب نہ ہونے کی وجہ

عبادات الٰہی وہی قابل اعتبار وقبولیت کے ہوتی ہیں،جن میں انسان کی اپنی جسمی حالت کے ہر امر میں پورا پورا اختیار ہو اور کوئی خارجی ہرج و دقت جسم پر وارد نہ ہو، بلکہ ہر چیز کے ترک واخذ اور کھانے پینے اور نہ کھانے پینے کا اختیار رکھتا ہوں۔مگر مسافر ومریض کا حال ایسا نہیں ہوتا۔لہٰذا ان پر ماہ رمضان کا روزہ تا ایام اقامت وصحت واجب نہیں ہوا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ ماہ رمضان میں مسافر ومریض روزہ رکھ لیں،تو جائز ہوتا ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ جائز نہیں ہوتا بلکہ ان پر ایام اقامت وصحت میں اس کا اعادہ واجب ہے۔حضرت ابن عربیؒ کا قول ہے کہ مریض اگر حالت مرض میں ماہ رمضان کا روزہ رکھ لے،تو وہ روزہ نفلی ہو جاتا ہے اور نیکی کا کام ہے۔مگر وہ روزہ اس پر فرض نہیں ہوتا۔اور اگر وہ اس روزہ کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لے،تو جائز نہیں ہوتا۔اور وہ ماہ رمضان میں مسافر کے روزہ کے متعلق لکھتے ہیں وَ اَمَّا الْمُسَافِرَ فَاِنَّہٗ لَا یَکُوْنُ

صَـوْمُـه، فِیْ السَّفَرِ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ وَ لَا فِیْ غَیْرِہٖ عَمَلَ بِرٍّ وَ اِذَا لَمْ یَکُنْ عَمَلَ بِرٍّ کَانَ کَـمَنْ لَمْ یَعْمَلُ شَیْئًا اَوْ یَکُوْنُ عَلٰی ضِدِّ بِرٍّ وَ نَقِیْضُه، ھُوَ الْفُجُوْرُ ۔ترجمہ۔یعنی مسافر کا روزہ ماہ رمضان وغیرہ میں نیکی کا کام نہیں ہوتا۔تو جب اس حالت میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہ ہوا،تو ایسا ہوا کہ جیسے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام نیکی کے برخلاف اور اس کی ضد ہوتا ہے۔اور وہ فجور یعنی گناہ ہے۔

نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ اَلصِّیَامُ فِیْ السَّفْرِ ۔ترجمہ۔یعنی سفر میں روزہ رکھنا نیکی میں شمار نہیں ہوتا۔اور عبدالرحمٰن بن عوف راوی ہیں قَـالَ رَسُـوْلُ اللہِ صَـلّٰی اللہُ عَلَیْـهِ وَسَـلَّـم اَلـصَّائِمُ فِی السّفُرِ کَالْمُفْطِرِ فِی الْحَضْرِ ۔ترجمہ۔یعنی ماہ رمضان میں بحالت سفر روزہ رکھنا ایسا ہے جیسا کوئی ماہ رمضان میں بحالت اقامت روزہ افطار کردے۔

دراصل مسافر و مریض ہر دو کو ماہ رمضان کا روزہ بحالت سفر و مرض واجب سمجھ کر رکھنا گناہ ہے۔ مگر مریض کے لئے ایک وجہ سے جائز ہوسکتا ہے، جو آئندہ بیان ہوگی۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔مَـنْ کَانَ مِـنْـکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِنْ اَیَّامٍ آخرٍ ۔ترجمہ۔یعنی جو تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو،وہ ماہ رمضان کے بعد کے دنوں میں روزے رکھے۔اس میں خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو مریض یا مسافر اپنی ضد سے یا اپنے دل کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے انہی ایام مرض و سفر میں روزے رکھے،تو پھر بعد میں رکھنے کی اس کو ضرورت نہیں ۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا صریح حکم ہے کہ وہ بعد میں روزے رکھے ۔ بعد میں روزے بہرحال اس پر فرض ہیں ۔ درمیان کے روزے اگر وہ رکھے،تو امر زائد ہے اور اس کے دل کی خواہش ہے۔اس سے خدا تعالیٰ کا وہ حکم، جو بعد میں رکھنے کے متعلق ہے،ٹل نہیں سکتا۔

الغرض جو شخص مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں ماہ صیام میں روزہ واجب سمجھ کر رکھتا ہے، وہ خدا تعالیٰ کے صریح حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔خدا تعالیٰ نے صاف فرمادیا کہ مریض اور مسافر روزہ نہ رکھے۔مرض سے صحت پانے اور سفر کے ختم ہونے کے بعد روزے رکھے۔خدا کے اس حکم پر عمل کرنا چاہئے ۔کیونکہ نجات فضل سے ہے، نہ کہ اپنے اعمال کا زور دکھا کر کوئی نجات حاصل کرسکتا ہے۔مریض اور مسافر اگر روزہ ماہ رمضان بوجہ وجوب رکھیں گے،تو ان پر حکم عدولی کا فتویٰ لازم آئے گا۔

مریض کا نفلی روزہ ماہ رمضان میں جائز ہونے کی وجہ

علمائے سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر بیمار حالت بیماری میں روزہ رکھ لے،تو جائز ہوجاتا ہے مگر مسافر کا روزہ جائز نہیں ہوتا۔اور اس میں وجہ یہ لکھی ہے کہ مرض خلاف صحت ہے۔اور روزہ رکھنے کی حکمتوں میں سے ایک حصول صحت جسم بھی ہے۔اسلئے مریض کا روزہ بغرض حصولِ صحتِ جسمانی جائز

ہوسکتا ہے۔مگر اس پر رمضان کا روزہ بحالتِ مرض واجب نہیں ہوتا۔ کیونکہ مرض اور روزہ دوضدین ہیں، جو آپس میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں۔ مریض پر روزہ واجب ہوتا،تو استعمال دوا میں روزہ کوتوڑنا پڑتا اور یہ ابطال عمل کی صورت ہے، جوخدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

بھول کر کھانے پینے اور جماع کرنے والے کا روزہ نہ ٹوٹنے کی وجہ

سوال۔ جب کہ صوم کے معنی ترک کرنے وروکنے کے ہیں،تو جوشخص بھول کر کوئی چیز کھا پی لے،اس نے حدصوم اور صفت ترک کوتوڑ دیا۔پس اس کا روزہ کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔

جواب۔ اگر روزہ دار بھول کر کسی چیز ناقض صوم کا استعمال کرلے،تو بھی امساک وترک شرعی اس کے حق میں موجود ہے۔ کیونکہ شارع نے اس کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ اللہُ اَطْعَمَہ، وَ سَقَاہُ ۔یعنی خدا تعالیٰ نے اس کو کھلایا اور پلایا۔پس اس میں بندہ کا فعل معدوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ کھانے والا ہوتا ہے۔اور امساک ،جس کے معنی صوم یعنی روزہ کے ہیں، وہ معدوم نہیں ہوتا بلکہ اسی طرح موجود ہے۔

سال میں چھتیس روزے رکھنے سے صائم الدہر بننے کی حکمت

نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔مَنْ صَامَ صِیَامَ رَمَضَانَ فَاَتْبَعَہ، سِتًّا مِنْ شَوَّالَ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ ۔ترجمہ یعنی جوشخص رمضان کے روزے رکھ کر اس کے بعد شوال کے چھ روزے اور رکھ لے،تو ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہے۔ اور ان روزوں کی مشروعیّت میں یہ بھید ہے کہ یہ روزے ایسے ہیں، جیسے نماز پنجگانہ کے ساتھ سنتیں مقرر کی گئی ہیں۔جن کی وجہ سے ان لوگوں کو فائدہ کی تکمیل ہوجاتی ہے، جو اصل نماز سے پورا فائدہ حاصل نہیں کرتے۔اور ان روزوں کی فضیلت میں یہ بات ہے کہ ان کی وجہ سے آدمی کو ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔اس لئے مخصوص کئے گئے کیونکہ یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس نیکیوں کے برابر ملتا ہے اور ان چھ روزوں سے یہ حساب پورا ہوسکتا ہے۔یعنی ۳۰+۶=۳۶۔اور ۳۶ کو دس سے ضرب دینے سے تین سو ساٹھ حاصل ضرب ہوتے ہیں، جو لگ بھگ ایک سال کے دن ہوتے ہیں۔

ہر ماہ میں تین روزے مستحب ہونے کی وجہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے میں سے تین روزے رکھا کرتے تھے۔اس امر کی وجہ وجیہہ حکمائے اسلام نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ہر ایک ماہ

جوانسان پر وارد ہوتا ہے، وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر بطور مہمان کے وارد ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان پر مہمان کا حق ضیافت دینا ضروری ہے۔ اور مہمان کا حق تین یوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے ہر ماہ میں تین روزے بطور مستحب مقرر کئے ہیں اور ہر ماہ کے ابتدائی تین ایام میں روزہ رکھنے کی ترغیب فرمائی۔ کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ مہمان کے لئے ضیافت جلدی مہیا کی جائے۔ چنانچہ فرمایا **اَلْعِجْلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ اِلَّا فِیْ ثَلَاثٍ** ۔ترجمہ۔ جلدی کرنا شیطانی کام ہے، مگر تین جگہ رحمانی کام ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مہمان کو کھانا جلدی کھلانا چاہیئے۔

ماہ رمضان میں دوزخ کے دروازے بند ہونے اور بہشت کے دروازے کھلنے کی وجہ

حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے راوی ہیں **اِذَا جَآءَ شَھْرُ رَمَضَانَ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ وَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ** ۔ترجمہ یعنی جب رمضان کا مہینہ آتا ہے، تو بہشت کے دروازے کھلتے اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیطان جکڑے جاتے ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ دنیا میں عام شرو بدیاں جو انسانوں سے سرزد ہوتی ہیں وہ ان کی سیری وقوت جسمی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لہٰذا روزہ کے باعث جب قوت جسمی میں فتور آجائے، تو گناہوں میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ پس جب انسان محض خدا تعالیٰ کے لئے بھوکے اور پیاسے ہوتے اور گناہوں کو ترک کرتے ہیں، تو ان کے لئے رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے اور بہشت کے دروازے ان کے لئے کھل جاتے ہیں۔ اور دوزخ کے دروازوں کا بند ہونا بھی ظاہر ہے کہ جب گناہوں کا دروازہ ہی بند ہو گیا، جس کے باعث سے غضب الٰہی کی آگ بڑھکتی ہے، تو بیشک دوزخ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

اور شیاطین کا جکڑا جانا بھی ظاہر ہے کہ جب بنی آدم کے رگ وریشہ وجسم میں توانائی اور شکم میں سیری ہوتی ہے، تو گناہوں کی طرف انسانوں کو رغبت ہوتی ہے۔ اور اندر سے پٹھوں ونسوں سے شیطانی تحریکات شروع ہو جاتی ہیں۔ مگر جب سارے جسم میں بھوک و پیاس کا اثر ہوا اور بحکم الٰہی شہوانی قویٰ کو روزہ کے ذریعہ دبایا جائے، تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرح سے شیطان جکڑے جاتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔ **اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنْ بَنِی آدَمَ کَمَجْرَی الدَّمِ** ۔ترجمہ یعنی شیطان بنی آدم کے رگ وریشہ میں خون کی طرح جاری ورواں رہتا ہے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ شیطان کا مقام بنی آدم کے رگ وریشہ میں ہوتا ہے۔ پس

جب رگ وریشہ کی قوتوں میں فتور آجائے اور شیطانی تحریکات کا پاس خاطرِ صوم ظہور نہ ہو، تو یہی شیاطین کا جکڑا جانا ہے۔

ایام بیض کے تین روزے رکھنے کی حکمت

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے ہر قمری ماہ کی تیرہویں۔ چودہویں۔ پندرہویں کے تین روزے رکھنا بطور استحباب روایت کی ہے۔

ان روزوں کے رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ ان تاریخوں کی راتوں ودنوں کو ایام بیض کہتے ہیں۔ کیونکہ ان تاریخوں کی راتیں اول سے لیکر آخر تک نور آفتاب کی روشنی سے، جو قمر پر پڑتی ہے، روشن رہتی ہیں۔ انبیاء کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جسمانی امور سے روحانی عبرت پکڑتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں رافع بن عقبےٰ کو دیکھا تو ان کے نام سے یہ تعبیر لی کہ عاقبت میں ہمارا درجہ رفیع ہو گا۔ سہیل کو دیکھ کر فرمایا سَھَّلَ اللّٰہُ لَنَا اُمُوْرَنَا۔ ترجمہ یعنی خدا تعالیٰ ہمارے کام آسان کردے گا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نور آفتاب کا پرتو قمر پر ملاحظہ فرمایا کہ جس سے تینوں راتیں روشن ومنور رہتی ہیں اور درمیان میں کوئی چیز حائل نہیں، تو آپ کے دل میں اس امر کا جوش پیدا ہوا کہ اس حقیقی آفتاب یعنی ذات الٰہی کا نور بھی ہم پر اسی طرح منور ودرخشاں رہے اور کوئی چیز درمیان میں حائل نہ ہو۔ لہٰذا بشری حاجات کھانا۔ پینا۔ جماع جو کثافت وظلمت سے نسبت رکھتے ہیں، ان کو اس نور حقیقی کے درمیان حائل دیکھ کر ترک کردیا اور تین روزے رکھ کر درگاہ الٰہی میں بشکل صوم دعا پیش کردی کہ ہمیں بھی ایسا ہی روشن رکھیو۔ اور ہمارے پرتوِ نور کو دوسروں تک پہونچا دیجئیو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ قالیہ بھی اس امر میں منقول ہیں اور اسی رنگ کو دیکھ کر آپ نے تین روزے رکھے اور خدا تعالیٰ سے واصئ نور کے لئے بصورت صیام بیض دعا درگاہ الٰہی میں پیش کی کہ جلوۂ نور حقیقی کو ہم سے محجوب نہ کیجئیو۔ کیونکہ آفتاب کے مقابل اشیاء عائلہ نفوذ نور سے مانع ہوتی ہیں، ورنہ نور تو ہر چیز میں درخشاں ہے۔

ان تین ایام میں حق کی تجلی خلق میں ہوتی ہے۔ اور وہ آفتاب ہے، جو ہمیں بدر کی راتوں میں چاند میں دکھائی دیتا ہے۔ اور ان راتوں کو روشن راتیں اور نورانی دن کہتے ہیں۔ کیونکہ ان دنوں میں رات اول سے آخر تک روشن رہتی ہے۔ پس ان دنوں کی راتیں بمنزلہ دنوں کے ٹھہرالی گئی ہیں، کیونکہ ان میں تاریکی نہیں ہوتی۔ اور بذریعہ ماہتاب سورج کی روشنی طالع رہتی ہے۔ پس آفتاب کا ظہور ماہتاب کے آئینہ میں گویا حق کا ظہور خلق میں ہوتا ہے۔ کیونکہ **نور** خدا تعالیٰ کے اسمائے صفاتی میں سے ہے، پس وہ اپنے اسم نور کے ساتھ ظہور ماہتاب میں ظاہر ہوا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے **وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْھِنَّ**

نُــوۡرًا ترجمہ۔یعنی خدا تعالیٰ نے چاندکوان میں نورانی بنایا۔پس چاند نورِ شمس کا مجلّا ہےاور خدا تعالیٰ نے سورج کو اس عالم میں چراغ بنایا، کیونکہ نور کو خدا سے نسبت ہے اور وہ ہر منور کو اپنے نور سے امداد دیتا ہے۔اور چراغ سے، جو تیل روشن کیا جاتا ہے، اس کی روشنی تیل کے ذریعہ قائم رہتی ہے۔ایسا ہی ان اجرام کی روشنی نورِ الٰہی سے قائم ہے۔جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آفتاب کو عالمتاب ٹھیرایا اور اسی طرح نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو ارواح کے لئے منور بنایا، کیونکہ آپ کو خدا تعالیٰ دعوت لخلق الی اللہ کے لئے نور روحی سے امداد دیتا تھا۔اور جس کو دعوت الی اللہ کی گئی ہے، وہ بالضرور اپنے جی میں سعی الی اللہ کریگا۔پس اگر اندھیرے میں چل پڑے، تو راستہ میں ہلاکت کے مظالم و گڑھے نہیں دیکھ سکتا اور اس کے اور وصول الی اللہ کے درمیان گڑھا یا کنواں حائل ہو جاتا ہے اور وہ اس میں گر پڑتا ہے۔یا کوئی درخت یا دیوار راستہ میں آجاتی ہے، جو آگے سے اس کے منہ کو لگتی ہے اور اس کو مطلوب اور راہِ وصال سے پھیر دیتی ہے۔اور وہ راہِ راست کو عدمِ تمیز کے سبب بھول جاتا ہے، کیونکہ جب کہ انسان قربِ الی اللہ کا ارادہ اپنے علم و عقل کے ساتھ کرے، تو یہ تمام اشیاء اس کی نظر میں گمراہ کنندہ امور کی مثل ہیں۔یہ وہ مقام ہے، جس کے متعلق حافظ شیرازی کہتا ہے۔

شب تیرہ چوں سرآرم رہِ پیچ پیچ زلفت مگر آنکہ شمع رویت بر ہم چراغ دارد

لہٰذا سالک کو ایک ایسے نور کی حاجت درکار ہوئی، جس کے ساتھ اس کو مطلوب اور وصول الی اللہ سے روکنے اور محروم کرنے والی اشیاء نظر آجائیں۔پس خدا تعالیٰ نے اپنی شریعت کو ایک روشن چراغ بنایا، جس کے ساتھ سالک کو راہ وصال و مطلوب ظاہر و باہر دکھائی دے۔اور اس روشن چراغ یعنی شریعت کے لانے والے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی جہت سے خدا نے سراجاً منیراً فرمایا۔چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرۡسَلۡنَاکَ شَاھِداً وَّ مُبَشِّراً وَ نَذِیۡراً . وَ دَاعِیاً اِلٰی اللہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجاً مُّنِیۡراً . ترجمہ یعنی اے نبی ہم نے تجھ کو چرغ روشن و شاہد و بشیر و نذیر و داعی الی اللہ کر کے بھیجا ہے۔اور قرآن کریم میں آپ کے متعلق ایک دوسرے مقام میں فرمایا ہے۔ قُلۡ اَدۡعُوۡا اِلٰی اللہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِی ۔ترجمہ۔یعنی اے نبی کہہ دے کہ میں اور میرے تابعین علی وجہ البصیرۃ داعی الی الحق ہیں۔

پس خدا تعالیٰ نے جیسا کہ بنی آدم کی ظاہر بینائی کے لئے اپنی صفت نور سے ایک سراج منیر (سورج) بنایا ہے، ایسا ہی اس نے اپنی صفت نور سے ایک روحانی سراج منیر منور کر کے ہماری روحانیت کے روشن کرنے کے لئے ہمیں عطا کیا ہے، جو کہ نور الٰہی سے ممدود ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات بابرکات ہے۔

الغرض جسمانی سلسلہ کے مقابل ایک روحانی سلسلہ بھی ضرور ہے اوراس کو نہ جاننے کے سبب بعض لوگوں نے اس سوال پر اپنی کتابوں میں بڑی بحث کی ہے کہ مرکز قویٰ قلب ہے یا دماغ۔ اور اصل بات فیصلہ کن یہ ہے کہ جسمانی رنگ میں مرکز دماغ ہے، کیونکہ تمام حواس کا تعلق دماغ ہی سے ہے۔ اور روحانی رنگ میں مرکز قلب ہے۔ انبیاء علیہم الصلوات والسلام چونکہ روحانیت کی طرف توجہ رکھتے ہیں اس لئے وہ ظاہری نظارہ سے روحانی نظارہ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوات والسلام کو اللہ تعالیٰ نے سراجاً منیراً فرمایا ہے۔ اور آپ سراج منیر کیوں نہ ہوتے، جب کہ آپ نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَ عَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَ عَنْ یَّسَارِیْ نُوْرًا وَ فَوْقِیْ نُوْرًا وَ تَحْتِیْ نُوْرًا وَ خَلْفِیْ نُوْرًا وَ اجْعَلْ لِیْ نُوْرًا وَ فِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَ فِیْ عَصْبِیْ نُوْرًا وَ لَحْمِیْ نُوْرًا وَ دَمِیْ نُوْرًا وَ شَعْرِیْ نُوْرًا وَ بَشْرِیْ نُوْرًا وَ اجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَ اعْظَمْ لِیْ نُوْرًا اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا ۔ ترجمہ۔ اے اللہ ڈال نور میرے دل میں اور نور میری آنکھ میں اور میرے کان میں نور اور میرے دائیں نور اور میرے بائیں نور اور میرے اوپر نور اور میرے نیچے نور اور میرے آگے نور اور میرے پیچھے نور اور میرے پٹھوں میں نور اور میرے گوشت میں نور اور میرے خون میں نور اور میرے بالوں میں نور اور میرے بدن میں نور اور ڈال میری جان میں نور اور بڑا کر میرے واسطے نور اے اللہ مجھے نور بخش۔

قطب جنوبی وشمالی میں روزہ ماہ رمضان میں مقرر نہ ہونیکی وجہ

سوال۔ قطبین میں چھ چھ مہینے کے دن رات ہوتے ہیں۔ اوراس کی وجہ بیان ذیل سے اسی سوال میں واضح ہوگی۔ جب آفتاب خط استواء پر ہوتا ہے، تو اس کی روشنی دونوں قطبوں پر پہنچتی ہے۔ لیکن جس قدر سورج خط استواء سے شمال کی طرف آتا ہے، اسی قدر اس کی روشنی قطب شمالی کو آگے بڑھتی اور قطب جنوبی سے وور ہٹتی جاتی ہے۔ اوراسی واسطے قطب شمالی پر دن اور قطب جنوبی پر رات ہوجاتی ہے۔ مگر سورج خط استواء سے تین مہینوں میں شمال کی طرف آکر خط سرطان پر پہنچتا اور پھر تین ہی مہینے میں خط سرطان سے خط استواء پر آتا ہے۔ پس ان چھ مہینوں میں قطب شمالی آفتاب کی روشنی سے منور اور قطب جنوبی اس سے غائب ہوجاتا ہے۔ اور ایسا ہی باقی چھ مہینے جب آفتاب نصف کرۂ جنوبی میں ہوتا ہے، قطب جنوبی تو آفتاب کی روشنی سے منور اور قطب شمالی تاریکی میں ہوتا ہے۔ اوراسی واسطے ان دنوں قطب جنوبی پر دن اور قطب شمالی پر رات ہوتی ہے۔ یعنی ۲۱ مارچ سے ۲۲ ستمبر تک آفتاب کے نصف کرۂ

شمال میں رہنے کے سبب قطب شمالی پر دن اور قطب جنوبی پر رات ہوتی ہے۔ پس جہاں رات چھ ماہ کی اور دن بھی چھ ماہ کا ہو، وہاں روزہ رکھنے کا کیا انتظام ہوگا۔ کسی انسان کی اتنی طاقت و وسعت نہیں ہے کہ اتنے بڑے دن یعنی چھ ماہ کا روزہ رکھ سکے۔ اور چھ ماہ تک غروب آفتاب کا انتظار کرے اور بھوکا و پیاسا رہے۔ مثلاً گرین لینڈ میں جو جائے، وہاں اس کے روزے کا کیا انتظام ہو؟

جواب ۔ قطبین و گرین لینڈ وغیرہ پر روزہ رکھنے کے مسئلہ کو قرآن کریم نے بھلا نہیں دیا۔ بلکہ واضح کر کے بتا دیا ہے۔ ایک مختصر تمہید کے بعد اس مسئلہ کو بعونہٖ تعالیٰ واضح کر دیا جائے گا۔

ا۔ چور کا ہاتھ کاٹنا قرآنی حکم اور اسلام میں عملدرآمد تھا۔ اور ہاتھ کٹے چور مسلمان بھی ہو جاتے اور ہوتے تھے اور نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ اور قرآن کریم میں وضو اور تیمّم کے وقت دونوں ہاتھوں کا دھونا یا مسح کرنا ضروری تھا۔ تو اس کا اطلاق کیسے ہاتھ کٹے چور پر ہوسکتا ہے۔ جہاں ہاتھ ہی نہیں، وہاں ان کا دھونا کیسا؟ اور جہاں ماہ رمضان ہی نہیں، وہاں رمضان کے روزے چہ معنے دارد؟

۲۔ ماہ رمضان میں خدا تعالیٰ نے روزہ رکھنا انسان پر واجب ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** ۔ ترجمہ۔ یعنی جو شخص ماہ رمضان کو پائے، وہ اس میں روزے رکھے۔ پس جہاں رمضان کی نوبت ہی نہیں آتی اور جہاں رمضان موجود ہی نہیں ہے، وہاں روزے بھی مقرر نہیں ہوئے۔ ایسے مقامات میں یہی حال نماز کا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا** ۔

۳۔ بالعموم قطبین پر بنی آدم کے علاوہ دوسری اشیاء کی آبادی بھی بوجہ انجماد برف و آب و برودت قریباً ناممکن نظر آتی ہے۔ اس لئے جہاں خدا نے بنی آدم کی آبادی ہی نہیں رکھی، وہاں روزہ کا تعیّن بھی نہیں ہوا۔ خوب سوچو کہ بادشاہی احکام کا نفاذ و اجر وہاں ہوتا ہے، جہاں اس کی رعیت موجود ہو اور جہاں اس کی رعیت ہی نہ ہو، وہاں احکام کا اجر بھی نہیں ہوتا۔

۴۔ ماہ رمضان روزوں کا مہینہ قمری ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ** ۔ یعنی رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اور ہر قمری مہینہ ۲۹ دن ۱۲ گھنٹے ۴۴ منٹ کا ہوتا ہے۔ پس جہاں یہ قمری مہینہ ہی نہیں ہے، وہاں روزے بھی نہیں ہیں۔ **اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ** ۔

اختلافی نوٹ از مرتب ۔ مصنف نے یہاں پر اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ قطبین پر انسانی آبادی کا وجود پایا جاتا ہے، جو اپنے دن اور رات کے اوقات کو گھڑیوں کی مدد سے طے کرتے ہیں، جس

میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا سونا اور جاگنا اور کام پر جانا اور دوسرے امور دنیاوی و دینی اسی طریق سے سرانجام دینا اس بات پر دلیل ہے کہ قطبین پر انسانی زندگی اسی نہج پر سرانجام پاتی ہے، جیسے دوسرے علاقوں اور ملکوں میں۔ عرصہ دراز سے وہاں پر مسلمان بھی آباد ہیں، جو گھڑی کی مدد سے نماز کی ادائیگی کے اوقات مقرر کرتے ہیں اور رمضان کے مہینے میں بغیر کسی قسم کی دقت کے سحری اور افطار کے اوقات طے کرتے ہیں۔ اس لئے مصنف کا اجتہاد درست ثابت نہیں ہوتا۔ قطبین پر رہنے والوں پر ماہ رمضان میں روزے رکھنا اسی طرح واجب ہے، جیسے دوسرے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں پر۔

روزہ دار کی دو خوشیوں کی وجہ

نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَ فَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ۔ ترجمہ۔ روزہ رار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خوشی افطار روزہ کے وقت اور ایک خوشی اپنے پروردگار کو ملنے کے وقت۔

ان خوشیوں کی حکمت یہ ہے کہ بھوک و پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا معدہ وانتڑیاں افطار روزہ کے وقت طالب طعام و پانی ہوتی ہیں۔ پس جب وہ غذا کھاتا اور پانی پیتا ہے، تو اس کے جسم میں بہ نسبت غیر صائم کے غذا و پانی سے فرحت و بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ اور غذا و پانی اس کو لذیذ و خوشگوار معلوم ہوتے ہیں اور قوت ہاضمہ بڑھتی اور صحت جسمی وصفائی روحانی ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ یہی وہ خوشی ہے، جو روزہ دار کو افطار روزہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسری خوشی خدا تعالیٰ کے دیدار فرحت آثار کے وقت حاصل ہوگی، جس میں ساری کامیابیوں کا راز مرکوز ہے۔ اور حدیث قدسی اس طرف مشیر ہے۔ اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ۔ یعنی روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں۔

وجہ تقرری صدقہ فطر

۱۔ عید الفطر میں صدقہ اس واسطے مقرر کیا گیا کہ اول تو اس کے سبب سے عید الفطر کے شعار الٰہی ہونے کی اس سے تکمیل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں روزہ داروں کے لئے طہارت اور ان کے روزہ کی تکمیل ہے، جس طرح کہ نماز میں فرائض کی تکمیل کے لئے سنتیں مقرر کی گئی ہیں۔ ایسا ہی یہ صدقہ مقرر ہوا۔

۲۔ اغنیاء و دولتمندوں و ذی وسعت لوگوں کے گھروں میں تو عید ہوتی ہے۔ مگر مساکین و مفلسوں کے گھروں میں بوجہ ناداری اسی طرح شکل صوم ہی موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے ذی

وسعت لوگوں پر بوجہ شفقت علی خلق اللہ لازم ٹھہرایا کہ مساکین کو رمضان کی عید سے پیشتر صدقہ دیں، تا کہ وہ بھی عید کریں ۔ یہاں تک کہ نماز عید پڑھنے سے پیشتر ہی ان کو صدقہ دینا لازم ٹھہرایا۔ اور اگر مساکین کثرت سے ہوں، تو یہ صدقہ خاص جگہ پر جمع کرنے کا ایما ہوا، تا کہ مساکین کو یقین ہو جائے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔

ہر ذی وسعت مسلمان پر صدقہ فطر ایک صاع جَو یا چھوہارے یا نصف صاع گندم مقرر ہونے کی حکمت

نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے صدقہ فطر ہر غلام اور آزاد مرد و عورت و چھوٹے بڑے پر جبکہ مسلمان ہوں ایک صاع چھوہارے یا جَو یعنی دو سیر پختہ اسلئے مقرر فرمائے کہ غالباً یہ مقدار ایک کنبہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس سے فقیر و مساکین کی حاجت پورے طور سے رفع ہو جاتی ہے اور غالباً کوئی شخص ایک صاع دینے سے ضرر بھی نہیں پاتا۔ اور جَو کے ایک صاع کو گندم کے نصف صاع پر قیاس کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت میں بہ نسبت جَو گیہوں کی گرانی تھی اور امراء اس کو کھا سکتے تھے اور مساکین گیہوں نہ کھاتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔ **اِذَا وَسَّعَ اللّٰہُ فَوَسَّعُوْا** ۔ یعنی جب خدا تعالیٰ تم کو وسعت اور کشادگی عطا کرے، تو تم بھی صدقہ دینے میں فراخی اختیار کرو۔

واضح رہے کہ صدقہ فطر میں کھجوریں۔ چھوہارے۔ انگور خشک۔ گیہوں۔ میوہ نصف صاع یعنی ایک سیر دینا چاہیئے۔ اور جَو۔ مکی۔ جوار۔ باجرہ۔ موٹھ ایک صاع دینا چاہیئے۔ کیونکہ ایک صاع انگریزی تول کے مطابق پختہ دو سیر کے برابر ہوتی ہے۔

باب العیدین

تقرری عید الفطر کا راز

ا۔ ہر قوم میں کوئی نہ کوئی دن ایسا ضرور ہوتا ہے، جس میں عام طور سے خوشی منائی جاتی ہے۔ بہت عمدہ لباس پہنا جاتا ہے اور عمدہ کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ **لِکُلِّ قَوْمٍ عِیْدٌ فَھٰذَا عِیْدُنَا** ۔ یعنی ہر قوم کی ایک عید ہے اور ہماری بھی ایک عید ہو تو مناسب ہے۔

۲۔ یہ وہ دن ہے کہ جب لوگ اپنے روزوں سے فارغ ہوتے ہیں اور ایک طرح کی زکوٰۃ ادا کر چکتے ہیں۔ اس لئے اس دن دو قسم کی خوشیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ طبعی اور عقلی۔ طبعی خوشی تو ان کو اس لئے

حاصل ہوتی ہے کہ روزہ کی عبادت شاقہ سے فراغ ہو جاتے ہیں اور محتاجوں کو صدقہ مل جاتا ہے۔ اور عقلی خوشی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے عبادت مفروضہ کے ادا کرنے کی ان کو توفیق عطا فرمائی اور ان کے اہل و عیال کو دوسرے سال تک باقی رکھنے کا ان پر انعام کیا۔ یہ بات لفظ عید سے مفہوم ہو رہی ہے۔

لفظ عید اور فطر کے معنے و وجہ تسمیہ

لفظ عید اصل میں عِوْد تھا۔ اس کے حرف ماقبل پر کسرہ اور م بعد پر سکون ثقیل ہونے کی وجہ سے واؤ یا سے بدل گئی۔ لفظ عید کے معنے ہیں جو پھر کر دوبارہ آئے۔ چونکہ یہ دن لوگوں کے لئے ہر سال فرحت و سرور لانے والا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں۔ لفظ فطر کے معنے کھولنے و پھاڑنے کے ہیں۔ چونکہ اس دن لوگ اپنا روزہ کھولتے ہیں۔ اس لئے اس کو عید فطر کہتے ہیں۔

تقرری عیدین کی وجہ

ہر قوم میں کچھ دستور، رسمیں اور عادات ہوتی ہیں۔ منجملہ ان کے میلے بھی ہیں۔ جن کا متمدن اور غیر متمدن قوموں میں رواج ہے۔ میلے کے دن خوراک، لباس، میل و ملاقات میں خاص نمایاں تبدیلی ہوتی ہے، یہ فطرتی چیز ہے۔ مگر اس میں بڑھتے بڑھتے ہوا و ہوس کو بہت دخل ہو گیا۔ بہت سے میلے تجارت کی بنیاد پر قائم ہیں۔ ہمارے ملک میں تجارت کے ایسے بہت سے میلے ہیں۔ چنانچہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی گاؤں میں میلا ہوتا ہے۔ بعض میلوں میں جانوروں کو جمع کرتے ہیں، جسے منڈی کہتے ہیں۔ غرض ان میلوں کی تہ میں عجیب عجیب مقاصد کام کر رہے ہیں۔ بعض تو اپنے گذارے کے لئے میلا لگاتے ہیں۔ بعض خاص چندے اور نذر و نیاز کے لئے اور بعض محض اپنی عظمت اور جبروت کے اظہار کے لئے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاں بڑے بڑے احسانات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے ان میلوں کی اصلاح کر دی ہے۔ چونکہ یہ ایک فطرتی بات تھی، اس لئے ان کو ضائع نہیں کیا، صرف اصلاح کر دی۔ اور وہ یوں ہے کہ آپ نے جہاں ہر رسم و رواج کو اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور شفقت علیٰ خلق اللہ کے نیچے رکھ لیا، وہاں ان میلوں میں یہ بات بھی پیدا کر دی۔

عید میں آپ نے اول تو تکبیر کو لازم ٹھہرایا اور خدا تعالیٰ کی تعظیم کے اظہار کے لئے وہ لفظ مقرر کیا، جس سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے۔ صفات میں اکبر سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے۔ اور جامع جمیع صفات کاملہ ہونے کے لحاظ سے اللہ سے بڑھ کر اس مفہوم کو کوئی لفظ ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ تو تعظیم لِامر اللہ ہے۔ اور مخلوق پر شفقت کرنے کے لئے رمضان کی عید میں صدقہ فطر کو لازم ٹھہرایا۔ یہاں تک کہ نماز

میں تب شامل ہو جب اس کو ادا کر چکا ہو۔ اور پھر صدقہ خاص جگہ پر جمع کرے، تا کہ مساکین کو یقین ہو جاوے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ پھر عید قربان میں مساکین وغیرھم کے لئے سید الطعام یعنی گوشت کی مہمانی کی ہے۔ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے لئے کی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت فرائض، جو انسان پر ہیں، اور جو فرائض مخلوق کے ہیں، ان کو پورا کریں۔ دنیا کے کسی میلے کو دیکھ لو کہ ان میں یہ حق و حکمت کی باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، جو عیدین میں ہیں۔

تقرری عید قربان کی وجہ

تقرری عبادت کے اوقات میں سے یہ بھی ہے کہ اس وقت میں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے جو طاعت و عبادت الٰہی کی ہو اور خدا تعالیٰ نے اس کو قبول کر لیا ہو، اس سے ان کی جان نثاری یاد آ کر اس کی طرف رغبت ہو۔ یہ وہ دن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوۃ والسلام کو بحکم پروردگار خدا تعالیٰ کے حضور ذبح کر کے پیش کرنیکا ارادہ فرمایا تھا۔ اور خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوۃ والسلام کی جان کے بدلہ میں جنت کا دُنبہ عنایت کیا۔ اس عید میں قربانی اسی لئے مقرر کی گئی ہے کہ اس میں ملت ابراہیمی کے آئمہ کے حالات کی یاد دہانی اور جان و مال کو خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں خرچ کرنے اور ان کے غایت درجہ صبر کرنے کے ساتھ لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اور نیز حاجیوں کے ساتھ تشبّہ اور ان کی عظمت ہے اور جس کام میں وہ مصروف ہیں اس کی طرف لوگوں کو ترغیب دی گئی ہے۔

عیدین میں نماز و خطبہ مقرر ہونے کی وجہ

عیدین میں خطبہ اور نماز اس لئے مقرر ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی اجتماع ذکر الٰہی اور شعار دین کی عظمت و جلال الٰہی سے خالی نہ ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک دن مخصوص ہوتا ہے کہ اس میں اپنے تجمّل کا اظہار کرتے ہیں اور خوب زیب و زینت کے ساتھ اپنے شہروں سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ ایسی رسم ہے کہ اس سے کوئی قوم عرب و عجم میں خالی نہیں ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو پبلک کے لئے دو دن ایسے مقرر تھے کہ وہ ان میں لہو لعب یعنی کھیل و کود کرتے تھے۔ تب آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے بجائے ان دونوں کے دو اور بہتر دن بدلہ میں دیئے ہیں۔ وہ یوم اضحیٰ اور یوم فِطر ہیں۔

مشہور یوں ہے کہ وہ دو دن یوم نَو رُوز اور یوم مہرجان تھے۔ اور ان کے تبدیل کرنے کی یہ

ضرورت ہوئی کہ لوگوں میں کوئی دن خوشی کا نہیں ہوتا، مگر مقصود اس سے اظہار اشعارِ دین یا آئمہ مذہب کے موافق یا کوئی اس قسم کی اور بات ہوتی ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ اس کو آپ نے اسی حالت پر چھوڑ دیا، تو ایسا نہ ہو کہ جاہلیت کے طریقہ کا رواج ان میں پایا جائے۔ پس اس لئے آپ نے بجائے ان دونوں کے ایام عیدین کو مقرر فرمایا۔ ان میں ملت ابراہیم حنیف علیہ السلام کے شعار کی عظمت ہے اور تجمّل کے ساتھ ذکر خدا اور دیگر عبادات کو ملا دیا کہ مسلمانوں میں کوئی اجتماع صرف لہو ولعب نہ ہو، بلکہ ان کے اکٹھے ہونے سے اعلائے کلمہء اسلام ہو۔ لہٰذا تکبیر کا کہنا مسنون کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَ لِتَكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ یعنی خدا تعالیٰ نے جو تم کو ہدایت فرمائی ہے اس کی بڑائی کو بیان کرو۔ اس لئے قربانی کرنا اور تکبیر بآواز بلند کہنا مشروع ہوا۔

عیدین کے دنوں میں عمدہ غذا کھانے اور نفیس لباس پہننے کی وجہ

جب کہ عید خدا تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے خاص ضیافت و مہمانی کا دن مقرر ہے، تو اس میں ضرور ہوا کہ خدا تعالیٰ کی خاص ضیافت و مہمانی، جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کی ہے، وہ عمدہ و نفیس ہو اور اس کی قدر کی جائے۔ لہٰذا خداداد نعمائے الٰہی سے خدا تعالیٰ کی طرف سے عمدہ کھانے پکائے جائیں اور اکل و شرب و لباس میں حد جائز تک وسعت کی جائے۔ کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کی ضیافت و دعوت کی تعظیم و تکریم پائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ ضیافت الٰہی کا دن ہے، اس لئے مومن کو چاہیئے کہ کھانے میں توسیع کر دے اور غربا کی خبر گیری کرے۔ (فضل)

عیدین کی نمازوں میں زیادہ تکبیرات کہنے کی وجہ

۱۔ اسرار شریعت جلد اول کی تمہید میں مفصل بیان ہو چکا ہے کہ احکام کی علّتیں ان کے اوصافِ مؤثرہ اور ان کے بالمقابل اضداد سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ تکبیر الٰہی میں خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اپنا انکسار و ترکِ ماسوا مدنظر ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عیدَین کے ایام میں انسان کوئی ایسا فعل کرتے ہیں، جس میں ان کو بکثرت تکبیر الٰہی اور اپنے انکسار و عاجزی اور ترک ماسوا پر توجہ دلائی گئی ہے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ لوگ عیدَین کے دنوں میں بکثرت اپنی شان و شکوہ دکھاتے اور اپنے تجمّل کا اظہار کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کو حکم ہوا کہ ہر شان و شکوہ اور تجمّل کے اظہار کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کی کبریائی بیان کرو اور اس کو مدنظر رکھو۔ کیونکہ اسی نے تم کو اس دن شان و شکوہ کی اجازت دی ہے۔ پس یہ اسی کی بڑائی و کبریائی کا استحقاق ہے۔ ہر تکبیر میں کانوں پر ہاتھ لے جانا ترک کبر و ترک

ماسوا کی طرف ایما ہے اور اپنی بڑائی و عظمت سے تائب ہونے کی تعلیم ہے۔

۲۔ جہاں کسی جائز فعل کی کثرت کا اظہار ہو اس کو بحد اعتدال لانے کے لئے اس کے اضداد مقرر ہیں۔لہٰذا عیدین میں کثرت تکبیرات کا راز کثرت توجہ الٰہی و ترک ماسوا کی طرف ایما ہے۔

۳۔عیدَین کی نمازوں میں بہ نسبت دوسری نمازوں کے زیادہ تکبیرات مشروع ہونے کی وجہ کسی امر زائد کی طرف ایماء ہے، جو رسم عید سے مفہوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ لفظ عید عَود سے ہے۔لہٰذا ان میں تکبیر کا اعادہ کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ نماز عید ہے اور اس میں خدا کی کبریائی کا اعادہ ہوتا ہے، تاکہ مناجات ایک مقرر و مؤکّد تعظیم کے ساتھ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ کسی امر کے تکرار و اعادہ اور اس کے بار بار کرنے سے دل میں اس کا پورا پورا اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دن کی نماز کا نام صلوٰۃ العید ہوا، کیونکہ ناموں کے حکم و مرتبہ کو شرافت و بزرگی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ناموں کے علم کے ذریعہ ہی تو آدم علیہ السلام کو ملائکہ پر فوقیت و بزرگی عطا ہوئی ہے۔ پس اسم عید اعادۂ تکبیر کی طرف ایماء کر رہا ہے۔

۴۔ چونکہ یہ دن حظوظ نفس کا تھا، لہٰذا خدا نے اس دن کی نمازوں میں تکبیرات بڑھا دی ہیں۔ تاکہ جس کبر و عظمت و جلال کا استحقاق خدا تعالیٰ کو ہے، وہ خدا تعالیٰ ہی کو رہے۔ اور انسانوں کو اپنے حظوظ نفس کی وجہ سے خدائی کبر و عظمت و جلال نظر انداز نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان ایام کے متعلق فرمایا ہے۔ وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرُ۔ یعنی خدا تعالیٰ کی یاد سب سے بڑی ہے۔ (فضل)

عیدین میں تین وسات و پانچ تکبیرات کہنے کی حکمت

☆ جو لوگ عیدَین کی نمازوں میں تین تکبیرات کہتے ہیں، اس کی مراد خدا تعالیٰ کے لئے اس جہان کے تینوں عالموں کے ترک کی طرف ایماء ہے۔ یعنے عالم جمادات۔ عالم بناتات۔ عالم حیوانات (حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ)

☆ اور جو لوگ سات تکبیرات کے عامل ہیں، وہ اپنی سات صفات کو ترک کرنے اور خدا تعالیٰ کی صفات سبع کو ثابت کرنے کی طرف ایماء کرتے ہیں۔ (مالک و شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ)

☆ اور جو لوگ نماز عیدَین میں پانچ تکبیرات کے عامل ہیں، ان کی مراد ایک سے تو ذات الٰہی کا اقرار اور چار صفات اللہ۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین کے اثبات کی طرف ایماء ہے۔ (شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ)

تکبیرات عیدین میں ہاتھوں کے اٹھانے کی وجہ

ہر تکبیر میں ہاتھوں کا اٹھانا انسان کی طرف سے بدرگاہ الٰہی یہ ایماء ہے کہ اے خدا ہم اپنی کبریائی کو چھوڑتے اور تیری کبریائی و بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔اور جو کچھ ہمارا ہے وہ سب تیری کبریائی و عظمت وجلال کے لئے ہے۔ یہ ہمارا اکل وشرب ولبس وتجمل سب کچھ تیرے ہی لئے ہے۔ ہم اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنی کبریائی وعظمت سے توبہ کرتے ہیں اور اپنی زندگی ومرنا سب تیرے ہی لئے وقف کرتے اور تجھ ہی کو سپرد کرتے ہیں۔ **اِنَّ صَلاتِیُ وَ نُسُکِیُ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیُ لِلّٰهِ رَبَّ الْعٰلَمِیُن**۔یعنی میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میرا مرنا سب خدا تعالیٰ کے لئے ہے۔

باب الاضحٰے

تقرری قربانی کی وجہ

قربانی اصل میں قربان سے ہے۔چنانچہ صراح میں لکھا ہے۔ **قُرُبَان بِالضَّم وَ هُوَ مَا یَتَقَرَّبُ بِهٖ اِلٰی اللّٰهِ تَعَالٰی یُقَالُ قَرَّبُتُ لِلّٰهِ قُرُبَانًا**۔ترجمہ۔یعنی قربان اس چیز کو کہتے ہیں،جس کے ساتھ انسان خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈ ہتا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں میں نے فلاں چیز خدا تعالیٰ کی قربت حال کرنے کے لئے نذر کی۔ چونکہ انسان قربانی سے قربت الٰہی کا طالب ہوتا ہے،اس لئے اس فعل کا نام قربانی ہوا۔

ا۔دراصل قربانی کیا ہے۔ایک تصویری زبان میں تعلیم ہے،جسے جاہل اور عالم پڑھ سکتے ہیں۔ خدا کسی کے خون اور گوشت کا بھوکا نہیں۔وہ تو **وَ هُوَ یُطْعِمُ وَ لا یُطْعَمُ** (وہ کھلاتا ہے نہ کہ اس کو کھلایا جاتا ہے) ایسا پاک اور عظیم الشان نہ تو کھانوں کا محتاج ہے،نہ گوشت کے چڑھاوے کا۔ بلکہ وہ تمہیں سکھانا چاہتا ہے کہ تم بھی خدا کے حضور اس طرح قربان ہو جاؤ۔اور ادنیٰ اعلیٰ کے لئے قربان ہوتا ہے۔

۲۔کل دنیا میں قربانی کا رواج ہے اور قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادنیٰ چیز اعلیٰ کے بدلے میں قربان کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ہم بچے تھے تو یہ بات سنی تھی کہ کسی کو سانپ زہریلا کاٹے،تو وہ انگلی کاٹ دی جائے،تا کہ کل جسم زہریلے اثر سے محفوظ رہے۔گویا انگلی تمام جسم کے لئے قربان کی جاتی ہے۔

۳۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا کوئی دوست آ جائے،تو جو کچھ ہمارے پاس ہو،اس کی خوشی کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔گھی۔آٹا۔گوشت وغیرہ قیمتی اشیاء اس پیارے کے سامنے کوئی شئے نہیں ہیں۔

۴۔اس سے زیادہ عزیز ہو،تو مرغے مرغیاں، حتیٰ کہ بھیڑیں اور بکرے قربان کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر گائے اور اونٹ بھی عزیز مہمان کے لئے قربان کر دیئے جاتے ہیں۔

۵۔طب میں دیکھا گیا ہے کہ وہ قومیں جو جائز نہیں سمجھتیں کہ کوئی جاندار قتل ہو، وہ بھی اپنے زخموں کے کئی سینکڑوں کیڑوں کو مار کر اپنی جان پر قربان کر دیتے ہیں۔اس سے اوپر چلو،تو ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ کے لئے قربان کیا جاتا ہے۔مثلاً چوہڑے ہیں اور گو انکی عید کا دن ہی ہو،مگر ان کے سپرد وہی کام ہے۔ بلکہ ایسے ایام میں ان کو زیادہ تاکید ہوتی ہے کہ لوگوں کی آسائش و آرام کی خاطر کوئی گندگی کسی گذرگاہ میں نہ رہنے دیں۔گویا ادنیٰ کی خوشی اعلیٰ کی خوشی پر قربان ہوئی۔

۶۔اہل ہنود گئو رکھشا بڑے جوش سے کرتے ہیں۔لداخ کے ملک میں تو دودھ تک نہیں پیتے، کیونکہ یہ بچھڑوں کا حق ہے۔مگر یہاں کے ہندو تو دھوکا دے کر دودھ دوہ لیتے ہیں اور پھر اس سے اور اس کی اولاد سے سخت کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے کاموں کے لئے انہیں مار مار کر درست کرتے ہیں۔یہ بھی ایک قسم کی قربانی ہے۔

۷۔ادنیٰ سپاہی اپنے افسر کے لئے اور وہ افسر اعلیٰ افسر کے لئے اور اعلیٰ افسر اپنے بادشاہ کے بدلے میں قربان ہوتا ہے۔پس خدا نے اس فطرتی مسئلہ کو برقرار رکھا اور اس قربانی کی تعلیم دی کہ ادنی اعلیٰ کے لئے قربان کیا جائے۔محبت میں انسان بے اختیار ہوتا ہے۔مگر اس میں بھی قربانیوں کا ایک سلسلہ ہے۔چنانچہ محبّ بھی بتدریج محبوبوں کے مراتب رکھ کر ایک کو دوسرے پر قربان کرتا ہے۔اپنے بیٹا یا جان محبوب ہے،مگر دوسرے محبوب پر اسے قربان کر دینے میں عذر نہیں۔

۸۔انسان کو مال کی محبت ہے۔بی بی کی الفت ہے۔بچوں سے پیار ہے۔یار و آشنا کی محبت ہے۔امن وچین کی محبت ہے۔اللہ تعالیٰ کی کتابوں،اللہ تعالیٰ کے رسولوں وصلحاء سے محبت ہے۔سچے علوم سے محبت ہے۔ان تمام محبتوں میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان کیا جاتا ہے۔

۹۔قربانی کا ایک نظارہ اس وقت ہمارے سامنے آیا،جب ہم نے جہازوں میں سفر کیا اور بعض وقت مچھلی کے سوا کچھ نہ مل سکا اور لاچار گوشت خوری سے کام لینا پڑا۔ورنہ ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑتا۔

۱۰۔قربانی کا ایک نظارہ ان تعلیمات سے ہمیں حاصل ہوا،جن کو ہر ایک عقل مند صاحب مذہب نے سیاست اور راج نیتی دھرم کے اندر بیان کیا ہے۔ایک راجا اور اس کی پرجا اور ان کے فتحمند کرنے کے لئے کس قدر فوجیں اور آگ اور بجلی اور اس سے بڑھ کر دشمن کش ہتھیار ایجاد کئے گئے اور ان کی تعریف کی گئی۔خود منو جی اور سیتارتھ کے مصنف اور یورپ کے غریب دل برّے کے پیروؤں نے

تجویز کئے اور رات دن ایک عالم سیاسیوں کا ان کی ایجاد میں مصروف ہے۔ یہ فطری تحریک بھی، جو ہر زمانہ اورقوم میں جاری رہی ہے، گوشت خوری کی بڑی مؤید ہے۔اس کے خلاف ہمارے پیارے نبی کریم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایاہے۔کہ لَا یُعَذِّبُ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ۔یعنی آگ سے عذاب نہیں دیتا،مگر وہی جو آگ کا مالک ہے،یعنی خداوند کریم۔اور نہ آگ کے ہتھیار بنانے کی تاکید قرآن کریم نے کی ہے۔مگر منو اور وید نے بقول دیانند بڑے روز سے ایسے ہتھیاروں کے بنانے کی تاکید کی ہے۔دیکھو ستیارتھ صفحہ ۳۷۰۔ "چنانچہ جیسے کوئی ایک لوہے کا بان یا گولہ بنا کر اس میں ایسی اشیاء رکھے کہ جو آگ کے لگانے سے ہوا میں دھواں پھیلنے اور سورج کی کرن یا ہوا کے مَس ہونے سے آگ روشن ہو جائے، اسی کا نام اگنی آستر (آگ کا ہتھیار) ہے۔ جب دوسرے اس کا دفعیہ کرنا چاہے تو اسی پر وارن آستر چھوڑ دے یعنی جیسے دشمن نے دشمن کی فوج پر اگنی آستر چھوڑ کر تباہ کرنا چاہا ویسے ہی اپنی فوج کی حفاظت کے لئے سیناپتی (سردار فوج) وارن آستر سے اگنی آستر کا دفعیہ کرے۔ وہ ایسی اشیاء کے ملانے سے ہوتا ہے کہ جن کا دھواں ہوا کے مَس ہوتے ہی بادل ہو کر جھٹ برسنے لگ جائے اور آگ کو بجھا دے۔ایسی ہی ناک پھانس یعنی جو دشمن پر چھوڑنے سے اس کے اعضاء کو جکڑ کر باندھ لیتا ہے۔ ویسے ہی ایک موہن آستر یعنی ایسی نشیلی چیزوں کے ڈالنے سے بنایا جائے کہ جس کے دھویں کے لگنے سے دشمن کی سب فوج سو جائے یعنی بیہوش ہو جائے۔اسی طرح شستر آستر ہتھیار اوزار ہوتے تھے اور ایک تار سے یا شیشے یا کسی اور چیز سے بجلی پیدا کر کے دشمنوں کو ہلاک کرتے تھے۔اس کو بھی اگنی آستر نیز پاشو پتا ستر کہتے ہیں۔توپ یا بندوق یہ نام غیر ملک کی زبان کے ہیں۔سنسکرت یا آریہ ورت کی بھاشہ کے نہیں ہیں۔البتہ جس کو غیر ملک والے توپ کہتے ہیں، سنسکرت اور بھاشہ میں بھشنڈی کہتے ہیں، جو سنسکرت ودیا نہیں پڑھے وے غلطی میں پڑ کر کچھ کا کچھ لکھتے اور کچھ کا کچھ کہتے ہیں۔اس کو دانا لوگ مان نہیں سکتے"۔

۱۱۔موت ایک شدنی اور ضروری بات ہے، جو ذی روح کے واسطے لازمی ہے۔کوئی دوسرا اسے قتل کرے یا نہ کرے کیونکہ دیالو کرپالو نے آخر ضرور مارنا ہے۔ پس اگر جانور دوسرے کے قتل سے نہ مارا جائے، تو بھی اس کو ایک مدت کے بعد قسم قسم کے دکھوں میں مبتلا ہو کر آخر مرنا ہوگا۔ اور اس کو جو بیماری میں کیڑے پڑیں گے، وہ بھی آخر ہلاک ہو جائیں گے۔ اور اس کے تعفن سے بہت سے ذی روحوں اور انسانوں کو شدید تکلیف پہنچے گی۔ پس کیا مناسب نہیں کہ جانوروں کو ان دکھوں سے بچانے کے لئے قتل کیا جائے اور پھر ان سے کوئی کام بھی لیا جائے۔قتل کے دکھ بہر حال عام بیماریوں سے بہت

تھوڑا ہے، کیونکہ وہ آنی ہے اور شدنی مرض الموت کا آخر ایک زمانہ کے بعد اَور زمانہ تک آنا ضروری ہے۔ اگر کہا جائے کہ آدمیوں کے لئے بھی کیوں ایسی موت تجویز نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی اضطراری موت فوجی جوانوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ اور عام اس لئے نہیں کہ انسان کے ساتھ بہت سے حقوق متعلق ہوتے ہیں، ان کا ضائع ہونا زیادہ دکھوں کا موجب ہے۔

۱۲۔ قربانی کا ایک نظارہ آریہ مذہب کی کتابوں میں ہمیں یہ دکھائی دیا ہے کہ آریوں کے نزدیک درخت بھی وہی روحیں رکھتے ہیں، جو انسان رکھتے ہیں۔ دیکھو صفحہ ۳۴۲ ستیارتھ پرکاش جہاں لکھا ہے، جو "نہایت درجہ کے تموگنی ہیں، وہ غیر متحرک درخت وغیرہ کیڑے مکوڑوں مچھلی سانپ کچھوا مویشی اور مرگ (جنگلی چوپایہ) کا جنم پاتے ہیں"۔ (منو۱۲۔۴۲)۔ اس قانون اور اعتقاد کی بنا پر درخت کا کاٹنا اور مرگ کا قتل کرنا برابر ہو جاتا ہے۔ اس صورت کو مدنظر رکھ کر آریوں پر فرض ہے کہ ایک درخت کے کاٹنے پر وہی جوش ظاہر کریں جو کسی جاندار کے قتل پر کرتے ہیں۔ ورنہ وہ اپنے مقرر کردہ اصول کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اور درختوں میں بیہوشی کا عذر دعویٰ بے دلیل ہے۔

وجہ تسمیہ قربانی

قربانی دینا ہمارے دین اسلام میں ان کاموں میں شمار کیا گیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا موجب ہوتے ہیں۔ اور اس سواری کی طرح یہ کام سمجھا گیا ہے، جو اپنی سیر میں بجلی سے مشابہ ہو، جسکو بجلی کی چمک سے مماثلت حاصل ہو۔ اسی وجہ سے ذبح ہونیوالے جانوروں کا نام قربانی رکھا گیا۔ کیونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ یہ قربانیاں خدا تعالیٰ کے قرب اور ملاقات کا موجب ہیں۔ اس شخص کے لئے کہ جو قربانی کو اخلاص اور خدا پرستی اور ایمانداری سے ادا کرتا ہے۔ قربانی شریعت کی بزرگ تر عبادتوں میں سے ہے، اس لئے قربانی کا نام عربی زبان میں نسیکہ ہے۔ اور نسک کا لفظ عربی زبان میں فرمانبرداری اور بندگی کے معنوں میں آیا ہے۔ اور ایسا ہی یہ لفظ یعنی نسک ان جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی زبان مذکور میں استعمال پاتا ہے، جنکا ذبح کرنا مشروع ہے۔ پس یہ اشتراک کہ جو نسک کے معنوں میں پایا جاتا ہے، قطعی طور پر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقی پرستار اور سچا عابد وہی شخص ہے، جس نے اپنے نفس کو مع اسکی تمام قوتوں اور مع اسکے ان محبوبوں کے، جنکی طرف اسکا دل کھینچا گیا ہے، اپنے رب کی رضا جوئی کے لئے ذبح کر ڈالا اور خود بھی گداز ہو گیا اور اسکے وجود کا کچھ نمونہ نہ رہا اور چھپ گیا۔ اور فنا کی اس پر تند ہوائیں چلیں اور اسکے وجود کے ذرات کو اس ہوا کے سخت دھکے اڑا کر لے گئے۔ اور جس شخص نے ان دونوں مفہوموں میں کہ جو باہم نسک کے لفظ میں مشارکت رکھتے ہیں غور کیا ہوگا اور اس مقام کو تدبّر کی

نگاہ سے دیکھا ہوگا اور اپنے دل کی بیداری اور دونوں آنکھوں کے کھولنے سے پس وپیش کو زیرنظر رکھا ہو گا،اس پر پوشیدہ نہیں رہے گا۔اور اس امر میں کسی قسم کی نزاع اس کے دامن کو نہیں پکڑے گی کہ یہ دو معنوں کا اشتراک کہ جونسک کے لفظ میں پایا جاتا ہے اس بھید کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عبادت، جو آخرت کے خسارہ سے نجات دیتی ہے، وہ اس نفس امّارہ کا ذبح کرنا ہے کہ جو برے کاموں کے لئے زیادہ سے زیادہ جوش رکھتا ہے اور ایسا حاکم ہے کہ ہر وقت بدی کا حکم دیتا رہتا ہے۔پس نجات اس امر میں ہے کہ اس براحکم دینے والے کو انقطاع الی اللہ کے کاردوں سے ذبح کر دیا جائے۔اور خلقت سے قطع تعلق کر کے خداتعالیٰ کو اپنا مؤنس اور آرام جان قرار دیا جائے۔اور یہی اسلام کے معنے ہیں اور یہی کامل اطاعت کی حقیقت ہے۔اور مسلمان وہ ہے جس نے اپنا منہ ذبح ہونے کے کے لئے خداتعالیٰ کے آگے رکھ دیا ہو۔اور اپنے نفس کی اونٹنی کو اس کیلئے قربان کر دیا ہو اور ذبح کے لئے پیشانی کے بل اس کو گرا دیا ہو اور موت سے ایک دم غافل نہ ہو۔پس حاصل کلام یہ ہے کہ ذبیحہ اور قربانیاں، جو اسلام میں مروّج ہیں، وہ سب اسی مقصود کے لئے، جو بذل نفس ہے، بطور یاددہانی ہیں اور اس مقام کے حاصل کرنے کے لئے ایک ترغیب ہے اور اس حقیقت کیلئے، جو سلوک تام کے بعد حاصل ہوتی ہے، ایک ڈھارس ہے۔ پس ہر ایک مرد مومن اور عورت مومنہ پر، جو خدائے ودود کی رضا کی طالب ہے، واجب ہے کہ اس حقیقت کو سمجھے اور اسکو اپنے مقصود کا عین قرار دے اور اس حقیقت کو اپنے نفس کے اندر داخل کرے، یہانتک کہ وہ حقیقت ہر ذرہ وجود میں داخل ہو جائے اور راحت وآرام اختیار نہ کرے جب تک کہ اس قربانی کو اپنے رب معبود کے لئے ادا نہ کرے اور جاہلوں اور نادانوں کی طرح صرف نمونہ اور پوست بے مغز پر قناعت نہ کر بیٹھے۔بلکہ چاہیئے کہ اپنی قربانی کی حقیقت کو بجالائے اور اپنی ساری عقل کے ساتھ اور اپنی پرہیزگاری کی روح سے قربانی کی روح کو ادا کرے۔یہ وہ درجہ ہے، جس پر سالکوں کا سلوک انتہا پذیر ہوتا ہے اور عارفوں کا مقصد اپنی غایت کو پہنچتا ہے اور اس پر تمام درجے پرہیزگاروں کے ختم ہو جاتے ہیں اور سب منزلیں راستبازوں اور برگزیدوں کی پوری ہو جاتی ہیں۔اور یہاں تک پہنچ کر سیر اولیا کا اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچتا ہے۔اور جب تو اس مقام پر پہنچ گیا، تو تو نے اپنی کوشش کو انتہا تک پہنچا دیا اور فناء کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔پس اس وقت تیرے سلوک کا درخت اپنے کامل نشو نما تک پہنچ جائے گا اور تیری روح کی گردن تقدّس اور بزرگی کی مرغزار کے نرم سبزہ تک پہنچ جائے گی۔اس اونٹنی کی مانند، جس کی گردن لمبی ہو اور اس نے اپنی گردن کو ایک سبز درخت تک پہنچا دیا ہو، اور اس کے بعد حضرت احدیت کے جذبات ہیں اور خوشبوئیں اور تجلّیات ہیں، تا وہ ان رگوں کو کاٹ دے کہ جو بشریت میں سے باقی رہ

گئی ہوں۔اور بعد اس کے زندہ کرنا ہے اور باقی رکھنا اور قریب کرنا اس نفس کا، جو خدا کے ساتھ آرام پکڑ چکا ہے، جو خدا سے راضی اور خدا اس سے راضی اور وہ فنا شدہ ہے تا کہ یہ بندہ حیات ثانی کے بعد قبول فیض کے لئے مستعد ہو جائے اور اس کے بعد انسان کامل کو حضرت احدیت کی طرف سے خلافت کا پیرایہ پہنایا جاتا ہے اور رنگ دیا جاتا ہے الوہیّت کی صفتوں کے ساتھ۔اور یہ رنگ ظلّی طور پر ہوتا ہے تا کہ مقام خلافت متحقق ہو جائے۔اور پھر اس کے بعد خلقت کی طرف اترتا ہے تا کہ اس کو روحانیت کی طرف کھینچے اور زمین کی تاریکیوں سے باہر لا کر آسمانی نور کی طرف لے جائے اور یہ انسان سب کا وارث کیا جاتا ہے، جو نبیوں اور صدیقوں اور اہل علم اور درایت میں سے اور قرب ولایت کے سورجوں میں سے اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔اور دیا جاتا ہے اس کو علم الاولین اور معارف گذشتہ اہل بصیرت اور حکمائے ملت کے تا اس مقام وراثت کا متحقق ہو جائے۔پھر یہ بندہ زمین پر ایک مدت تک، جو اس کے رب کے ارادہ میں ہے، توقف کرتا ہے تا کہ مخلوق کو نور ہدایت کے ساتھ منور کرے۔اور جب خلقت کو اپنے رب کے نور کے ساتھ روشن کر چکا یا امر تبلیغ کو بقدر کفایت پورا کر دیا پس اس وقت اس کا نام پورا ہو جاتا ہے اور یہی رفع کے معنے ہیں ان کے نزدیک جو اہل علم اور معرفت ہیں۔اور مرفوع وہ ہے جس کو اس کے محبوب کے ہاتھ سے جام وصال پلایا جاتا ہے، جو حسن و جمال کا دریا ہے اور ربوبیّت کی چادر کے نیچے داخل کیا جاتا ہے باوجود اس بات کے کہ عبودیت ابدی طور پر رہتی ہے۔اور یہ وہ مقام آخری ہے، جس تک ایک حق کا طالب انسانی پیدائش میں پہنچ سکتا ہے۔

پس اس مقام سے غافل نہ ہو اور نہ اس بھید سے غفلت کرو، جو قربانیوں میں پایا جاتا ہے۔اور قربانیوں کو اس حقیقت کے دیکھنے کے لئے آئینوں کی طرح بنا دو اور ان وصیتوں کو مت بھلاؤ اور ان لوگوں طرح مت ہو جاؤ، جنہوں نے اپنے خدا تعالیٰ اور اپنی موت کو بھلا رکھا ہے۔اور اس راز پوشیدہ کی طرف خدا تعالیٰ کے کلام میں اشارت کی گئی ہے۔چنانچہ خدا تعالیٰ، جو اصدق الصادقین ہے، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے۔**قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن** ۔ ترجمہ۔یعنی ان لوگوں سے کہہ دے کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اس خدا تعالیٰ کے لئے ہے، جو پروردگار عالمیان ہے۔پس دیکھ لو کہ کیونکر نُسک کے لفظ کی حیات اور ممات کے لفظ سے تفسیر فرمائی ہے اور اس تفسیر سے قربانی کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اے عقلمندو اس میں غور کر لو۔جس نے اپنی قربانی کی حقیقت کو معلوم کر کے قربانی ادا کی اور صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ ادا کی، پس اس نے اپنی جان اور اپنے بیٹوں اور اپنے پوتوں کی قربانی

کردی۔اور اس کیلئے اجر بزرگ ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس کے ربّ کے نزدیک اجر تھا۔اور اس کی طرف ہمارے سید برگزیدہ اور رسول برگزیدہ نے، جو کہ پرہیزگاروں کا امام اور خاتم انبیاء ہے، اشارہ کیا ہے۔اور فرمایا ہے اور وہ خدا کے بعد سب سچّوں سے سچا ہے۔**اِنَّ الضَّحَایَا ھِیَ الْمُطَایَا تُوْصِلُ اِلٰی رَبِّ الْبَرَایَا وَ تَمْحُو الْخَطَایَا وَ تَدْفَعُ الْبَلَایَا** ۔ترجمہ یعنی جو قربانیاں تم دیتے ہو یہ وہ سواریاں ہیں، جو خدا تعالیٰ تک پہنچاتی ہیں اور خطاؤں کو محو کرتی ہیں اور بلاؤں کو دور کرتی ہیں۔

یہ وہ باتیں ہیں، جو ہمیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی ہیں۔آنجناب نے ان کلمات میں قربانیوں کی حکمتوں کی طرف فصیح کلموں کے ساتھ، جو موتیوں کی مانند ہیں، اشارہ فرمایا ہے۔ دراصل قربانی روح کی ہے اور بکروں کی قربانیاں روح کی قربانی کے لئے مثل سایوں اور آثار کے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے شریعت اسلام میں بہت سے ضروری احکام کے لئے نمونے قائم کئے ہیں۔ چنانچہ انسان کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اور اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا کی راہ میں قربان ہو۔پس ظاہری قربانیاں اسی حالت کے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی ہیں۔لیکن اصل غرض یہی قربانی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**لَنْ یَنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَ لَا دِمَاؤُھَا وَ لٰکِنْ یَنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ** ۔ترجمہ یعنی خدا تعالیٰ کو تمہاری قربانیوں کا گوشت نہیں پہنچتا، مگر تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔یعنی اس سے اتنا ڈرو کہ گویا اس کی راہ میں مر ہی جاؤ۔اور جیسے تم اپنے ہاتھ سے قربانیاں ذبح کرتے ہو، اسی طرح تم بھی خدا کی راہ میں ذبح ہو جاؤ۔جب کوئی تقویٰ اس سے ذرہ درجہ کم ہے، تو وہ ابھی ناقص ہے۔

الغرض قربانیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی وحدت پر یقین ہو جائے اور ہر طرح سے عزیز چیزوں کی قربانی کر کے ثابت ہو جائے کہ ان سب سے پیارا اور مقصود بالذات خدا ہی ہے۔اس پر سب کچھ قربان کر کے دکھا دینا ہی سچی بہادری اور صداقت ہے۔

قربانی کے جانوروں کا ذبح کرنا خلاف رحم نہ ہونے کی وجہ

خدا تعالیٰ کو ماننے والی قومیں، خواہ وہ کوئی ہوں، اس بات کی ہرگز قائل نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ ظالم ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کو رحمان، رحیم۔ دیالو، کرپالو مانتی ہیں۔پس خدا تو ظالم نہیں اور بیشک ظالم نہیں۔

اب خدا تعالیٰ کے فعل دیکھو کہ ہوا میں باز۔شکرے۔گدھ۔ چرغ وغیرہ شکاری جانور موجود ہیں اور وہ غریب پرندوں کا گوشت ہی کھاتے ہیں۔گھاس اور عمدہ سے عمدہ میوے اور اس قسم کی کوئی چیز نہیں کھاتے۔پھر دیکھو کہ آگ میں پروانہ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔پھر پانی کی طرف خیال کرو کہ اس میں کس قدر خونخوار جانور موجود ہیں۔گھڑیال اور بڑی بڑی مچھلیاں۔اود بلاؤ وغیرہ چھوٹے چھوٹے

آبی جانوروں کا کھا جاتے ہیں۔ بلکہ بعض مچھلیاں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک شکار کے لئے جاتی ہیں۔ پھر ایک اور قدرتی سطح زمین پر دیکھو کہ چیونٹی خور جانور کیسے زبان نکالے پڑا رہتا ہے۔ جب بہت سی چیونٹیاں اس کی زبان کی شیرینی کی وجہ سے اس کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں، تو جھٹ زبان کھینچ کر سب کو نگل جاتا ہے۔ مکڑی مکھیوں کا شکار کرتی ہے۔ مگس خور جانور اپنی غذا ان جانداروں کو ہی مار کر بہم پہنچاتے ہیں۔ بندروں کو چیتا مار کر کھاتا ہے۔ جنگل میں شیر۔ بھیڑیئے۔ تیندوئے کی غذا، جو مقرر ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بلی کس طرح پکڑ کر چوہوں کو ہلاک کرتی ہے۔

اب بتلاؤ کہ اس نظارہء عالم کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون ذبح، جو عام طور پر جاری ہے، یہ کسی ظلم کی بنا پر ہے۔ ہرگز نہیں۔ پھر انسان پر حیوان کے ذبح کرنے کے ظلم کا الزام کیا مطلب رکھتا ہے۔ انسانوں کو جوئیں پڑ جاتی ہیں یا کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ کیسی بے باکی سے ان کی ہلاکت کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا اس کا نام حلم رکھا جاتا ہے۔ جب اسے ظلم نہیں کہتے صرف اس لئے کہ اشرف کے لئے اخس کا قتل جائز ہے، تو ذبح پر اعتراض کیونکر ہوسکتا ہے۔

بلکہ غور کرو تو حضرت ملک الموت کو دیکھو کیسے کیسے انبیاء و رسل۔ بادشاہ۔ بچے۔ غریب۔ امیر۔ سوداگر سب کو مار کر ہلاک کرتے اور دنیا سے نکال دیتے ہیں۔ پھر غور کرو کہ ہم جانوروں کو عید الاضحیٰ پر ذبح نہ کریں۔ اور ہمارا ذبح کرنا رحم کے خلاف ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا اور ان پر یہ رحم ہوگا کہ وہ نہ مریں۔

پس اس تمہید کے بعد گذارش ہے کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا رحم نہیں ہے، تو شکاری اور گوشت خوروں کو اللہ کریم پیدا نہ کرتا۔ نیز اگر ذبح نہ کیا جائے، تو خود بیمار ہو کر مریں گے۔ پس غور کرو کہ ان کے مرنے میں کیسی تکلیف ان کو لاحق ہوگی۔

قانون الٰہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز بے انت بڑھنا چاہتی ہے۔ اگر ہر ایک بڑ کے بیج حفاظت سے رکھے جائیں، تو دنیا میں بڑ ہی بڑ ہوں اور دوسری کوئی چیز نہ ہو۔ مگر دیکھو ہزاروں ہزار جانور اس کا پھل کھاتے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ اس بڑھنے کو روکنا منشاء الٰہی ہے۔ اگر ساری گائیوں کی پرورش کریں، تو ایک وقت میں دنیا کی ساری زمین بھی ان کے چارے کے لئے کافی نہ ہوگی۔ آخر بھوک پیاس سے خود ان کو مرنا پڑے گا۔ جب کہ یہ نظارہء قدرت موجود ہے، تو ذبح کرنا خلاف منشاء الٰہی کیوں ہے۔ اگر کسی چیز کو ذبح نہ کریں، تو پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ کبھی نہ مرے گی۔ جب آخر مرے گی، تو سُکھ کی موت ذبح ہوسکتی ہے، یا یہ کہو کہ بھوکا پیاسا رہ کر یا بیمار ہو کر بہت سے شدائد اور تکلیف اٹھا کر

مرے۔ پھر ماننا پڑے گا کہ سُکھ کی موت ذبح ہی ہے۔

ذبح انسان ناجائز ہونے کی وجہ

پھر کوئی کہے کہ ذبح انسان بھی جائز ہوسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذبح انسان کے لئے بھی عمدہ تو ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شہادت کو سب نے متفق اللفظ ہو کر اعلیٰ مانا ہے۔ مگر انسان کے ذبح نہ کرنے پر اور بہت سے قوی دلائل ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کے ساتھ اَوروں کے حقوق ہیں۔ کسی کی پرورش ہے، تو کسی کا کچھ۔ اگر ایسا حکم دیں، تو مشکلات کا ایک بڑا سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے قتل انسان مستلزم السزا کو عرفی اور شرعی قانون میں سخت گناہ کہا گیا ہے۔ الغرض انسان کا قتل اس لئے تجویز نہیں ہوا کہ انسان کے ساتھ بہت سے حقوق ہیں۔ ان کا ضائع ہونا زیادہ دکھوں کا موجب ہے۔

کتاب الحج

حج وطواف کعبہ کی وجہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِلنَّاسِ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّد. اَلَّذِیْ عَلَّمَ لَنَا النُّسُکَ لِنَھْتَدِیَ اِلَیْہِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ خُلَفَائِہِ الَّذِیْنَ نُوِّرُوْا بِاَنْوَارِہٖ وَ اَوْضَحُوْا لَنَا سُبُلَ الْوِصَالِ.

امابعد۔ واضح ہو کہ لفظ حج عربی زبان کا ہے، جس کے معنے قصد کرنے کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں بقصد تکمیل عبادات مخصوصہ زیارت کعبہ کو جانے کے ہیں۔

ا۔عبادت حج کا بنی آدم کے لئے موضوع ہونے میں یہ حکمت ہے کہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ روحانی امور کے مقابل پر جسمانی امور بھی نمونہ کے طور پر پیدا کر دیتا ہے، تاکہ روحانی امور پر دلالت کریں۔ اسی عادت کے موافق خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور عبادت دو قسم کی ہے۔ ایک انکسار و تذلل۔ دوسرے محبت و ایثار۔ تذلل و انکسار کے لئے اس نماز کا حکم ہے، جو جسمانی رنگ میں انسان کے ہر ایک عضو کو خشوع و خضوع کی حالت میں ڈالتی ہے۔ یہاں تک کہ دلی سجدہ کے مقابل پر اس نماز میں جسم کا بھی سجدہ رکھا گیا۔ تاکہ جسم اور روح دونوں اس عبادت میں شامل ہوں۔

۲۔جسم کا سجدہ بیکار اور لغو نہیں۔ اول تو یہ مسلم ہے کہ خدا جیسا روح کا پیدا کرنیوالا ہے، ایسا ہی وہ جسم کا بھی خالق ہے۔ اور دونوں پر اس کا حق خالقیت ہے۔ ماسوا اس کے جسم اور روح ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ بعض وقت جسم کا سجدہ روح کے سجدہ کا محرک ہو جاتا ہے اور بعض وقت روح بھی جسم میں سجدہ کی حالت پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ جسم اور روح دونوں باہم مرایا متقابلہ کی طرح ہیں۔ مثلاً ایک شخص جب محض تکلف سے اپنے جسم میں ہنسنے کی صورت بناتا ہے، تو بسا اوقات سچی ہنسی بھی آ جاتی ہے کہ جو روح کے انبساط کے متعلق ہے۔ ایسا ہی جب ایک شخص تکلف سے اپنے جسم میں یعنی آنکھوں میں ایک رونے کی صورت بناتا ہے، تو بسا اوقات حقیقت میں رونا ہی آ جاتا ہے۔ جو روح کی درد اور رِقت

کے متعلق ہے۔ پس جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ عبادت کے اس قسم میں، جو تذلل اور انکسار ہے، جسمانی افعال کا روح پر اثر پڑتا ہے اور روحانی افعال کا جسم پر اثر پڑتا ہے۔ پس ایسا ہی عبادت کی دوسری قسم میں جو ایثار اور محبت ہے، انہی تاثرات کا جسم اور روح میں عوض معاوضہ ہے۔

۳۔ محبت کے عالم میں انسانی روح ہر وقت اپنے محبوب کے گرد گھومتی ہے اور اس کے آستانہ کو بوسہ دیتی ہے۔ ایسا ہی خانہ خدا کو جسمانی طور پر محبان صادق کے لئے ایک نمونہ بنا دیا گیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو یہ میرا گھر ہے اور یہ حجر اسود میرے آستانہ کا پتھر ہے۔ اور ایسا حکم اس لئے دیا کہ انسان جسمانی طور پر اس گھر کے گرد گھومتے ہیں۔ ایسی صورتیں بنا کر گویا محبت میں دیوانہ اور مست ہیں، زینت دور کر دیتے ہیں، سر منڈوا دیتے ہیں اور مجذوبوں کی شکل بنا کر اسکے گھر کے گرد عاشقانہ طواف کرتے ہیں۔ اور یہ جسمانی ولولہ روحانی تپش اور محبت پیدا کر دیتا ہے اور جسم اس گھر کے گرد طواف کرتا ہے اور سنگ آستانہ کو چھومتا ہے۔

۴۔ اکثر آدمی اپنے پروردگار کے شوق میں تڑپتا ہے۔ اس وقت اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ اپنا شوق پورا کرے، تو سوائے حج کے اور کوئی چیز ایسی نہیں ملتی۔

۵۔ جیسا کہ دولت اور سلطنت کو ہمیشہ ایک آزمایش اور امتحان کی ضرورت پڑتی ہے، جس سے مخلص اور منافق میں تمیز ہو جائے، دوست کی شہرت ہو، اس کا کلمہ بلند ہو اور سب لوگوں میں باہم جان پہچان ہو جائے۔ ایسا ہی مذہب کو حج کی ضرورت ہے، تا کہ منافق اور موافق کی بخوبی تمیز ہو جائے۔ اور دین الٰہی میں مختلف لوگوں کا داخل ہونا عیاں ہو جائے۔ ایک دوسرے سے ملیں جلیں اور ہر ایک دوسرے سے ان فوائد کو حاصل کر سکیں، جو ان کو حاصل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ مقاصد باہمی مصاحبت اور ایک دوسرے کے ملنے ہی سے حاصل ہوا کرتے ہیں۔

۶۔ آئمہ دین کی حالت کو یاد کرنے اور ان کے اختیار کرنے کی آمادگی کے لئے کوئی چیز حج سے زیادہ مفید نہیں ہے۔

۷۔ چونکہ حج میں دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ نہایت دشوار عمل ہے اور بڑی مشقت سے پورا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تکالیف کا برداشت کرنا خدا تعالیٰ کی خالص عبادت ہے، جس سے خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔

۸۔ آدمی طواف کعبہ کی وجہ سے ان مقرب ملائکہ الٰہی کا مشابہ ہو جاتا ہے، جو عرش الٰہی کے گرد گھومتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرو کہ طواف کعبہ سے مقصود صرف جسم کعبہ کا مقصود ہے۔

بلکہ طواف سے مراد ربّ الکعبہ کا طواف ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کا آغاز اور انجام اس پر ہو، جیسے کہ طواف کی ابتداء اور انتہا بیت پر ہوتی ہے۔ عمدہ طواف دل کا حضرت اُلوہیّت کا طواف ہے۔ اور خانہ کعبہ عالم ظاہری میں اس دربار الٰہی کا نمونہ ہے، کیونکہ وہ عالم باطن میں ہے اور آنکھ سے محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عالم ظاہری میں بدن کا نمونہ ہے۔ اس بات کی طرف یہ اشارہ ہے کہ بیت المعمور آسمان میں خانہ کعبہ کے مقابل میں ہے اور فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ چونکہ خلق کا رتبہ اس جیسے طواف سے قاصر ہے، لہٰذا ان فرشتوں کی مشابہت کا حکم ہوا کہ آدمی کا حشر اس قوم کے ساتھ ہوگا، جو اس قوم کے ساتھ مشابہت کرے، وہ انہی میں شمار ہوگا۔

۹۔ اسلامی پانچویں اصل حج ہے۔ اہل اسلام کے قومی اجتماع کا ایک سفر۔ مسلمان بھائی محلے محلے کے آپ میں ہر روز پانچ دفعہ نمازوں میں باہم مل لیا کریں۔ یہ بات محلوں میں پانچ بار حاصل ہو جاتی ہے۔ اور شہر شہر کے اہل اسلام کا باہم ملنا برسوں میں حج کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۰۔ قصبات اور دیہات اور شہری اہل اسلام کے اجتماع سال میں دو بار عید الفطر اور عید الضحیٰ پر تجویز کئے۔ کثرت بھیڑ میں عدم صحت کا اندیشہ اس طرح مٹایا کہ نہاؤ، کپڑے بدلو۔ سخت گرمی سے پہلے ہی شہر سے باہر کھلے میدان میں زن و مرد سب جا کر جمع ہوں۔ وہاں دو رکعت کی نماز ہے اور اس کے بعد ضرورتوں پر خطبہ (لیکچر) تمام بلاد اسلام کے مسلمان بھائیوں کے اجتماع کے واسطے وہ جگہ تجویز ہوئی، جہاں سے ایسے عظیم الشان حکیمانہ مذہب کی نشو ونما اور ابتداء شروع ہوئی۔ چونکہ ہر ایک مسلمان کا فقیر ہو یا امیر ہر سال وہاں جانا خلاف فطرت تھا اور خلاف امکان۔ اسلئے حکم ہوا کہ آسودہ لوگ اور استطاعت والے مسلمان وہاں جائیں۔ اور مختلف بلاد کے حالات جاننے اور انکے علوم وفنون کے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر لانے میں اصحاب استطاعت ہی غالباً عمدہ طور پر کامیابی کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

کمال اتحاد اور باہم پرلے درجہ کی یکتائی کے واسطے اور اس لحاظ سے بھی کہ امراء و رؤسا کے ساتھ ان کے غریب نوکر چاکر بھی ہوں گے، اور ضرور ہے کہ کوئی عاشق الٰہی غریب مسکین بھی وہاں جا پہنچے، اس لئے حکم دیا کہ تمام حجاج سادہ لباس، صرف دو چادروں پر اکتفا کریں۔ کسی کے سر پر عمامہ اور ٹوپی نہ ہو۔ کوئی کرتہ نہ پہنے، کمال درجہ کی بے تکلفی اور سادگی سے باہم ملیں۔ اور **لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ لَا شَـرِیکَ لَکَ** کی صدا بلند کریں۔ اتنا بڑا اجتماع اس صدر مقام میں کہاں ہو؟ شہر سے کئی کوس کے فاصلے پر نہایت بڑے وسیع میدان میں، جہاں کسی مخلوق کی تعظیم کا نام ونشان ہی نہیں۔ نہ کوئی پتھر، نہ کوئی درخت، نہ کوئی ندی، نہ کوئی رتھ۔

۱۱۔اور سنو نیاز مندی دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک نیاز مندی خادمانہ، خدام کی نیاز مندی اپنے آقا اور بادشاہ کے سامنے۔ دوسری نیاز مندی عاشقانہ، عاشق کی محبوب کے ساتھ۔ پہلی قسم کی نیاز مندی کو مناسبت ہے کہ درباری لباس پہن کر بڑے ادب اور وقار سے مالک کے دربار میں حاضر ہو اور تمام حکام اور مربیوں کی اطاعت کا کان پر ہاتھ رکھ کر اقرار کرے۔ ہاتھ باندھ کر حکم کا منتظر رہے، جھک کر تعظیم دے، زمین پر ماتھا رکھے، حضور کے غریب نوکروں کے لئے نذر دے۔

۱۲۔ عاشقانہ نیاز میں ضرور ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے سامنے عشق میں بھوک اور پیاس بھی دیکھے۔نہایت درجے کے اس عزیز کو بھی، جس کی نسبت لکھا ہے کہ انسان ماں باپ کو چھوڑ کر اس سے متحد اور ایک جسم ہوگا، کچھ دیر کے لئے ترک کرے اور جہاں یقینی طور پر سن لیا ہو کہ میرے محبوب کی عنایات اور توجہات کا مقام ہے، وہاں دوڑتا کودتا سر کے عمامے اور ٹوپی سے بے خبر پہنچے۔ پروانہ وار وہاں فدا ہو۔کہیں دشمنوں کی روک ٹوک کی جگہ سُن پائے، تو وہاں پتھر چلائے۔

۱۳۔ہم مضمون ذیل کو بطرز اختصار قبل ازیں لکھ چکے ہیں اور اب مفصل طور پر اس کو دوھراتے ہیں۔ نماز پنجگانہ کا باجماعت پڑھنا اور جمع و عیدَین کی اقامت ،جس حکمت کے اصول پر مبنی ہیں، انتظامات ملکی کا دقیقہ شناس اس کی خوبی سے انکار نہیں کرسکتا۔ ہزاروں برسوں کے دور کے بعد جو دنیا نے ترقی کی اور چاروں طرف غلغلہ تہذیب بلند ہوا۔اس سے بڑھ کر اور کوئی تجویز کسی عقل مند کے دل میں نہ آئی کہ کلب بنائے جائیں۔، انجمنیں منعقد ہوں اور وقت کی ضرورت کے موافق قوم کو بیدار کرنے والی تقریریں کی جائیں۔لیکن ظاہر ہے کہ بایں ہمہ ترقی علوم ایسی انجمنوں کے قایم واستحکام کے کیا کیا طریقے نکالے، جنہیں کوئی مزاحم، کوئی مانع توڑ نہیں سکتا۔ اعضائے انجمن کے اجتماع کے لئے ٹکٹ جاری کئے جاتے ہیں، اشتہار چھاپے جاتے ہیں۔اس طریق الٰہی میں وقت معین پر اذان دی جاتی ہے، جو پاک انجمن (مسجد) میں پہنچائے بغیر چھوڑ ہی نہیں سکتی۔

قرب وجوار کے لوگوں کا ہر روز پانچ مرتبہ ایک جگہ میں جمع ہونا اور پھر شانے سے شانہ جوڑ اور پاؤں سے پاؤں ملا کر ایک ہی سچے معبود کے حضور میں کھڑا ہونا قومی اتفاق کی کیسی بڑی تدبیر ہے۔ ساتویں دن جمعہ کو آس پاس کے چھوٹے قریوں اور بستیوں کے لوگ صاف اور منظف ہو کر ایک بڑی جامع مسجد میں اکٹھے ہوں اور ایک عالم بلیغ تقریر (خطبہ) حمد و نعت کے بعد ضرورت قوم پر کرے۔

عیدین میں کسی قدر دور کے شہروں کے لوگ ایک فراخ میدان میں جمع ہوں اور اپنے ہادی کی شوکت مجسم کثیر جماعت بن کر دنیا کو آفتاب اسلام کی چمک دکھا دیں۔اور بالآخر اس پاک زمین میں

اوس فاران میں، جہاں سے اولاً نورتوحید چمکا،کل اقطار عالم کے خدا دوست حاضر ہوں، ساری بچھڑی ہوئی متفرق امتیں اس دنگل میں اکٹھی ہوں۔ وہاں نہ اس مٹی اور پتھر کے گھر کی، بلکہ اس ربّ الارباب معبود الکل کی، جسنے اس ارض مقدسہ سے توحید کا عظیم الشان واعظ بے نظیر ہادی نکالا، حمد وستائش کریں۔

اس طرح ہر سال اس یادگار بیت اللہ کو دیکھ کر ایک نیا جوش اور تازہ ایمان دل میں پیدا کریں، جو بحسب تقاضائے فطرت ایسی یادگاروں اور نشانوں سے پیدا ہونا ممکن ہے۔ سخت جہالت ہے اگر کوئی اہل اسلام کی سی موّحد قوم پر مخلوق پرستی کا الزام لگائے۔ ایسے شخص کو انسانی طبیعت کے عام میلان اور جذبات کو مدّ نظر رکھ کر ایک واجب الامرامر پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر قرآن کے پورے اور خالص معتقدین کی طبائع میں بت پرستی ہوتی، تو ان کو اپنے ہادی منجی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مقدسہ سے بڑھ کر کونسا مرجع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ معظّمہ میں آنحضرت ؐ کا مرقد مبارک نہیں ہونے دیا، تاکہ توحید الٰہی کا سرچشمہ پاک ہر قسم کے شوائب اور ممکن خیالات کے گرد وغبار سے پاک وصاف رہے اور مخلوق کی فوق العادت تعظیم کا احتمال بھی اٹھ جائے۔

۱۴۔ تمام قوموں میں میلوں کا رواج ہے اور میلوں کا ہونا عمدہ مصالح دنیوی پر مبنی ہے۔ کل مذاہب اور تمام اقوام کے میلے خالص توحید سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ کھیل غیر اللہ کی پرستش ہے۔ کھیل صرف دنیوی خیال ہے، جو فانی اور غیر باقی ہے۔ ان کو عظمت الٰہی سے کچھ سروکار نہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلامی میلے تمام دنیا کے میلوں سے روحانیت میں بڑھے ہوئے ہیں۔

دولتمندوں پر حج واجب ہونے کی وجہ

۱۔ امراء کے حق میں عیش اور کُبر ہی مہلک امراض اور ترقی کے دشمن ہیں۔ دور دراز کا سفر کرنا، احباب اور اقارب کو چھوڑنا، سردی اور گرمی کو برداشت کرنا، مختلف بلاد کے علوم اور فنون اور اقسام مذاہب اور عادات پر واقف ہونا، سستی اور نفس پروری کا خوب استیصال کرتا ہے۔

۲۔ حج کے اعمال کبر و بڑائی کے سخت دشمن ہیں۔ زیب وزینت کو ترک کرنا، غربا کے ساتھ ننگے سر کوسوں چلنا، دنیاداروں، مستوں، عیاشوں کو کیسی کیسی ہمت بڑہانے کا موجب ہے۔ غرض حج کیا ہے، اسلامیوں کو تجربہ کار اور ہوشیار بنانا ہے۔

۳۔ بے ریب ایک ملک کے فوائد کو دوسرے ملک تک پہنچانے میں جیسی طاقت دولتمند رکھتے ہیں، ویسی علے العموم غریب لوگ نہیں رکھتے۔

۴۔ امرا کے ساتھ، جن پر حج فرض ہے، ممکن ہے، بلکہ ضرور ہی تھا کہ ان کے نوکر چاکر بھی حج

کرنے کے ساتھ جائیں۔اور کچھ لوگ غربا میں سے عشق الٰہی کے مجبور کئے ہوئے بھی وہاں پہنچیں۔اس لئے اسلام نے بغرض کمال اتحاد اہل اسلام تجویز فرمایا کہ سب لوگ سادہ چادروں پر اکتفا کر کے امیر و غریب یکساں سر سے ننگے کرتے سے الگ سادہ وضع پر ظاہر ہوں تا کہ ان کی یکتائی اور اتحاد کامل درجے پر پہنچے۔

حکمت احرام حج

ا۔احرام باندھنے میں یہ حکمت ہے کہ حج وعمرہ کے لئے احرام ایسا ہے،جیسے نماز کے لئے تکبیر تحریمہ۔احرام کے اندر اخلاص و تعظیم اور ایک ظاہری فعل سے حج کے مصمم ارادے کی صورت معلوم ہوتی ہے۔اور اس میں آدمی کے نفس کی ذلّت اور خشوع کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں،کیونکہ اس میں تمام لذائذ اور عادات مالوفہ اور ہر قسم کی زینت کی باتوں کو چھوڑنا ہوتا ہے۔اور اس میں تعب اور خستگی اور خدا تعالیٰ کے لئے اپنی حالت کو بدلنا ہوتا ہے۔اور محرم کو ان اشیاء سے اجتناب کرنے کا اس لئے حکم دیا گیا کہ ذلّت اور ترک زینت اور خراب خستہ ہونے کے معانی پائے جائیں اور خوف رہے اور اسکی تعظیم کا اثر ظاہر ہو۔اور نفس کو اپنی خواہشوں کے پورا کرنے میں مطلق العنانی نہ ہو جائے۔

۲۔زیب وزینت کی پہلی سیڑھی حجامت بنوانا،بال کٹوانا ہے۔اور اس کی ان ایام میں ممانعت ہے،جو وضع کے پابندوں کو محال نظر آتی ہے۔اور کتب مقدسہ میں اس طرز کی نظیر موجود ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ نذیر یعنی نذر کرنے والے کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے،جب تک وے دن،جن میں اس نے اپنے خداوند کے لئے نذر کیا ہے،گذر جائیں۔سر کے بال بڑھنے دے۔(گنتی ٦ باب ۵)

سات بار طواف کعبہ کی وجہ

ا۔سات بار طواف کعبہ سے خدا تعالیٰ کی صفات سبع کے اثبات واقرار کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔یہ ابراہیمی عبادت کی طرح پر ایک عبادت ہے،جسے طواف کہتے ہیں۔پروانہ وار چند بار الٰہی مسجد کے گرد گھومنا۔اس طواف کے ثبوت کے لئے دیکھو(زبور ٢٦)۔

کعبہ کے حجر اسود کی اصل

حجر کے معنے پتھر۔اَسْوَدْ کے معنے کالا۔چونکہ اس پتھر کا رنگ سیاہ ہے،اس لئے اس کو حجر اسود کہتے ہیں۔

حجر اسود کیا ہے؟ایک بن گھڑا پتھر ہے۔چونکہ گھڑے ہوئے پتھروں کی عبادت ہوتی تھی۔اس

واسطے ابراہیم اور ان کی اولاد نے یادگار نشان کے لئے بن گھڑے پتھر رکھے تھے۔(پیدائش ۲۸۔باب ۱۸) یعقوب نے پتھر کھڑا کیا اور اس پر تیل ڈالا۔اور (پیدائش ۳۵ باب ۱۵) اور (یشوع ۴ باب ۵۔۲۶) ہر ایک تم میں سے بنی اسرائیل کے فرقوں کے مطابق ایک ایک پتھر اپنے کاندھے پر رکھے، تاکہ تمہارے درمیان نشان ہو۔ پادری ان باتوں سے انکار نہیں کر سکتے۔دانیال ۲ باب ۳۴ میں ہے۔ یہود غیر قوموں کو بھی پتھر کہتے تھے۔اور ہمیشہ بنی اسماعیل کو یہ معمار قوم حقیر جانتی تھی۔عرب میں قدیم سے اس لئے کہ وہ اَن پڑھ قوم تھی۔تصویری زبان میں بطور پیشگوئی اور بشارت کے بیت اللہ کے کونے پر ایک بن گھڑا پتھر نصب کیا گیا، جسے صرف ہاتھ لگاتے تھے، جو بیعت اور اقرار کا نشان ہے۔مطلب یہ کہ اس پاک شہر میں وہ کونے کا پتھر پیدا ہوگا، جس کے ہاتھ پر بیعت کرنا ضرور ہے۔ جو کوئی اس پر گرے گا چور ہوگا۔جس پر یہ گرا پیس ڈالے گا (زبور ۱۱۸) اور (اشعیا ۲۸ باب) اور (متی ۲۱ باب کی بشارت) وہ پتھر جسے معماروں نے ردّ کیا، وہ کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ یہ وہی کونے کا پتھر ہے، جس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی مرکوز ہے۔توریت۔زبور۔انجیل کو ماننے والے عیسائی خوب غور کر لیں۔

قدیم زمانہ میں تصویری تحریر کا عام رواج تھا۔محسوسات کے اشکال پر اشارات اور کنایات سے گفتگو مروّج تھی۔عیسائی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ یہودیوں میں پولا ہلانے کی رسم کو مسیحؑ کا جی اٹھنا خیال کرتے ہیں۔ یوشع کا یردن سے بارہ پتھر اٹھانا۔بارہ حواریوں کی طرف اشارہ بتاتے ہیں۔اور مینڈے کی قربانی کرنا حقیقی برّے کی قربانی خیال کرتے ہیں۔خصوصاً اَن پڑھ قوم کے لئے یہ تصویری زبان نہایت ضروری ہے۔اس واسطے قدیم زمانے سے بنی عرب سے پہلے خاص کعبے کے کونے پر ایک بن گھڑا پتھر، جسے حجر اسود کہتے ہیں، رکھا تھا۔اور اس کو ہاتھ لگانا اور اسے چھونا اور اس سے ہاتھ ملانا حج میں ضروری رسم تھی۔اور اس پتھر کو یَدُ الرَّحْمٰنِ فِی الْاَرْضِ (خدا کا ہاتھ زمین پر) کہتے تھے۔ یہ پتھر رسول عربی کے شہر میں گویا رسول خدا حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی بشارت تصویری زبان میں تھی۔ آپ رحمۃ للعلمین اور مظہر اسم رحمان تھے۔آپ کی بیعت رحمان سے بیعت تھی۔قرآن کریم بشارت حجریّہ کی نسبت عجیب کنائے اور رمز سے اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔ترجمہ۔جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے، وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے۔اور بخاری اور مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس طرف ایما کرتی ہے۔ مَثَلِیْ وَ مَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ کَمَثَلِ قَصْرٍ اُحْسِنَ بُنْیَانُہٗ تُرِکَ مِنْہُ مَوْضَعُ اللَّبِنَۃِ اِلٰی اَنْ قَالَ فَکُنْتُ اَنَا سَدَدْتُ

مَوضَعَ اللَّبِنَةِ وَ فِیْ رِوَایَةٍ فَانَا تِلْکَ اللَّبِنَۃُ۔(ترجمہ۔یعنی میری اور دوسرے نبیوں کی مثال ایک عظیم الشان محل کی ہے کہ ایک اینٹ کی جگہ اس میں چھوڑ دی گئی۔ پھر میں نے اس اینٹ کی جگہ کو پورا کر دیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں وہی اینٹ ہوں)اس آیت اور حدیث سے صاف واضح ہے کہ اسکے ہاتھ کی بیعت گویا رحمان کی بیعت تھی۔ ایسے ہی رسول کی بیعت بھی رحمان کی بیعت ہے۔ اور رسول خدا ایک اینٹ اس محل سرا کی ہیں، جو انبیاء کی ذات بابرکات سے تیار ہوئی۔ اس پتھر کو بن گھڑا اس لئے رکھا گیا کہ بت پرستوں کا کام بن گھڑے پتھر سے نہیں تھا، بلکہ گھڑے ہوئے سے۔ ابراہیم اور یعقوب جہاں خدا کو دیکھتے وہاں بن گھڑا پتھر اس بات کی یادگار میں کھڑا کر دیتے تھے۔(یشوع ۴ باب ۶۔ پیدائش باب ۱۲)

مرمتی کعبہ میں اصلاح قوم کی پیشگوئی

نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی عمر جب کہ ۳۵ سال کی تھی، تو کعبہ کی مرمتی میں کونے کے پتھر حجر اسود کے رکھنے پر تمام قبائل حجاز میں اس بات پر نفاق شروع ہوا کہ اس کونے کے پتھر کو کون اٹھا کر رکھے۔ قریب تھا کہ تمام قوم کٹ کر ہلاک ہو۔ اس حقیقی کونے کے پتھر نے، جس کی پیشگوئی کے لئے تصویری زبان میں اشارہ تھا، اس کا ایسا فیصلہ کیا کہ قوم پر ثابت کر دیا کہ میرے ہاتھ کے چھونے سے تم کو آرام اور نجات ہے۔ مجمل قصہ یوں ہے۔ جب قوم میں اس پتھر کے رکھنے میں اختلاف ہوا کہ اس پتھر کو کون رکھے۔ تو ان لوگوں نے یوں ٹھان لی کہ جو پہلے دروازے سے اندر آئے، وہی اس کا رکھنے والا ٹھہرے۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے اپنی چادر بچھا دی اور پتھر اس میں رکھ کر حکم دیا کہ تمام قومیں بالاتفاق اس چادر کو اٹھالیں۔ اس سچے سبت اور سچے کونے کے پتھر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آفت قتل وقتال سے قوم کو آرام بخشا۔

حجر اسود کو ہاتھ لگانے و چومنے پر اعتراض کا جواب

نادان کہتے ہیں کہ مسلمان پتھر کی پرستش کرتے ہیں۔ آریہ اور عیسائی بتائیں کہ عبادت کسے کہتے ہیں؟ عبادت میں استتی۔ حمد۔ اور تعریف۔ پرارتھنا یعنی دعا اور اپاشنا یعنی دھیان ضرور ہے۔ بتائیں کہ مسلمان کب اس پتھر سے دعا کرتے اور اس کا دھیان اور اس کی استت و مہما کرتے ہیں۔ کسی اسلامی عبادت میں اس پتھر کا ذکر بھی نہیں۔ بلکہ عبادت اسلامیہ میں تو مکّے کا بھی ذکر نہیں۔ اس کی عبادت کیا ہو گی۔ اگر اس کو ہاتھ لگانا یا چومنا عبادت ہے، تو سب لوگ بیاہی ہوئی عورتوں کے عابد اور خدا کو سجدہ کرنے

والے زمین کے پجاری ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ مقدس مقام میں تصویری زبان کے اندر یہ گفتگو ہے کہ نبوت کی محل سرا میں کونے کا پتھر یہاں مکّے سے نکلے گا۔ بلکہ مسیح ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متی ۲۱ باب ۳۳ میں خود کہا ہے کہ یہ تمثیل ہے۔

حجر اسود کو ہاتھ لگانے و چومنے کی وجہ

ا۔ حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت انسان کو یہ خیال کرنا چاہئے کہ میں خدا تعالیٰ سے اس کی اطاعت پر بیعت کرتا ہوں کہ اس عہد و پیمان کو پورا کروں گا۔ کیونکہ جو شخص بیعت میں دغا کرتا ہے، وہ مستحق غضب الٰہی ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے راوی ہیں کہ **اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ یَمِیْنُ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ فِی الْاَرْضِ یُصَافِحُ بِھَا خَلْقَہٗ کَمَا یُصَافِحُ الرَّجُلُ اَخَاہُ** ۔ترجمہ۔ حجر اسود زمین میں خدا تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے کہ اس کے ساتھ اپنی مخلوق سے مصافحہ کرتا ہے۔ جیسے آدمی اپنے بھائی سے مصافحہ کرتا ہے۔

۲۔ خانہ کعبہ کا پتھر حجر اسود ایک روحانی امر کے لئے نمونہ قائم کیا گیا ہے۔ اور اس طریق سے کوئی شرک نہیں۔ ایک دوست اپنے دوست کا خط پا کر بھی اسے چومتا ہے۔ الغرض یہ پتھر محبوب ازلی بے شبہ و بے مانند کے دستِ قدرت کا لکھا ہوا ہے، جس کو اس نے اپنے آستانہ کا نمونہ ٹھہرایا۔ اور خدا کا آستانہ مصدر فیوض ہے، یعنی اس کے آستانہ سے ہر ایک فیض ملتا ہے۔ اس لئے معتبرین لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خواب میں حجر اسود کو بوسہ دے، تو اس کو علوم روحانیہ حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ حجر اسود سے مراد منبع علم و فیض ہے۔

کوئی مسلمان خانہ کعبہ کی پرستش نہیں کرتا اور نہ حجر اسود سے مرادیں مانگتا ہے۔ بلکہ صرف خدا تعالیٰ کا قرار دادہ ایک جسمانی نمونہ سمجھا جاتا ہے وبس۔ جس طرح ہم زمین پر سجدہ کرتے ہیں، ایسا ہی حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ مگر وہ بوسہ اس پتھر کے لئے نہیں۔ پتھر تو پتھر ہے، جو نہ کسی کو نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ مگر اس محبوب کا ہاتھ ہے، جس کو اس نے اپنے آستانہ کو نمونہ ٹھہرایا ہے۔ **عَنْ عَابِسِ ابْنِ رَبِیْعَۃَ قَالَ رَاَیْتُ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ یُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَ یَقُوْلُ اِنِّی اُقَبِّلُکَ وَ اَعْلَمُ اِنَّکَ حَجَرٌ وَ لَوْ لَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُکَ لَمْ اُقَبِّلُکَ** ۔ترجمہ۔ یعنی عابس بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا کہ آپ حجر اسود کو چومتے تھے اور کہتے تھے۔ اے پتھر میں تجھ کو چومتا ہوں (اور جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے، نہ نفع دے سکتا ہے نہ ضرر)۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ آپ تجھے چومتے تھے، تو میں تجھے نہ چومتا۔

حجر اسود تصویری زبان میں نمونہ ہے

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں بہت مدت سے تصویری زبان کا رواج تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ سری رام چندر جی اور شیو جی کے تصویری قصص ہندوؤں کے پاس ،خصوصاً ہند کے قدیم مصوروں کے پاس، موجود ہیں۔ رومی سکندر جس کو حضرت دانیال نبی نے ذوالقرن یعنی ایک سینگ کا بکرا خواب میں دیکھا ہے۔ یہ تصویری زبان کی شہادت ہے۔ (دیکھو دانیال باب ۸)۔ اسی طرح دارا، ایرانی بادشاہ، کی تصویری زبان میں گفتگو عام نظموں میں موجود ہے ۔ تصویری زبان کی کتابیں اور اخبارات ہند میں بکثرت موجود ہیں۔ سکندریہ ملک مصر کے ایک جریدہ نگار نے ابھی ایک رسالہ قدیمی تصویری زبان کے متعلق لکھ کر شائع کیا ہے۔ جس میں صرف حیوانات و آلات واشجار وغیرہ کی اشکال ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں پہلے اس زبان کا عام رواج تھا۔ اب بھی تصویری زبان کا ان بلاد میں، جہاں تعلیم کا رواج کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا، زیادہ تر استعمال کی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر تصویری زبان بہ نسبت تحریری کے زیادہ قوی ہوا کرتی ہے۔ اسواسطے یادگاروں کو عقلا اور حکماء اکثر تصویری تحریروں میں ادا کرتے ہیں۔

یوشع بن نون نے یردن سے گذرتے وقت بارہ پتھر اٹھائے۔ (یوشع باب ٦) وہ بقول عیسائیوں کے بارہ حواریوں کی پیشگوئی تھی۔ یہود اور عیسائی غیر قوموں کو اور بعض خواص کو پتھر کہتے تھے۔ یہ ان کا محاورہ تھا۔ پطرس کو پتھر اس واسطے کہا کہ کلیسا کے لئے وہ فونڈیشن سٹون یعنی بنیادی پتھر ہوا۔ ان باتوں پر خوب غور کرو۔ اب اس تمہید کے بعد واضح رہے کہ کتاب مقدسہ میں ایک پیشگوئی بہ نسبت حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زور سے درج تھی۔ (دیکھو لوقا ۲۰ باب ١٦، ١٧) وہ پتھر، جسے راجگیر وں نے رد کیا، وہی کونے کا سرا ہوا۔ اور (دیکھو زبور ١٨-٢٢) وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ (متی باب ۲۱ آیت ۴۲، ۴۴) غرض یہ ایک بشارت ہے، جو کئی کتب مقدسہ میں مندرج ہے۔ اس بشارت اور اس پیشنگوئی کے اظہار و تصدیق کے لئے مکہ معظّمہ کی بڑی عبادت گاہ میں بطور تصویری زبان کے حجر اسود کونے میں رکھا گیا تھا۔ محمدیوں سے پہلے صدہا سال سے یہ پتھر ابراہیمی عبادت گاہ کے کونے میں منصوب تھا اور عرب کے لوگ اسے چومتے اور اس سے ہاتھ ملاتے تھے۔ گویا قدیم زمانے میں نبی عرب سے پہلے یہ فقرہ تصویری طور پر مکہ معظّمہ کی مقدس مسجد پر لکھا تھا کہ اس شہر میں وہ کونے کا پتھر جسے یوں کہا جائیگا کہ نبوت اور رسالت کی عظیم الشان اور مستحکم عمارت جو انبیاء اور رسولوں کے وجود ذی جود سے وہ عمارت پوری ہوئی ہے۔ ان کی بیعت رحمان کی بیعت اور ان کی اطاعت رحمان کی اطاعت ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ بولے الٰہی کے بلانے سے بولے۔ حضرت رسالتمآب نے بھی یہی

تفسیر فرمائی ہے۔ دیکھو مشکوٰۃ وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ مَثَلِیْ وَ مَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ کَمَثَلِ قَصْرٍ اُحْسِنَ بُنْیَانُہٗ وَ تُرِکَ مِنْہُ مَوْضَعَ اللَّبْنَۃِ اِلٰی اَنْ قَالَ فَکُنْتُ اَنَا سَدَدْتُّ مَوْضَعَ اللَّبْنَۃِ وَ فِیْ رَوَایَۃٍ فَاَنَا تِلْکَ اللَّبْنَۃُ۔ (ترجمہ۔ میری اور دوسرے نبیوں کی مثال اس محل کی ہے کہ جو بہت خوبصورت بنایا گیا اور ایک اینٹ کی جگہ اس میں خالی رکھی گئی۔ میں وہی اینٹ ہوں۔ حضرت مسیح علیہ السلام انجیل متی میں فرماتے ہیں۔ اَلْحَجَرُ الَّذِیْ رَفَضَہُ الْبَنَّاؤُنَ ھُوَ قَدْ صَارَ رُؤُسُ الزَّاوِیَۃِ مِنْ قِبَلِ الرَّبِّ کَانَ ھٰذَا وَ ھُوَ عَجِیْبٌ فِیْ اَعْیُنِنَا لِذَالِکَ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنَّ مَلَکُوْتُ اللّٰہِ یَنْزَعُ مِنْکُمْ وَ یُعْطٰی لِاُمَّۃٍ تَعْمَلُ اَثْمَارَہٗ وَ مَنْ سَقَطَ عَلٰی ھٰذَا الْحَجَرِ یَتَرَضَّضُ وَ مَنْ سَقَطَ ھُوَ عَلَیْہِ یَسْحَقُہٗ۔ (ترجمہ۔ وہ پتھر، جسے معماروں نے رد کیا، وہی کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند سے ہے۔ اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں، خدا کی بادشاہت تم سے لی جاوے گی اور قوم کو، جو اس کے پھل لاوے، دی جاوے گی۔ جو اس پتھر پر گرے گا، چور چور ہو جاویگا۔ پھر جس پر وہ گرے گا، اسے پیس ڈالے گا)۔

حجر اسود و خانہ کعبہ کے علو درجات کے متعلق صلحاء کے مکاشفات

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کہ خدا تعالیٰ حجر اسود کو قیامت کے دن اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی، جن سے دیکھے گا اور زبان ہوگی، جس کے ساتھ بولے گا۔ جس نے اس کو لوجہ اللہ چوما ہوگا، اس کی شہادت بیان کرے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ قوّت ملکیہ سے بھرا ہوا ہے۔ پس اس مناسبت سے ضروری ہے کہ عالم مثال میں حجر اسود کو آنکھیں اور زبان، جو جانداروں کے لوازم ہیں، عطا کی جائیں اور قیامت میں ان کا ظہور ہو۔

حکایت ۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ میں جلوہ گاہ حقائق میں اپنی پیدائش کو کعبہ سے افضل اور اس کے رتبہ کو اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔ اور مولدات (تشریح۔ مولدات کا پہلا درجہ عالم جمادات ہے) کے پہلے درجہ میں اس کی پیدائش کو ذہن میں لاتا تھا۔ اور ان عالی درجات سے، جن کے ساتھ خدا تعالیٰ نے اس کو مخصوص کر رکھا ہے، روگرداں تھا۔ اور یہ امر کعبہ کی بلندیء درجہ پر دال ہے کہ رسولوں اور بزرگوں کے طواف اور ان کے حجر اسود کو چومنے سے وہ بذاتہا محجوب نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس جہان کے علویات اور سفلیات کا ایک ہی حالت پر ثابت رہنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اصل، جو ساری موجودات عالم کا مرجع ہے، وہ تو

خدا تعالیٰ ہی ہے اور خدا تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ (خدا تعالیٰ ہر یوم و ہر آن ایک شان میں ہے) پس محال ہے کہ اس جہان کی کوئی چیز ایک ہی حالت پر ہر دو زمانوں میں باقی رہ سکے۔ اور شیئون الٰہیہ کے اختلاف کے سبب سے اس کے احوال مختلف نہ ہوں۔ اور مجھ سے کعبہ کے حق میں یہ بات غلبہء حال کے باعث صادر ہوئی۔ اور خدا تعالیٰ نے مجھے اس حالت مستی میں آگاہ و متنبہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ لہٰذا ایک بڑی ٹھنڈی اور ماہتابی رات میں، جب کہ پانی کا چھینٹا ہو چکا تھا، خدا تعالیٰ نے مجھے اپنی خوابگاہ سے بیداری کی توفیق بخشی۔ میں وضو کر کے سردی سے کانپتا ہوں طواف کعبہ کو چلا۔ اور طواف میں ایک آدمی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے حجر اسود کو چوما اور طواف شروع کیا۔ جب میں حجر اسود کے پیچھے میزاب کے مقابلہ پر پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ کعبہ کی بنیادیں اکٹھی ہو کر اوپر کو مرفوع ہو گئیں۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ کعبہ نے ارادہ کیا ہے کہ جب میں طواف کرتا ہوا رکن شامی کو پہنچوں، تو اپنے آپ کو مجھ پر دے مارے اور طواف سے مانع ہو۔ اور میں اپنے کانوں سے سنتا تھا کہ کعبہ مجھ سے وعید آمیز باتیں کرتا اور ڈراتا تھا۔ پس میں سخت ڈرا اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر کعبہ سے اتنی تنگی و غصہ ظاہر فرمایا کہ میں اس جگہ سے ادھر ادھر حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں حجر اسود کی اوٹ میں ہو گیا تا کہ کعبہ کی ضرب پتھر پر واقعہ ہو۔ میں نے حجر اسود اور کعبہ کو اپنے اور کعبہ کے درمیان ڈھال سا ٹھہرا لیا۔ خدائے عز و جل کی عزت کی مجھے قسم ہے کہ میں سنتا تھا کہ کعبہ مجھے کہتا تھا۔ آگے آ تا کہ تو دیکھے جو کچھ میں تیرے ساتھ کروں گا۔ کس قدر تو میری قدر کو پست اور بنی آدم کے مرتبہ کو بلند ٹھہراتا رہے گا اور عارفوں کو مجھ پر فضیلت دیتا رہے گا۔ مجھے خدا کی قسم ہے کہ میں تجھ کو طواف نہیں کرنے دونگا۔ پس میں نے اپنے دل میں سوچا اور جان لیا کہ خدا تعالیٰ مجھے تادیب کرنا چاہتا ہے۔ اس پر میں نے خدا تعالیٰ کا شکر کیا اور وہ غم مجھ سے رفع ہو گیا، جو میں محسوس کرتا تھا۔ بخدا کعبہ زمین سے اپنی بنیادوں کے ساتھ ایسا مرفوع ہو گیا، جیسا کہ انسان جب کہ اپنے مکان سے اٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کپڑے جمع کر لیتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کعبہ نے اپنی دیواروں جمع کر لیں تا کہ مجھ پر حملہ کرے۔ اور اس وقت کعبہ ایک ایسا حسین عورت کی صورت میں نمودار ہوا کہ میں نے ایسی حسین شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پس میں نے اسی وقت کعبہ کو خطاب کر کے ابیات ذیل فی البدیہہ پڑھیں اور اس کو اس تنگی سے اترنے کی درخواست کی، جس میں اس کو مشاہدہ کیا تھا۔ میں ان ابیات میں کعبہ کی تعریف کرتا جاتا تھا اور وہ کشادہ ہوتا ہوا اپنی دیواروں کے ساتھ اپنی جگہ پر اتر آیا۔ اور میں نے سنا کہ وہ میری مدح سے خوش و مسرور ہو گیا۔ حتیٰ کہ اپنی پہلی حالت پر آ گیا۔ اور مجھے امن دیگر طواف کے لئے اشارہ کیا۔ پس میں نے

اپنے آپکواس پر ڈالدیا۔ اور میرا ہر ایک عضوقوت وغلبہ حال سے مضطرب تھا۔ اور وہ مجھ سے خوش ہو گیا اور میں نے اس سے صلاح کر لی اور حجر اسود کو چومنے کے وقت شہادت توحید کی اپنی مانت اس کے سپرد کر دی۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ شہادت میرے تلفظ کے وقت ایک لڑی کی صورت میں خارج ہوئی اور حجر اسود میں ایک طاق کھل گیا اور میں نے اس لڑی کو ایک گز کے قریب حجر اسود کے بیچ طول میں پڑا ہوا دیکھا۔ بعدازاں میں نے مجاورین کعبہ میں سے ایک سے اس بات کے بارے میں پوچھا، تو اس نے جواب دیا کہ میں نے اس لڑی کو ایک گز کے برابر ایسا ہی دیکھا ہے، جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے۔ پھر حضرت ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ وہ شہادت ایک گیند کی طرح گول ہوگئی اور وہ حجر اسود کے بیچ قرار پکڑ گئی اور پتھر اس پر مل گیا۔ اور میرے دیکھتے ہی وہ طاق بند ہو گیا۔ پھر کعبہ نے مجھے کہا کہ یہ تیری امانت ہے، جس کو میں قیامت کے دن تیرے لئے خدا کے آگے پیش کروں گا۔ پس میں نے اس پر کعبہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس وقت سے کعبہ اور میرے درمیان صلح واقع ہوگئی۔ اور میں نے کعبہ کو ابیات ذیل سے خطاب کیا اور مجھے فرحت اور سرور زیادہ ہوا۔

بِالْمُسْتَجَارِ اِسْتَجَارَ قَلْبِیْ لَمَّا اَتَتْ اَسْهُمُ الْاَعَادِیْ

میرے دل نے طلب پناہ کی جگہ یعنی کعبہ میں خدا سے پناہ طلب کی جبکہ میری طرف دشمنوں کے تیر آنے لگے

یَا رَحْمَةَ اللّٰهِ لِلْعِبَادِیْ اَوْدَعَکَ اللّٰهُ فِی الْجَمَادِیْ

اے بندوں کیلئے رحمت خدا تجھ کو خدا نے عالم جمادات میں بندوں کی بہتری کے لئے امانت رکھا ہے

یَا بَیْتُ رَبِّیْ یَا نُوْرُ قَلْبِیْ یَا قُرَّةُ الْعَیْنِ یَا فُؤَادِیْ

اے میرے پروردگار کے گھر، اے میرے دل کے نور، اے آنکھوں کی ٹھنڈک، اے میرے دل

یَا سِرُّ قَلْبُ الْوُجُوْدِ حَقًّا یَا حُرْمَتِیْ یَا صَفَا وِدَادِیْ

ازروئے حقیقت اے سارے عالم کے دل کے بھید، اے میری حرمت اے میری دوستی کی صفائی

یَا قِبْلَةٌ اَقْبَلَتْ اِلَیْهَا مِنْ کُلِّ رُبْعٍ وَ مِنْ کُلِّ وَادِیْ

اے قبلہ جس کی طرف ہر آبادی اور ہر ویرانے سے

وَ مِنْ بَقَاءٍ وَّ مِنْ سَمَاءٍ وَ مِنْ فَنَاءٍ وَ مِنْ مِهَادِیْ

اور زمین اور آسمان سے اور مقام فنا اور فرش سے زیارت کے لئے مخلوق چلی آتی ہے

یَا کَعْبَةُ اللّٰهِ یَا حَیَاتِیْ یَا مَنْهَجِ السَّعْدِ یَا رَشَادِیْ

اے خدا کے کعبہ، اے میری زندگی، اے راہ سعادت، اے راہ ہدایت

اَوْ دَعَکَ اللّٰہُ کُلَّ اَمْنٍ　　مِنْ فَزْعِ الْھَوْلِ فِی الْمَعَادِ

تجھ میں خدانے ہرامن امانت رکھاہےاورتیرے ذریعہ آخرت کی گھبراہٹ سے بےخوف کیاہے

فِیْکَ الْمُقَامُ الْکَرِیْمُ یَزْھُوْ　　فِیْکَ السَّعَادَاتُ لِلْعِبَادِیْ

تجھ میں بزرگ مقام ہے جوناز کرتا ہے، تجھ میں بندوں کی سعادات ہیں

فِیْکَ الْیَمِیْنُ الَّتِیْ کَسَتْھَا　　خَطِیْئَتِیْ جِدَّۃَ السَّوادِیْ

تجھ میں وہ ہاتھ ہے جس کو پہنادیا ہے میری خطاؤں نے سیاہ لباس

مُلْتَزَمٌ فِیْکَ مَنْ یُّلَازِمُ　　ھَوَاہُ یَسْعَدُ یَوْمُ التَّنَادِ

ملتزم تجھ میں ہے جوکوئی اس کے عشق کا ملازم ہو، وہ قیامت کوسعادت مند ہوگا

مَاتَتْ نُفُوْسٌ شَوْقاً اِلَیْھَا　　مِنْ اَلَمِ الشَّوْقِ وَ الْبِعَادِ

جس کے شوق سے بہت سے نفوس دردشوق اوردوری کے سبب مرگئے

مِنْ حُزْنٍ مَا نَالَھَا عَلَیْھِمْ　　قَدْ لَبِسَتْ حُلَّۃَ الْحَدَّادِ

زائران کعبہ پر جوغم وارد ہوااس کا شمہ کعبہ کو پہنچا، اس لئے کعبہ نے سیاہ لباس غم کوظاہر کرنیوالا پہنا ہے

لِلّٰہِ نُوْرٌ عَلٰی ذَرَاھَا　　مِنْ نُوْرِہٖ لِلْفُوَادِ بَادِیْ

خدا کا نور کعبہ کے ذرات پر برس رہا ہے، خدا کے نور سے دلوں کے لئے روشنی پہنچتی ہے

وَ مَا یَرَاہُ سِوٰی حَزِیْنٍ　　قَدْ کُحِلَ الْعَیْنُ بِالسُّھَادِ

نورخدا کوسوائے اس غمگین کے کوئی نہیں دیکھتا، جس نے اپنی آنکھوں میں بیداری کا سرمہ ڈال لیا ہے

اشیائے عالم جمادات وحیوانات عجم سے باتیں کرناممکن ہے

سوال۔ کعبہ عالم جمادات میں واقع ہےاور جمادات کا بات کرنا عقل ومشاہدہ کے خلاف ہے۔

جواب۔ واضح رہے کہ یہ بات عقل سے بعید نہیں ہے کہ انسانی نطق کیونکر ایک لڑی کے رنگ میں متشکل ہوئی۔ اور کعبہ نے کس طرح بات کی۔ آج کل کے ایک آلہ ءایجادِفرنگ سے تجربہ ہو چکا ہے کہ انسان کی ہر بات اوراس کا فعل جس مقام پر واقع ہو، وہ وہاں ہی متشکل ہوجاتا ہے۔ گراموفون آلہ کی ایجادفرنگ کودیکھوکہ انسانی اصوات کس طرح مجسم ہوکرسنائی دے رہی ہیں۔

ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس زمانہ سے تیرہ سوسال پیشتر خبر دی تھی کہ جوانسان کسی مقام میں نیکی یابدی کرتا ہے، وہ اس مقام پرنقش ہوجاتی ہے۔ اورقیامت کواس کے فاعل پربطور گواہ پیش ہوگی۔ قرآن کریم واحادیث نبویہ نے اس مضمون کو بہت جگہ بیان کیا ہے۔ بعض اہل مکاشفہ

نے انسان کی اچھی و بری باتوں کو کئی اشکال میں مجسم دیکھا ہے۔ خاکسار راقم حروف کو بھی کئی بار رؤیا میں اس امر کا مشاہدہ ہوا۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اچھی باتوں کو نورانی رنگ میں اور بری باتوں کو دھواں آمیز آگ کے شراروں کی شکل میں بھی دیکھنا بیان کیا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعض نطق کو پرندوں کی شکل میں اور بعض درختوں کی صورتوں میں متشکل ہونا بیان فرمایا ہے۔

اس مطلب کو ذیل کے دو فارسی بیتوں کے سوال و جواب میں حل کیا گیا ہے۔

چہ تعلق آں معانی را بجسم   چہ تعلق فہم اشیاء را باسم

سوال۔ ان معنوں کو جسم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ چیزوں کے سمجھنے کو اسم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

لفظ چوں وکر است معنی طائر است   جسم جوئے و روح آب سائر است

جواب۔ لفظ گھونسلے کی مانند ہے اور معنے پرندہ کی مثل ہیں۔ جسم نہر کی مثل ہے اور روح بہنے والے پانی کی مانند ہے۔

۳۔ عالم مثال میں بعض اوقات بعض کلمات روپیہ و دراہم کی شکل میں متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ وَالدَّرَاهِمُ الَّتِیْ لَا نَقْشَ عَلَيْهَا تَدُلُّ عَلٰی كَلَامٍ فِيْهِ وَرَعٌ. اَلدِّرْهَمُ فِی الْمَنَامِ يَدُلُّ عَلَی الْوَلَدِ لِمَنْ عِنْدَهٗ حَامِلٌ وَ قَدْ يَدُلُّ عَلَی الذِّكْرِ وَ التَّسْبِيْحِ۔ ترجمہ۔ یعنی عالم رویا میں ایسے درہم (روپے) دیکھنا جن پر نقش نہ ہو، ان کی دلالت ایسی بات پر ہے، جس میں تقویٰ ہو۔ خواب میں درھم (روپیہ) دیکھنا بیٹے پر دلالت کرتا ہے اور کبھی ذکر اور تسبیح پر دال ہے۔ (تعطیر الانام۔ صفحہ ۱۶۶۔ جلد اول)

۴۔ ان کھلونوں اور مشینوں ایجاد فرنگ کو دیکھو جن کو چابی لگائی جاتی ہے، تو ان سے آدمی اور پرندوں کی آوازیں نکلتی ہیں۔ پس جب کہ انسان ضعیف البنیان جمادات سے بذریعہ چابی کے اس طرح باتیں کرا سکتا ہے، تو قادر مطلق کے آگے کس طرح ناممکن ہو سکتا ہے کہ وہ بھی کسی وقت کسی چیز کو روحانی چابی لگا کر جو کام نطق و حرکت کا اس سے لینا چاہے لے لے۔ آخر ہم بھی تو ایک عالم جمادات میں ہی تھے۔ اسی کی روحانی چابی لگانے سے ہماری حرکات و اصوات کا ظہور ہوا۔

محض بنی آدم کی خاطر اس عالم شہادت میں خدا تعالیٰ نے بالعموم عالم جمادات و نباتات و حیوانات میں ایک آڑ و امتیاز رکھا ہوا ہے۔ اور ان کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے آگے یہ بات ہرگز ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی خاص وجہ سے موالید ثلاثہ کی کسی ایک چیز سے اس کے ماتحت یا اس کے موافق کا کام لے لے۔ کیونکہ خداوند کریم کے نزدیک تو سب چیزیں زندہ ہیں۔ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ تصویری زبان اور اشارات سے حیوانات و پرندوں

کا باتیں کرنا مشہور و معروف ہے۔ گو انسان کی طرح ان سے فصیح و بلیغ باتیں کرنا متعارف نہیں ہے۔ لیکن عالم مثال میں ان سے صادر ہونا مستبعد نہیں ہے۔ خاکسار راقم حروف نے بعالم رؤیا ایک پرندہ بٹیر کو فصیح و بلیغ باتیں کرتے دیکھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس جانور کا یہ باتیں کرنا اس کی روحانی حالت کا نقشہ ہے۔ ایسا ہی کعبہ کا حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے باتیں کرنا اس کی روحانی حالت کا نقشہ تھا، جوان کے آگے بعالم مکاشفہ پیش ہوا۔

تودہ خاک ترا چوں زندہ ساخت　　خاکہارا جملگی باید گداخت

جبکہ خدا تعالیٰ نے تمہارے جسم کی مٹی کے ڈھیر کو زندہ کیا ہے، تو ایسا ہی اور مٹیوں کو جاننا چاہیئے

مردہ زیں سو اند زانسو زندہ اند　　خامش اینجا و آں طرف گوئیندہ اند

سب مٹیاں ہماری طرف سے مردہ اور خدا کی طرف سے زندہ ہیں۔ ہمارے پاس خاموش اور اسکے حضور میں باتیں کرتی ہیں۔

چوں ازانسو شان فرستد سوئے ما　　آں عصا گردد سوئے ما اژدہا

جب اس طرف سے انکو خدا بھیجتا ہے تو زندہ ہو جاتی ہیں، جیسا حضرت موسیٰ کا عصا ہمارے پاس سانپ بن گیا تھا۔

کوہ ہا ہم لحن داؤدی شود　　آہنیں خارا بکف مومی شود

پہاڑ بھی داؤد علیہ السلام کے ساتھ ہم آواز ہو گئے تھے اور سخت لوہا انکی ہتھیلی میں موم ہو گیا تھا

باد حمالی سلیمانے شود　　بحر با موسیٰ سخندانے شود

ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کو اٹھانیوالی ہو گئی تھی اور سمندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باتیں کرتا تھا

ماہ با احمدؐ اشارت بیں شود　　نار ابراہیم را نسرین شود

چاند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے کو سمجھتا تھا اور آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر پھول ہو جاتی ہے

خاک قاروں را چو مارے در کشد　　استین حنانہ آید در رشد

مٹی قاروں کو سانپ کی طرح اندر کھینچ لیتی ہے۔ اور ستون حنانہ آپ کی توجہ سے ہدایت پاتا ہے

سنگ احمد را سلامے می کند　　کوہ یحیٰی را پیامے مے کند

پتھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا ہے اور پہاڑ یحییٰ علیہ السلام کو پیغام دیتا ہے

جملہء ذرات عالم در نہاں　　با تو مے گویند روزاں و شباں

جہاں کے سارے ذرات پوشیدہ طور پر تم سے باتیں کرتے ہیں دن اور رات میں

یا سمیعیم و بصیریم و خوشیم　　با شما نا محرماں ما خامشیم

اور کہتے ہیں کہ ہم سنتے اور دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں کہ تم نامحرموں کے ساتھ خاموش ہو

باش تا خورشید حشر آیا عیاں   تا بہ بینی جنبش جسم جہاں

ٹھہرو کہ قیامت کا آفتاب ظاہر ہو اور تم اس جہان کے جسم کی حرکت کو دیکھو

دراصل بات یہ ہے کہ جہاں اس قسم کے خرق عادات کا ظہور ہو وہ ایک خاص قسم کے ملائکہ کے توسط سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کے اندر سے آواز اِنِّــیٓ اَنَـا رَبُّـکَ سنائی دینا۔ اور ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کعبہ کا باتیں کرنا اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سنگریزوں کا تسبیح پڑھتے ہوئے سنائی دینا۔ اور مسجد نبوی کے ستون حنانہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اپنا درد اور فراق بیان کرنا سب اسی قبیل سے ہیں۔

مگر یہ بھی ممکن ہے اے پختہ کار   کہ خود غیب سے ہو یہ سب کاروبار

کہ پردے میں قادر کے اسرار ہیں   کہ عقلیں وہاں ہیچ و بیکار ہیں

تو یک قطرہ داری ز عقل و خرد   مگر قدرتش بحر بے حد و عد

تم عقل کا ایک قطرہ رکھتے ہو اور خدا کی قدرت کا بے پایاں سمندر ہے

اگر بشنوی قصہء صادقاں   مجنباں سرِ خود چو مستہزیاں

اگر راسبازوں کا قصہ سنو تو اپنے سر کو ٹھٹھا کرنے والوں کی طرح نہ ہلاؤ

تو خود را خرد مند فہمیدہء   مقامات مرداں کجا دیدہء

تم نے اپنے آپ کو دانا سمجھ رکھا ہے، مگر راستبازوں کے مقامات تم نے کہاں دیکھے ہیں

(ابن عربی۔ احمد۔ رومی۔ فضل)

صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا راز

۱۔ صفا و مروہ کے درمیان خانہ کعبہ کے چوک کے اندر سعی کرنی ایسی ہے کہ جیسے غلام اپنے بادشاہ کے محل کے چوک میں بار بار آتا جاتا ہو۔ اس خیال سے کہ خدمت میں اپنا خلوص ظاہر کرے تاکہ نظر رحمت سے سرفراز ہو۔

۲۔ اس میں یہ راز ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ کے پاس داخل ہو اور پھر باہر نکلے اور نہ جانتا ہو کہ بادشاہ میرے باب میں کیا حکم کرے گا۔ منظور فرمائے گا یا نامنظور۔ تو دربار کے چوک میں بار بار آتا جاتا ہے۔ اس امید سے کہ اول دفعہ رحم نہ کرے گا، تو دوسری بار رحم کرے گا۔

گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے   عاقبت زاں در بروں آید سرے

نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب کسی دروازہ کو کھٹکھٹاؤ، تو بالآخر اس دروازہ سے کوئی باہر آئے گا

سایہء حق بر سرِ بندہ بود　　عاقبت جویندہ یا بندہ شود

خدا کا سایہ بندے کے سر پر ہوتا ہے۔ڈھونڈنے والا پالیتا ہے

چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے　　عاقبت بنی تو ہم روئے کسے

جب کسی کے کوچے میں بیٹھو گے،تو آخرکار اس کا منہ بھی دیکھ لوگے

چوں ز چاہے میکنی ہر روز خاک　　عاقبت اندر رسی در آب پاک

جب کسی کنوئیں سے روزمرہ مٹی کھودو گے،تو آخرکار پانی تک بھی پہنچ جاؤ گے

۳۔اس میں یہ راز بھی ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت کرنے کے وقت یہ خیال کرنا چاہیئے کہ میدان قیامت میں میزان کے دونوں پلّوں کے بیچ اس طرح پھرنا ہوگا۔صفا کو نیکیوں کا پلڑہ سمجھ لو اور مروہ کو برائیوں کا پلّہ خیال کرو۔اور یہ سمجھو کہ دونوں پلّوں کے درمیان اسی طرح آنا جانا ہوگا کہ دیکھیئے کونسا پلّہ غالب آتا ہے اور کونسا مغلوب۔عذاب و مغفرت کے درمیان تردد ہوگا کہ میں کس کا سزاوار ہوں۔

۴۔صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں یہ راز بھی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرت حاجرہ کو جب سخت پریشانی ہوئی،تو صفا و مروہ میں انہوں نے تیز رفتاری سے ٹہلنا شروع کیا،جس طرح کوئی متفکر آدمی جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہے۔اور خدا تعالیٰ نے ان کے فکر کو دو طریقوں سے رفع کیا۔ایک تو آب زمزم برآمد ہو گیا۔دوسرا لوگوں کے دلوں میں اس جنگل میں آباد ہونے کا الہام ڈالا۔اس لئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد اور ان کے فرمانبرداروں پر ضروری ہوا کہ اس نعمت کا شکر اور ان کی کرامت کو یاد کریں۔تاکہ ان کی قوت بہیمی مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔اور اس کے اندر کوئی بات اس سے زیادہ بہتر نہیں ہے کہ دلی اعتقاد کو کسی خاص ظاہری فعل سے،جو ان کے خلاف عادت ہے اور مکہ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک قسم کی ان کے لئے ذلت ہے،ان کے اعتقاد کی مضبوطی کی جائے۔اور وہ فعل حضرت حاجرہ کی اس تکلیف اور مشقت کی نقل کرنا ہے۔اور ایسے موقعہ پر ایک حالت کا نقل کرنا بدرجہ ہا زبانی باتوں سے مفید تر ہے۔

۵۔واقعات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہ نے پہلے کبھی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کوئی عہد لیا تھا کہ جو میں کہوں گی۔اسے اس کو پورا کرنا ہوگا۔اب سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا کہ حاجرہ کو کسی دور دراز جگہ میں چھوڑ آؤ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت سمجھایا مگر سارہ نے نہ مانا اور اپنی بات پر اصرار کیا۔پس حضرت ابرہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ اے خدا

میں کیا کروں۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنا وعدہ پورا کرو۔ پس آپ حضرت ہاجرہ کو لے کر دور دراز ملک میں چلے گئے اور وادیء مکہ میں چھوڑ آئے۔ حضرت حاجرہ کی گود میں ایک بچہ تھا، جس کا نام اسمٰعیل تھا اور وہ ابھی شیر خوار تھا۔ ایک مشکیزہ پانی کا اور کچھ ستو دے آئے تھے اور ان سے رخصت ہوتے وقت آپ نے یہ دعاء فرمائی اور اس دعاء میں اس زمین کا نقشہ بھی ظاہر کیا ہے۔ رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِی بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ ذَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ ۔ ترجمہ۔ اے ہمارے رب میں نے بسائی ہے ایک اپنی اولاد ایسے میدان میں، جہاں کھیتی نہیں۔ تیرے ادب والے گھر کے پاس۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ قایم رکھیں نماز۔ لہٰذا بعض لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اور ان کو روزی دے ہر قسم کی ثمرات سے تاکہ وہ تیرے شکر گذار رہوں۔ (۱۳ رکوع ۱۸)

یہی دعا ہے، جسکے اثر نے سارے عالم کو مکہ کی طرف مائل کر لیا ہے اور وہ چار ہزار سال کے عرصہ سے دنیا کے ہر گوشہ سے ہر قسم کے ثمرات اولاد ابراہیمؑ کو وہاں پہنچا رہے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انکو چھوڑ کر واپس آنے لگے، تو حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا کہ مجھکو یہاں کیوں چھوڑ چلے ہو اور کس کے حکم سے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں تمکو یہاں خدا تعالیٰ کے حکم سے چھوڑ چلا ہوں۔ یہ سن کر حضرت ہاجرہ نے کہا کہ بس جاؤ، اب مجھ کو کسی کی ضرورت نہیں۔ مشکیزہ پانی کا تو بہت جلد ختم ہو گیا۔ بچہ رونے لگا۔ حضرت ہاجرہ بہت بے چین ہو گئیں۔ اس عالم پریشانی میں مروہ پر گئیں۔ اور پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ پر سات مرتبہ انہوں نے چکر لگائے مگر نہ ملا۔ آخر واپس بچے کو دیکھنے آئیں کہ ایسا نہ ہو بچہ بیہوش ہو جائے۔ پھر چلاّ کر کہنے لگیں کہ کوئی میری آواز کو سنتا ہے؟ بچہ کے قریب آ کر دیکھا تو اسکو اسقدر بے تاب پایا کہ دیکھ نہ سکیں اور دور ہٹ گئیں۔ پھر قریب آئیں تو ایک چشمہ دیکھا جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کی جگہ سے پھوٹ نکلا تھا۔ اور اسکے اردگرد کناروں پر پتھر لگا دیں تاکہ پانی بہ نہ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ پتھر نہ رکھتیں، تو ضرور تھا کہ یہ چشمہ ایک ندی کی صورت میں تبدیل ہو جاتا۔ پانی خود پیا اور بچے کو پلایا۔ بعض اصحاب اہل تجربہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس چشمہ کا پانی پی کر سترہ (۱۷) دن تک آدمی گذارہ کر سکتا ہے۔ بعض جانوروں کا بھی پانی سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ پانی کے سبب سے وہاں پرندے بھی آن موجود ہوئے اور ایک قافلہ کا گذر اسطرف سے ہوا۔ انہوں نے پرندوں کو دیکھ کر پہچان لیا کہ یہاں کہیں ضرور پانی ہے۔ کچھ آدمیوں کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ ان آدمیوں نے آ کر دیکھا کہ ایک عورت چشمے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ہے اور ایک شیر خوار

بچہ اسکی گود میں ہے۔ قافلہ والوں کو اطلاع دی۔ قافلہ اس طرف آیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو، تو ہم یہاں ٹھکانہ بنالیں، بستی کی طرح ڈالیں۔ حضرت ہاجرہ نے جواب دیا کہ ہاں ہم کو منظور ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہاں نمبرداری ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ قافلہ والوں نے اسکا وعدہ کرلیا اور مکانات بنائے۔ ایک مکان حضرت ہاجرہ کو بھی بنادیا۔ خدا فرماتا ہے کہ خواہ کسی پر کتنی ہی مصیبت آ جائے، پروہ صفا ومروہ پر جاکر دیکھ لے کہ ہم بھی ہیں یا نہیں۔ اسلئے فرمایا کہ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللہِ۔ (ترجمہ۔ صفا اور مروہ خدا تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں)۔ اس میں یہ راز ہے کہ ہاجرہ کو امر تھا کہ وہ صفا و مروہ کے اندر رہے، ان سے باہر نہ جائے۔ اس نے باوجود مصیبت وتکلیف شدید حکم الٰہی پر ثابت قدم و صابر رہنے کا نمونہ دکھایا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے انکے اندر سب لوگوں کو انکے نقش قدم پر چلنے کے لئے ایما فرمایا۔ صفا ومروہ کے درمیان بیادگار امّ اسمٰعیل ہاجرہ علیہا السلام چلنا ٹھہرا۔ اس قسم کی یادگاریں اولاد ابراہیم علیہ السلام میں مروج تھیں۔ (دیکھو پیدائش ۳۵ باب ۱۵)۔ بلکہ یشوع نے بارہ پتھر دریا سے صرف یادگار کے لئے اٹھائے اور دریا کے باہر لاکر رکھے۔ (نور۔ فضل)

حج کے لئے خصوصیت مکہ کی وجہ

۱۔ حج کے لئے ایسے مقام میں جمع ہونا لازم ہوا، جہاں خدا تعالیٰ کے نشانات بیّنات موجود ہوں۔ وہ مکہ میں بیت اللہ ہے، جو سب جگہوں سے زیادہ حج کے قابل ہے۔ اس میں برملا نشانات الٰہی موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، جن کی نیکی اور خوبی کی شہادت اکثر امتوں کی زبان سے ظاہر ہے، خدا کے حکم اور وحی الٰہی سے اس کی بنیاد قائم کی۔

۲۔ حج کے لئے مکہ معظّمہ سے زیادہ بہتر کوئی مکان نہ تھا۔ کیونکہ اول تو وہ مقام مبداء اسلام تھا۔ دوم اس میں ایسے لوگوں کی یادگاریں تھیں، جن کی محنت اور کوشش سے سخت سے سخت بت پرستی کا دنیا سے استیصال ہوا۔ اور خالص توحید الٰہی قائم ہوئی۔

۳۔ اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ مکہ معظّمہ سے وعظ توحید شروع ہوا۔ اس معظّم مکان نے مسئلہ توحید کی تائید کی اور شرک کا استیصال کیا۔ قومی نفاق اور طوائف الملوکی اور خانہ جنگیاں عرب کی دور کیں۔ دختر کشی، شراب اور خطرناک قمار کا اس ملک میں نام ونشان نہ چھوڑا۔ اتباع میں نفاق وکسل و کاہلی کے بدلہ آزادی صبر وہمت واخوت وہمدردی وشجاعت اور استقلال اور عزم کو پیدا کیا۔

۴۔ مکہ کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُمّ القرٰی فرمایا۔ اُمّ عربی زبان میں ماں کو اور قریٰ دہات کو کہتے ہیں۔ اس میں یہ ظاہر کیا کہ مکہ تمام روئے زمین کے دہات کی ماں ہے۔ اسی سے ان کو

روحانی دودھ ملے گا اور پرورش پائیں گے۔ اس شہر کا نام اُمّ القریٰ رکھ کر ایما فرمایا کہ سارے عالم کی تربیت وتہذیب یہاں سے ہوگی۔

کعبہ کا ثبوت توریت سے

پیدائش باب ۱۲۔ ۶۔ ۹ میں لکھا ہے۔ ابراہیم نے خداوند کے لئے کنعان میں ایک قربان گاہ بنائی۔ اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل کے پورب کو ایک پہاڑ کے نیچے اپنا ڈیرا کھڑا کیا۔ بیت ایل اس کے پچھّم اور عی اس کے پورب کو تھا۔ اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔ اور ابراہام رفتہ رفتہ دکن کی طرف گیا۔ یہاں، جس بیت ایل کا تذکرہ ہے، وہ ضرور مکہ ہی ہے۔ کیونکہ کنعان عرب کی حدود میں ہے۔ اور لکھا ہے قربان گاہ بنا کے جب روانہ ہوا، پھر ایک جگہ ڈیرا لگایا اور وہاں دوسری قربان گاہ بنائی۔ اور اس کے پچھّم ایک اور بیت ایل کا بیان کیا، جو بیت ایل سمندری ہے۔ یم سمندر کو کہتے ہیں اور وہاں لفظ بیت ایل یم ہے اور آخر میں لکھا ہے ابراہام رفتہ رفتہ دکن پہونچا۔ اور مسیحؑ کہتے ہیں کہ دکھن کی ملکہ شہر سبا کی شہزادی تھی، جو سلیمان کے پاس آئی۔ اور صاف ظاہر ہے کہ بیت اللہ، جسے مکہ کہتے ہیں، کنعان سے دکن کی طرف واقع ہے۔ علاوہ بریں پیدائش ۱۳ باب ۳ میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت لکھا ہے کہ وہ دکھن کی طرف چلا اور سفر کرتا دکھن سے بیت ایل پہونچا۔ اور قومی روایات، ملکی تواتر رسومات کا توافق، ابراہیمی عبادات سے ختنے کی رسم۔ قربانی وغیرہ مناسک میں اتحاد، تمام اقوام عرب کا اس بات پر نسلاً بعد نسلٍ اتفاق گواہی دیتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس مسجد سے تعلق ہے، جسے بیت اللہ کہتے ہیں۔

پھر کوئی امر قانون میں اور کوئی ضروری اور بدیہی علم نہیں، جو اس اعتقاد سے پھیرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ بیت ایل کے معنے زبان عربی میں بیت اللہ اور فارسی میں خانہ خدا ہے۔ یسعیاہ ۶۰۔ باب ۶۔ اونٹنیاں کثرت سے تجھے آن کے چھپالینگی۔ مدین اور عیفہ کی جوان اونٹنیاں وے سب جو سبا کی ہیں آویں گی۔ ۷۔ قیدار پسر اسمٰعیل کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ بنیط پسر اسمٰعیل کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑہائے جائیں گے۔ اور میں اپنے شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔ یہ کون ہیں جو بدلی کی طرح اڑتے آتے ہیں۔ اور کبوتری کی مانند اپنی کابک کی طرف۔ یقیناً بحری ممالک تیرا راہ تکیں گے۔ اور ترسیس کے جہاز پہلے آوینگے۔ اجنبیوں کے بیٹے بھی تیری دیوار اٹھائینگے۔ اوران کا باشاہ تیری خدمتگذاری کرینگے۔ اگر چہ میں نے اپنے قہر سے تجھے مارا پھر اپنی مہربانیوں سے تجھ پر رحم کروں گا۔ اور تیری پھانکیں نت کھلی رہیں گی۔ وے دن رات کبھی

بند نہ ہوں گی۔ ہاں سب ،جنہوں نے تیری تحقیر کی ، تیرے پاؤں پڑیں گے۔اور وہ خدا کا شہر اسرائیل کے قدوس کا صیہوں (سنگلاخ زمین) تیرا نام رکھیں گے اس امر کے بدلے کہ تو ترک کی گئی اور تجھ سے نفرت ہوئی۔

یسعیاہ باب ۵۴۔ا۔آ رے بانجھ تو جو نہیں جنتی تھی (مکے اور قوم قریش میں کوئی نبی اور رسول نہ ہوا تھا۔اس لئے اسے بانجھ کہا) خوشی سے للکار۔تو جو حاملہ نہ ہوتی تھی وجد کر کے گا اور خوشی سے چلاّ۔ کیونکہ خداوند فرماتا ہے۔بیکس چھوڑی ہوئی کی اولاد خصم والی کی اولاد سے زیادہ ہیں۔(اہل اسلام یہود سے زیادہ ہیں اور عیسائی اور مجوس یروشلم سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔وہ ظاہری یروشلم کی اولاد ہی نہیں) اپنے خیمے کو بڑھا دے۔ہاں مسکن کے پردے پھیلا۔دریغ مت کر۔اپنی ڈوریں لمبی اور اپنی میخیں مضبوط کر۔ اس لئے کہ تو داہنے اور بائیں طرف بڑھے گی۔اور تیری نسل قوموں کی وارث ہوگی۔اور اجاڑ شہروں کو بساوے گی۔مت ڈر کہ تو پشیمان نہ ہوگی۔تو مت گھبرا کہ تو پھر رسوانہ ہوگی۔تو اپنی جوانی کے ننگ بھول جائے گی۔اور اپنی بیوگی کی عار پھر یاد نہ کرے گی۔کیونکہ تیرا خالق تیرا شوہر ہے۔اس کا نام ربّ الافواج ہے۔اور تیرا نجات دینے والا اسرائیل کا قدوس ہے۔وہ ساری زمین کا خدا کہلائے گا۔کیونکہ تیرا خدا کہتا ہے۔خداوند نے تجھے جو طلاق ہوئی اور دل آزردہ سی عورت ہے اور جوانی میں ایک ایک کی جورو کے مانند جورو کی گئی ہو۔پھر بولایا ہے۔لیکن اب میں بہت سی مہربانیوں کے ساتھ تجھے سمیٹ لونگا۔شدت قہر کے حال میں میں نے اپنا منہ تجھ سے ایک لحظہ چھپایا۔پر اب میں ابدی عنایت سے تجھ پر رحم کرونگا۔ خداوند تیرا بچانے والا یوں فرماتا ہے۔میرے آگے یہ نوح (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پانی کا معاملہ ہے۔جس طرح میں نے قسم کھائی تھی کہ پھر زمین پر نوح کا سا طوفان کبھی نہ آئیگا۔اس طرح میں نے قسم کھائی کہ میں تجھ سے پھر کبھی آزردہ نہ ہونگا۔

اب ہم عربی تورات کتاب یسعیاہ باب ۶۰ سے عبارت ذیل در باب پیشگوئی مکہ وکعبہ لکھ کر اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔ **قُوْمِیل اِسْتَنِیْرِیْ لِاَنَّہ' قَدْ جَآءَ نُوْرُکِ وَ مَجْدُ الرَّبِ اَشْرَقَ عَلَیْکِ لِاَنَہَّ 'ھَا ھِیَ الظُّلْمَۃُ تُغَطِّی الْاَرْضَ وَالظَلامُ الدَّامِسُ الْاُمَمِ. اَمَّا عَلَیْکِ فَیَشْرَقُ الرَّبُّ وَ مَجْدہ' عَلَیْکِ یُرَیٰ. فَتُسِیْرُ الْاُمَمُ فِیْ نُوْرِکِ وَالْمُلُوْکُ فِیْ ضِیَاءِ اَشْرَا قِکِ**۔ترجمہ۔ اٹھ روشن ہو تیری روشنی آئی اور خداوند کے جلال نے تجھ پر طلوع کیا۔دیکھ تاریکی زمین پر چھا گئی اور تیری قوموں پر بھی تاریکی نے اثر کیا۔لیکن خداوند تجھ پر طالع ہوگا۔اور اس کا جلال تجھ پر نمودار ہوگا۔اور قومیں اور بادشاہ تیری روشنی اور تیرے طلوع کی تجلی میں چلیں گے۔

ہم یقینی طور پر کہتے ہیں کہ یہ سب مکّے کی تعریف ہے۔ اگر نہیں تو بتاؤ مَدین اور عیفہ اور سبا کی اونٹنیاں کہاں جمع ہوئی ہیں۔ قیدار کی بھیڑیں اور بنیط کے مینڈھے کس مذبح پر چڑھائے جاتے ہیں۔ عربی میں یہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کی تعریف کرنی مطلوب ہوتی ہے اسے ملکہ اور عورت کر کے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر انکار ہے تو دیکھو حزقیل باب ١٦۔ (نور۔ فضل)

مکّہ سے رخصت ہونیکے وقت دوبارہ خانہ کعبہ میں جانے کا راز

١۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ لَا یَنْفِرَنَّ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ آخِرُ عَھْدِہٖ بِالْبَیْتِ۔ (ترجمہ)۔ یعنی تم میں سے کوئی شخص آخر وقت بیت اللہ میں جائے بغیر وہاں سے نہ نکلے)۔ یہ اس لئے ہے کہ آخر وقت پر بیت اللہ کے جانے میں بیت اللہ کی تعظیم ہے۔ اس لئے کہ بدایت بھی اسی سے ہوئی ہے اور تمامی بھی اسی پر ہوئی۔ تا کہ معلوم ہو جائے کہ مقصود بالذات سفر سے بیت اللہ ہے۔

٢۔ دستور ہے کہ لوگ رخصت ہوتے وقت اپنے سلاطین سے مل کر جاتے ہیں۔

مکّہ میں امن کا راز

مکّہ میں داخل ہونے کے وقت یہ دھیان کرو کہ اب حرم مامون میں پہنچ گیا ہوں۔ اور خدا تعالیٰ سے یہ امید رکھو کہ وہ اس میں داخل ہونے کی وجہ سے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ اور اس بات کا خوف رکھنا چاہیئے کہ مبادا قرب کا اہل اگر میں نہ ہوا، تو حرم میں آنے سے گنہگار اور مستحق عذاب ٹھہروں گا۔ مگر سب وقتوں میں امید غالب ہونی چاہئے۔ کیونکہ اس کا کرم ہے۔ اور خانہ کعبہ کی شرافت نہایت بڑی ہے۔ آنے والے کے حق میں رعایت کیا کرتے ہیں اور پناہ مانگنے والے اور دہائی دینے والے کو حرمت میں تلف نہیں کرتے۔

حج میں سر منڈانے کی وجہ

حَلق سر کی وجہ یہ ہے کہ بہت دنوں سر کھلا رہا، گرد وغبار پڑا۔ عام لوگوں کو سامان سر دھونے کا اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے کہ سر منڈوا دیں یا بالوں کو کٹوائیں۔ حَلق کا حکم جیسا کہ ہماری کتب قرآن و احادیث وفقہ میں مذکور ہے، ایسا ہی اس کا رواج اور اس کا ثبوت مقدسہ کتب میں موجود ہے۔ دیکھو ایوب۔ ١۔ باب ٢٠۔ نذیر یعنی نذر دینے والا جماعت کے خیمے کے دروازے پر سر کی مَنّت منڈا دے۔ گنتی ٦ باب ١٨۔

کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ

ا۔قرآن کریم خوداس بھید سے آ گاہ فرماتا ہے۔ **وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ**۔ترجمہ۔اورنہیں کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا مگراس لئے کہ ظاہر ہوجائے کہ کون رسول کے تابع ہے۔اس سے جو پھر جاتا ہے اپنی ایڑیوں پر۔

۲۔ یہ بہت صاف امر ہے اور حقیقت شناس و عاقل کے نزدیک کچھ بھی محل اعتراض نہیں۔اس ہادی کو، جسے تمام دنیا میں متداولہ عبادت کے طریقوں سے ،جن میں شریک اور مخلوق پرستی کا جزو اعظم شامل تھے،اپنے طریق عبادت کو خالص کرنا منظور تھا۔ اور ایک واضح وممتاز مسلک قائم کرنا ضرور اس لئے واجب ہوا کہ وہ اپنی امت کے رخ ظاہر کو بھی اسی سمت کی طرف پھیرے،جس میں قوائے روحانی کی تحریک اور اشتعال قدرت ومناسبت ہو۔

۳۔اس میں اتفاق واتحاد قومی کا فائدہ ہے۔اس لئے سب کو حکم ہوا کہ ایک دل ہوکر معبود حقیقی کی عبادت کریں۔ ہر ایک مسلمان کو یقین ہے کہ مکے میں بیت اللہ کو توحید کے بڑے واعظ نے تعمیر کیا۔ اور آخری زمانے میں اسی کی اولاد میں سے ایک زبردست کامل نبی مکمل شریعت لیکر ظاہر ہوا،جس نے اسی پہلی تلقین وتعلیم کو پھر زندہ وکامل کیا۔پس نماز میں جب ادھر کو رخ کرتے ہیں،تو یہ تمام تصور آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔اوراس مصلح عالم کی تمام خدمات اور جانفشانیاں ، جو اس نے اعلاء کلمۃ اللہ میں دکھلائیں،یاد آ جاتی ہیں۔

۴۔خانہ کعبہ کو اسلام والے بیت اللہ کہتے ہیں۔اور بالکل ظاہر ہے کہ کوئی شخص کسی کے مکان کو جاتا ہے،تو اس کا مطلب مکان والا ہوا کرتا ہے۔کسی تخت نشین بادشاہ اور بزرگ کے آداب و نیاز اس کے تخت کے آداب نہیں ہوا کرتے۔

گر مصلی کند بوقت صلوٰۃ روئے در کعبہ از جمیع جہات
باشد از حق دراں جہت مامور ورنہ حق نیست اندراں محصور

۵۔اس میں یہ حکمت بھی مرکوز ہے کہ کامل مذہب، یہ توحید کا آفتاب،اسی پاک سرزمین سے نمودار ہوا۔ وہ خداوندی حکمت بحال رکھی گئی۔ ورنہ اہل اسلام کا عقیدہ تو یہ ہے کہ خداتعالیٰ کی ذات مکان اور جہت کی قید سے منزّہ ہے۔اور عنصری وکونی صفات سے اعلیٰ اور مبرّا ہے۔کوئی جہت نہیں،جس میں وہ مقید ہو۔کوئی خاص مکان نہیں،جس میں مخصوصاً وہ رہتا ہے۔اسی مطلب کی طرف قرآن شریف اشارہ کرتا ہے اور معترض کے اعتراض کو اپنے علم بسیط سے پہلے ہی رد کردیا ہے۔ **وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ**

الْـمَـغْـرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْ فَثَمَّ وَجْهِ اللهِ ۔ترجمہ۔خداہی کا مشرق اور مغرب ہے۔سو جس طرف بھی تم منہ کرو، وہ اللہ کی طرف ہے۔

٦۔ایک اور لطیف بات قابل غور ہے کہ آغاز نماز میں جبکہ مسلمان قبلہ رو کھڑا ہوتا ہے تو یہ آیت پڑھتا ہے۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِی لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ترجمہ۔میں نے اپنا رخ کیا اس خداوند تعالیٰ کی طرف جس نے آسمان اور زمین کو بنایا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

٧۔اس میں یہ راز بھی ہے کہ جماعت کے انتظام میں خلل نہ ہو اور تمام دنیا کے اہل اسلام یک جہت رہیں۔

قربانی کے جانوروں کو اشعار کرنے اور ان کے گلے میں جوتیاں اور ریشم لٹکانے کا راز

مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ صَلّٰی رَسُوْلُ اللهِ صَلّٰی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلظُّهْرَ بِذِی الْحُلَیْفَةِ ثُمَّ دَعَا بِنَا قَتِهٖ فَاَشْعَرَهَا فِیْ صَفْحَتِهٖ سَنَامِهَا الْاَیْمَنَ وَسَلَتْ عَنْهَا الدَّمَ وَ قَلَّدَهَا نَعْلَیْنَ ثُمَّ رَکَبَ بِرَاحِلَتِهٖ ۔ترجمہ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز ذی حلیفہ میں پڑھی اور پھر اپنی اونٹنی منگوا کر اس کے کوہان کی دائیں طرف کے پہلو میں زخم کا نشان کیا اور اس سے خون جاری ہو گیا، جس سے دراصل قربانی کے جانور کو سرخ رنگ سے ممتاز کرنا تھا۔ پھر اس کے گلے میں دونوں پاپوش بھی لٹکا دیئے گئے۔ یہ اس لئے تھا کہ اس طریق سے لوگوں کو علم ہو جائے کہ یہ جانور خدا تعالیٰ کے نام پر قربانی کے لئے چنا جا چکا ہے۔تا کہ وہ اس سے تعرض نہ کریں اور اس کو مقام مقصود تک باحفاظت پہنچنے دیں۔(اس بارے میں دوسری جگہ پر تفصیل درج کی جائے گی)۔

واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ شیاطین ہیں۔اور اس امر کو اونٹوں کے مقامات بود و باش میں منع نماز کی علّت ٹھہرایا۔شیطنت رحمت الٰہی سے دوری کی صفت ہے اور خدا سے دوری کی صفت نہیں ہے۔ کیونکہ سب اشیاء خدا تعالیٰ کے قبضہء قدرت میں واقع اور اسکے سامنے ہیں۔اشعار نشان اور اعلان کرنے کو کہتے ہیں اور محسنین پر کوئی سبیل نہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی کو دعوت کی جاتی ہے، جو خدا کے نزدیک اس صفت میں نہ ہو، جس صفت کی طرف اسکو دعوت کی جاتی ہے۔اور شفاعت اسی کے بارے میں واقع ہوتی ہے، جو کسی ایسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو، جو اس شخص اور اسکی سعادت و مراد کے درمیان حائل ہو اور شیاطین الانس و

جنات سے بعید تر کوئی چیز نہیں ہے اور ہدیہ اس سے دور ہوتا ہے، جسکی طرف ہدیہ لایا جاتا ہے، کیونکہ وہ ہدیہ دینے والے کے مِلک میں ہوتا ہے۔ سو وہ بدیں صفت بُعد سے موصوف ہوتا ہے۔ اور اہل دعا سے جو کوئی خدا تعالیٰ کے آگے کچھ چیز بطور قربت پیش کرتا ہے، اسکے لئے یہی بہتر ہوتا ہے کہ جو کوئی دروازۂ خدا سے بعید ہو اس کو خدا کی طرف پھیرے تا کہ اس کو رحمتِ خدا حاصل ہو۔ کیونکہ رسول خدا کی طرف سے مشرکوں کو توحید الٰہی سکھانے کیلئے دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں۔ مخلوق خدا میں سے مشرک خدا تعالیٰ سے بہت ہی دور ہوتے ہیں۔ اور رسول اسکو خدا کی طرف پھیرتے اور محل قرب الٰہی و رحمت ایزدی کی طرف چلاتے ہیں۔ اسلئے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ ہدیہ میں پیش کیا۔ باوجودیکہ اونٹ کے بارے میں فرمایا کہ اونٹ شیاطین ہوتے ہیں۔ اس سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد تھا کہ اہل علم جان لیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد دُوروں کو مقام قرب کی طرف لانا ہے۔

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدیہ کے اونٹ کے کوہان کی دائیں طرف زخم کا نشان کیا۔ اس میں یہ راز ہے کہ اونٹ کا کوہان اس کے جسم کا بلند ترین حصہ ہوتا ہے اور یہ وہ صفتِ کِبر ہے، جو انسانوں کے دلوں میں متمکن ہوتی ہے۔ اس میں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے لئے یہ ایما ہے کہ جس انسان میں یہ صفت ہو، اس سے کنارہ کش اور مجتنب رہیں۔ کیونکہ دارِ آخرت کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے ٹھہرایا ہے، جو دنیا میں علّو اور کِبر کے طالب اور خواہاں نہیں ہوتے۔ اونٹ کے کوہان سے مراد بلندی ہے اور اشعار کوہان کے دائیں طرف واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ دائیں طرف قدرت اور قوت کا محل ہے۔ اور صفحت میں یہ ایما ہے کہ جس شخص میں یہ صفت ہو گی، جب وہ اپنی صفت کِبر سے کنارہ کش ہو، جو اس کے لئے موجب بُعد ہوا اور وہ قرب الٰہی کا طالب ہو، تو خدا تعالیٰ اس کے گناہ سے درگذر فرمادے گا۔

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوران قربانی کی شیطنت اور اس کے رفع کِبر کی دلالت گلے میں جوتیوں کے ڈالنے میں ظاہر فرمائی۔ اس لئے کہ جوتیوں کو گلے میں ڈالنے سے وہی ذلیل ہوتے، جو ذلیل اور خستہ حال ہوں۔ جو کوئی اس حالت میں ہو اس میں صفت کِبر نہیں رہتی۔

اور جوتیوں کو پشم کے ساتھ بُدنوں (شتران قربانی) کے گلے میں ڈالنے سے یہ ایماء ہے کہ اس حالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کا ارادہ یاد آ جائے۔ جیسا اس نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ **وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ**۔ یعنی ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ پہاڑ دھنی ہوئی پشم کی طرح اڑتے پھریں گے۔ جب انسان کی یہ صفت ہو جائے، تو اس کو قربت الی اللہ کی قربانی کا درجہ ملتا ہے۔ اور شیطانی صفت

دوری کے ساتھ موصوف ہونے کے پیچھے قربت الی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔پس جب کہ شیاطین کو بھی رحمت الٰہی پہنچ سکتی ہے،تو اہل اسلام کے ساتھ تمہارا کیا گمان ہے۔کیا وہ رحمت الٰہی سے محروم رہ جائیں گے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موٴحدّین کی طرف بھی مبعوث ہوئے کہ وہ اپنی توحید کے ذریعہ قربت الٰہی کے اس مرتبہ کو مشاہدہ کریں،جس کے ادراک کے لئے عقل استقلال نہیں رکھتی۔بلکہ قربت الٰہی کے مرتبہ کو عقل بذات خود بجز زبانِ شرع دریافت کرنے سے عاجز ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مشرکین وموحّدین کی طرف دووجہ سے متحقق ہے۔مشرک شیطان متکبر ہوتا ہے۔اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چشمہ قرب الٰہی کی دعوت کی، چنانچہ ہم اس امر کا ذکر کر چکے ہیں۔اس کا قرب قبول ہوکر اس بُعد ، دوری اور اوصاف ذمیمہ،جن کا ذکر ہم نے اشعاراور جوتیوں کو گلے میں باندہنے میں لکھا ہے،زائل ہوجاتے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موٴحدِین کو اپنے مقام دعوت پر آگاہی بخشی اور دعوت توحید کے لئے بھی دعوت فرمائی۔اوراہل توحید کو قبل ازیں اس بات کا کوئی علم نہ تھا۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں ایک بکری کا ہدیہ پیش کیا۔یہ وہ پاک جانور ہے،جس کے مقام نشست وبرخاست میں نماز جائز ہے۔سو یہ موحّدین کو قریب کرنے کی مثال ہے۔

قربانی حج کے اونٹ کو خون آلودہ کر کے کعبہ میں روانہ کرنیکی حکمت

سوال ۔اشعار ھدیٰ یعنی قربانی کے اونٹ کے کوہان کو خون آلودہ کر کے کعبہ میں روانہ کرنا خلاف اصول قیاس وعقل ہے۔کیونکہ ایسا کرنا گویا مثلہ کرنے سے مشابہ ہے۔اور مثلہ کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

جواب ۔ اشعار عربی لفظ ہے۔اس کے معنے صراح میں یہ لکھے ہیں۔اشعار بمعنے خون آلودہ کردن کوہان شترِ قربانی۔یعنی قربانی کے اونٹ کے کوہان کو خون آلودہ کرنا۔اور ہدیٰ کا معنی ہے قربانی کا جانور۔مثلہ سے مراد ناک وکان کاٹنا ہے۔

واضح ہو کہ مُثلہ کرنا وہ جوروزیادتی وظلم کا فعل ہے،جو نہ عذاب اور نہ شعائر اللہ کی تعظیم میں سے شمار ہوتا ہے۔مگر قربانی والے اونٹ کے کوہان کی ایک طرف کو خون آلودہ کرنا اس لئے ٹھہرایا گیا کہ اشعار اسلام اور خدا تعالیٰ کے محبوب ترین طریق کا اظہار ہوتا ہے۔اور عقل وکتاب الٰہی وسنت نبویؐ نے اس فعل کو حرام نہیں ٹھہرایا، بلکہ پسند فرمایا ہے۔اور اشعار کا قیاس مثلہ پر ہرگز نہیں ہوسکتا، کیونکہ اشعار کو خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے اور مثلہ کو ناپسند۔

ا۔دراصل اشعار ہدیٰ میں عاشقانہ رنگ کے نیاز کا اظہار ہوتا ہے،جو صاحب ہدیٰ اپنے معشوق

حقیقی کے آگے ظاہر کرتا ہے کہ میرا مال و جان سب کچھ تیری راہ میں قربان ہے۔
۲۔اشعار ہدیٰ سے شعائر اللہ کی عظمت و عزت کا اظہار ہوتا ہے۔
۳۔اسمیں یہ امر بھی مدنظر ہے کہ عام لوگوں کے معلوم ہو جائے کہ یہ قربانیاں محض تقرب الی اللہ کیلئے خدا کے گھر کو روانہ کی گئی ہیں۔اور انمیں بزبان حال قرب الٰہی کی درخواست و مال و جان کی قربانی کا اظہار براہ محبوبِ حقیقی ہے۔ایسا ہی کعبہ کے اندر نماز میں اسی قرب الٰہی کی درخواست ہوتی ہے۔
۴۔یہ فعل مشرکوں اور خدا کے دشمنوں کے برخلاف کیا جاتا ہے، جو کہ اپنے ارباب کی رضا کے لئے قربانیاں اور چڑھاوے چڑھاتے اور ذبح کرتے ہیں اور اس سے انکی قربت چاہتے ہیں۔سو یہ امر ان کے برعکس کیا گیا تا کہ ان کو معلوم ہو کہ بندگان خدا کی قربانیاں اور ان کی نمازیں یعنی مالی و بدنی عبادات محض خدائے واحد لاشریک ہی کیلئے ہوا کرتی ہیں۔اس میں کسی انسان کو شراکت نہیں ہو سکتی۔
۵۔اس فعل میں باطنی اعتقاد و توحید الٰہی کے خیال کو عملی صورت میں ظاہر کرنے کا ایماء ہوا۔ تا کہ دین الٰہی کی سب ادیان پر بڑائی و بلندی و بزرگی ثابت ہو۔(فضل)

مقام نحر سے پہلے ہدیہ کا گوشت ہادی کیلئے کھانا ناجائز ہونیکی وجہ

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسک حج سے کوئی امر فوت ہوا، تو آپ نے ناجیہ بن کعب اسلمی کے ہمراہ ایک ہدیہ کا جانور کعبہ کو روانہ کر کے امر فرمایا کہ اپنا پاپوش ہدہ کے جانور کے خون کے ساتھ آلودہ کر کے اس کے گلے میں ڈال دو۔اس سے تمہارے اور لوگوں کے درمیان تخلیہ ہو جائیگا۔اور اس جانور سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔کیونکہ وہ سمجھ جائینگے کہ یہ جانور خدا تعالیٰ کے نام ہے۔اور آپ نے ناجیہ بن کعب اسلمی کو فرمایا کہ تم اور تمہارے رفقاء میں سے اس ہدیہ کے جانور کا گوشت کوئی نہ کھائے۔
اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر اس جانور کا گوشت مقام نحر سے پہلے کھانا جائز کیا جاتا، تو یہ امر بسا اوقات اس جانور کے چارہ و حفاظت میں کوتاہی کا باعث ہوتا اور وہ مقام مقصود پر پہنچنے سے پہلے مر جاتا۔اور اس کے ہلاک ہونے سے ان کی غرض مقام نحر پر پہنچنے کی طرح حاصل ہو جاتی۔پس جب لوگوں کو مقام نحر سے پہلے جانور کے ہلاک ہونے سے اپنی حصول غرض میں ناامیدی ہوئی او مقام نحر پر پہنچنے سے حصول غرض کی امید ہوئی، تو یہ امر اس جانور کے لئے مقام مقصود تک با حفاظت پہنچانے کا باعث ہوا۔

حج میں قربانی کے جانور کے گلے میں قلادہ ڈالنے کا راز

مسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک بکری کا ہدیہ کعبہ میں پیش کیا اور اس کے گلے میں پٹہ باندھا۔ یہ صفت غلامی اور اطاعت الٰہی کے لئے انسان کو ایماء کرتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے اس جانور کو قربانی کا لقب ملتا ہے۔ اس فعل میں انسان کو اس طرف دعوت کی گئی ہے کہ انسان ہر وقت حکم الٰہی کے آگے سر نہاد اور معشوق حقیقی الٰہی کی اطاعت میں ایسا منقاد ہو کہ گویا وہ ہر وقت اپنے گلے میں اس کی غلامی اور فرمانبرداری کا پٹہ رکھتا ہے۔ قربانی کے جانور کے گلے میں قلادہ ڈالنے میں گویا کہ نفس انسانی کے گلے میں اطاعت الٰہی کا نورانی پٹہ اور ایفائے عہد الٰہی کا ایماء ہے۔

نورِ او در عین و یسر و تحت و فوق بر سر و بر گردنم مانند طوق

خدا کا نور میرے دائیں اور بائیں اور نیچے اور اوپر اور میرے سر اور میری گردن پر طوق کی مانند پڑا ہے

ایسا فعل کرنے میں اطاعت الٰہی کے اظہار کی طرف اشارہ ہے، جس میں قولی زبان کے ساتھ زبان حالی کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے۔ اور پھر محض زبان کچھ کام نہیں دیتی جب تک اس کے ساتھ کچھ مالی و جانی ہدیہ بھی پیش نہ ہو۔

قول و فعل آمد گواہانِ ضمیر زیں دو بر باطن تو استدلال گیر

انسان کا قول اور فعل اسکے دل کے گواہ ہوتے ہیں۔ قول و فعل سے انسان کے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

قربانی کے اونٹ کو کھڑا کر کے اسکے بائیں پاؤں کو باندھ کر ذبح کرنے کی حکمت

عبدالرحمٰن ثابتؓ راوی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام قربانی کے اونٹ کو کھڑا کر کے اس کے بائیں پاؤں کو باندھ کر ذبح کرتے اور باقی تین پاؤں پر اس کو کھڑا رکھتے تھے۔ اس میں یہ راز ہے کہ چونکہ اونٹ کا ذبح کرنا قربت ہے، اس لئے اس کے ذبح کرنے کی صفت میں وتریت کی مناسبت کا ارادہ کیا۔ لہٰذا بُدنہ کو تین پاؤں پر کھڑا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وہ وتر کو دوست رکھتا ہے۔ اور تین افراد کا پہلا عدد ہے۔ کیونکہ افراد میں تین سب سے پہلا مرتبہ ہے۔ اور اولیت بھی وتریت ہے۔ اور بُدنہ کو ذبح کرنے کے وقت قائم رکھنے میں بھی یہ ایماء ہے کہ قائم ہونا وتریت کی طرح صفت الٰہی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر نفس پر اس کے کسب کے موافق قائم ہے۔ اس میں ذابح کو بُدنہ کی یہ حالت دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قیومیت یاد آ جاتی ہے۔ اور ذبح کرنا ذابح کا کسب اور **قَائِم عَلیٰ کُلِّ نَفْسٍ** کا مشاہدہ ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ جملہ عبادات ذکر الٰہی کے قائم

کرنے کے لئے مشروع ہوئی ہیں اور قربانی حج کی عبادات میں سے ہے۔ اور قربانی کے جانور کا اس حالت میں ذبح کرنا خداتعالیٰ کی یاددلاتا ہے۔

بُدنہ کے دو پچھلے پاؤں کو جفت رکھنے میں یہ بھید ہے کہ اس میں امر دنیا وآخرت کو جمع کر کے دکھایا گیا ہے۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۔ترجمہ۔ یعنی پنڈلی دوسری پنڈلی سے مل جائے گی۔ اور بُدنہ کے دائیں پاؤں کو اکیلا چھوڑا گیا، جس میں یہ ایماء ہے کہ انسان وتر یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اعتماد و بھروسہ رکھے۔ دائیں طرف قدرت و طاقت کا ایماء کرتی ہے۔ بُدنہ خلق کے حق میں اپنے ہر دو پچھلے پاؤں کے جفت اور اپنے دائیں پاؤں کی وتریت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اس صفت میں بھی اللہ تعالیٰ کی وتریت یاد دلائی گئی ہے۔ کیونکہ تمام اشیاء عالم کا قیام بجز وتر کے درست نہیں ہوسکتا۔ اور وتر جفت اور طاق کا جامع ہے۔ یہ وہ پہلی حالت ہے، جس میں یہ جمع ظاہر ہوتا ہے اور وہ تین ہی ہیں۔ اور بُدنہ کا قیام تین پاؤں کے سوا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اور عقل بائیں ہاتھ میں ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس قوت سے خالی ہے، جو دائیں میں ہے۔ اور قیام اعتماد و بھروسہ کے لئے قوی تر ہوتا ہے۔ چنانچہ نماز کے بارے میں فرمایا۔ اَقِیْمُوا الصَّلوٰۃَ ۔یعنی نماز قائم کرو۔ اور قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃ میں بھی یہی ایماء ہے۔ اس میں بندہ کو نماز کے لئے قائم ہونے سے پیشتر ماضی کے ساتھ خبر دی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر صلوٰۃ اسی کے قیام سے مراد ہے۔ اس میں بھی بندہ کو صلوٰۃ کی طرف قائم ہونے کے لئے ایماء ہوا، تا کہ وہ اپنے قیام سے صلوٰۃ کی نشاۃ کو قائم کرے۔ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ ۔یعنی اللہ تعالیٰ تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ اور قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃ میں صلوٰۃ ہی کا ایماء ہوا ہے۔ پس تمام عبادات میں قیام معتبر ہے۔ اسی لئے یوم عرفہ میں قیام مقرر ہے۔ اور منیٰ میں جمع نماز اور رمی جمار اور تمام اعمال حج قیام سے ہی درست ہوتے ہیں۔ اور ان سب قیام کی حالتوں سے اسی ذات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کی تشریح قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ میں کی گئی ہے۔

احرام کے ہر دو کپڑوں کو تبدیل کرنے کا راز

ابوداؤد نے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام اپنے ہر دو کپڑے تنعیم میں تبدیل کئے۔ اس میں حالت سختی کا نرمی کے ساتھ تبدیل ہونے کے لئے حالی دعا اور حال کو قال کے ساتھ ملانے کا ایماء ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہر دو احرام کے کپڑوں کا اس مکان میں تبدیل کرنا، جس کا نام تنعیم ہے، اس میں آنحضرت نے صحابہ کرام اور اپنی امت کو اس امر کا ایماء فرمایا کہ جب تم کو حج میں

احرام کی تکلیف پہنچے اور مناسک حج کے بجالانے سے دردناک حالت پیدا ہو، تو اللہ کی ان بیشمار نعمتوں کو یاد کرو، جو اعمال حج کے بدلے میں تم کو ملیں گی۔ اور جنہیں دیکھ کر تمہیں نعمت اور لذت حاصل ہوگی اور تم کو سرور آ جائے گا۔ کیونکہ یہ تمام تکلیفات ان عظیم الشان نعماء کے حاصل کرنے کے لئے مقرر ہوئی ہیں، جو ان صعوبتوں کے بعد حاصل ہوں گی۔ پس تم پر اپنے راستہ کی تمام کلفتیں اور شدائد آسان ہو جائینگے اور تم شکر گذار ہو گے اور قیامت میں تم کو صدیقین صابرین کا بدلہ ملے گا۔

حج میں کلام نہ کرنے والے کا حج جائز نہ ہونے کی وجہ

ابن اعرابی نے زینب بنت جابر سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جابر کو ایک عورت کے بارے میں حکم فرمایا، جو زینب کے ساتھ چپ چاپ حج کر رہی تھی کہ **قُولِیُ لَهَا تَتَكَلَّمُ فَاِنَّه، لَا حَجَّ لِمَنُ لَمُ يَتَكَلَّمُ** ۔یعنی اس عورت کو کہو کہ کلام یعنی (ذکر الٰہی) کرے، کیونکہ جو کلام نہ کرے، اس کا حج نہیں ہوتا۔ یہ حدیث زینب تک متصل ہے اور اس کو ابن حزم نے کتاب محلی میں ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ راز ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **اِنَّا نَحُنُ نَزَّلُنَا الذِّكُرَ** یعنی ہم نے قرآن اتارا۔ اور قرآن کلام الٰہی ہے اور کلام صفت الٰہی ہے۔ اور تم عبادت مشروع میں مشغول ہو۔ پس اس میں ذکر الٰہی لازم بلکہ واجب ہے۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ **اِنَّ الُمَنَاسِکَ فِی الُحَجِّ اِنَّمَا وُضِعَتُ لِاِقَامَةِ ذِكُرِ اللهِ** ۔یعنی حج میں عبادات ذکر الٰہی قائم کرنے لئے وضع ہوئی ہیں۔

تشریح ۔ہم (یعنی انسان) کلام الٰہی سے صادر ہوئے ہیں، جس سے مراد خدا تعالیٰ کا کلام **کُنُ** ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے ابتداء میں عالم اور اشیاء عالم کو پیدا کرنے کے لئے اپنا کلام کُنُ فرمایا، جس کے معنے ہیں ہو جا۔ پس ہم ہو گئے۔

خاموشی حالتِ عدمی ہے اور کلام حالتِ وجودی ہے۔ کلام کا اثر ہوتا ہے۔ اور کلام کا نام اس لئے کلام ہوا کہ یہ کلم سے مشتق ہے اور کلم کے معنے زخم کرنے کے ہیں۔ اور زخم بدن میں مؤثر ہوتا ہے۔ اور انسان موجود ہے۔ لہٰذا لازم نہیں ہے کہ وہ صفت وجودی کے سوا کسی اور صفت سے موصوف ہو۔ اور صفت وجودی کلام ہے۔ اور صفت عدمی سے متصف نہ ہو۔ اور وہ خاموشی ہے۔ کیونکہ حقیقت انسانی نطق کی مقتضی ہے۔ اور جب وہ خاموش ہو جائے، تو حالت زبان سے اپنے آپ پر جھوٹ بولتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے خاموشی کے کئی مقام اور مواقع مقرر فرمائے ہیں اور وہ خاموشی اضافی ہے۔ اور اس سے مراد بیہودہ و لایعنی کلام کا ترک کرنا ہے۔

کعبہ ومسجد کو بیت اللہ کہنے کی وجہ

ایک آریہ کے اعتراض ذیل کے جواب میں مصنف کتاب نور الدین کے فاضل نے لکھا۔

آریہ کا اعتراض ہے کہ مسجد کو خدا کا گھر کہنے سے خدا کو محدود کہنا پڑتا ہے۔

جواب۔ سنسکرت میں پانی کو نارا کہتے ہیں، جو پہلے پرماتما کا گھر تھا۔اس لئے پرماتما کو نارائن کہتے ہیں اور ایک آریہ ترجمہ رگوید میں بحوالہ رگوید لکھتا ہے ۔جس ملک میں علم اور دھرم کی ترقی اور اشاعت ہوتی ہے، وہ میرا مقام مالوف ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ مکہ معظّمہ سے وعظ توحید شروع ہوا۔اس معظم مکان نے مسئلہ توحید کی تائید اور شرک کا استیصال کیا۔قومی نفاق اور طوائف الملو کی اور خانہ جنگیاں عرب کی دور کیں۔دختر کشی، شراب اور خطرناک قمار کا اس ملک میں نام ونشان نہ چھوڑا۔نفاق و کسل وکاہلی کے بدلہ آزادی،صبر و ہمت واخوت وہمدردی وشجاعت واستقلال وعزم کو پیدا کردیا۔اب بتاؤ یہ مکان خدا تعالیٰ کا مقام مالوف اور گھر نہ ہوتو اور کونسا ہو۔خاص نسبت اور تعلق کے لئے اضافت ہوا کرتی ہے۔اس سے کوئی عقل مند منکر نہیں ہے کہ اسلامی مساجد (سجدہ گاہیں) صرف عبادت الٰہی کی جگہ ہیں۔اور محض اللہ ہی کی رضا مندی کے لئے بنائی جاتی ہیں۔اس واسطے ان کو بیوت اللہ اور ہر ایک کو بیت اللہ کہتے ہیں۔یعنی ان گھروں میں صرف اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے اور بس۔مثلاً خانہ کعبہ میں اندر جا کر دورکعت نماز ودعا کی جاتی ہے اور اس کے اندر کسی مخلوق کا بُت نہیں رکھا گیا۔اس لئے اس کو بیت اللہ کہتے ہیں۔

کعبہ پر نظر کرنے کی حکمت

انسان کو چاہیئے کہ کعبہ پر نظر کرنے کے وقت اس کی عظمت دل میں حاضر کرے اور فرض کرے کہ گویا ربّ البیت کو دیکھ رہا ہے۔اور امید کرے کہ خدا تعالیٰ نے جس طرح بیت عظیم کا دیکھنا مجھے نصیب کیا ہے، اسی طرح اپنی ذات پاک کی طرف دیکھنا بھی نصیب کرے گا۔اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اس نے ایسے مرتبہ پر پہنچایا اور اپنے پاس آنے والوں کے زمرہ میں داخل فرمایا ہے۔اور اسی وقت یہ دھیان کرے کہ قیامت میں سب لوگ جنت میں داخل ہونے کی امید سے اسی طرح جھکیں گے۔پھر ان کے دوفریق ہو جائیں گے کہ بعض کو تو اجازت اندر جانے کی ہوگی اور بعض لوٹا دیئے جائینگے، جیسے حاجیوں کے دوفریق ہیں کہ بعض کا حج مقبول ہے اور بعض کا نامنظور۔جو احوال حج میں پیش آئیں، ان کو دیکھ کر امور آخرت سے غفلت نہ کرنی چاہیئے ۔اس لئے حاجیوں کے سب حالات پر آخرت کے حالات

دلالت کرتے ہیں۔(غزالی)

میقات پر احرام باندھنے و لبیک کہنے کا بھید

مواقیت کے اندر اصل یہ ہے کہ مکہ کو ایسی حالت میں آنا چاہئے کہ سر پر خاک بھری ہو اور بدن سے بدبو آنے لگی ہو اور نفس ذلت میں ہو۔ شارع علیہ السلام کو یہی مطلوب ہے۔ اگر تمام لوگوں کو اس بات کا حکم دیا جاتا کہ اپنے اپنے شہروں سے احرام باندھ کر آیا کریں، تو ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر دِقت تھی۔ کیونکہ بعض شہر مکہ سے ایک مہینے کی مسافت پر واقع ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ دور ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ احرام باندھنے کے لئے مکہ کے گرد چند مقامات سے احرام باندھا کریں اور ان مقامات کے بعد تاخیر نہ کر سکیں۔ اور ضرور ہے کہ یہ مقامات ظاہر اور مشہور ہوں اور کوئی شخص ان مقامات سے ناواقف نہ ہو۔

میقات پر احرام باندھنے اور لبیک کہنے سے یہ جانے کہ لبیک کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی پکار پر جواب عرض کرر ہا ہوں کہ میں حاضر ہوں۔ اس وقت یہ امید کرے کہ یہ جواب مقبول ہو اور خوف ہو کہ کہیں یہ نہ کہہ دیا جائے وَ لَا لَبَّیکَ وَ لَا سَعُدَیُکَ۔ اس لئے ضرور ہوا کہ خوف و رجا کے درمیان متردد رہے اور اپنی تاب و طاقت سے علیحدہ ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر تکیہ رکھے۔ اس لئے کہ لبیک کہنے کا وقت ہی حج کا شروع ہے اور وہ خطرہ کی جگہ۔

لبیک کہنے والا جب میقات میں لبیک پکارے، تو اس غرض سے کہے کہ خدا تعالیٰ کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ جو اس نے فرمایا ہے۔ وَ اَذِنُ فِی النَّاسِ بِالُحَجِّ۔ ترجمہ۔ یعنی پکار لوگوں کو حج کے واسطے۔

اور دھیان کرے کہ آخرت میں قرنا کے پھونکنے سے لوگ اسی طرح پکارے جائیں گے۔ اور قبروں سے اٹھ کر میدان قیامت میں حاضر ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی پکار کا جواب دیں گے۔ اور ان کی بہت سی قسمیں ہوں گی۔ کوئی مقرب ہوں گے۔ کسی پر غصہ ہوگا۔ بعضے مقبول ہوں گے اور بعضے مردود۔

پردہ کعبہ کو پکڑنے کا راز

پردہ کعبہ کو پکڑنے اور ملتزم سے چمٹنے کے وقت انسان یہ نیّت کرے کہ بیت اور ربّ البیت کی محبت اور شوق میں قرب کا طالب ہوں۔ اور کعبہ سے بدن کو چھونے کو برکت جانے اور یہ توقع کرے کہ جو عضو بدن کعبہ سے مل جائے گا، وہ آگ سے محفوظ رہے گا۔ اور پردہ پکڑنے میں یہ نیت ہو کہ طلب

مغفرت اور درخواست امان میں الحاح کرتا ہوں، جیسے کوئی خطار وار، جس کا کوئی قصور کرتا ہے، اس کے دامن کو لپٹتا ہے اور عفو قصور کے لئے اس کے سامنے انکسار کرتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا ملجا وَ ماویٰ بجز تیرے اور کہیں نہیں۔ اور سوا تیرے کرم اور عفو کے اور کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اور اب میں تیرا دامن نہ چھوڑوں گا، جب تک خطا معاف نہ کر دے۔ اور آیندہ کو امن نہ دے۔

توجہ ءقبلہ پر اعتراض آریہ کا جواب وتحویل قبلہ کی وجہ

آریہ معترض ہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وحی اور الہامات پر یقین نہ تھا، اس واسطے تحویل قبلہ وکعبہ کیا۔

جـــــواب ۔۱۔ معترض لوگ نہیں جانتے کہ تحویل قبلہ اور یہ انقلاب اللہ تعالیٰ نے اس واسطے کرائے کہ تا یہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمان کعبہ پرست نہیں ہیں۔ ہر دو متبرک مقامات میں جن کی بزرگی اور عزت کی وجہ سے کبھی کسی زمانے میں کسی کو ان کی پرستش کا خیال ہوسکتا تھا، ان کو پیٹھ کے پیچھے کرا کے اس امر کا اظہار عام طور پر کرا دیا کہ مسلمان واقعی اور حقیقی طور سے خدا پرست ہیں نہ کہ کعبہ پرست۔ بایں ہمہ یہ لوگ مسلمانوں پر حجر اسود کی پرستش کا الزام دیئے جاتے ہیں۔

صاف بات ہے کہ عبادت کے لئے انسان کو کسی نہ کسی طرف تو منہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ پس ایک شخص تو خود اپنی خواہش سے کسی طرف کو پسند کرتا ہے اور دوسرا حکم الٰہی سے ایک خاص طرف منہ کرتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی ان میں سے کون اچھا ہے۔ ایک تو حکم پرست ہے اور دوسرا نفس پرست۔ بایں ہمہ یہ لوگ مسلمانوں کو کعبہ پرست کہتے ہوئے شرماتے کیوں نہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تحویل کعبہ کرنا اسی حقیقت پر مبنی تھا۔ کہ مسلمان خاص موحّد اور توحید کے پابند ہو جائیں، کعبہ پرستی کا وہم تک بھی ان کے دل سے نکل جائے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی تلوّن اور یقین کی وجہ سے تحویل قبلہ ہوا، جیسا کہ معترضوں کا وہم ہے۔ کیونکہ آپ تو صاف کہتے ہیں۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ترجمہ۔ کہہ دے کہ یہ میرا راستہ ہے، جس پر میں علی وجہ البصیرۃ خدا کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیرو بھی۔

۲۔ دوسری وجہ آیت ذیل سے ظاہر ہے۔ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ترجمہ۔ نہیں ٹھہرایا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا مگر اس لئے کہ ہم تمیز کر لیں کہ کون رسول خدا کی پیروی کرے گا اور کون اپنی ایڑیوں پر پھر جائیگا۔

۳۔ یاد رہے کہ نماز علاوہ ان تمام خوبیوں کے، جو اس پر مداومت کا لازمی نتیجہ ہیں، بڑا بھاری

قومی امتیاز اور نشان ہے ۔ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ میں ایک منافق مسلمانوں کو دھوکا دینے یا ان کے رازوں پر مطلع ہونے کے لئے شامل ہوسکتا ہے اوراسکی قوم کواس پر اطلاع بھی نہ ہو۔ کیونکہ ان امور کی بجا آوری میں اپنی قوم کے نزدیک وہ کسی بیماری، لزوم فاقہ، سفروتفرج یا خیرات کا حیلہ تراش ہوسکتا ہے اور مسلمان بھی اسے بے تردد مسلمان وفادار کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہی امور میں مسلمان ہونا محصور ہو۔ مگر سخت مشکل اور پردہ برانداز امر نماز ہے، جسے کوئی شخص بھی، جو اپنے مذہب کا کچھ بھی پاس اور ہیبت دل میں رکھتا ہو، کبھی بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ خصوصاً ایک علیحدہ قومی نشان اور بالکل الگ ہیہات میں الگ مذہبی سمت کی طرف متوجہ ہو کر، بایںہمہ اپنی قوم میں بھی شامل رہے، ناممکن ہے۔ اب غور فرمایئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کواس خصوص میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔

تاریخ اور قومی روایت متفقاً شہادت دیتی ہیں کہ بیت اللہ زمانہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے برابر اباً عَنْ جدٍّ قوموں کا مرکز اور جائے تعظیم چلا آیا ہے۔ کفار مکہ، گو بت پرستی کے لباس میں تھے، اس بیت ایل کو مقدس عبادت گاہ یقین کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق کا وعظ شروع فرمایا اور خدا کا کلام دن بدن پھیلنے لگا اور دشمنان دین مخالفت میں ہر طرح زور لگا کر تھک گئے ۔ آخر یہ حیلہ سوچا کہ نفاقاً اسلام میں داخل ہو گئے اور اس طرح وہ لوگ سخت سخت اذیتیں اور مخفی در پردہ مصائب مسلمانوں کو پہنچانے لگے۔ بناءً علیٰ ھذا بانی مذہب کو ضرور ہوا کہ اس معجون مرکب کے اجزاء کی تحلیل کے لئے کوئی بھاری کیمیاوی تجویز نکالے۔ آپ نے ابتداً مکے میں بیت المقدس کی جانب نماز میں رخ پھیرا۔ اس ربّانی الہامی تدبیر سے قریش مکہ، جو نہایت بت پرست تھے اور اہل کتاب اوران کے مذہب کو بہت برا جانتے تھے، مسلمانوں کی جماعت سے بالکل الگ ہو گئے۔ اب کوئی منافق ظاہری طور پر بھی شامل ہونے کو گوارا نہ کرسکا۔ اور خاص مکے میں بجز خالص مخلص اصحاب اور یاران جان نثار کے اور کوئی پیرو نہ بنا۔ اس تدبیر سے ایک اور فائدہ عظیم یہ ہوا کہ بانی کو اپنے مشن کی ترقی اور خالص پیروؤں کا اندازہ ہو گیا۔ اور آئندہ کے واسطے معتمد وفاداروں اور غدّار منافقوں میں امتیاز کلی ہو گیا۔ پھر جب مدینے میں آپ تشریف لے گئے ، جہاں بکثرت یہود رہتے تھے اور جو اول اول باغراض مختلفہ آپ کی تشریف آوری سے خوش ہوئے اور آپ کے تابعین میں خوب مل جل گئے ۔ پھر آخر اپنی امیدوں کے برخلاف دیکھ کر خفیہ خفیہ اسرار وافساد میں ریشہ دوانی کرنے لگے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربانی الہامی ہدایت سے، جو ایسے تاریک وقتوں میں اپنے پاک نبیوں کو کشائش کے راہ دکھاتی ہے، اصلی قدیمی ابراہیم واسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے بیت اللہ کی طرف نماز ادا کرتے ہوئے

رخ موڑا۔ اس سے خالص انصار اور غدار یہودیوں میں امتیاز کی راہ نکل آئی۔ قرآن کریم بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے اس آیت کو معہ ترجمہ اس مضمون میں درج کر دیا گیا ہے۔

اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ ایسی جدید قوم کو، جس کے استیصال کے درپے مختلف قومیں ہو رہی تھی، ایسے نئے مذہب کو، جسے اولاً مخلصین ومنافقین میں تمیز کرنا اور دشمنوں کے جابرانہ حملوں کا اندفاع اختیار کرنا تھا، نہایت ضروری تھا۔ اور عقلاً ونقلاً اس سے بہتر نہیں ہوسکتا تھا کہ ایسی ہی تدبیر سے کام لیا جاتا۔ سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔
(احمد۔نور۔فضل)

زمانہ سابق میں عدم تفصیل اسرار شریعت کی وجہ اور کعبہ میں خزانہ مدفون ہونے کی حکمت

سوال۔ جو اسرار شریعت تم بیان کرتے ہو اگر واقعی اور سچے ہیں، تو خود خدا نے یا رسالت مآب نے یا آپ کے صحابہ کرام نے کیوں بیان نہ کئے؟

جــــــواب۔ قانون قدرت پر نظر کرو۔ فوٹو گراف۔ لیتھو گراف۔ ٹیلیگراف۔ چھاپہ۔ ریل۔ گراموفون۔ ٹیلیفون۔ اسٹیم کے اسرار عناصر میں اس وقت سے موجود ہیں، جب سے عناصر کو خالق عناصر نے پیدا کیا۔ مگر نہ خدا نے اس وقت ان اسرار کو بیان فرمایا، نہ اس کے مقربین بارگاہ نے، جو اس وقت تھے، ان کی تشریح کی۔ تو پھر کیا اس وقت کے بیان نہ کرنے سے لازم آتا ہے کہ یہ اسرار موجود ہی نہ تھے۔ اور یہ منافع جو آج ظاہر ہوئے ان عناصر میں اِسی زمانہ میں موجود ہو گئے ہیں۔ قانون اسلام بعینہٖ قانون الٰہی سمجھو۔ قانون قدرت اور طبقات میں صرف وہی اسرار اور منافع نہیں، جو حکمائے یونان اور یورپ اور دانایان ہند نے بیان کئے، بلکہ اور بے اَنت اسرار بھی ہیں۔ اسی طرح طبعی قانون کے اسرار بے انتہا ہیں اور صرف اس قدر نہیں، جو اب تک حکماء نے بیان کئے ہیں۔ تو احکام اسلام کے اسرار بھی ایسے ہی سمجھو۔

معلوم نہیں زمانے کی ترقی پر کیا کیا اسرار قانون قدرت اور قانون شریعت کے ظاہر ہوں گے۔ ہر چیز کا ظہور و بروز اپنے وقت پر ہونا مقدر ہے۔ میرے خیال میں اس تقریب پر ابن عربیؒ کا مکاشفہ ذیل قابل ذکر ہے، کیونکہ وہ بیان سے مناسبت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کعبہ میں ایک خزانہ ودیعت رکھا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے نکالنے کا ارادہ فرمایا تھا کہ اس کو نکال کر لوگوں میں بانٹ دیں۔ پھر آپ نے کسی مصلحت کے لئے اس کو وہیں چھوڑا اور نہ نکالا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس کے

نکالنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر انہوں نے بھی اقتدائے نبویؐ کا خیال کر کے اس کا نکالنا ترک کر دیا اور وہ خزانہ اب تک کعبہ میں موجود ہے۔ ۵۹۸ھ کو میں شہر تونس میں مقیم تھا، تو عالم مکاشفہ میں کعبہ سے میرے پاس سونے کی ایک تختی لائی گئی، جس میں ایک شگاف تھا۔ اور اس کی موٹائی ایک انگل بھر اور اس کا عرض ایک بالشت یا کچھ زیادہ تھا۔ اس میں ایک قسم کا خط لکھا ہوا تھا۔ میں نے بپاس ادب نبویؐ خدا تعالیٰ سے التجا کی کہ اس تختی کو پھر واپس رکھا جائے۔ اور اگر میں اس کو نکال کر لوگوں میں ظاہر کرتا، تو بڑا اندھا دھند فتنہ برپا ہوتا۔ اس مصلحت کے لئے بھی میں نے اس کو وہیں رہنے دیا۔ کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو یونہی عبث نہیں چھوڑا دیا۔ بلکہ اس لئے چھوڑا کہ اس کو القائم بامر اللہ امام مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام آخر زمانہ میں آ کر نکالیں گے۔ اب میں اس خزانہ کا بہ تفصیل ذکر نہیں کرتا اور نہ میں اس بات کا ذکر کرتا ہوں، جو میں نے دیکھا ہے۔

پھر آگے چل کر حضرت شیخؒ لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ عارف کے دل میں علوم الٰہیہ کا خزانہ اسی طرح رکھتا ہے۔ اور اسکے استدلال میں آیت ذیل پیش کر کے اس کی تشریح لکھی ہے۔ **شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَ اُولُوالْعِلْمِ فَجَعَلَهَا كَنْزاً فِيْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ بِاللّٰهِ تَعَالٰى** ۔ ترجمہ۔ خدا تعالیٰ شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور اس کے فرشتے اور صاحبان علم بھی اس امر پر شاہد و قائم برانصاف ہیں۔ دیکھو خدا نے اس علمی شہادت کو علمائے ربانی کے دلوں میں خزانہ قرار دیا۔

دراصل کعبہ میں یہ مدفون خزانہ علمی خزانہ ہے، جس کا اخراج القائم بامر اللہ امام مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس کا اخراج مہدی ہی کے زمانہ سے مناسبت تامہ رکھتا ہے۔ شیخ اکبرؒ کو اپنی کتاب "**فُصُوْصُ الْحِكَمْ**" لکھنے سے پہلے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک نگینہ کی صورت میں دکھا کر فرمایا **خُذْ هٰذَا فَصَّكَ** یعنی اپنا نگینہ لے لو۔ اور اس سے مراد علوم کا ذخیرہ تھا۔

اور صاحب "**تعطیر الانام**" نے صفحہ ۱۸۸ میں اشیائے زمینی معادن کو عالم رویا میں دیکھنا علم مکنون ہی لکھا ہے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سونے کی تختی جو شیخ اکبرؒ کو دکھائی گئی اس سے مراد علوم الٰہیہ ہیں، جن کا ظہور حسب مصلحت زمانہ بتدریج اپنے وقت پر مقدر ہے۔

اور ان علوم کا کعبہ میں مدفون ہونا ان کی حقیقت و سچائی پر دلالت ہے۔ اور سونے کی تختی کی شکل میں ظاہر ہونا یہ ہے کہ جو شخص ان کی اشاعت کرے گا، اس کو کچھ تکالیف و صعوبتیں لاحق ہوں گی۔ اور اس تختی کا درمیان سے شق ہونا یہ ہے کہ امت نبویؐ، جو استقبال قبلہ کرتے ہیں، ان علوم کی اشاعت سے دو گروہ ہو جائیں گے۔ کچھ تو ان علوم کی تصدیق کریں گے اور کچھ انکار کریں گے۔ اور اس تختی کو ایک ہی

ہونا یہ ہے کہ بالآخر وہ دونوں گروہ ایک ہی ہو جائیں گے۔ اور ان علوم کی سب تصدیق کرلیں گے۔ اور اس امت بنویؐ کو نزول کے بعد پھر ایسا عروج حاصل ہوگا کہ کسی زمانہ میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ عروج خود بخود قدرتی اسباب سے بتدریج دوسری قوموں کے اسلام کی طرف رجوع لانے سے حاصل ہوتا جائیگا۔ اور یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی خلیفہ یا امام وقت بجر و اکراہ کفّار کو بزور شمشیر مسلمان کرے گا۔ کیونکہ اس طرح سے گروہ منافقین کی کثرت ہوتی جاتی ہے، جو باعث ضعف اسلام ہے۔ بلکہ اسلام کی صداقت و سچائی کی تلوار خود بخود دلوں کو فتح کرے گی۔

ہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلامی جہاد جس کے متعلق خداتعالیٰ کا فرمان واجب الاذعان قرآن کریم میں وارد ہے۔(۱)**وَ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.** (۲) **وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَاتَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ** ۔ترجمہ۔یعنی (۱) اپنے مالوں اور جانوں کو راہ خدا میں لڑا دو، جہاد میں لگا دو۔ یہ کام تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ تم جانتے ہی ہو کہ جو لوگ جان و مال کے ساتھ کسی کام کے لئے کوشش و محنت کرتے ہیں، ان کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ (۲) تم ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تمہارے ساتھ جنگ کرنے میں ابتدا کریں۔ اور جو تم سے نہیں لڑتے، تم ان سے مت لڑو۔ ورنہ خدا کی حد سے نکلنے والے ٹھہرو گے۔ اور جو لوگ خدا کی حد سے بڑھ جاتے ہیں ان کو خدا دوست نہیں رکھتا۔

اس بات میں کچھ شک نہیں ہے کہ بموجب اس فرمان الٰہی کے جہاد دائمی ہے، اس کو کوئی بند نہیں کرسکتا۔ مگر اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں سیف و سنان یعنی تلوار و نیزہ کا جہاد تھا۔ اور اب وہ لسانی و قلمی و مالی جہاد ہے۔ اس وقت بھی جہاد تھا اور اب بھی جہاد ہے۔ لیکن صورت بدل گئی ہے۔ دوستو اس زمانہ میں مخالفوں نے بھی مذہبی لڑائیاں چھوڑ دی ہیں۔ ہاں اس مقابلہ نے ایک اور صورت اور رنگ اختیار کرلیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ قلم سے کام لے کر اسلام پر اعتراض کر رہے ہیں۔ پس ہمیں بھی ان کے مقابلہ میں قلم سے کام لینا چاہئے۔

احرام باندھنے والے پر جنگل میں شکار حرام ہونے کی وجہ

واضح ہو کہ خداتعالیٰ نے نفوس متنفرہ کو شکار کرنے کے لئے پھندے لگا رکھے ہیں۔ دانہء محبت اور اطعمہ کے ذریعہ ان کو پھندوں میں قید کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض شکار پھندے میں اپنی جنس کو دیکھ کر اُن کے ساتھ ملنے کی طمع سے آن پھنستے ہیں اور شکاری کے قبضہ میں آ جاتے ہیں۔ اور بعض شکار پھندے پر دانہ ڈالنے سے پھنستے ہیں۔ بعض شکاریوں کے پاس سیٹی ہوتی ہے، جس کی آواز

پرندوں کی طرح ہوتی ہے۔ جب پرندے اس آواز کو سنتے ہیں، تو آن پھنستے ہیں۔ وہی مثال یہاں ہے، جس نے خدا تعالیٰ کی آواز سنی، اس نے اس کو قبول کرلیا۔

ہاں حاجی احسان کا شکار نہیں ہوتا۔ اور پرندہ احسان کا شکار ہوتا ہے، جو دانہ کے احسان کو دیکھ کر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس نے دانہ کے احسان کو دیکھا اور احسان اس کو کھینچ لایا اور اپنے آپ کو اس احسان پر پھینک دیا۔ اور اس کو شکاری نے پھانس لیا۔ اگر احسان نہ ہوتا، تو نہ آتا۔ پس اس کا آنا غرض و علت پر مبنی ہے اور جنگل محسن واحسان ہے۔ اور خدا تعالیٰ سخت غیور ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا یہ خاص طائفہ حاجیان احسان کے بندے بنیں۔ اور خدا تعالیٰ کے خاص بندے نہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی ژولیدہ مو، پریشان حال، غبار آلود، اور اَن سیئے کپڑے پہنے ہوئے خداوند تعالیٰ کی آواز **اَذِّنْ فِــــــیْ النَّـاسِ بِالْحَجِّ** سن کر حاضر ہو گئے ہیں اور اس کے جواب میں خالصاً للہ ہو کر تلبیہ و تہلیل کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ غیرت خدا تعالیٰ کی خاص صفات میں سے ہے۔ لہٰذا وہ اس گروہ مقربین کے لئے احرام میں زیادہ احسان نہیں چاہتا کہ مبادا احسان کے بندے بنیں اور حقیقت کے بندے نہ بنیں۔ کیونکہ اس میں جناب الٰہی کی ہتک و سبکی ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ غرضی غرض کا بندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی غرض کے لئے کسی کی مصاحبت کرے، تو اس کی مصاحبت انقضائے غرض کے بعد نہیں رہتی۔ اور خدا کے ساتھ بندہ کی مصاحبت در حقیقت ذاتی ہونی چاہئے۔ کیونکہ بندہ اس کے قبضہء مِلک سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اور اگرچہ وہ اپنے زُعم سے بھاگ جائے، مگر اس کے مِلک سے نکل نہیں سکتا۔ بھاگنے والا درحقیقت خدا تعالیٰ کی ملکیت سے جاہل و ناواقف ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جہاں جائیگا، وہاں پر خدا کی بادشاہی اور مِلک ہوگی۔ **لِلّٰہِ مُـلْکُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ** آسمانوں وزمینوں کی بادشاہی خدا کی ہے، اس لئے حاجی پر جنگل کا شکار حرام ہوا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ خدا سے محبت کرو۔ وہ تم کو اپنی نعمت سے غذا دیتا ہے۔ یہ بندگان احسان کے لئے خاص خطاب ہے۔

مُحرِم پر دریا کا شکار حرام نہ ہونے کی وجہ

مُحرِم پر دریا کا شکار حرام نہ ہوا، کیونکہ وہ پانی کا شکار ہے۔ اور پانی زندگی کا عنصر ہے، جس سے خدا نے ہر چیز کو زندہ کیا ہے۔ اور اس عبادتِ حج اور دیگر عبادات کے ساتھ زندگیء دل ہی تو مطلوب ہے۔ پس جبکہ اس عبادت کے ساتھ دل اور اعضاء کی زندگی مقصود ہے اور سب عبادات کے ساتھ ان کے ظاہر و باطن میں مطلوب منہ یعنی زندگی پانے کی مناسبت واقع ہے، تو سمندر کا شکار حرام نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ بحر بوجہ وسعت کے آیا ہے، کیونکہ وہ عام ہے۔ اور فی نفسہٖ ایسا ہی امر ہے۔ کیونکہ جو چیز

ہے وہ خدا تعالیٰ کی تسبیح وتمہید کہہ رہی ہے اور تسبیح وتمہید وہی چیز کہتی ہے، جو زندہ ہو۔ پس تمام موجودات میں زندگی دائر وسائر ہے۔ لہٰذا بحر کا حکم وسیع ہوا۔ پس بحر کی مناسبت وسعت کے اعتبار سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکار کو بحر کی طرف نسبت کی اور پانی کی طرف بحر کی وسعت کی رعایت کے لحاظ سے نسبت نہ کی۔ لہٰذا بحر کا شکار محرم ومحلل کے لئے حلال ہے (فتوحات مکیہ)

شیر خوار بچہ کی طرف سے حج کرنا جائز ہونے کی وجہ

سوال۔ جبکہ شریعت کا خطاب ہی عاقل و بالغ کے لئے قرار دیا گیا ہے، تو جو بچہ ابھی عقل وسن بلوغ سے بے بہرہ ہے، اس کا حج کس طرح ادا ہوسکتا ہے؟

جواب۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ہر بچہ مسلمان اور فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ **كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ الْإِسْلَامِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ۔** ترجمہ۔ یعنی ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر سن بلوغ کو پہنچ کر اس کے ماں باپ اسکو یہودی یا نصرانی یا مجوسی کر دیتے ہیں۔ پس جس کا اسلام ثابت ہو جائے، مگر اس میں باقی شرائط وجوب حج کے نہ پائے جائیں، تو اس پر حج فرض و واجب تو نہیں، لیکن اس کی طرف سے جائز ہوسکتا ہے۔ بچہ نے اگر چہ اسلام کا نام تک نہ لیا ہو، اور نہ نیت حج جانتا ہو۔ اور وہ مر جائے، تو خدا تعالیٰ اس کے لئے حج بطور فرضیت قبول فرمالیتا ہے اور آخروی زندگی میں اس کے لئے مفید ہوتا ہے۔ شیر خوار بچہ کے حج کی صحت کے متعلق ایک حدیث نبوی میں ذکر آیا ہے اور محققین نے بھی اس حج کو جائز ثابت کیا ہے۔ اور شریعت نے بھی اس کو معتبر کہا ہے۔ وجوب حج کے شرائط (۱) اسلام (۲) عقل (۳) بلوغ (۴) مالی وسعت (۵) صحت (۶) امن مقرر ہیں۔ مگر ان میں سے صرف اسلام ثابت ہو اور باقی شرائط نہ ہوں، تو واجب نہیں ہوتا، مگر جائز ہوسکتا ہے۔ اور آخروی زندگی میں اس کا حج اس کے لئے نتائج مفیدہ کا باعث و مثمر برکات ہوگا۔ ایک عورت نے ایک چھوٹا بچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آگے پیش کر کے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس کا حج ہوسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں ہوسکتا ہے۔ اور اس کا ثواب تجھے بھی ملے گا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی نسبت اس بچہ کی طرف فرمائی، جس کا بظاہر کوئی قصد نہیں تھا۔ اگر اس شیر خوار کا کسی وجہ سے قصد نہ ہوتا، جس کو شارح علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحب کشف نے پہچان کر فتویٰ فرمایا، تو حج کی نسبت اس کی طرف نہ فرماتے۔ اور بچے کا حج اگر جائز نہ ہوتا، تو نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمود جھوٹا ٹھہرتا۔

ایک عورت اپنے ایک چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور اس کے پاس سے ایک بڑا سورما

خوبصورت و بانکا صاحب حشم و جاہ شخص گذرا۔تو اس عورت نے کہا اے خدا میرے بیٹے کو اس شخص کی طرح بنا۔تو شیر خوار نے اپنی ماں کا پستان چھوڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا اور کہا اے خدا مجھے اس شخص کی مثل نہ بنائیو۔

اس عورت کے پاس سے ایک عورت گذری اور اس کو زدوکوب ہو رہی تھی۔اور لوگ اس کی بابت کہتے تھے کہ اس نے زنا اور چوری کی ہے۔پس اس عورت دودھ پلانے والی نے دعا کی کہ اے خدا میرے بیٹے کو اس عورت کی مثل نہ بنائیو۔تو اس بچے نے اپنی ماں کا پستان چھوڑ کر اس عورت کی طرف نظر کی اور کہا اے خدا مجھے اس عورت کی مثل بنا (جس کو لوگ جھوٹی تہمتیں دے رہے ہیں)۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس شخص کے متعلق فرمایا کہ وہ سرکش اور متکبر آدمی تھا۔اور عورت کے متعلق فرمایا کہ وہ ان باتوں سے بَری تھی، جن کی نسبت اس کی طرف کی جاتی تھی۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ میری ایک بیٹی شیر خوار ایک سال سے کم عمر کی تھی۔میں نے اس کو بلایا۔اے دختر نیک اختر۔پس وہ میری طرف متوجہ ہوگئی۔میں نے اس کو کہا اس مرد کے حق میں تو کیا کہتی ہے، جس نے اپنی عورت سے مباشرت کی اور اس کو انزال نہ ہوا ہو۔اس پر کیا واجب ہوتا ہے۔پس اس لڑکی نے کہا کہ اس پر غسل واجب ہوتا ہے۔مجھے اس کی سنجیدہ بات سے غشی آ گئی۔یہ بات میں نے بہ نفس خود مشاہدہ کی۔وہ لکھتے ہیں کہ شیر خوار بچے اور جنین کا صدقہ و زکوٰۃ مثمر برکات ہے۔

کعبہ کے چار ارکان ہونے کی حکمت

ا۔بنظر غور دیکھو تو معلوم کرو گے کہ اسلام کا ہر ایک کام و حکم اپنی مناسبت پر ہے۔اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو، جو اس کے اسم کو یاد کرنے کا محل و مکان ہے، چار ارکان پر ٹھیرایا ہے۔اور انہی چار طبائع پر اس کی پیدائش ہے۔جیسا کہ کعبہ کے موجودہ چار ارکان اور عرش کے موجودہ چار حاملین ہیں۔ایسا ہی قرآن کریم و احادیث نبویہ میں وارد ہے کہ عرش کے موجودہ حاملین چار ہیں۔اور آخرت میں آٹھ ہوں گے، جب باقی چار کا ظہور ہوگا۔اس لئے آخرت میں دل کے حامل آٹھ ہوں گے۔چار تو وہ ہیں، جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔اور باقی چار (۱) علم (۲) قدرت (۳) ارادہ (۴) کلام ہیں۔پس اگر کہو کہ وہ آج بھی موجود ہیں، ان کو تم نے آخرت کے لئے کیوں ٹھیرایا ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ آٹھ حاملین آج بھی موجود ہیں، لیکن ان کے خاص حمل کا حکم دنیا میں نہیں، بلکہ آخرت میں ہوگا۔ایسا ہی یہ صفات، جنکا ہم نے ذکر کیا، ان کا حکم دنیا میں نافذ نہیں ہوگا، بلکہ ان کا حکم سعیدوں کے لئے آخرت میں ہوگا۔اور ان چار کا حکم

جواس گھر کی طبائع ہیں وہ اجسام میں ظاہر ہیں۔

۲۔ خدا تعالیٰ کی اُمّھات الصفات، جن کا ظہور اس دنیا میں ہو رہا ہے، وہ چار ہیں۔ (۱) رب (۲) رحمٰن (۳) رحیم (۴) مالک یوم الدین۔ خدا تعالیٰ کی باقی ساری صفات انہی میں سے نکلتی ہیں۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کی خاص عبادت کے گھر کے ارکان بھی اسی مناسبت سے چار ہی چاہئیں۔ کیونکہ جو عابد ہوگا، وہ انہی چار صفات کے تحت ہوگا۔

چونکہ اس مضمون عنوان الصدر میں عرش الٰہی کا ذکر بھی آیا ہے، تو ممکن ہے کہ کوئی شخص نافہمی سے عرش کو کعبہ کی طرح جسمانی قرار دے دے۔ چنانچہ اس پر نادان آریہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں لکھا ہے کہ خدا عرش پر بیٹھا ہوا ہے اور چار فرشتوں نے اس کے تخت کو اٹھایا ہوا ہے۔ اس طرح پر ثابت ہوتا ہے کہ خدا محدود ہے اور قایم بالذات نہیں۔ اور جب وہ محدود ہے، تو اس کا علم بھی محدود ہوگا اور وہ حاضر و ناظر نہ ہوگا۔

جواب۔ عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز نہیں ہے، جس پر خدا بیٹھا ہے۔ تمام قرآن شریف کو اول سے آخر تک پڑھو، اس میں ہرگز نہیں پاؤ گے کہ عرش بھی کوئی چیز محدود اور مخلوق ہے۔ خدا نے بار بار قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو کوئی وجود رکھتی ہے اس کا میں ہی پیدا کرنے والا ہوں۔ میں ہی زمین و آسمان اور روحوں اور ان کی تمام قوتوں کا خالق ہوں۔ میں اپنی ذات میں آپ قائم ہوں اور ہر ایک چیز میرے ساتھ قائم ہے۔ ہر ایک ذرہ اور ہر ایک چیز جو موجود ہے، وہ میری ہی پیدائش ہے۔ مگر کہیں نہیں فرمایا کہ عرش بھی کوئی جسمانی چیز ہے، جس کا میں پیدا کرنے والا ہوں۔ اس اعتراض کی بنیاد تو محض اس بات پر ہے کہ عرش کوئی علیحدہ چیز ہے، جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ اور جب یہ امر ثابت نہ ہو سکا، تو کچھ اعتراض نہ رہا۔

قرآن شریف میں یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ خدا کو کوئی فرشتہ اٹھا رہا ہے۔ بلکہ جا بجا لکھا ہے کہ خدا ہر چیز کو اٹھا رہا ہے۔ ہاں بعض جگہ یہ استعارہ مذکور ہے کہ خدا کے عرش کو، جو دراصل کوئی مجسم چیز نہیں، فرشتے اٹھا رہے ہیں۔ دانشمند اس جگہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب کہ عرش کوئی مجسم چیز اور مخلوق نہیں، تو فرشتے کس چیز کو اٹھا رہے ہیں۔ ضرور یہ کوئی استعارہ ہوگا۔ نظم

اَلْعَرْشُ اللهِ بِالرَّحْمٰنِ مَحْمُوْلٌ   وَ حَامِلُوْهُ وَ هٰذَا الْقَوْلُ مَعْقُوْلٌ

وَ اَیُّ حَوْلٍ لِمَخْلُوْقٍ وَ مَقْدِرَةٌ   لَوْ لَاهُ لَمَّا جَاءَ بِهٖ عَقْلٌ وَ تَنْزِیْلٌ

ترجمہ۔ خدا کے عرش اور حاملین عرش کو خدا ہی اٹھانے والا ہے۔ اور یہ بات معقول ہے۔ مخلوق خدا کی کیا طاقت و قدرت ہے کہ وہ خدا کو اٹھائے۔ اگر خدا تمام عالم کا حامل نہ ہوتا، تو نہ یہ عالم ہوتا اور نہ عقل ہوتی اور نہ نزول قرآن ہوتا۔

اہل لغت لکھتے ہیں۔ اِنَّ الْعَرْشَ فِیْ لِسَانِ الْعَرَبِ وَیُطْلَقُ وَ یُرَادُبِہٖ اَلْمُلْکُ یُقَالُ تَلَّ عَرْشُ الْمَلِکِ اِذَا دَخَلَ فِیْ مُلْکِہٖ خَلَلٌ وَ یُطْلَقُ وَ یُرَادُبِہٖ اَلسَّرِیْرُ فَاِذَا کَانَ الْعَرْشُ عِبَارَۃٌ عَنِ الْمُلْکِ فَتَکُوْنَ حَمْلَتُہٗ لَھُمُ الْقَائِمُوْنَ بِہٖ وَ اِذَا کَانَ الْعَرْشِ السَّرِیْرفَتَکُوْنَ حَمْلَتُہ، مَا یَقُوْمُ عَلَیْہِ مِنَ الْقَوَائِمْ اَوْ مَنْ یَّحْمِلُہ، عَلٰی لَوَاھِلِھِمْ ۔ترجمہ۔اہل عرب کی زبان میں عرش کا اطلاق ومراد بادشاہی کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کا ملک خلل پذیر ہوگیا۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب کہ اس کی بادشاہی میں خلل داخل ہوجائے۔اور کبھی لفظ عرش کا اطلاق ومراد تخت ہوتا ہے۔تو مدبرین امور ہیں۔ جب عرش سے مراد تخت ہو،تو اس کے حاملین سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس کے پائے اٹھاتے ہیں، یا وہ ہوتے ہیں، جو اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہیں۔

اب حاملین الٰہی کی اصل حقیقت سنو۔ واضح ہو کہ خدا تعالیٰ کی چار صفات ہیں، جن سے الوہیّت کی پوری شوکت نظر آتی ہے اور کامل طور پر اس ذات ازلی ابدی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان ہی چار صفتوں کو سورہ فاتحہ میں بیان کر کے اپنی ذات کو معبود قرار دینے کے لئے ان لفظوں سے لوگوں کو اقرار کرنے کی ہدایت دی ہے۔ کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَاکَ نَسْتَعِیْنَ ۔یعنی اے وہ خدا، جو ان چار صفتوں سے موصوف ہے، ہم خاص تیری پرستش کرتے ہیں۔ کیونکہ تیری ربوبیّت تمام عالموں پر محیط ہے۔اور تیری رحمانیّت بھی تمام عالموں پر محیط ہے۔اور تیری رحیمیّت بھی تمام عالموں پر محیط ہے۔اور تیری صفت مالکانہ جزاء وسزا بھی تمام عالموں پر محیط ہے۔اور تیرے اس احسان میں بھی کوئی شریک نہیں۔اس لئے ہم تیری عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے۔

خدا تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان چار صفتوں کو اپنی الوہیّت کا مظہر اتم قرار دیا ہے۔اور اس لئے صرف اس قدر ذکر سے یہ نتیجہ مترتب کیا ہے کہ ایسا خدا، جو یہ چار صفتیں اپنے اندر رکھتا ہے، وہی لائق پرستش ہے۔اور درحقیقت یہ صفتیں بہروجہ کامل ہیں۔اور ایک دائرہ کے طور پر اپنی ربوبیّت کے تمام لوازم اور شرایط پر محیط ہیں۔ کیونکہ ان صفتوں میں خدا کی ابتدائی صفات کا بھی ذکر ہے اور درمیانی زمانہ کی رحمانیّت اور رحیمیّت کا بھی ذکر ہے۔اور پھر آخری زمانہ کی صفت مجازات کا بھی ذکر ہے۔اور اصولی طور پر کوئی فعل اللہ تعالیٰ کا ان چار صفتوں سے باہر نہیں۔ پس یہ چار صفتیں اللہ تعالیٰ کی پوری صورت دکھاتی ہیں۔

سو درحقیقت **استوا علی العرش** کے یہی معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہی صفات جب دنیا کو پیدا کر کے ظہور میں آ گئیں، تو خدا تعالیٰ ان معنوں میں اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ

کوئی صفت صفات لازمہ ربوبیّت سے باہر نہیں رہی۔ اور تمام صفات کی پورے طور پر تجلّی ہوگئی۔ جیسا کہ جب بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتا ہے، تو اس کی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف شاہی ضرورتوں کے لئے طرح طرح کے سامان تیار ہونے کا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور تیار ہو جاتے ہیں۔ اور وہی حقیقت الوہیّت عامہ ہیں۔ دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جود وسخاوت سے مالا مال کیا جاتا ہے۔ تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں، ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات کے انجام کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ چوتھی طرف جزا وسزا کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ چار صفتیں تخت نشینی کے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چہار صفتوں کو دنیا پر نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اسکے کیا معنے ہیں کہ اس تخت کو چار فرشتے اٹھاتے ہیں اور قیامت میں آٹھ اٹھائیں گے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ان چار صفتوں پر چار فرشتے موکل ہیں، جو دنیا پر یہ صفات خدا تعالیٰ کی ظاہر کرتے ہیں۔ اور انکے تحت چار ستارے ہیں، جو چار رَبّ النَّوع کہلاتے ہیں، جنکو وید میں دیوتا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ پس وہ ان چار صفتوں کی حقیقت کو دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ گویا اس روحانی تخت کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ چاروں صفات خدا تعالیٰ کے عرش کو اٹھاتی ہیں۔ یعنی خادموں کی طرح ان صفات الٰہی کو اپنے آئینوں میں ظاہر کرتی ہیں۔ اور عرش سے مراد لوازم صفات تخت نشینی ہیں۔

الغرض یہ چار دیوتے یعنی اکاش۔ سورج۔ چاند۔ دھرتی خدا کے عرش کو، جو صفت ربوبیّت اور رحمانیّت اور رحیمیّت اور مالک یوم الدین ہے، اٹھا رہے ہیں۔ اس جگہ فرشتوں سے مراد اکاش۔ سورج۔ وغیرہ ہیں، جو خدا تعالیٰ کی چار صفتوں کو اٹھا رہے ہیں۔ یہ وہی صفتیں ہیں، جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مظہر چار ہیں، جو چار دیوتے کہلاتے ہیں۔ اور وہ ہیں اکاش، جس کا نام اِندر بھی۔ سورج، جس کو عربی میں شمس بھی کہتے ہیں۔ اور چاند، جس کو عربی میں قمر کہتے ہیں۔ دھرتی، جس کو عربی میں ارض کہتے ہیں۔ یہ چاروں دیوتے خدا کی چار صفتوں کو، جو اس کے جبروت اور عظمت کا اتم مظہر ہیں، جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا جاتا ہے، اٹھا رہے ہیں۔ اور قرآنی اصطلاح کی رو سے ان کا نام فرشتے بھی ہے۔ اور ان دیوتاوں پر اور طاقتیں مسلط ہیں، جو ملائک کے نام سے موسوم ہیں، جو ان دیوتاؤں کی طاقتوں کو قائم رکھتے ہیں۔ جن میں سے زبان شرع میں کسی کو جبرائیل اور کسی کو میکائیل اور کسی کو عزرائیل اور کسی کو اسرافیل کہتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی و ارضی پیدا کر کے پھر اپنے وجود کو وراء الوراء مقام میں مخفی کیا، جس کا نام عرش ہے۔ اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں، جو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات میں درج ہیں، تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا۔ یعنی ربوبیّت۔ رحمانیّت۔ رحیمیّت۔ مالک یوم الدین ہونا۔ سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کے کلام میں قرار دیئے گئے ہیں، جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں۔ یعنی اس وراء الوراء مقام میں خدا ہے، جو اس مخفی مقام سے اس کو دکھلا رہا ہے۔ ورنہ خدا کی شناخت کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا۔

ہم پورے طور پر ظاہر کر چکے ہیں کہ یہ چاروں صفتیں ہیں، جو اس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، یعنی اس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اس دنیا میں پتہ لگتا ہے۔ اور یہ معرفت عالم آخرت میں دو چند ہو جائے گی، یعنی یہی چار صفات عالم آخرت میں دو چند ہو کر آٹھ ہو جائیں گی۔ تو گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے اس دن عرش کو اٹھائیں گے۔

الغرض صرف یہی کلمہ عرش اللہ قرآن کریم میں پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا تخت ہمارے تخت کی طرح ہے اور وہ اس پر ہماری طرح بیٹھا ہوا ہے۔ ایسا ہرگز نہ سمجھو۔ لفظ ایک ہوتا ہے، مگر کہیں اس کے معنے صوری آئے ہیں اور کہیں معنوی۔ مثلاً کہتے ہیں زید بیٹھ گیا۔ دیوار بیٹھ گئی۔ اسکی محبت میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اسکا کام بیٹھ گیا۔ اسکا کارخانہ بیٹھ گیا۔ صاحب عرش و فروش۔ صاحب تخت و بخت۔

دراصل یہ مضمون ہماری کتاب "اسرار شریعت" جلد سوم سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا مفصل ذکر آئے گا۔

عرفات میں ٹھہرنے کا سرّ

۱۔ عرفات کے وقوف میں یہ راز ہے کہ ایک زمانہ اور ایک مکان میں مسلمانوں کا اجتماع اور خدا تعالیٰ کی طرف ان کا راغب ہونا اور خشوع و خضوع کے ساتھ اس سے دعا کرنا اور برکات الٰہی کے نازل ہونے اور روحانیّت کے انتشار میں اثر عظیم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان اس روز تمام روزوں سے زیادہ ذلت اور خواری کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور نیز اجتماع میں مسلمانوں کی شوکت و شان معلوم ہوتی ہے۔ اور اس دن اور اس مقام کی خصوصیت تمام انبیاء علیہم السلام سے بدستور چلی آتی ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ اور ان کے مابعد انبیاء سے اس کی نسبت روایات بیان کی جاتی ہیں۔ اور صلحائے سلف سے جو طریقہ منقول چلا آتا ہے توقیت اور یقین کے باب میں اس کا قبول کرنا بڑا اصل الاصول ہے۔

۲۔ عرفات پر ٹھہرنے میں جب لوگوں کا اژدہام اور آوازوں کا بلند ہونا اور زبانوں کا اختلاف

اور مشاعر کی آمد ورفت میں ہر ایک فرقہ کا اپنے اپنے اماموں کے قدم بقدم چلنا نظر پڑے، تو یہ یاد کرے کہ میدان قیامت میں بھی تمام امتیں مع انبیاء کے اس طرح اکٹھی ہوں گی۔ اور امت اپنے نبی کی پیروی کرے گی۔ اور انبیاء کی شفاعت کی طمع کرے گی۔ اور اس میدان میں قبولیت اور عدم قبولیت کے باب میں حیران رہیں گے۔ اور جب آدمی کو عرفہ میں یہ خیال گذرے، تو چاہئے کہ اپنے دل کو انکسار اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا لازم کردے، تاکہ فلاح والوں اور مرحوم فرقہ کے ساتھ حشر ہو۔ اور اس جگہ اپنی امید کو قبول ہی سمجھے۔ کیونکہ یہ میدان شریف ہے اور رحمت الٰہی دربار جلال سے تمام خلائق پر نازل ہوتی ہے۔ یہ میدان ابدال واوتاد کے گروہ سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ اور صالحین کے گروہ بھی اس میدان میں ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ جب ان لوگوں کی ہمتیں جمع ہوکر خدا کے آگے انکسار وزاری کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں اور گردنیں اس کی طرف جھک جاتی ہیں۔ اور ایک ہمت کے ساتھ طلب رحمت کے لئے آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہیں، تو پھر یہ گمان نہ کرو کہ وہ اپنی امید میں محروم رہیں اور ان کی کوشش بیکار جائے۔ بلکہ ان پر وہ رحمت نازل ہوتی ہے کہ سب کو ڈھانپ لے۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ بہت بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی عرفات میں موجود ہوکر یہ گمان کرے کہ خدا تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی۔ اور حج کا راز اور غایت مقصود بھی یہی ہے کہ ہمتوں کا اجتماع ہو۔ اور ابدال واوتاد شہروں کے اطراف سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ہونے سے جمع ہمت میں سہارا ہے۔ غرضیکہ رحمت الٰہی کے اتارنے کا طریق اس کے برابر اور کوئی نہیں ہے کہ ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر دل ایک دوسرے کی مدد کریں۔

۳۔ عرفات کے میدان میں جانا ایک ضروری فعل حج ہے، جہاں نہ کوئی پتھر نہ کوئی درخت، صرف یاد الٰہی ہے۔ اور اسی سے دعا مانگو۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی فرعون کو کہتے ہیں کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وے بیابان میں میرے لئے عید کریں۔ عرفات کا لفظ مسلمانوں کے باہم تعارف کی طرف ایماء ہے۔ یعنی جب اس مقام میں لوگ بکثرت جمع ہوتے ہیں، تو ان کا آپس میں بذریعہ عکس انوار وتبادلہء خیالات تعارف اور شناسائی ہوتی ہے، جو متحد القوم ہونے کا بڑا گُر ہے۔

مِنا میں اترنے کا راز

ا۔ منا میں اترنے کے اندر یہ راز ہے کہ ایام جاہلیت کے بازاروں میں سے منا۔ عکاظ۔ مجنہ اور ذی المجاز وغیرہ کی مانند ایک عظیم الشان بازار تھا۔ اور یہ بازار انہوں نے اس واسطے مقرر کیا تھا کہ حج کے

اندر کثرت سے دور دراز ملکوں کی خلقت اکٹھی ہوتی تھی اور تجارت کے حق میں اس سے زیادہ مناسب اور بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ ایسے میلے کے لئے اس کا وقت مقرر کیا جائے۔اور دوسری یہ بات ہے کہ مکہ کے اندر اس انبوہ کثیر کے رہنے کی گنجائش نہیں ہے۔لہٰذا بہتر یہی تھا کہ منا جیسے کشادہ میدان میں جمع ہوں۔اور تبادلہء خیالات ہو اور آپس میں تعارف پیدا کریں۔

مشعر الحرام میں ٹھہرنے کی وجہ

مشعر الحرام میں ٹھہرنے کا اس لئے حکم دیا گیا کہ یہاں اہل جاہلیت باہم تفاخر اور نمود کے لئے قیام کرتے تھے۔اس کے بدلہ میں کثرت سے ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا گیا، تا کہ ان کی یہ عادت دور ہو اور ایسی جگہ پر توحید بیان کرنے میں ان کو حرص پیدا ہو۔گویا ان سے کہا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی یاد زیادہ کرتے ہو یا اہل جاہلیت کی طرح اپنے مفاخر کا زیادہ ذکر کرتے ہو۔

رمی جمار کا راز

ا۔رمی جمار کرنے کا راز، جو حدیث میں وارد ہوا، یہ ہے کہ رمی جمار خدا تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ توقیت ذکر کی تمام اقسام میں سے بہتر اور کامل اور وجوہ توقیت کے لئے زیادہ تر جامع یہ قسم ہے کہ ایک زمانہ اور ایک مقام کے اندر ذکر الٰہی کی تعیین کی جائے اور اس کے ساتھ ایک ایسی قسم بھی مقرر کی جائے، جس سے ذکر کا شمار محفوظ رہ سکے۔اور سب کے سامنے ذکر الٰہی کا پایا جانا ثابت ہو اور کچھ مخفی نہ رہے۔ذکر الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ایک قسم تو یہ ہے کہ جس سے خدا تعالیٰ کے دین کی تابعداری منظور ہو۔اور اس قسم کے ذکر میں لوگوں کی کثرت زیادہ ضروری ہے، نفس ذکر کی کثرت ضروری نہیں۔رمی جمار یعنی کنکریاں پھینکنا بھی اسی قبیل سے ہے۔اس لئے اس میں کثرت سے ذکر کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔الغرض یہ امر تعیین ذکر کے لئے ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر کنکری پھینکنے کے ساتھ اللہ اکبر کہنا مشروط ہے۔چنانچہ ابوداؤد و ترمذی حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّـمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ وَ السَّعْىُ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ وَ رَمْيِ الْـجَمَارِ لِإقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ لَا لِغَيْرِهِ ۔یعنی طواف کعبہ اور سعی صفا و مروہ کے درمیان اور پتھروں کا پھینکنا فقط ذکر اللہ قائم کرنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے نہ کہ کسی اور بات کے لئے۔

۲۔رمی جمار یعنے کنکر پھینکنے میں یہ قصد کرے کہ غلامی اور بندگی کے ظاہر کرنے کے لئے امر کی اطاعت کرتا ہوں۔اور صرف تعمیل ارشاد کے لئے اٹھتا ہوں۔بغیر اس کے کہ اس فعل میں کچھ عقل و نفس کا

حظ ہو۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشابہت کا قصد کرے کہ اس مقام پر آپ کو شیطان مردود ظاہر ہوا تھا تا کہ آپ کے حج میں کچھ شبہ ڈال دے یا کسی معصیت میں مبتلا کرے۔ تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا کہ اس کے دفع کرنے کو اور اس کی امید منقطع کرنے کے لئے اس کو کنکریاں مارو۔ اب اگر یہ کہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر تو شیطان ظاہر ہوا تھا اور آپ نے اس کو دیکھا تھا اس لئے اس کو مارا تھا۔ ہم کو شیطان دکھائی نہیں دیتا۔ پھر کنکریاں مارنے سے کیا غرض ہے۔ تو اس کا یہ جواب ہے کہ یہ شبہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس نے یہ شبہ تمہارے دل میں ڈالا ہے، تا کہ تمہارا ارادہ رمی جمار کا سست پڑ جائے اور تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ یہ فعل ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایک کھیل کی سی صورت ہے اس میں کیوں مشغول ہوتے ہو۔ پس خوب کوشش اور مضبوطی کے ساتھ شیطان کو ذلیل کرنے کی نیت سے کنکریاں مار کر اپنے دل سے رفع کرو۔ اور جان لو کہ ہر چند کنکریاں پتھر پر مارتے ہیں، لیکن واقع میں شیطان کے منہ پر مارتے ہیں اور اسکی پیٹھ پر۔ کیونکہ اسکی ذلت اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے حکم کی بجا آوری کریں، جسکی تعمیل میں نفس و عقل کو کچھ حظ نہیں۔ صرف اسکی تعظیم ملحوظ ہے۔

آب زمزم کے پینے کی حکمت

آب زمزم کے پینے میں صرف یہ راز ہے کہ یہ امر شعائر الٰہی کی تعظیم اور خدا تعالیٰ سے طلب رحمت و حصول برکت کی خواہش کے لئے ہے۔

حج میں ہدی یعنی قربانی کرنے کی وجہ

ہدی میں یہ راز ہے کہ اس میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فعل کے ساتھ مشابہت ہے کہ انہوں نے اپنے پیارے بیٹے کو اس جگہ خدا تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور اس کی طرف توجہ کے قصد سے ذبح کرنا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو انعامات کئے ہیں، ان کی یاد دہانی ہوتی ہے۔ اس فعل کے کرنے میں نفس کو تنبیہ عظیم ہوتی ہے۔

ہدی کے ذبح کرنے کے وقت یہ جان لو کہ یہ فعل سبب امتثال و اطاعت امر کے باعث قرب الٰہی کا ہے۔ اس لئے اس کو اور اس کے تمام اجزاء کو پورا دیکھ لینا چاہئے۔ اور یہ امید کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے جزو کے بدلے میں ہمارے ہر جزو کو آگ سے آزاد کرے گا۔ کیونکہ وعدہ اسی طرح ہوا ہے۔ پس جس طرح ہدی بڑی ہوگی اور اس کے اجزاء بڑے ہوں گے، اسی طرح آگ دوزخ سے رہائی کی صورت زیادہ متصور ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنَ النَّارِ وَ ادْخِلْنَا فِي الْجَنَانِ وَ اَعِذْنَا مِنْ

وَسَاوِسِ الشَّيْطَانِ۔

بطن محسر میں تیز چلنے کا راز

بطن محسر میں سواری کے تیز کرنے کا یہ راز ہے کہ وہ جگہ اصحاب فیل کے ہلاک ہونے کا مقام ہے۔لہٰذا جس شخص کو خدا تعالیٰ اور اسکی عظمت کا خوف ہے، اسکو اس مقام میں خوف معلوم ہوتا ہے اور غضب الٰہی سے ڈر کر بھاگتا ہے۔اور چونکہ اس خوف کا معلوم کرنا ایک باطنی امر تھا، اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے ایک ظاہری فعل سے، جو نفس کو بھی خوف یاد دلاتا ہے اور اسکو آگاہ کرتا ہے، منضبط فرمایا۔

حرم کے جانوروں کا شکار نہ کرنے کی مصلحت

ا۔حرم کے جانوروں کا نہ کھانا ایسا ہے، جیسا کوئی شخص اپنے محبوب کے کوچہ کے جانوروں کو، باوجودیکہ گوشت کھایا کرتا ہو، کچھ نہ کہے۔

۲۔مکہ و مدینہ کے حرم میں یہ راز ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک خاص تعظیم ہوتی ہے۔کسی زمین کی تعظیم یہ ہے کہ اس میں کسی چیز سے تعرض نہ کیا جائے۔دراصل یہ تعظیم بادشاہوں کی حد اور ان کی شہر پناہوں سے ماخوذ ہے۔جب کوئی قوم ان کی فرمانبردار ہوتی ہے اور ان کی اطاعت و تعظیم کرتی ہے، تو ان کے مطیع ہونے میں یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر اس بات کو مقرر کر لیتی ہے کہ ان کی حدود کے اندر جو درخت و چارپائے وغیرہ ہیں ان سے ہم کچھ تعرض نہ کریں گے۔اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ **اِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمیً وَ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهٗ** ۔یعنی ہر بادشاہ کے لئے باڑ ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی باڑ اس کے محارم ہیں۔(غزالی۔احمد)

معارف قطع علایق بارادہءِ حج بیت اللہ

قطع علائق کا یہ مطلب ہے کہ حق داروں کے حق ان کے حوالہ کئے جائیں۔اور سب گناہوں سے خالصاً للہ توبہ کی جائے۔کیونکہ جو مظلمہ اور کسی کا حق ہے، وہ ایک علاقہ ہے۔اور ہر ایک علاقہ ایسا ہے جیسے کوئی قرض خواہوں میں سے موجود ہو۔اور اگر یہاں پکڑ کر یوں کہتا ہو کہ تو کہاں جاتا ہے۔کیا شہنشاہ کے گھر کا ارادہ رکھتا ہے، حالانکہ اس کے حکم کو گھر میں بجا نہیں لاتا۔اس کو حقیر جانتا ہے اور تعمیل نہیں کرتا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ اس کے سامنے بندہ گنہگار کی طرح جاتا ہے، تاکہ تجھے پیچھے ہٹا دے اور قبول نہ کرے۔اگر تجھے اپنی زیارت کے قبول ہونے کی رغبت اور خواہش ہے، تو اس کے حکم کی تعمیل کر اور حقوق، جو ظلم سے لئے ہوں، واپس کر۔اور اول سب گناہوں سے توبہ کر اور اپنے دل کا علاقہ اور طرف

التفات نہ کرنے سے قطع کرتا کہ تو اسکی طرف اپنے دل کے چہرہ سے متوجہ ہو، جس طرح کہ ظاہر حال سے تو اس کے گھر کا متوجہ ہے۔ اور اگر تو ایسا نہ کرے گا، تو اپنے سفر سے تجھے بجز اس کے کہ ابتداء میں رنج اور مشقت ہو اور انجام کو مردود ہونا اور نکالا جانا نصیب ہو اور کچھ وصول نہ ہوگا۔ اور وطن سے علاقہ کو ایسی طرح منقطع کرے، جیسے کوئی وہاں سے اٹھایا جاتا ہو۔ اور فرض کرے کہ پھر واپس نہ آؤنگا۔ اور اپنے اہل و فرزند کے لئے وصیت لکھ دے کہ مسافر ہدف موت ہوتا ہے، بجز اس شخص کے، جس کو خدا تعالیٰ بچائے۔ اور سفر حج کرنے کے لئے علاقوں کو قطع کرتے وقت یہ یاد کرے کہ سفر آخرت کے لئے بھی اسی طرح علاقے کو چھوڑ جائینگے۔ اس لئے یہ سفر عنقریب آگے چلا آتا ہے۔ اور سفر حج میں جو کچھ کرو اس سے سفر آخرت کی آسانی کی طمع کرو کہ قرارگاہ اور بازگشت وہی ہے۔ اس لئے چاہئے کہ سفر حج کی تیاری کرنے میں سفر آخرت کو نہ بھولو۔

معارف زاد راہ حج

زاد راہ یعنی اخراجات و مصارف حج حلال جگہ سے ڈھونڈھو۔ جب اپنے دل میں یہ خواہش معلوم کرو کہ کسی طرح خرچ بہت نہ ہو اور باوجود سفر دراز کے خرچ بچ رہے اور منزل مقصود تک پہنچنے سے آگے وہ زاد راہ خراب اور تبدیل نہ ہو جائے۔ تو تم سفر آخرت کو یاد کرو اور عبرت پکڑو۔ کیونکہ سفر آخرت سفر حج کی بہ نسبت بہت دراز ہے۔ اور اس کا خرچ تقویٰ ہے۔ اور تقویٰ و پرہیزگاری کے سوا جس چیز کو تم زاد راہ خرچ جانتے ہو، وہ تمہارے مرنے کے وقت سب تم سے پیچھے رہ جائیگا۔ اور تم سے دغا کریگا، جیسے تازہ اور پکا ہوا کھانا کہ سفر کی پہلی ہی منزل میں سڑ جاتا ہے۔ اور پھر بھوک کے وقت آدمی حیران اور محتاج رہ جاتا ہے۔ اور کوئی تدبیر نہیں بن پڑتی۔ پس تم بالضرور اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال صالح، جو راہ آخرت کے لئے زاد راہ ہیں، موت کے بعد تمہاری بداعمالی سے تمہارے ساتھ نہ رہیں۔ ریاء اور شہرت کی آمیزش اور تصور کی کدورت سے خراب ہو جاویں۔

معارف جدائی وطن بارادہء حج

بارادہء حج اپنے شہر سے نکلنے کے وقت یہ خیال کرو کہ میں اپنے وطن سے جدا ہو کر ایسے سفر میں خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جو دنیا کے سفروں کی طرح نہیں ہے۔ اس وقت دل میں یہ خیال کرو کہ میں کیا ارادہ کرتا ہوں اور کہاں جاتا ہوں اور کس کی زیارت کو متوجہ ہوتا ہوں۔ اس وقت یہ سمجھو کہ میں شہنشاہ کی طرف اس کی زیارت کرنے والوں کے زُمرہ میں متوجہ ہوں، جو نذر کے ساتھ حاضر ہوئے،

جن کو شوق دلایا گیا اور وہ مشتاق ہو گئے۔ اور جن کو جانے کا حکم ہوا، تو علاقوں وتعلقات کو قطع اور خلعت کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کے گھر کی طرف، جس کی شان عظیم اور قدر رفیع اور فخیم ہے، متوجہ ہوئے۔ تا کہ رب البیت کی زیارت کے عوض اس کے گھر کی زیارت سے دل نہ بھلائیں۔ یہاں تک کہ ان کو ان کی آرزو میسّر ہو اور اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مرادیں حاصل کریں اور اپنے دل میں امید حصول آرزو کی کریں۔ نہ اس طرح کہ اپنے اعمال پر بھروسہ ہو کہ اتنے دور سے گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل ورحم پر اس قدر بھروسہ ہو۔ چونکہ اس نے اپنے گھر کی زیارت کرنے والوں کے حق میں وعدہ فرمایا ہے، تو امید رکھیں کہ وہ اپنے وعدہ کو سچا کرے گا۔ اور یہ امید ہو کہ اگر خانہ کعبہ تک نہ پہنچا اور اثنائے راہ میں ہی طعمہء اجل ہوا، تو خدا تعالیٰ سے ملاقات اس حال میں ہو گی کہ اس کے پاس جا رہا ہوں۔ کیونکہ وہ خود فرماتا ہے۔ **وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ**۔ ترجمہ یعنی جو کوئی اپنے گھر سے بارادہء ہجرت الی اللہ اور اس کے رسول کے نکلا، پھر اس کو موت نے آ لیا، تو اس کو اس ہجرت کا اجر دینا خدا تعالیٰ پر ہو چکا۔

سواریئے حاجی کی عبرتیں

سواری جس وقت سامنے آئے، اس وقت اپنے دل میں خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو کہ اس نے ہماری سواری کے لئے چوپایوں کو اور عناصر آب و ہوا اور آتش وغیرہ، کو جن سے ریل و آگبوٹ وغیرہ چلتے ہیں، مسخر کیا کہ ہم کو تکلیف نہ ہو اور مشقت ہلکی ہو جائے۔ اور یہ یاد کرو کہ آخرت کی سواری بھی ایک دن اسی طرح سامنے آ جائے گی یعنی جنازہ کی تیاری ہو گی۔ اس پر سوار ہو کر دار آخرت کا کوچ کرنا پڑے گا۔ الغرض حج کا سفر آخرت کے سفر کی طرح ہے۔ لہٰذا ضرور نظر کر لینا چاہیئے کہ حج کی سواری پر سفر کرنا اس قابل ہے کہ سفر آخرت کی سواری کا توشہ ہو سکے۔ کیونکہ سفر آخرت آدمی سے بہت ہی قریب ہے۔ کیا معلوم کہ موت قریب ہو اور اونٹ کی سواری سے پیشتر ہی تابوت پر سوار ہو جائے۔ اور تابوت کی سواری یقیناً ہو گی۔ اور سامان سفر کا مہیا ہو جانا مشکوک امر ہے۔ تو مشکوک سفر میں احتیاط کرنا اور توشہ اور سواری سے مدد لینی اور یقینی سفر سے غافل رہنا کب زیبا ہے۔

معارف چادر ہائے احرام

احرام کی دو چادروں کے خریدنے کے وقت اپنے کفن کو اور اس میں اپنے لپیٹنے کو یاد کرو۔ کیونکہ احرام کی چادر اور تہ بند کو اس وقت باندھو گے، جب کہ خانہ کعبہ کے نزدیک پہنچو گے۔ اور کیا عجب کہ یہ

سفر پورا نہ ہو اور خدا تعالیٰ سے ملاقات کفن میں لپٹے ہوئے ہونی یقینی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی زیارت بھی مرنے کے بعد بجز اس صورت کے نہ ہوگی کہ دنیا کے لباس کے مخالف لباس ہو۔ کیونکہ احرام کا کپڑا کفن کے کپڑے کے مشابہ ہے۔

اسرار میقات و تکالیف حج

جنگل میں داخل ہو کر میقات تک گھاٹیوں کے دیکھنے میں وہ ہول و احوال یاد کرو، جو موت کے باعث دنیا سے نکل کر میقات قیامت تک ہوں گے۔ اس کے ہر ایک حال کو اس کی ہر کیفیت سے مناسبت ہے۔ مثلاً رہزنوں کی دہشت سے، منکر و نکیر کے سوال کی دہشت یاد کرنی چاہیئے۔ اور جنگل کے درندوں سے قبر کے سانپ، بچھو اور کیڑے دھیان کرو۔ اور اپنے گھر بار اور اقارب سے علیحدہ ہونے سے قبر کی وحشت اور سختی اور تنہائی کو سوچو۔

ابتدائے آفرینش میں خانہ کعبہ کی زمین اول تیار ہونے اور انتہائے زمانہ میں اس کا سب سے پہلے ویران ہونے کی حکمت

خانہ کعبہ کی آبادی میں اول ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تجلی گاہ مرتبہ محبوبیّت اور مظہر مرتبہ اول معبودیتّ ہے۔ دارالخلافہ اگر آباد کیا جاتا ہے، تو اول مکانات شاہی کے لئے کوئی جگہ تجویز کی جاتی ہے اور ان کی بناء ڈالی جاتی ہے۔ اس کے بعد وزراء، امراء، شاگرد پیشوں کے مکانات کی تعمیر کی تجویز ہوتی ہے۔ اور جب دارالخلافہ کسی وجہ سے بحکم شاہی ویران کیا جاتا ہے، تو اول بادشاہ اپنے مکانات چھوڑتا ہے۔ اس کے اتباع میں اس کے بعد وزراء، امراء، شاگرد پیشہ بھی اپنے اپنے مکانات چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس وقتِ دورہ اگر کسی مقام میں حکام کا قیام ہوتا ہے، تو اول خیمہ حکام کے لئے میدان مقرر ہو جاتا ہے اور اس میدان میں خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں اس کے آس پاس اوروں کے خیمے اور پالیں قائم کی جاتی ہیں۔ اور پھر جب وہاں سے کوچ ہوتا ہے، تو اول خیمہ شاہی اکھاڑا جاتا ہے۔ اس کے اکھڑتے ہی اوروں کے خیمے بھی اکھڑنے لگتے ہیں۔ غرض با اختیار حاکم تعمیر اور ویرانی یا مقام و کوچ ہوتا ہے تو یوں ہوتا ہے۔ اگر یہ ہے تو لازم ہے کہ تجلی گاہ تجلی اول، جو مخلسر امرتبہ محبوبیت اور خیمہ خاص مرتبہ اول معبودیت ہے، تعمیر میں بھی اول رہے اور تخریب میں بھی اول رہے۔ وہ تعمیر کیا جائے، تو اس کی تعمیر کے ہوتے ہی اوروں کے مکانات تعمیر ہونے لگیں۔ اور وہ ویران ہو تو اس کے ویران ہونے میں اوروں کے مکان بھی ویران ہونے لگیں۔

اجزائے عالم اجرام میں سے کسی کا اول بننا اور کسی کا اس کے مابعد منجملہ واقعات گذشتہ ہے۔ اگر برروایت معتبر یہ بات ثابت ہو جائے کہ زمین یا آسمان اور اس میں سے بھی فلاں مکان اول بنا ہے، تو بشرط فراہمی جملہ سامان اعتبار وارتفاع جملہ اوہام اہل انصاف کے ذمہ اس بات کا ماننا لازم ہوگا۔ اور پھر اس کے ساتھ شواہد خارجیہ بھی اس پر شاہد ہوں۔ اور دلائل واضح اس کے مؤید ہوں، تو پھر وہ یقین حدِّ اطمینان تک پہنچ جائے گا۔ مگر چونکہ تنقیح روایات میں اہل اسلام کا تمام مذاہب میں نمبر اول ہے، اس پر قرآن کی روایات متواتر ہر قرن میں لاکھوں ہزاروں حافظ برابر چلے آتے ہیں۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مثل آفتاب نیمروز روشن۔ اس لئے نہ یہ احتمال ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے یہ قرآن اور یہ حکایات بنا کر کھڑے کر دیئے ہیں۔ اور نہ یہ وہم ہو سکتا ہے کہ راویوں نے غلط کہہ دیا ہو یا غلطی کھائی ہو۔ اس لئے قرآن شریف کی آیات تو اول درجہ میں واجب التسلیم ہوں گی۔ اور احادیث اہل اسلام کی روایات دوم درجہ میں۔

مگر قرآن دیکھا تو یہ نکلا کہ زمین اول بنی ہے اس کے بعد آسمان۔ اور پھر زمین میں بھی اول تعمیر خانہ کعبہ ہے۔ مضمون اول پر تو آیت هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ وَ هُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ اور آیت قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَه اَنْدَاداً ذٰالِکَ رَبُّ الْعٰلَمِیْن ط وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بَارَکَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتِهَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِیْنَ ط ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعاً اَوْ کَرْهاً قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ ٭ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَهَا وَ زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ حِفْظاً ذَالِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۔ ترجمہ۔ خداتعالیٰ وہ ہے، جس نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب پیدا کیا۔ پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف اور آسمانوں کو سات بلندیاں قرار دیا۔ اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ کہہ دے کیا تم اس ذات سے انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا۔ تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ یہ ہے وہ رب العالمین، جس نے سب چیزیں پیدا کی ہیں۔ اور زمین میں بلند پہاڑ پیدا کئے اور برکت دی اس کو اور اس میں اندازے رکھے چار دنوں میں اور سب حاجتمندوں کی حاجتیں پوری ہو گئیں۔ پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور وہ دھواں تھا۔ پس اس کو اور زمین و آسمان کو فرمایا کہ طوعاً یا کرھاً میرے فرمانبردار بن جاؤ۔ وہ دونوں (زبان حال سے) بولے، ہم فرمانبردار ہو چکے ہیں تیرے حکم کے۔ پس خدا نے ان کو سات بلندیاں قرار دیا دو دنوں

میں ۔اور ہر آسمان کو اس کے کام کے بارے میں وحی کی ۔اور آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور اس کی حفاظت کی ۔ یہ اندازہ لگایا ہوا ہے زبردست اور جاننے والے خدا تعالیٰ کا۔

ویرانئ عالم یعنی قیامت کے وقت عالم کی ویرانی میں کعبہ کے اول ویران ہونے پر آیت ۔

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِلنَّاسِ وَ الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَالْھَدْیَ وَالْقَلَائِدَ ذَالِکَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ترجمہ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے کعبہ کو عزت کا گھر بنایا لوگوں کے قیام کے لئے اور مہینہ حرام کا اور ہدی اور قلائد یعنی قربانی کے جانور۔ یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور خدا تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔

یہ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ اگر لفظ قیاماً للناس کو بغور دیکھا جائے اور کچھ تکلف نہ کیا جائے ،تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ خانہ کعبہ سامان قیام جملہ بنی آدم ہے، کیونکہ قیام مقید بقید فی العرب وغیرہ نہیں ۔اور لفظ للناس اصل میں سب کو عام ہے۔اور وجہ تخصیص پس و پیش میں کوئی پائی نہیں جاتی ۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ قیام سے قیام فی العرب مراد ہے اور للناس سے فقط اہل عرب مقصود ہیں۔ اس سبب سے کہ عرب میں بوجہ کثرت خونریزی اور شیوع رہزنی قیام دشوار تھا۔ اور سامان قیام مثل تجارت وغیرہ ضروریات کی وہاں کوئی صورت نہ تھی۔البتہ ایام حج میں زائران کعبہ کو بلحاظ عظمت کعبہ کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔اس بہانہ سے سب کے کام چل جاتے تھے اور سب ارمان نکل جاتے تھے۔

اس کے برخلاف اگر یوں دیکھا جائے کہ جب تک یہ گھر قائم ہے،تب تک بنی آدم کا بھی اس عالم میں قیام ہے۔جس روز یہ ویران ہوا،تو ان کا قیام بھی یہاں پر اختتام کو پہنچے گا۔پھر سارے کارخانہء جسمانی کو ویران سمجھئے۔کیونکہ بدلالت آیت **خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً ثُمَّ اسْتَوٰیٓ اِلَی السَّمَاءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ** ۔ترجمہ۔خدا تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لئے پیدا کیا سب کچھ جو زمین میں ہے۔پھر متوجہ ہوا آسمانوں کی طرف اور ان کو سات بلندیوں پر استوار کیا۔

یہ بات عیاں ہے کہ زمین و آسمان سب بنی آدم کے لئے ہیں۔جب وہی نہ ہوں گے،تو زمین و آسمان کاہے کو رہیں گے۔گھاس دانہ گھوڑوں ہی تک رہتا ہے۔وہ نہیں رہتے تو اسے کون رکھتا ہے۔تو نہ تکلیف کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تخصیص کی نوبت آتی ہے۔بعض روایات میں ہے کہ اول پانی تھا۔پھر اس جگہ سے، جہاں اب کعبہ ہے، بلبلا سا اٹھا اور زمین کی پیدائش شروع ہوئی۔

ان روایات کے ملاحظہ سے آشکارا ہے کہ تجلی گاہ تجلی اول ہر طرح اول ہے۔زمین کا ٹکڑہ بھی

وہی بنا، جہاں کعبہ شریف ہے۔ اور تعمیر بھی اول اسی کی ہوئی۔ اور ویران بھی اول وہی ہوگا۔

الغرض عالم جسمانی میں خانہ کعبہ کو بمنزلہ مکان شاہی یا خیمہ شاہی خیال فرمائیے۔ اور کیوں نہ ہو۔ تجلی گاہ ربانی اور آئینہ جمال یزدانی ہے۔ اس لئے بنانے میں بھی اس کو اول رکھا اور ویرانی عالم کے وقت بھی اسی کو اول رکھیں گے۔ چنانچہ آیت اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ۔ جس کا یہ حاصل ہے کہ سب سے پہلا گھر، جو لوگوں کے لئے بنایا گیا، وہ ہے جو مکہ معظّمہ میں ہے۔ اس کی اولیت تعمیر پر دلالت کرتی ہے۔ اور اہل اسلام کی اس روایت پر نظر کیجئے، جس میں کچھ ایسا مذکور ہے کہ اول پانی تھا اور اس پانی ہی پر عرش کبریائی تھا۔ پھر اس پانی میں سے اس جگہ، جہاں پر اب خانہ کعبہ ہے، ایک بلبلا سا یا جھاگ سی اٹھی اور وہیں سے زمین کی بنا شروع ہوئی۔ تو اولیّت کعبہ دور تک پہنچتی ہے۔ کیونکہ دراصل موافق اشارات قرآن مثل خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعاً ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ۔ زمین جملہ عناصر اور تمام افلاک سے پہلے پیدا ہوئی ہے۔ گو اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد وقوع میں آیا ہو۔ پھر جب زمین کا یہ ٹکڑا خاص، جہاں خانہ کعبہ ہے، زمین کے اجزا میں بھی سب سے اول نکلا، تو یوں کہو کہ بعد عرش کے، جو عالم سے ایک علیحدہ چیز ہے، کیونکہ وہ تخت ربانی ہے اور عالم بمنزلہ ملک و رعیت یزدانی خانہ کعبہ کی جگہ سب میں اول ہوئی ہے۔ بہر حال اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ اور روایت مشاراً الیہا اور اشارت مذکورہ، جنکا حاصل یہ ہے کہ سب میں پہلی جگہ یہ ہے جہاں خانہ کعبہ ہے، اولیت تعمیر خانہ اور اولیت پیدائش بقعہ خانہ کعبہ پر دلالت کرتی ہے اور آیت جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھر لوگوں کے قیام کا باعث ہے۔ اس کی اولیت ویرانی پر دلالت کرتی ہے کہ حاصل اشارہ قرآنی یہ ہوا کہ جب تک یہ گھر قائم ہے لوگ بھی اس عالم میں قائم ہیں۔ جس روز یہ گھر ویران ہوا اور روز عالم کو خراب اور ویران سمجھو۔

مُحرِم پر جنایات کے بدلہ میں کفارہ لازم ہونے کی وجہ

حج کے تمام افعال عاشقانہ رنگ کے آداب ہیں، جو عاشقان الٰہی کے لئے اپنے معشوق حقیقی کے گھر کے پاس بجالانے معہود ہیں۔ پس جو شخص ان آداب پسندیدہء معشوق کے برخلاف کوئی حرکت کرے، تو اس پر عاشقانہ حرکت کو چھوڑنے اور اپنے معشوق کے آگے خلاف ورزیء آداب و نیاز کی وجہ سے کفارہ دینا لازم ہوا۔ لہٰذا مُحرِم اگر اپنے کسی اندام کو خوشبو لگائے، تو اس کو صدقہ دینا چاہئے اور اگر ایک دن کامل سیا ہوا کپڑا پہنے یا اپنے سر کو ڈھانپے، تو اس پر قربانی واجب ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے کم مدت میں یہ فعل کیا ہو، تو صدقہ دینا چاہئے۔ اور اگر اپنے سر کا چوتھا یا زیادہ حصہ منڈوائے، تو اس پر قربانی

لازم آتی ہے۔اوراس سے کم کے لئے صدقہ دینا چاہئے۔اورایسا ہی ناخن کٹوانے کے باب میں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ان حرکات کو عاشقانہ نیاز و خستگی و شکستگی کے برخلاف شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خوشبو مَلنا اور سیئے ہوئے کپڑے پہننا اور سر منڈوانا اور ناخن کٹوانا زیب و زینت کے اسباب اور حظوظ نفسانی و خود آرائی کی صورتیں ہیں۔اور یہ تمام حرکات عاشقانہ نیاز کے برخلاف اور معشوق حقیقی کی نظر میں بحالت احرام ناپسند ہیں۔لہٰذا ان مخالفانہ حرکات کی تدارک کے لئے کفارات مقرر ہوئے۔

ترک خوبی مے کناند خوب تر　　　　عشق را درماں بود عشق دِگر

سب سے اچھا جو ہوتا ہے وہ خوبی اور معشوقی چھڑا دیتا ہے۔عشق کا علاج یہ کہ دوسرے کا عشق اختیار کیا جائے۔

ہر کہ ترک خود کند یا بد خدا　　　　چیست وصل از نفس خود گشتن جدا

جو کوئی اپنے آپ کو ترک کرتا ہے وہ خدا کو پالیتا ہے۔وصل کیا ہے، یہی کہ اپنے نفس سے جدا ہو جائے

لیک ترک نفس کے آساں بود　　　　مردن و از خود شدن یکساں بود

لیکن نفس کا چھوڑنا کب آسان ہوتا ہے۔مرنا اور اپنے آپ سے جدا ہونا یکساں ہے

ہست آں عالی جنابے بس بلند　　　　بہر وصلش شور ہا باید فگند

خدا کی درگاہ بڑی بلند ہے۔اس کے وصل کے لئے شور ڈالنا چاہئے

زیب و زینت و آرائش اور ننگ و ناموس کے سامان و اسباب و حالت صحو سے وابستہ اور حالت عشق و فریفتگی و سکر کے نقیض و ضد اور ایک قسم کے تصنع و تکلیف پر دال ہیں۔ان سب کو بحالت احرامِ حج یعنی کوچہ محبوب میں گشت کرنے کے وقت ترک کرنا مناسب ہوا۔اور محبّ صادق و عاشق خالص کو وہ آداب و طریقے اختیار کرنے پڑے، جو کوچہ محبوب میں پہنچنے کے وقت معشوق حقیقی کی نظر التفات و توجہء رحمت کے جاذب ہوں۔چنانچہ ایک عاشق صادق کا ترانہء ذیل اسی حالت و رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔

ننگ و نام و عزت دنیا ز داماں ریختیم　　　　یار آمیزد مگر با ما بخاک آمیختیم

دنیا کا ننگ و ناموس ہمنے سب دامن سے گرا دیا۔شاید یار ہم سے مل جائے، اسلئے ہم خاک میں مل گئے

دل بدادیم از کف و جاں در رہے انداختیم　　　　و از پئے وصلِ نگارِ حلیہا انگیختیم

ہاتھ سے دل دے دیا اور جان اسکی راہ میں ڈال دی اور اس حقیقی معشوق کے ملاپ کے لئے بڑے حیلے کئے

بحالت احرام اپنی عورت سے جماع کرنے سے حج فاسد ہونیکی وجہ

دنیا کی تمام لذات و مرغوبات میں سے جماع سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔مگر حج میں ساری لذات کو چھوڑنا پڑتا ہے، کیونکہ حج کی تمام صورتیں اس کے برخلاف ہوتی ہیں۔حج میں عاشقانہ طرز و

وضع اختیار کی جاتی ہے، جس میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق حقیقی ومحبوب ابدی کے سوا تمام لذات و مرغوبات کو میں نے ترک کر دیا۔ پس جو شخص باوجود اس دعویٰ کے جماع جیسے لذیز ترین فعل کا ارتکاب بحالت احرام حج کرے، وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا اس کا حج فاسد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ عاشقان صادق کے زمرہ میں شمار نہیں ہوتا بلکہ خائن گنا جاتا ہے۔

ہر کہ بے باکی کند در راہ دوست　　راہزنِ مرداں شدہ نامرد اوست

جو کوئی دوست کی راہ میں بے باک ہو، وہ مردانِ خدا کا راہزن اور نامرد ہے

دراصل بات یہ ہے کہ بعض عبادات میں خدا تعالیٰ کے حلال بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان عبادات کے فعل مشروع کے لئے مخل و فاسد ہوتے ہیں۔ جیسے کلام کرنا یا کھانا پینا منع نہیں ہے، مگر نماز میں حرام ہے۔ ایسا ہی بوجہ حلال اپنی عورت سے مباشرت کرنا یا کھانا پینا منع نہیں ہے، مگر بحالت روزہ یہ افعال حرام ہیں، کیونکہ یہ افعال عبادات مشروع کے لئے ناقض ہیں۔ پس ایسا ہی حج کے لئے بعض محظورات ہیں، جن سے حج فاسد ہو جاتا ہے۔ اور حج ان سے اس لئے فاسد ہوتا ہے کہ ان امور کی اوضاع افعال حج کے ضد میں ہیں۔ اگر حج میں ایسے امور جائز ہوتے، تو افعال حج ایک کھیل سا ہوتا۔ اور جب ان امور کو حج میں ترک کیا گیا، تو حج کے سارے ارکان باحکمت ہو گئے۔

چیل، کوے، بچھو، سانپ، چوہے و بھیڑیئے و سگِ دیوانہ کو حرم میں مارڈالنا جائز ہونے کی وجہ

یہ جانور موذی و ضرر رساں اور عاشقان الٰہی کو گزند پہنچانیوالے اور کوچہء محبوب سے مانع ہوتے ہیں۔ لہٰذا محبوب حقیقی خداوند تعالیٰ کی نظر میں اسی وجہ سے مبغوض و ممقوت ٹھہرے کہ اس کے عاشقوں کو اس کے کوچہ سے مانع ہوتے ہیں۔ اور یہ امر اس کو ناپسند ہے۔ پس جو امر محبوب حقیقی کی نظر میں مبغوض ہو بالضرور اس کے عاشقوں و محبوں کی نظر میں بھی وہ مبغوض ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جانورانِ عنوان الصدر کو محرم مارڈالے، تو اس پر کوئی تاوان ان کے بدلہ میں دینا لازم نہیں ہوتا۔ بلکہ کارِ ثواب و رضائے محبوب ہے کیوں کہ یہ جانور اس کے محبوب کی نظر میں مبغوض و مردود ہیں۔

بحالت احرام حج سبّ و شتم جنگ و جدال منع ہونے کی وجہ

حجاج کعبہ میں بمنزلہ عاشقان ازلی و کوچہ گردانِ محبوب ابدی میں شمار ہوتے ہیں۔ پس جو شخص عاشقان الٰہی کو سبّ و شتم کرے اور ان سے لڑے بھڑے، وہ خدا کو مبغوض و ممقوت ٹھہرتا ہے۔ اور ایسا ہی

جو حاجی دوسرے حاجیوں سے لڑے اور ان کو سبّ وشتم کرے، وہ زمرہ ءعاشقان الٰہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لڑنا بھڑنا اکثر ننگ و ناموس وعزت وجستجوئے آرام وتن پروری کے لئے بھی ہوتا ہے۔ سوایسا شخص بدو وجہ زمرہ عاشقان سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ عاشقان الٰہی کوایذا دِہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی عزت وننگ و ناموس وآرام کا طالب ومحبوب حقیقی سے غافل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حاجی کعبہ میں جا کر بعض ایسے امور ممنوعہ کے مرتکب ہونے سے سخت دل ہو کر واپس آتے ہیں۔ کیونکہ وہ کوچہ محبوب حقیقی میں جا کر شرائط عاشقانہ کو توڑ کر اس کی نظر سے گر جاتے ہیں۔ ایسے مخطورات، جو محبوب ازلی کی نظر میں مبغوض وممقوت تھے، اس نے پہلے بھی بتا دیئے تھے کہ مبادا کوئی شخص بحالت عدم علم ان امور کا مرتکب ہو کر مبغوض ومردود ٹھہر جائے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ **اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَ لاَ فُسُوْقَ وَ لاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ** ۔ترجمہ۔ یعنی حج کے مہینے معلوم ومشہور ہیں۔ پس جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج کرنا ٹھہرا لے تو چاہئے کہ حج میں جماع ومحرکات جماع کا مرتکب نہ ہو اور کسی کو گالی نہ دے اور جھگڑا نہ کرے۔

مسائل حج کی دقائق فہمی کی برکات زمانہ خیر القرون میں

تاریخ ابن خلکان کا مؤلف حضرت وکیعؒ سے راوی ہے کہ وہ کہتے ہیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ نے مجھ سے بیان کیا کہ حج کے مسائل میں میں نے پانچ جگہ غلطی کی اور وہ مسئلے مجھے ایک حجام نے سکھائے۔ وہ پانچ مسئلے یہ ہیں کہ جب میں (حج کے ارکان کی ادائیگی کے بعد) حجامت بنوانے کو اس کے پاس گیا، تو میں نے پوچھا کہ میری حجامت کا کیا لو گے۔ اس نے پوچھا کہ کیا آپ دیہاتی ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ عبادت کے کاموں میں مزدوری کی شرط نہیں کی جاتی۔ آپ بیٹھ جائیے۔ پس میں بیٹھ گیا۔ مگر قبلہ کی طرف کو نہ بیٹھا۔ تو اس نے مجھے قبلہ کی طرف منہ کرنے کو کہا۔ اور میں نے چاہا کہ پہلے بائیں طرف سے حجامت بنواؤں۔ اس نے کہا کہ داہنی طرف سے بنوالو۔ میں نے داہنی جانب کو اس کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ حجامت بنانے لگا اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کہا کہ تکبیر کہتے رہو۔ میں تکبیر کہنے لگا۔ جب میں حجامت کے بعد چلنے لگا تو اس نے کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اپنے ڈیرہ کو جاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ دو رکعتیں پڑھ لو، اس کے بعد جاؤ۔ میں نے کہا کہ اے حجام، جن باتوں کا تو نے مجھ کو حکم دیا ہے، یہ کہاں سے تجھ کو حاصل ہوئیں۔ اس نے کہا کہ میں نے عطاء ابن ابی ریاح کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔

برکات حج

حج کی برکات میں سے ایک یہ تعلیم ہے، جو اس کے ارکان سے حاصل ہوتی ہے کہ اس میں انسان کو عملی صورت میں اختیارِ سادگی و ترکِ تکلفات اور کبر و بڑائی کو چھوڑنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حج کے سارے ارکان کبر و بڑائی کے بڑے دشمن ہیں۔ دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ احباب و اقارب چھوٹ جاتے ہیں۔ نفس پروری اور سستی و کسالت کا استیصال ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی یہ بات ہے کہ ہزارہا سال سے انسان کے لئے خدا تعالیٰ کا ایک پاک معاہدہ چلا آتا ہے، جس کا ایفاء بذریعہ ادائے حج ہو جاتا ہے۔

حجر اسود کے کالا ہونے کی وجہ

ترمذی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **نَزَّلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ هُوَ اَشَدُّ بَیَاضاً مِّنَ اللَّبَنِ فَسَوَّدَتُهُ خَطَا یَا بَنِی آدَمَ. قَالَ اَبُوْ عِیْسیٰ هٰذا حدیث حسن صحیح** ۔ترجمہ۔ یعنی حجر اسود بہشت سے اترا۔ اور وہ اسوقت دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ پھر اسکو بنی آدم کی خطاؤں نے کالا کر دیا۔ ابوعیسیٰ کہتے ہیں، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

یہ بات عقل و شرع کے سراسر خلاف ہے کہ لوگوں کے گناہوں کا اثر حجر اسود پر ہو کر وہ کالا ہو جائے۔ اس میں ایک راز ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں پر حجر اسود کو کالا کرنا شرافت اور عظمت کے معنے رکھتا ہے۔ اور اس کے برخلاف ذم کے معنے نہیں نکلتے۔ سواد کے معنے سیاہ اور **سَوَّدَتْ** کے معنے سرداری کے ہیں۔ اس کا مطلب تفصیل ذیل سے ظاہر ہوگا۔ اگر آدم علیہ السلام کی خطا نہ ہوتی، تو ان کی سرداری دنیا میں ظاہر نہ ہوتی۔ یہی چیز ہے جس نے ان کو سردار بنایا اور برگزیدہ کرایا۔ یعنی آدمؑ کا بہشت سے اس لئے خروج ہوا تھا کہ ان کی سرداری ہو۔ یہی حال حجر اسود کا ہے۔ جب یہ پتھر بہشت سے نکلا، تو بہت سفید تھا۔ سو ضرور تھا کہ اس کی سرداری کا اثر ظاہر ہوتا کہ جب بہشت میں پھر اس کا رجوع ہو تو اس اثر کے ساتھ اس کی دوسرے امثال پتھروں سے تمیز رہے اور اس کو قربت الٰہی کی خلعت عطا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حجر اسود کو بمنزلہ یمین الٰہی کے اتارا ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی مٹی کو بوقت پیدائش خمیر کیا تھا۔ اور حجر اسود کو بنی آدم کی خطاؤں نے سرداری بخشی۔ یعنی حجر اسود کو بنی آدم کے چومنے اور متبرک جاننے نے سردار بنا دیا۔ دنیا کا کوئی ایسا رنگ نہیں ہے، جو سرداری پر دلالت کرے مگر سیاہ رنگ۔ اللہ تعالیٰ نے حجر اسود کے دنیا میں آنے سے اس کو سردار بنایا، جیسا کہ آدمؑ کو سردار بنایا گیا۔ پس

آ دمؑ کا بہشت سے اترنا خلافت کے لئے تھا نہ کہ دودی کے لئے۔ حجراسود کا سواد بنی آ دم کی طرف منسوب ہوا، جیسا کہ آ دمؑ کو اپنی خطاؤں کے سبب ہی برگزیدگی اور سرداری حاصل ہوئی۔ یعنی خطاؤں کے سبب بنی آ دم کو امر ہوا کہ اس پتھر پر سجدہ کریں اور اس کو چومیں اور اس کے ساتھ خدا تعالیٰ سے برکت ڈھونڈھیں، تا کہ یہ امر ان کے گناہوں کا کفارہ ہو۔ بدیں معنی حجراسود کی سیادت ظاہر ہوئی۔ پس نبی علیہ الصلوٰۃ السلام کے اس فرمان کے معنے جو فرمایا **سَوَّدَتُہُ خَطَایَا بَنِیُ آدَمَ** یہ ہیں **اَیُ جَعَلَتُہُ سَیِّداً وَ جَعَلَتُ اَلّلَوُنِیَّۃِ السَّوَادِیَّۃُ دَلَالَۃٍ عَلٰی ھَذَا الُمَعُنَی** ۔یعنی بنی آ دم کی خطاؤں نے اس کو سردار بنایا۔ اور رنگ کی سیاہی کی دلالت اس سرداری کے معنے پر ٹھہرائی گئی ہے۔ پس یہ امر بنی آ دم کے حق میں مدح ہے ذم نہیں۔ تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آ دمؑ کی خلافت کا ذکر ملائکہ سے فرمایا۔ اور جب فرشتوں سے جو کچھ ظاہر ہونا تھا وہ ہو چکا، تو یہ بات ان کی طرف سے آ دمؑ سے بہتر ہونے کی ترجیح کے قائم مقام ہو گئی۔ اس امر میں فرشتوں نے اپنی فکر کو علم الٰہی پر ترجیح دی تھی اور یہ بات ان کے لئے بنی آ دم کی خطاؤں کے قائم مقام ٹھہر گئی۔ اور یہی سبب ان پر آ دمؑ کی سرداری کا ہوا۔ اور ان کو آ دمؑ کے آ گے سجدہ کرنے کا امر ہوا۔ تا کہ اس کی سرداری ان پر ثابت ہو جائے۔

سات موقعوں پر ہاتھ اٹھانے کا راز

بزار نے حضرت ابن عمرؓ سے اور اس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کی ہے کہ فرمایا۔ **تُرُفَعُ الُاَیُدِیُ فِیُ سَبُعَ مَوَاطِنَ اِفُتِتَاحِ الصَّلٰوۃِ وَاِسُتِقُبَالِ الُبَیُتِ وَ الصَّفَا وَالُمَرُوَۃِ وَالمَوقَفَیُنِ وَ عِنُدَ الُحَجُرِ** ۔ترجمہ۔ یعنی سات موقعوں پر ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ (۱) ابتدائے نماز۔ (۲) خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کے وقت۔ (۳) صفا۔ (۴) مروہ کے پاس اور (۵۔۶) ہر دو مقاموں کے پاس کھڑا ہونے کے وقت اور (۷) حجراسود کے پاس۔ ان موقعوں میں ہاتھوں کے اٹھائے جانے سے مراد خالی ہونا اور بیزار ہونا ان اشیاء سے ہے، جنکی نسبت ملکیت وقوت وغیرہ کی ہاتھوں کی طرف کی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو انسان خالی کر کے اٹھاتا اور جھاڑتا اور اسوقت اللہ تعالیٰ کا نام پکارتا ہے۔ اور زبان حال سے ظاہر کرتا ہے کہ ان میرے ہاتھوں میں کسی چیز کی ملکیت اور کوئی طاقت اور قوت نہیں، بلکہ سب چیزیں اور سب طاقتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ یہ تمام موقعے سوال کرنیکے ہیں۔ اور سوال بے پرواہ اور مالک سے متصور نہیں ہوتا، بلکہ سائل حاجتمند ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا حاجتمند کی صفت کا اپنے او پر وارد اور قائم کرنا انسان کیلئے ضروری ہوا۔ اور ہاتھوں کا اٹھانا اسی طرف ایماء کرتا ہے۔

حج کے احرام میں سر کے بالوں کو شہد ملنے کا راز

ابوداؤد نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمُ لَبَدَ رَاسَه‘ بِالْعَسَل۔ یعنی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سر کے بالوں کو شہد سے ملا۔

۱۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ ہے کہ چونکہ احرام میں بالوں کو کنگھی کرنا اور دھونا اور سنوارنا منع ہے۔ اور اگر ان کو نہ سنوارا جائے، تو بدنما معلوم ہوتے ہیں اور بکھر کر پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ شہد کے ملنے سے نہ بکھرتے ہیں اور نہ پراگندہ ہوتے ہیں۔ شہد میں یہ قدرتی خاصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو گندہ اور بوسیدہ نہیں ہونے دیتا۔

۲۔ دوسرے یہ حکمت ہے کہ سر کو بہت ایام تک نہ دھویا جائے، تو بالوں میں سے بو آنے لگتی ہے۔ اور بالوں کو شہد ملنے سے بو پیدا نہیں ہوتی، جس سے کسی مصاحب کو ایذا پہنچے۔

۳۔ تیسری حکمت یہ ہے کہ تلبید سر کے ایک حصہ کے بالوں کو دوسرے حصہ کے بالوں کے ساتھ ملانے کو کہتے ہیں، حتیٰ کہ سب بالوں کا ایک قطعہ بن جائے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان اپنی تمام صفات متعددہ و اسمائے حسنٰی اور مناسبت الیہ کو، جو اس کو شریعت اور عقل میں حاصل ہیں، ایک ہی عین کی طرف پھیر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّامَا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی۔ اور فرمایا۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ ترجمہ۔ یعنی کہہ دے کہ پکارو اللہ کو یا رحمٰن کو جس نام سے چاہو، اس کے اسماء حسنٰی بہت ہیں۔ تمہارا معبود برحق ایک ہی ہے۔

۴۔ چوتھی حکمت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے بالوں کو شہد کے ساتھ جمع کیا، حالانکہ دوسری چیزوں خطمی وغیرہ کے پتوں سے بال جمع ہو سکتے تھے۔ اس میں یہ راز ہے کہ شہد کو وہ حیوان بناتا ہے، جس کو وحی الٰہی میں حصہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شہد کی مکھی میں بوجہ وحی الٰہی کے مناسبت ہے، یعنی وجود باجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مگس شہد ہر دو مہبط وحی الٰہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ۔ یعنی تیرا پروردگار شہد کی مکھی کی طرف وحی فرماتا ہے۔ اور شہد بمنزلہ ان علوم الٰہیہ قرآن کریم و احادیث نبویہ کے ہے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس میں نبی کریمؐ اپنی امت کو شناسا فرماتے ہیں کہ ہم احکام متعددہ کو ایک ہی عین کی طرف لوٹا دیں۔ اور ہمارے علوم نظر عقلی و فکر و خیال سے نہ ہوں، بلکہ بخشش الٰہی اور کشف ربانی سے ہوں۔ اور ہم ہمیشہ علوم لدنیہ الٰہیہ کے لئے، جو بذریعہ وحی الٰہی ربانی حاصل ہوتے ہیں، منتظر رہیں۔ یہ مت گمان کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے علوم، جو الہام کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، بند ہیں۔ بلکہ ابد

الآ باد تک ان کا دروازہ مفتوح ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں۔

گیرم ایں وحیء نبی گنجور نیست　　　ہم کم از وحی دل زنبور نیست

یعنی ہم فرض کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو وحی اولیاء اللہ کو ہوتی ہے،
وہ آنحضرت کی وحی کی طرح نہیں ہے، مگر وہ وحی شہد کی مکھی کے دل سے کم نہیں۔

چونکہ اوحیٰ الرب الی النحل آمدہ است　　　خانہ وحیش پر از حلوہ شدہ است

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ یعنی تیرا رب شہد کی مکھی کو وحی فرماتا ہے۔ اور اس سبب سے انکا چھتا اور انکی آواز شیرینی سے پُر ہو جاتی ہے۔

او بنور وحی حق عز و جل　　　کرد عالم را پر از شمع و عسل

شہد کی مکھی اللہ تعالیٰ کی وحی کے نور سے سارے جہاں کو موم اور شہد سے پر کر دیتی ہے۔

آنکہ کرمنا است بالا مے رود　　　وحیش از زنبور کے کمتر بود

اور انسان، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے، وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ یعنی ہم نے نبی آدم کو سب چیزوں پر بزرگی عطا کی ہے۔ اس کی وحی شہد کی مکھی سے کب کم ہو سکتی ہے۔

نے تو اعطینک کوثر خواندہ　　　پس چرا خشکی و تشنہ ماندہء

کیا تم نے اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ نہیں پڑھی ہے۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ وحی والہام کا کوثر قیامت تک جاری رہے گا۔ پس جبکہ یہ بات ہے تو تم کیوں خشک اور پیاسے رہو

یا مگر فرعونی و کوثر چو نیل　　　بر تو گشتہ است ناخوش اے علیل

شاید تم فرعون ہو اور کوثر وحی نیل ہے، جو تمہارے آگے خون کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے
اور تم کو وحی کا کوثر پسند نہیں، کیونکہ تم بیمار ہو

ہر کرا دیدی ز کوثر سرخرو　　　او محمد خوست با او گیر خو

جس کو تم کوثر وحی سے سیراب دیکھو، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خو دخصلت پر ہے۔
تم اس کے ساتھ الفت پکڑ و اور اس کی مصاحبت میں رہو

حج کے احرام میں سر اور چہرہ کو کھلا رکھنے کی وجہ اور مقطوع موزہ پہننے اور رنگدار و خوشبودار کپڑا نہ پہننے کا راز

حج کے احرام میں سر اور چہرہ کو کھلا رکھنے میں یہ بھید ہے کہ حج کے سارے مناسک و عبادات اور

حرکات عاشقانہ ہیں۔اور سر و چہرہ کو ڈھانپنا اور روپوش ہونا عاشقانہ طریق اور طرز کے برخلاف ہے۔ اس لئے ان کا کھلا رکھنا مناسب ہوا۔اور رنگدار و خوشبودار کپڑا نہ پہننے اور مقطوع موزہ پہننے میں یہی عاشقانہ روش ملحوظ ہے۔

ترک خوبی میکناند خوبتر　　　عشق را درماں بود معشوق دگر

معشوق کا عشق زیب وزینت عاشق کو ترک کر دیتا ہے

ایک پنجابی شاعر نے دو دردمند بیت اسی بارے میں لکھے ہیں۔

جنہاں نیہوں لایا اوہ کتھوں کردے ہار سنگاراں　　　تن تے لیراں منہ تے مٹی سینہ گرم انگاراں

محبوباندے دردی سٹی انہاں چھتر شاہی　　　بادشاہی دا زیب آرائش انہاں مکھ سیاہی

طواف میں اضطباع کرنے کا راز

ترمذی نے یعلیٰ بن امیّہ سے ذکر کیا کہ بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کعبہ کا طواف بحالت اضطباع کیا۔اور آپ کے اوپر چادر تھی۔

اضطباع یہ ہے کہ چادر ایک طرف بائیں شانہ پر رکھ کر باقی حصہ کو بغل سے دائیں بازو کے نیچے اور سینہ سے گذار کر بائیں شانہ پر رکھا جائے اور سینہ ڈھانپا رہے۔اس طرح دائیں شانہ کو برہنہ اور بائیں کو ڈھانپا ہوا دکھایا گیا ہے۔اس میں یہ راز ہے کہ خفا وظہور غیب اور شہادت باطن وظاہر کو یکجا کر کے دکھایا اور ان میں پیوند و پیوستگی بتائی اور دل کے مقام کو ڈھانپ کر بتایا۔اس میں یہ راز ہے کہ انسان میں یہی مقام غیب ہے،جس سے اسکی پیوستگی عالم آخرت سے ہوتی ہے اور اسی سے عالم شہادت میں اعضاء کے ذریعہ افعال واعمال کا ظہور ہوتا ہے۔اگر دل اعضا کو حرکت نہ دے،تو ان سے کوئی حرکت ظاہر نہ ہو۔یہ نمونہ غیب کی تاثیر کا عالم شہادۃ میں دکھایا گیا ہے اور اس میں یہ ایماء کیا گیا ہے کہ ہر ایک فیض و رحمت اور برکت کا ظہور عالم باطن سے آتا ہے۔اسلئے انسان کو اُس عالم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

تعبیرات حج

☆ جو شخص خواب میں دیکھے کہ اس نے اسلام کا حج اور کعبہ شریف کا طواف کیا اور عبادات حج میں سے کوئی عبادت بجا لایا،تو یہ امر اس کے اصلاح دین اور راہ راست پر قائم رہنے اور ثواب دارین حاصل ہونے اور خوف سے امن پانے اور ادائے قرض و امانت پر دلیل ہے۔

☆ اگر دیکھے کہ حج کے موسم میں حج کو جا رہا ہے،تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اگر وہ ملازمت سے

معطل اور معزول ہو گیا ہو، تو بحال ہو جائے گا۔ اور مسافر ہو، تو سلامت رہے گا اور اگر سوداگر ہو، تو فائدہ حاصل کرے گا اور بیمار ہو، تو شفا پائیگا اور قرضدار ہو، تو اس کا قرض ادا ہو جائیگا اور حج نہ کیا ہو، تو حج کرے گا۔ اور راہ کج پر ہو، تو راہ راست پر آ جائیگا۔

☆ اگر خواب میں دیکھے کہ اس نے حج یا عمرہ کیا، تو اس کی عمر دراز ہوگی۔

☆ اگر خواب میں دیکھے کہ حج کو روانہ ہوا اور ادا نہیں کر سکا، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اگر حاکم ہو گا، تو معزول ہو جائیگا اور سوداگر ہو، تو زیان اٹھائیگا۔ اور مسافر ہو، تو اس کو راہزن لوٹ لیں گے۔ اور تندرست ہو، تو بیمار ہو جائیگا۔

☆ اگر خواب میں دیکھے کہ اس پر حج واجب ہے اور اس نے حج ادا نہیں کیا، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ وہ اپنے آقا اور ولی نعمت کا ناشاکرا اور امانتوں کا خائن ہے۔

☆ جو شخص خواب میں دیکھے کہ وہ اکیلا حج کو چلا جا رہا ہے اور لوگ اس کو رخصت کر رہے ہیں، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ شخص جلدی مر جانے والا ہے۔ اس کی موت قریب آ گئی ہے۔

☆ جو شخص خواب میں دیکھے کہ وہ کعبہ کے حجر اسود کو توڑ رہا ہے، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی رائے پر اکٹھا کر رہا ہے۔

☆ جو شخص خواب میں دیکھے کہ اس نے حجر اسود کو ہاتھ لگا لیا ہے، تو اس کی یہ مراد ہے کہ وہ کسی عظیم الشان شخص کو اپنا امام و متبوع بنائے گا۔

☆ جو شخص خواب میں دیکھے کہ اس نے کعبہ سے کوئی چیز لے لی ہے، تو اس کو خلیفہ وقت سے کچھ حاصل ہوگا۔

☆ خواب میں کعبہ کی دیوار کا گرتا دیکھنا خلیفہ وقت کی موت پر دلالت ہے۔

☆ خواب میں جو کوئی دیکھے کہ کعبہ اس کا گھر ہے، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ وہ لوگوں میں صاحب حشمت و عظمت ہوگا۔

☆ خواب میں جو کوئی دیکھے کہ اس نے کعبہ کے اوپر نماز پڑھی، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ اس کے دین میں خلل واقع ہوگا۔

☆ خواب میں جو کوئی دیکھے کہ اس نے کعبہ کی طرف رخ کیا، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ اس کا دین درست ہوگا۔

☆ خواب میں جو کوئی دیکھے کہ وہ مکہ میں مجاور رہے، تو اسکی یہ تعبیر ہے کہ وہ ارزل عمر کو پہنچے گا۔

☆خواب میں جوکوئی دیکھے کہ وہ مُردوں کے ساتھ ہے اور وہ اس سے کچھ مانگ رہے ہیں، تو اس کی یہ تعبیر ہے کہ وہ شہید ہو کر فوت ہوگا۔

☆☆☆☆☆

کتاب النکاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقاصد نکاح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمَ النَّبِیِّیْن وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَاتِّبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن ۔اما بعد واضح ہو کہ اسرار شریعت جلد اول کی تمہید میں سہولت فہم احکام الٰہی کے قواعد ہم کئی بار لکھ چکے ہیں اور قوانین دقیقہ الٰہیہ کی علتوں کو معلوم کرنے کیلئے ناظرین کو انکے آثارِ مؤثرہ پر نظر کرنے کیلئے توجہ دلا چکے ہیں۔لہٰذا نکاح کے آثارِ مؤثرہ پر نظر کرو گے،تو صاف نمایاں طور پر نکاح کی علت غائی کو مندرجہ ذیل مقاصد واغراض پر مشتمل پاؤ گے۔

۱۔خدا تعالیٰ قرآن کریم کے پارہ۲۱ میں فرماتا ہے۔ خَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً لِتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مُوَدَّۃً وَ رَحْمَۃً ۔ترجمہ۔یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے تم میں سے جوڑے بنائے کہ تم ان سے آرام پکڑ واور تم میں دوستی ونرمی رکھ دی۔

۲۔پھر فرمایا۔ نِسَائُکُمْ حَرْثٌ لَکُمْ ۔یعنی تمہاری عورتیں تمہاری اولاد پیدا کرنے کے لئے بمنزلہ تمہاری کھیتی کے ہیں۔

۳۔پھر فرمایا۔حَافِظَاتٌ لِلْغَیْبِ ۔یعنی تمہاری بیویاں تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے مال و عزت ودین کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

۴۔بی بی آرام وسکون کیلئے بنائی گئی ہے اور غمگسار و ہزاروں افکار میں آرام کا موجب ہے۔ انسان میں طبعی طور پر دوستی اور محبت کرنا ایک فطری امر ہے اور دوستی ومحبت کیلئے بی بی عجیب وغریب چیز ہے۔عورت نازک بدن اور ضعیف الخلقت ہے اور بچوں کو جننے اور گھر کا انتظام رکھنے میں ذمہ دار اور ایک عظیم الشان بازو ہے۔پس اسکے متعلق رحم سے کام لو۔خدا تعالیٰ نے اس کو رحم کیلئے بنایا ہے۔اس کی غفلتوں اور فطرتی کمزوریوں پر چشم پوشی کرو۔

۵۔آدمیوں میں قدرتی طور پر شہوت کا مادہ ہے۔قدرت نے اس کا محل بی بی ہی کو بنایا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ عورت کھیتی ہے اور بیج بونے کے قابل ہے۔جس طرح کھیت کا علاج معالجہ ضرور ہوا

کرتا ہے اور اس میں خاص غرض ہوا کرتی ہے۔ بنا بریں عورت میں بھی خاص خاص اغراض ہیں، جن سے متمتع ہونا چاہیئے۔

۶۔عورت ننگ وناموس اور مال واولاد کی محافظ اور مہتمم ہے۔

۷۔قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی عفت، پرہیزگاری، حفظ صحت وحفظ نسل کے لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔**وَلِيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحاً حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ**۔(سورہ نور) یعنی جو لوگ نکاح کی طاقت نہ رکھیں، جو کہ پرہیزگار رہنے کا اصل ذریعہ ہے، تو ان کو چاہیئے کہ اور تدبیروں سے طلب عفت کریں۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نکاح کرنے پر قادر نہ ہو سکے، اس کیلئے پرہیزگار رہنے کی یہ تدبیر ہے کہ وہ روزہ رکھا کرے۔ اس حدیث کا خلاصہ ترجمہ ذیل میں بصیرت ناظرین کیلئے درج کر دیتے ہیں۔ فرمایا۔ اے نوجوانوں کے گروہ، جو کوئی تم میں سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو، تو چاہیئے کہ نکاح کرے۔ کیونکہ نکاح آنکھوں کو خوب نیچا کر دیتا ہے اور شرم کے اعضاء کو زنا وغیرہ سے بچاتا ہے۔ ورنہ روزہ رکھو کہ وہ خصی کر دیتا ہے۔

جو خواہش مرد کے دل میں عورت کیلئے یا عورت کے دل میں مرد کیلئے ہے، وہ تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ اور اس خواہش کا جائز ذریعہ نکاح کے ذریعہ سے پورا کرنا انسان کے دل میں سچی محبت اور پاکیزگی کے خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ پس نکاح انسان کو پاکیزگی کی طرف لیجانے اور اس کو ناپاکی سے دور رکھنے کا ذریعہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فطری خواہش، جو مرد اور عورت کے دل میں ایک دوسرے کیلئے موجود ہے، اسے گندی یا ناپاک خواہش کے نام سے منسوب کرنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ اس خواہش کو فطرت انسان میں پیدا کرنے والا خود خدا تعالیٰ ہے۔ اور اسی نے اپنی مصلحت اور حکمت سے بعض اغراض کیلئے اس خواہش کو انسان کے نفس میں مرکوز فرمایا ہے۔ ہاں اس کا برا استعمال یعنی ناجائز طریقوں سے اس کا پورا کرنا بیشک انسان کو ناپاکی اور بدی کی طرف لیجانے والا ہے۔

الغرض نکاح کا بڑا مقصد وہی ہے، جسکی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ تعلیم دی ہے کہ پرہیزگار رہنے کی غرض سے نکاح کرو اور اولاد صالح طلب کرنے کیلئے دعا کرو، جیسا کہ وہ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے. **مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ**۔یعنی چاہیئے کہ تمہارا نکاح اس نیت سے ہو کہ تا تم تقویٰ اور پرہیزگاری کے قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حیوانات کی طرح محض نطفہ نکالنا ہی تمہارا مطلب ہو اور محصنین کے لفظ سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو شادی نہیں کرتا وہ نہ صرف روحانی آفات میں

گرتا ہے، بلکہ جسمانی آفات میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ احصان کا لفظ حصن سے مشتق ہے اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں اور نکاح کرنے کا نام احصان اس واسطے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے انسان عفت کے قلعہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بدکاری اور بدنظر سے بچ جاتا ہے اور جسم بھی بے اعتدالی سے بچا رہتا ہے۔ پس گویا نکاح ہر ایک پہلو سے قلعہ کا حکم رکھتا ہے۔

بہت سی آیات اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح شہوت رانی کی غرض سے نہیں، بلکہ بد خیالات اور بدنظری اور بدکاری سے اپنے تئیں بچانے اور نیز حفظ صحت کی غرض سے ہے۔ اور پھر نکاح میں ایک اور بھی غرض ہے، جس کی طرف قرآن کریم کی سورہ فرقان میں یہ اشارہ ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِن اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیَاتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَ اجْعَلنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۔ ترجمہ۔ یعنی مومن وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اپنی بیویوں اور فرزندوں سے دل کی ٹھنڈک عطا کر اور ایسا کر کہ ہماری بیویاں اور ہمارے فرزند نیک بخت ہوں اور ہم کو ان کا پیشرو و امام بنا (فضل۔ احمد۔ نور)

تعریف نکاح یعنی نکاح کیا چیز ہے

نکاح عربی لفظ ہے، جسکے معنی عقد مرد و عورت اور مجامعت کرنیکے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں نکاح نام ہے اس تقریب کا جس میں اعلان عام اور تقرری مہر اور رضائے فریقین سے کسی عورت یا لڑکی کا کسی مرد کے ساتھ رشتہ یا عقد کیا جاتا ہے۔ اس میں اول خدا تعالیٰ کی رضامندی دیکھ لی جاتی ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہے کہ نہیں۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ضابطہ اور عملدرآمد کے موافق ہے یا نہیں۔ پھر لڑکی کے ولی کی رضامندی ضروری ہے۔ اگر ولی رضامند نہ ہوں اور کوئی نکاح ہو جائے، تو ایسے نکاح بدیوں میں مل جاتے ہیں اور انکے نتائج خراب اور ناگوار ہوتے ہیں۔ ایسا ہی لڑکوں اور لڑکیوں کی رضامندی ضروری ہے۔ ان رضامندیوں کے بعد گویا نکاح ہوتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی نارضامندی اور مخالفت ہو، تو پھر اسمیں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مہبط وحی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملدرآمد کے موافق اور ولیوں و طرفین کی رضامندی کے بعد جب ایک فریق منظور کرتا ہے اور دوسرا اس کو قبول کرتا ہے، تو یہ نکاح ہوتا ہے۔

نقصانات تجرد و فوائد نکاح

خدا نے چونکہ آدمی کو بالطبع متمدن بنایا ہے، اسلئے وہ تنہائی و گوشۂ خلوت میں آرام سے زندگی

بسر نہیں کرسکتا اور مجبور ہے کہ وہ اپنے ہمنشین و ہمدم کا خواہشمند ہو۔ جمعیت کا حاصل ہونا اجماع مرد و عورت کے سوا ناممکن ہے۔ لہٰذا ازدواج انسان کیلئے لازمی وضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفروں نے نکاح کو لوازم انسانیت میں سے گنا ہے۔ جو لوگ اس قانون الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اپنی دارینی زندگی کے دشمن ہیں۔

حیوانات میں جماع ایک فطرتی خواہش ہے۔ جب تک اس کا جائز استعمال ہو، وہ کسی طرح بھی مضر نہیں۔ لیکن اگر ناجائز طور پر اس کا استعمال کیا جائے، تو صدہا الم و امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

تجرد ایک گناہ کبیر ہے، جو خلقت کے انتظام پیدائش کا حارج ہے۔ ازدواج سے منشاء اور مراد تکثیر بنی نوع انسانی ہے۔ اور اس ذریعہ سے وطن اور اہل وطن کی خدمتگذاری اور ادائے وظیفہء انسانیت اور تابعداری اور قانون فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام رہبانیت کا سخت مخالف ہے۔ اور خود قرآن شریف میں سخت تاکید اس بارے میں ہوئی ہے۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے زور سے ازدواج کی تاکید فرمائی۔ اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغَبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنَّا۔ ترجمہ۔ یعنی نکاح میری سنت ہے۔ پس جو شخص میری سنت سے پھر جائے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

مجرد کو اس میں فائدہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ عیالداری کے تفکرات سے آزاد رہتا ہے۔ مگر نقصان صدہا ہیں۔ خانہ داری کی برکت اور آسائشوں سے محروم رہنا تھوڑی بات نہیں۔ محبت جو اس دنیا میں نعمت عظمیٰ ہے، اس کے مزے سے مجرد آدمی عمر بھر واقف نہیں ہوتا۔ پھر جنون اور اختناق الرحم اور جمود وغیرہ بیماریاں ایسی ہیں، جو بالخصوص مجردوں ہی کو ہوتی ہیں۔ اور خودکشی کے مرتکب جس قدر مجرد لوگ ہوتے ہیں، اس قدر متاہل نہیں ہوتے۔ یہ بات فوتیدگی کے رجسٹروں سے بخوبی ثابت ہو چکی ہے۔

نوجوان مرد اور عورتیں جنکو شادی کا اتفاق نہیں ہوتا، انکو خواہش جماع کے سبب سخت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس خواہش کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور انسانی کمزوریاں ان کو ایسے مصائب میں ڈالتی ہیں کہ باقی ماندہ عمر مشکلات و بیماریوں میں گذرتی ہے۔ جوان آدمی کیلئے تجرد کی حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا قریباً ناممکن ہے۔ اور بحالت مجبوری اپنی خواہشات کو دوسرے طریق سے پورا کرنا یقینی ہے۔ مجردوں کیلئے جتی رہنا مشکل ہے۔ چھپ کر اغلام رانی یا مشت زنی کرتے ہیں یا رنڈی بازی کی علت ان کو ہو جاتی ہے۔ اس سبب سے ان کی صحت کا بگاڑ اور آبرو کا نقصان ہونا متوقع ہے۔ اور یہ بھی ایک صریح امر ہے کہ جو آدمی روزمرہ بازار سے خرید کر کھانا کھائے اور کوئی مستقل انتظام اپنے گھر کا نہ رکھتا ہو، وہ بہت سا روپیہ برباد کرے گا۔ وہ مدام بے اطمینان و پریشان ہوگا اور اسکی

صحت خراب وغموم وافکار کی افواج کے حملے شب وروز اس پر وارد ہوتے رہیں گے۔

افسوس ہے ان عورتوں پر جو کسی مجبوری سے تنگ آ کر یا شوقیہ اپنی قدر دیکھ کر اس پیشے کو اختیار کرتی ہیں اور اسکے انجام کو نہیں سمجھتیں۔ اگر تمام دنیا کے لوگ اس پیشے پر کمر باندھ لیں اور مجردوں وغیر متاہل لوگوں کا گروہ کثیر ہو جائے، تو بچوں کی پرورش اور معذوروں و بوڑھوں کی خدمت کون کریگا۔ اور دنیا کی گاڑی کس طرح چلے گی۔ جو لوگ بازاری عورتوں سے میل جول رکھتے ہیں اور بالکل آزاد رہنا چاہتے ہیں، وہ غور کریں اور سوچیں کہ بیماری اور بڑھاپے میں انکا کون خدمتگار و مددگار وغمگسار ہوگا۔

نکاح کرنے سے انسان پابند ہو جاتا ہے۔ مستعدی کے ساتھ کمانے کی فکر کرتا ہے۔ اور ناجائز کام کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ محبت، حیا، فرمانبرداری اس میں پائی جاتی ہے۔ وہ نہایت کفایت شعاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور بیشمار امراض سے بچا رہتا ہے۔

جس جمعیت کے لئے انسان فطرۃً مجبور و مجبول ہے، وہ تزوج زوجین علی وجہ المعروف ہے۔ یہ امر مفید صحت۔ اطمینان بخش۔ راحت رساں۔ سرور افزا۔ کفایت آمیز۔ مترقی ء زندگی دارین ہے۔ اخلاقی یا مذہبی نقطہء نگاہ سے اس امر پر غور کرو گے، تو اس کو سراسر فائدوں سے معمور پاؤ گے۔ طریق معیت کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ حب الوطنی کی یہی جڑھ ہے اور ملک وقوم کے لئے اعلیٰ ترین خدمات میں سے ہے۔ بیماریوں سے بچانے اور صدہا امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ ایک حکمی نسخہ ہے۔ اگر یہ قانون الٰہی بنی آدم میں نافذ نہ ہوتا، تو آج دنیا سنسان ہوتی۔ نہ کوئی مکان، نہ کوئی باغ، نہ کسی قوم کا نشان باقی رہتا۔

وجوہات تعدّد از دواج

ا۔ منجملہ وجوہات تعدّد از دواج سب سے مقدم حفظ تقویٰ یعنی پرہیزگار رہنا اور بدی سے بچنا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی پیاری چیز ہے کہ اس کا خیال ہر انسان کو باقی سب باتوں پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ قدرت نے بعض آدمیوں کو عام آدمیوں کی نسبت زیادہ قوی الشہوت بنایا ہے اور ایسے آدمیوں کے لئے ایک عورت کافی نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ان کو جائز طور پر دوسرا یا تیسرا یا چوتھا نکاح کرنے سے روکا جائیگا۔ تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ تقویٰ کو چھوڑ کر بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ زنا ایک ایسی بدکاری ہے، جو انسان کے دل سے ہر ایک پاکیزگی اور طہارت کا خیال دور کر دیتی ہے۔ اور اس میں ایک خطرناک زہر پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے لئے جو قوی الشہوت ہیں ضرور کوئی ایسا علاج ہونا چاہئے، جس سے وہ زنا جیسی سیاہ کاری میں پڑنے سے بچے رہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ قوی الشہوت آدمیوں کو ایک سے

زیادہ عورتوں کی حاجت پڑے گی، یہ بات اظہر من الشّمس ہے۔

۲۔عورت سارا وقت اس قابل نہیں ہوتی کہ خاوند اس سے تعلقات زناشوی پیدا کر سکے۔ کیونکہ لازمی طور پر عورت پر ہر مہینے میں کچھ دن ایسے آتے ہیں، یعنی ایام حیض، جن میں مرد کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔اس کے برعکس مردوں پر کوئی ایسا وقفہ نہیں آتا۔

۳۔ایام حمل میں عورتوں کو خصوصاً اس کے پچھلے مہینوں میں اپنی اور اپنے جنین کی صحت کی خاطر مرد سے جماع کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔اور یہ وقفہ بعض صورتوں میں بہت لمبا ہوسکتا ہے۔

۴۔وضع حمل کے بعد بھی کچھ مدت تک عورت کو مرد سے جماع کرنے سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔

اب ان تمام اوقات میں جبکہ عورت کے لئے یہ قدرتی روکیں پیدا ہو جاتی ہیں، خاوند کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ کثرت سے ایسے مرد پائے جاتے ہیں، جو ان وقفوں میں دوسری عورت سے شادی کرنے کے بغیر تقویٰ کو قائم رکھ سکتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ کوئی عقلمند اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا میں قوی الشہوت آدمی بھی موجود ہیں۔اور اس قوت کا زیادہ ہونا کسی صورت میں ان کے لئے باعث الزام نہیں ہے، جن کو اگر ان یا اس قسم کے اور وقفوں کے اندر دوسری عورت سے نکاح کی اجازت نہ دی جائے، تو پھر وہ اس خواہش کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کریں گے۔

۵۔گرم ملکوں میں عورتیں بہت تھوڑی عمر میں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں۔اس لئے ان ممالک میں شادی کا زمانہ عمر کے لحاظ سے نوجوانی کا ہوتا ہے۔ان پر بڑھاپا بھی بہت جلد آجاتا ہے۔اس لئے عقل اور خوبصورتی دونوں ایک وقت میں جمع نہیں ہونے پاتیں۔ جب کہ خوبصورتی کا یہ تقاضا ہے کہ عورت حکومت کرے۔مگر عقل اور تجربے کا فقدان اس کے راستے میں روک بن جاتے ہیں۔ پھر جب عقل اور تجربہ حاصل ہوتا ہے، تو خوبصورتی نہیں رہتی۔اس لئے عورتوں کو ایک محکومی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔عقل اور تجربہ بڑھاپے میں جا کر وہ حکومت پیدا نہیں کر سکتے، جو جوانی اور خوبصورتی کے ہوتے ہوئے نہ کر سکے تھے۔اسلئے یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ ان ممالک میں تعدّد ازدواج کا رواج ہو۔

۶۔مردوں کی نسبت عورتوں کے قویٰ بڑھاپے سے جلدی متاثر ہوتے ہیں۔پس جہاں مرد کے قویٰ بالکل محفوظ ہوں، جیسا کہ وہ اکثر حالات میں ہوتے ہیں، جب کہ عورت بوڑھی ہو چکی ہوتی ہے، تو دوسری عورت سے نکاح کرنا بسا اوقات مرد کے لئے ایسا ہی ضروری ہو جاتا ہے، جیسا کہ پہلے کسی وقت

پہلی عورت سے نکاح کرنا ضروری تھا۔ پس جو قانون تعدّ داز دواج سے روکتا ہے، جو مردوں کو جن کے قویٰ خوش قسمتی ہے بڑھاپے کی عمر تک محفوظ رہیں، یہ راہ بتاتا ہے کہ وہ ان قویٰ کے تقاضے کو زنا کے ذریعے پورا کریں۔ایسا قانون عام انسانوں کی حالتوں کے مطابق کیونکر ہوسکتا ہے۔

۷۔ مذکورہ بالا ضروریات تو مردوں کی ہیں۔مگر خود عورتوں کو بعض وقت ایسی مجبوریاں آن پڑتی ہیں کہ اگر ان کے لئے یہ راہ کھلی نہ رکھی جائے کہ وہ ایسے مردوں سے نکاح کرلیں،جن کے گھروں میں پہلے سے عورتیں موجود ہیں،تو اس کا نتیجہ بدکاری ہوگا۔ایک ہی امر پر غور کرو کہ کس طرح ہر سال دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں لاکھوں مردوں کی جانیں لڑائیوں میں تلف ہو جاتی ہیں، جب کہ عورتیں اکثر محفوظ رہتی ہیں۔اگر پرانی مثالوں کی طرف نہ جائیں،تو ذیل کی تازہ دو مثالیں ہی اس دلیل کی صداقت کا کافی ثبوت ہیں۔یعنی انگلستان کی لڑائی بوئروں کے ساتھ، جو جنوبی افریقہ میں ہوئی،اور روسیوں اور جاپانیوں کی لڑائی ، جو ابھی ختم ہوئی ہے۔اس لڑائی میں طرفین سے قریباً پانچ لاکھ مرد تلف ہوئے۔اب ایسے واقعات ،یعنی جنگوں میں مردوں کی جانوں کا تلف ہونا، ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔اور جب تک دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں ایسے واقعات ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گےاور ہمیشہ ان کے سبب مردوں کی تعداد میں کمی ہوکر عورتوں کی تعداد کا بڑھ جانا ایک لازمی امر ہے۔اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ عورتوں کی تعداد کی یہ زیادتی کسی قوم میں ہمیشہ کے لئے نہیں رہتی،تاہم اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک مدت تک مردوں کی اس کمی کا اثر ضرور رہے گا، جو اس طرح پر پیدا ہوگی۔اب یہ عورتیں جو مردوں کی تعداد سے زیادہ ہوں گی،ان کے لئے کیا حل سوچا گیا ہے۔تعدداز دواج کی ممانعت کی صورت میں ان کا کیا حال ہوگا۔کیا ان کو یہی جواب نہیں ملے گا کہ جس کے دل میں مرد کے وہ خواہش پیدا ہو، جو قدرت نے فطرت انسانی میں رکھی ہے، وہ ناجائز طریقوں سے اسے پورا کرے۔سوچ کر دیکھ لو کہ تعدداز دواج کی راہ کو بند کرکے ان لاکھوں عورتوں کو، جو اس طرح لڑائیوں کے سبب بیوہ ہوگئیں یا جن کے لئے نکاح کے ذرائع نہیں رہے، یہ جواب دینا پڑے گا۔عیسائیوں پر افسوس ہے کہ ایک غلط اصول کی حمایت میں انسانی ضروریات پر ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے۔ وہ نہیں سوچتے کہ تعدداز دواج کے سوا اور کوئی ایسی راہ نہیں ہے، جو ان ضروریات کو پورا کرسکے۔

اب ہم سوال کرتے ہیں کہ اس بات پر فخر کرلینا تو آسان ہے کہ ہم تعدّ داز دواج کو برا سمجھتے ہیں،مگر یہ بتایا جائے کہ ان کم از کم چالیس لاکھ عورتوں کے لئے یورپ نے کونسا قانون تجویز کیا ہے،جن کو یورپ میں خاوند نہیں مل سکتے۔سوال یہ ہے کہ جو قوانین انسانوں کے لئے تجویز کئے جاتے ہیں، وہ

انسانوں کی ضرورت کے مطابق بھی ہونے چاہئیں یا نہیں۔ وہ قانون، جو تعدّد ازدواج کی ممانعت کرتا ہے، وہ ان چالیس لاکھ عورتوں کو یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف چلیں اور ان کے دلوں میں مردوں کے لئے کبھی خواہش پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ تو ناممکن امر ہے جیسا کہ خود تجربہ ثابت کر رہا ہے۔ پس نتیجہ یہ ہوگا کہ جائز طریق سے روکا جانے کے باعث وہ ناجائز طریق اختیار کریں گی۔ اس طرح پر ان ممالک میں زنا کی کثرت ہوگی۔ یہ تعدّد ازدواج کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ امر کہ زنا اس ذریعہ سے زیادہ پھیلے گا۔ یہ محض خیال ہی خیال نہیں، بلکہ امر واقع ہے، جیسا کہ ہزارہا ولد الحرام بچوں کی تعداد سے ثابت ہو رہا ہے، جو یورپ میں ہر سال پیدا ہوتے ہیں۔

۹۔ نکاح کی اغراض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے لئے بطور رفیق کے ہوں۔ پس اگر کوئی وجہ ایسی پیدا ہو جائے، جس کے سبب عورت مرد کے لئے بطور رفیق کے نہ رہے یا اس سے اس کو وہ خوشی حاصل نہ ہو سکے، جو ایسے رفیق سے ہونی چاہئے، تو ان صورتوں میں بھی مرد کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ مثلاً اگر عورت کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے، جو اس کو ہمیشہ کے لئے یا بڑے بڑے وقفوں کے لئے ناقابل کر دے، یعنی اس امر کے قابل نہ رہنے دے کہ خاوند اس سے تعلقات زناشوی رکھ سکے، تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں نکاح کی اصل غرض کو مرد دوسرے نکاح کے ذریعہ سے پورا نہ کرے۔ جیسا کہ انسانی زندگی کے حالات کا دائرہ وسیع ہے، ویسا ہی ان ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہے، جو بعض وقت مرد کو دوسرا نکاح کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ایسی ضروریات اکثر پیدا نہیں ہوتیں۔ مگر جب واقعی پیدا ہو جائیں اور یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی سوسائٹی میں وہ کم و بیش پیدا ہوتی رہیں، تو سوائے تعدّد ازدواج کے اور کوئی ذریعہ ان کے پورا ہونے کا نہیں۔ پس اس علاج کو روکنا بیماریوں کو بڑھانا ہے۔ ایسا ہی تعدّد ازدواج اکثر حالات میں طلاقوں کی کمی کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

۱۰۔ قدرت نے عورت کو وہ سامان دیئے ہیں، جو مرد کے لئے باعث کشش ہیں۔ اور مرد و عورت کے تعلق میں فریفتگی اور کشش کی ان موجبات کی موجودگی ایک نہایت ضروری امر ہے۔ اور صرف اس صورت میں نکاح بابرکت ہوسکتا ہے کہ ایسے سامانِ کشش عورت میں موجود ہوں۔ اور اگر عورت میں ایسے سامان موجود نہ ہوں یا کسی طرح سے جاتے رہیں، تو مرد کو عورت سے وہ تعلق نہیں ہوسکتا۔ پس ایسی صورت میں اگر خاوند کو دوسری شادی کی اجازت نہ دی جائے، تو یا تو وہ کوشش کرے گا کہ کسی طرح اس عورت سے نجات حاصل کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو بدکاری میں مبتلا ہوگا اور ناجائز تعلق پیدا کرے گا۔ کیونکہ جب عورت کی رفاقت سے اسے وہ خوشی حاصل نہ ہو سکے، جس کا حصول فطرت انسانی چاہتی

ہے، تو ناچار اس خوشی کے حصول کے لئے وہ اور ذریعے تلاش کرے گا۔ ان صورتوں کے لئے تعدّد ازدواج ہی ایک علاج ہے اور اسی سے ایک گھرانا خوشحال ہوسکتا ہے۔

۱۱۔ تعدد ازدواج کی روک سے بعض صورتوں میں نکاح کی تیسری غرض یعنی بقائے نسل انسانی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اگر ایک عورت بانجھ ہو اور اس کا عقم ناقابل علاج ہو، تو تعدد ازدواج کی ممانعت کی صورت میں قطع نسل لازم آئے گی یہ بیماری عورتوں میں بہت پائی جاتی ہے اور سوائے تعدد ازدواج کے اور کوئی راہ نہیں، جس سے یہ کمی پوری ہو سکے۔ ایسی صورت میں عورت کو طلاق دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ اور ممکن ہے کہ عورت اور مرد میں ایسی محبت ہو کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکتے ہوں۔ بقائے نسل کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ ایسی صورتوں میں مرد کو نکاح ثانی کی اجازت دی جائے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی قسم کی وجوہات ہیں، جو تعدد ازدواج کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ مگر ان سب کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے۔

اصل سبب تعدد ازدواج کا بدکاریوں سے بچنا ہے۔ جو لوگ بحثوں میں تعدد ازدواج کے مخالف ہیں، ان کو اندرونی خواہشات اور افعال کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ صرف کمزور، جلق کے عادی، مخنث طبع، عدیم الفرصت لوگ اس فکر سے مستثنیٰ ہیں۔ جس قوم نے زبان سے تعدد ازدواج کا انکار کیا ہے، وہ عملی طور پر ناجائز اور ناپاک تعدد ازدواج یعنی زنا کاری میں گرفتار ہوئی۔ ان کی خواہشوں کی وسعت اور دست درازی نے ایک عورت پر قناعت نہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ فطرت میں تعدد ازدواج اور تنوع کی آرزو ضرور پائی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کے قانون کا یہ مقتضا ہونا چاہئے کہ وہ انسان کی وسیع خواہشوں اور اندرونی سیلانوں پر مطلع اور حاوی ہو کر ایسی ترتیب اور طرز پر واقع ہو کہ مختلف جذبات والی طبائع کو بھی تقویٰ اور طہارت کے دائرے میں محدود رکھے۔

مرد کے لئے تعدد ازدواج چار تک محدود ہونے کی وجہ

۱۔ مرد کے لیے چار عورتیں منکوحہ تک محدود ہونے کی وجہ خدا تعالیٰ کی کمال حکمت و اتمام نعمت و مصلحت و رحمت پر مبنی ہے۔ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ مرد کو قوتیں و طاقتیں بہ نسبت عورت کے زیادہ عطا کی گئی ہیں۔ اس لئے وہ کئی عورتوں سے ایک زمانہ میں نکاح کرسکتا ہے۔ تعدد ازدواج کی حقیقت نکاح کی علت غائی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ سو نکاح کی علت غائی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، سب سے اول و اہم تقویٰ و عفت و غرض اولاد ہے۔ لہٰذا چونکہ تمام بنی آدم کی قوت یکساں نہیں ہوتی، اس لئے خدا نے انکی طاقتوں و قوتوں کے مناسب حال انکے لئے اسباب فراہم کئے ہیں۔ جن اشخاص کو ہیجان و توقان شہوت

زیادہ ہو،ان کی حفاظتِ عفت کے لئے ہر سال میں چار عورتیں نوبت بنوبت ان کے پاس ہونی چاہئیں اور ایسے آدمیوں کیلئے یہ عدد عین قانون قدرت کے مطابق ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جب ایک عورت کو نکاح میں لائیگا، تو کم ازکم یہ عورت اس کے لئے تین ماہ تک کافی ہے۔ کیونکہ حمل کی شناخت کم ازکم تین ماہ تک مقرر ہے۔ پس اگر اس میعاد میں اس عورت کو حمل ٹھہر جائے، تو ایسے ہیجان و جوش شہوت والا آدمی اگر اس عورت سے صحبت کرے گا، تو جنین پر بُرا اثر پڑے گا اور حمل کے گر جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اس عورت کو آرام دے کر اور اس سے صحبت ترک کر کے دوسری عورت نکاح میں لائیگا۔ اگر دوسری عورت کو بھی تین ماہ تک اقرار حمل ہو جائے، تو اس سے بھی صحبت ترک کرنی پڑے گی، کیونکہ اس سے اسقاط حمل کا اندیشہ ہے اور والدین کے شہوانی جوش جنین پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ چھ ماہ ہوئے۔ اب تیسری عورت سے نکاح کرے گا۔ اگر تیسری عورت کو بھی حمل ہو جائے گا، تو اس سے بھی اس کو صحبت ترک کرنی پڑے گی۔ یہ نو ماہ ہوئے۔ اب پہلی عورت کا وضع حمل ہو جائیگا۔ مگر وہ غالبًا تین ماہ تک قابل صحبت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کو چوتھی عورت نکاح میں لانی پڑے گی۔ اب چوتھی عورت کے حمل کی شناخت بھی تین ماہ تک مقرر ہے۔ یہ ایک سال ہوا۔ اور اس اثناء میں پہلی عورت، جس کو وضع حمل سے تین ماہ گذر چکے ہیں، تعلقات زناشوی کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اس طرح وضع حمل کے بعد ہر ایک نوبت بنوبت اس کے لئے مہیا ہو گی۔ پس یہ تعداد ہر ایک قوی الشہوت انسان کے لئے کافی اور عین قانون قدرت وفطرت کے مطابق ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے جو قرآن کریم میں دو دو تین تین چار چار تک فرمایا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ بعض آدمیوں کے لئے ہر سال میں دو ہی عورتیں کافی ہو سکتی ہیں، کیونکہ بعض عورتوں کو اولاد نہیں ہوتی یا دیر سے حمل ٹھہرتا ہے۔ اور بعض کے لئے سال میں تین ہی کافی ہوتی ہیں اور بعض کو چار تک کی ضرورت پڑتی ہے۔

حاملہ کے ساتھ منع صحبت کی وجہ ایک تو اندیشہ اسقاط حمل ہے۔ دوسرا اس حمل سے جو اولاد ہو گی، اس کے اخلاق و اطوار میں والدین کے شہوانی جوش مرکوز ہو کر بداخلاقی پیدا کریں گے۔ کیونکہ جوش شہوت کا اثر جنین پر بالضرور پڑتا ہے۔ اور وہ طبع میں فطری ہو جاتا ہے۔ طبّی قاعدے کی رو سے دودھ پلانے والی سے صحبت کرنی بچے کے لئے مضر ہے۔ لیکن اطباء نے اس امر کی اصلاح بعض ادویہ کے ساتھ بتائی ہے۔ لہٰذا یہ امر بھی قادح نہ رہا۔

۲۔ ضرور تھا کہ ایک خاص حد بیویاں کرنے کی مقرر ہوتی، ورنہ اگر حد مقرر نہ ہوتی، تو لوگ حد اعتدال سے نکل کر صدہا تک بیویاں کرنے میں نوبت پہنچاتے اور ان پر اور اپنی جانوں پر اس طرح سے

ظلم اور بے اعتدالیاں کرتے۔

۳۔ چار عورتوں تک مرد کیلئے محدود ہونے کی وجہ آدمی کے مزاج طبیعت اور اسکے چار ارکان اور سال کی چار فصلوں کے لحاظ پر ہے۔ کیونکہ جس انسان کی توقان شہوت اپنے کمال کو ہوگی، وہ اپنے ارکان اربعہ وقدرتی فصول اربعہ کے عدد سے متجاوز نہ ہوگی، جس کے لئے چار کا عدد رکھا گیا ہے۔

۴۔ چار سے زیادہ بیویاں کرنا اس لئے منع ہوا کہ زیادہ بیویاں کرنے سے لوگ بیویوں کے حقوق کو کماحقہ بجانہ لائیں گے۔ اور اس طرح سے ان پر جورو جفا وظلم ہوگا۔

۵۔ مرد کے لئے چار عورتوں تک محدود ہونیکی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ جب ایک قوی الشہوت مرد کی چار عورتیں ہوں، تو اسکے لئے لازم ٹھہرایا گیا کہ وہ ہر تیسرے دن کے بعد ان میں سے ایک کے پاس شب باشی کرے۔ اور ایک شب سے کم میں نوبت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور ایسے وقت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے کسی کے پاس شب باشی کی۔ اور تین عربی زبان میں کثرت یعنی جمع کی پہلی حد ہے اور چار اس کی زیادتی ہے۔ الغرض تین کا وہ پہلا عدد ہے، جس سے جمع کا مرتبہ شروع ہوتا ہے۔ شارح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین کے عدد کے ساتھ بہت سے احکام معلق فرمائے ہیں۔ مہاجر کے لئے جائز رکھا کہ حج کرنے کے بعد مکہ میں تین دن رہے اور مسافر کے لئے مباح کیا گیا کہ موزوں پر تین دن رات مسح کرے۔ اور لازم مہمانی کی حد تین دن تک ٹھہرائی گئی۔ اور عورت کے لئے مباح کیا گیا کہ اپنے شوہر کے سوا والدین وغیرہ اقربا کا تین دن سوگ رکھے۔ اور سوکن پر رحم ہوا کہ اس سے اس کے شوہر کی جدائی تین دن تک ہو۔

علامہ شیخ حسین افندی جسر باشندہ ملک مصر مؤلف رسالہ حمیدیہ نے مرد کے لئے چار عورتوں تک محدود ہونے کی وجہ بیان کرنے میں سخت غلطی کی ہے۔ علامہ موصوف اپنے رسالہ حمیدیہ صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں۔ وَ كَانَ حَصْرُ التَّعَدُّدِ بِالْاَرْبَعِ لِمُقَابَلَةِ كُلِّ وَاحِدَةٍ بِنَوْعٍ مِنْ اَنْوَاعِ الْمُكَاسِبِ الَّتِي يَرْتُزَقُ مِنْهَا الْاِنْسَانُ وَ يَنْفِقُ عَلٰى زَوْجَتِهٖ وَ هِيَ التِّجَارَةُ وَالصَّنَاعَةُ وَالْفَلَاحَةُ وَالْاَمَارَةُ وَ قَدْ تَكُوْنُ اِحْدَاهَا وَافِرَةً فَتَقُوْمُ مَقَامَ الْبَقِيَّةِ۔ ترجمہ۔ یعنی عورتوں کا مرد کے لئے چار تک محدود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر عورت کے مقابلہ میں انواع مکاسب میں سے ایک نوع کسب کے ہونے کے لئے ہے، جن سے انسان روزی کماتا اور اپنی بیوی پر خرچ کرتا ہے۔ اور مکاسب یہ ہیں۔ صناعت۔ زمینداری۔ تجارت۔ امارت۔ اور کبھی ان پیشوں میں سے ایک ہی وافر ہوتا ہے۔ پس وہ باقیوں کے قائم مقام ہوجاتا ہے، جس سے مرد کی چاروں بیویوں کی گذران ہوسکتی ہے۔

ہم کہتے ہیں علامہ موصوف کی یہ فلسفی ایسی ہی ہے، جیسا سعدیؒ کہتا ہے۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است　　　تو معتقد آنی کہ زیستن ز برائے خوردن است

واضح ہو کہ خداتعالیٰ نے قرآن کریم میں نکاح کی علت غائی حفظِ تقویٰ و عِفت و غرض اولاد بیان فرمائی ہے۔ مگر علامہ موصوف کے مضمون مذکور کو نکاح کی علت غائی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اعمال و احکام شریعت میں تقرری اعداد کی حکمت

ہر چیز کی تین حدیں مقرر ہیں۔ قلیل۔ وسط۔ کثیر۔ یعنی ابتداء۔ درمیان۔ انتہاء۔ جمع قلیل کی ابتدا تین سے شروع ہو کر نو پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور جمع کثیر کی ابتداء دس سے شروع ہو کر ہزارہا تک پہنچتی ہے۔ شریعت میں بعض اعمال ایسے ہیں کہ اگر جمع قلیل کی ابتدائی حد سے ان میں تجاوز کیا جائے، تو عامل کو اس سے یا تو ملال خاطر لاحق ہوتا ہے یا وہ عمل ہی حکمت تشریع سے خارج ہو کر فاسد ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نور نبویؐ نے اکثر اعمال کے لئے جمع قلیل کا ابتدائی عدد تین اختیار فرمایا ہے، جو وسط کی ابتداء اور اعمال کے خاتمہ و تکمیل پر دال ہے۔ اور خَیْرَ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا میں داخل ہے۔ وجہ یہ کہ تین کا عدد واحد و تثنیہ کی حد سے نکل کر جمع پر پہنچا ہے، جو تکمیل اعمال پر دال ہے۔ اسی حکمت پر مسح موزہ مسافر کے لئے تین دن رات کی حد ہوئی۔ اندام وضو کو تین بار دھونا ٹھہرا۔ رکوع میں تسبیح کی حد تین بار ہوئی۔ جس کی چار عورتیں ہوں، اس کو ہر عورت کے پاس بشرط صحت جانبین ہر تیسرے دن کے بعد شب باشی کا حکم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سے اعمال ہیں، جن کی تکمیل تین پر آ کر ہوتی ہے۔

احکام الٰہی میں چار جو جمع قلیل کا دوسرا عدد ہے، نمود ترقی مدارج پر دال ہے۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج کی تحدید کا عدد اپنے نبیؐ کی ازدواج کے عدد سے نصف یعنی چار مقرر ہونا اس امر پر دال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے فیوض کا دروازہ اپنی امت کے لئے قیامت تک کھلا ہے۔ اس میں امت کو استفادہ و استفاضہ روحانی کی امید دلائی گئی ہے۔ اگر امت کی ازدواج کی تحدید کا عدد تین مقرر ہوتا، تو یہ بات اس امت کی خیر متعدی پر دال نہ ہوتی، کیونکہ تین اعمال کے اختتام کی آخری حد ہے اور چار نمود ترقی کا ابتدائی عدد ہے، جو خیرات متعدیہ و فیوض جاریہ پر دال ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ امت بہترین امم ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج کی تحدید کے لئے جمع قلیل کا آخری عدد نو مقرر ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالتِ شان و بعد مرتبہ و آخری کمالات انسانی کے پہنچنے پر دال ہے اور نیز اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص آنے والا نہیں ہے، جس کا مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فوق ہو۔ کیونکہ یہ عدد اس بات پر دال ہے کہ آپ تمام کمالات

انسانی کے جامع اور خاتم الانبیاء تھے۔اگر آپ کی ازدواج کا آخری تحدیدی عدد دس یا اس سے اوپر ہوتا تو اس میں یہ حکمت امت کے لئے مفقود ہوتی، کیونکہ اعشار کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

احکام الٰہی کی حکمتوں میں تعدد کی وجوہات

جبکہ اس بات کا تجربہ ہو چکا اور یہ امر مسلم شدہ ہے کہ ایک ایک دوا صدہا امراض کے لئے کافی ہوتی ہے، تو پھر یہ امر کیوں کہ ناممکن شمار ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی حکمتوں میں تعدّد نہ ہو۔ پس جیسا کہ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ادویہ کے خواص میں تعدّد ہے، ایسا ہی اس کے احکام کی مصلحتوں و حکمتوں میں تعدّد ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بہ نسبت اپنی امت کے زیادہ بیویاں کرنے کی وجہ

ا۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِنَ النِّسَاءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۔ ترجمہ۔یعنی پس نکاح کرو جو تم کو پسند ہو عورتوں میں سے دو دو تین تین اور چار چار۔اس آیت کے نزول سے پہلے کئی صحابہ کرام و نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی چار سے زیادہ عورتیں نکاح میں لا چکے تھے، کیونکہ اس سے پہلے اہل عرب میں تزویج عورات کی کوئی شرعی تحدید معین ومقرر نہ تھی۔اور انبیاء علیہم السلام اپنی طرف سے کوئی امر و نہی کسی کام کے متعلق پسند نہیں کرتے، جب تک ان کے لئے حکم الٰہی نازل نہ ہو۔ جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلام الٰہی فرمایا اَمۡسِکۡ اَرۡبَعاً وَ فَارِقۡ سَائِرَھُنَّ ۔یعنی چار رکھو اور باقی سب کو چھوڑ دو۔اور آپ کو اپنی موجودہ بیویوں کے متعلق حکم الٰہی پہنچا کہ ان کو طلاق مت دو، بلکہ ان کو اپنے پاس رہنے دو۔اور آئندہ کبھی کسی عورت سے نکاح نہ کرو۔ کیونکہ جبکہ امت کو آپ کی متعلقہ عورتوں سے بوجہ شرافت وکرامت وعظمت نبیؐ نکاح کرنا حرام ہوا، تو ان کا نبیؐ سے علیحدہ ہونا ان کے لئے سخت مشکلات کا پیش خیمہ بنتا۔

۲۔انبیاء کا یہ خاصہ ہے کہ جب تک حکم الٰہی نہ پہنچے، وہ خواہ مخواہ کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں ٹھہراتے اور نہ اس میں دخل دیتے ہیں۔ چونکہ اہل عرب میں قبل از بعث نبویؐ تحدید ازدواج کا کوئی قانون مقرر نہ تھا، لہٰذا اسی رواج کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بلا تعین تعداد کئی عورتوں کو اپنے نکاح میں لا چکے تھے۔جب تحدید ازدواج کا حکم الٰہی نازل ہوا، تو صحابہ کرام کو چار کے سوا باقی عورتوں کو چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر ہوا کہ جس قدر عورتیں نکاح میں لا چکے ہیں، ان کو اپنے نکاح میں رہنے دیں اور آئندہ کسی عورت کو نکاح میں نہ لائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے طلاق دینے سے روکا گیا کہ اگر آپ بعض عورتوں کو طلاق دیتے، تو جن دینی اغراض کے لئے ان کو نکاح میں لائے تھے وہ مفقود ہو جاتیں۔ دوسرا یہ کہ اپنے نبیؐ کی مطلقہ سے کوئی امتی شخص نکاح کرتا، تو اس سے حقارت نبی متصور ہوتی۔ اور عظمت نبی کا خیال اس کے دل سے مفقود ہو جاتا۔ اور یہ امر تابع نبی کے لئے مضر ترین امور میں سے ہے۔ اور اگر طلاق کا حکم تو نافذ ہو جاتا، مگر مطلقہ کو نکاح میں لانے کی ممانعت ہوتی، تو اس عورت کی پرورش اور خبر گیری کرنیوالا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا خدا نے اس باب کو ہی مسدود کر دیا۔

الغرض نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زیادہ بیویاں کرنا اس غرض سے نہ تھا، جیسے کہ ہمارے مخالف آریہ وعیسائی اعتراض کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کا یہ کام انسانی ہمدردی ومصلحت الٰہی سے تھا۔

کار پاکاں بر بداں کردن قیاس　　کار ناپاکاں بود اے بد حواس
خود نگہ کن آں یکی زندانی است　　واں دگر داروغہء سلطانی است
گرچہ در یکجاست ہر دو در اقرار　　لیک فرقے ہست دروے آشکار
کاملاں کز شوق دلبر مے روند　　باد و صد بارے سبکتر مے روند
ایں کمال آمد کہ با فرزند و زن　　از ہمہ فرزند و زن یکسو شدن
در جہان باز بیروں از جہاں　　بس ہمیں آمد نشان کاملاں
فانیاں را مانعے از یار نیست　　بچہء و زن بر سر شاں بار نیست
باد و صد زنجیر ہر دم پیش یار　　خار با او گل، گل اندر ہجر خار
تو بیک خارے برآری صد فغاں　　عاشقاں خنداں بپائے جانفشاں

۳۔ انبیاء کے لئے بعض ایسی خصوصیتیں ہیں، جن میں اوروں کو اشتراک نہیں ہے۔ انبیاء کو بعض صفات قدسیہ وآسمانی نسبتیں وقوتیں ایسی عطا ہوتی ہیں، کہ وہ اوروں کو نہیں دی جاتی ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بسا اوقات بہ نفس نفیس ایسے اعمال بجالاتے تھے کہ جن کی بنا پاکی وطہارت پر تھی مگر ان کا اپنی امت کو حکم نہیں دیا کرتے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے مامون تھے کہ کسی شے کو بے محل و بے موقعہ استعمال کریں یا جس حد تک ان اعمال کو عمل میں لانیکا حکم دیا گیا اس سے بڑھ کر ملال خاطر اور ضعف جسمانی کی نوبت پہنچے اور بجز آپ کے کوئی شخص اس بات سے مامون نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کو چار بیویوں سے زیادہ کرنے سے منع کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا اَمۡسَکۡ اَرۡبَعاً وَ فَارِقۡ سَائِرَھُنَّ ۔ ترجمہ۔ یعنی چار عورتیں اپنے پاس منکوحہ رکھ لو اور باقی سب

کو چھوڑ دو۔

۴۔ جیسا کہ آپ بنی آدم کے مَردوں کے لئے رسول تھے، ایسا ہی عورتوں کے بھی رسول تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ کچھ عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی صحبت میں رہ کر آنحضرتؐ سے تعلیم پا کر دوسری عورتوں تک تعلیم و تبلیغ اسلام کریں۔ سو اسی غرض کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نسبت اپنی امت کے زیادہ بیویاں کی ہیں۔

۵۔ آپ کی جسمانی و روحانی قوت بہ نسبت اَوروں کے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ آپ صومِ وِصال یعنی روزے پر روزہ رکھ لیا کرتے تھے، مگر امت کو اس سے منع فرمایا۔ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ تو صومِ وِصال رکھتے ہیں۔ فرمایا تم میں مجھ سا کون آدمی ہے۔ اُبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یُسْقِیْنِیْ۔ ترجمہ۔ یعنی میں اپنے پروردگار کے پاس شب باش ہوتا ہوں، وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

۶۔ آپ پر نماز تہجد واجب تھی اور کسی پر واجب نہ ہوئی بلکہ مستحب ہے۔

۷۔ آپ ریاضات و مجاہدات میں تمام امت سے بڑھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیتیں آپ کی مخصوص کثرت ازدواجی پر دلالت کرتی ہیں، جن کی بنا تقویٰ و طہارت و تبلیغ اسلام و انسانی ہمدردی پر ہے۔

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کے متعلق بڑی غلط فہمی عیسائیوں وغیرہ میں ہے۔ آپ کے نکاح جن کی اصل غرض یا تو محض ہمدردی اور ترحم تھا اور یا مختلف قوموں کو ایک کرنا اور جن میں علاوہ ان کے اور کئی ملکی مصالح اور دینی اغراض تھیں۔ ہمارے مخالفین ان کی بنا نفسانی خواہشات بتاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی وللہ علیہ وسلم نے ۲۵ برس کی عمر میں نکاح کیا تو آپ عفت اور پرہیزگاری میں تمام عرب میں مشہور تھے۔ پھر اس کے بعد ۲۵ سال تک یعنی جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زندہ رہیں آپ نے دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا، حالانکہ عرب میں تعدد ازدواج کی رسم بلا قید کسی شرط کے مروج تھی۔ ان لوگوں کا جو ناحق نیک افعال میں بد اغراض تلاش کرتے ہیں یہ فرض ہے کہ اس کا سبب بھی تلاش کریں کہ کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۵۵ سال کی عمر تک، جب آپ بوڑھے ہو چکے تھے، ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح نہ کیا۔ اگر نفسانی خواہشات کسی وقت ایک شخص کے دل پر غلبہ پا سکتی ہیں، تو وہ جوانی کا وقت ہوتا ہے، جب جذبات جوانی جوش میں ہوتے ہیں۔ مگر اس جوانی کے وقت میں آپ نے ایک بی بی پر ایسا اکتفا کیا کہ جس وقت قریش نے جمع ہو کر آپ کو کہا کہ آپ بت پرستی کو برا کہنا چھوڑ دیں، تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور

خوبصورت سے خوبصورت عورتیں آپ سے نکاح کرنے کی خاطر حاضر کرتے ہیں، تو آپ نے کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ بلکہ کہا کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیا جائے، تو بھی میں اس تبلیغ کو نہیں چھوڑ سکتا، جس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور کیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ نفسانی خواہشات کے غلبہ کا وقت جوانی کا وقت ہے اور چونکہ آپ کے اس زمانہ کی نسبت آپ کے سخت ترین دشمنوں کو بھی اقرار ہے کہ آپ اس وقت طہارت، پاکیزگی اور عفت کا نمونہ تھے۔ اس لئے یہ الزام کہ نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے آپ نے شادیاں کیں، آپ کی ذات عصمت مآب پر سخت بہتان ہے۔

۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے اور آخری زمانے میں بڑا بھاری تغیر واقع ہو چکا تھا۔ ابتدائی برسوں میں جب مکہ میں آپ نے تبلیغ شروع کی، تو اگرچہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ اور اذیتیں پہنچتی تھیں، مگر رشتہ داری کے تعلقات بکلی منقطع نہیں ہو چکے تھے۔ خصوصاً ایسے لوگ، جو ذی وجاہت تھے، وہ نسبتاً کفار کے حملوں سے محفوظ تھے اور ان سے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لڑکی ایک کافر سے بیاہی ہوئی تھی۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی عائشہؓ کی منگنی بھی ایک کافر کے لڑکے جبیر بن مطعم سے ہوئی تھی۔ مگر مطعم نے بدیں وجہ انکار کیا کہ اس تعلق سے خوف ہے کہ لڑکا نئے دین میں چلا جائیگا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ اگرچہ ابتداء میں ایسے تعلقات تھے، مگر آہستہ آہستہ یہ تعلقات بالکل منقطع ہو چکے تھے۔ اور کسی مسلمان عورت کا کفار کے ہاتھ پڑ جانا اس کے لئے ہلاکت کا موجب تھا۔ پھر آپ کی ہجرت سے رہے سہے تعلقات بھی کٹ گئے۔ پس مسلمان لڑکیوں یا بیوہ عورتوں کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان خاوند ہی ہوں۔ ان واقعات کو مدنظر رکھ کر ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کو دیکھنا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آپ کی ساری بیویاں بیوہ عورتیں تھیں۔ ان کو ہم الگ الگ جماعتوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ اول وہ عورتیں جنہوں نے اپنے خاوندوں کے ساتھ حبش یا مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اور دوسری وہ عورتیں جو کسی قوم کے سردار کی لڑکیاں یا بیوہ تھیں اور جن کے خاوند لڑائیوں میں مارے گئے۔ ان کا ذکر ہم اس ترتیب سے کرتے ہیں، جس ترتیب سے ان کے نکاح ہوئے۔

اُمّ المؤمنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد سب سے پہلے آپ نے اُمّ المؤمنین

سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ سودہ اور اس کا خاوند ابتداء ہی میں ہجرت کر کے حبش کو چلے گئے تھے اور اس جگہ وہ بیوہ ہو گئیں۔ واپس آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے نکاح کیا۔

اس کے بعد اُمّ المؤمنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ کا نکاح ہوا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لڑکی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ جب آپ بیوہ ہو گئیں، تو حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت عثمانؓ کو اور پھر حضرت ابوبکرؓ کو آپ سے نکاح کرنے کے لئے کہا۔ مگر ان دونوں نے انکار کیا۔ اس کے بعد آپ کا نکاح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ حضرت عمرؓ کا خود حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو کہنا صاف بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو کس قدر مشکلات تھیں۔

اس کے بعد اُمّ المؤمنین اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔ وہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ اس پہلے گروہ میں شامل تھیں، جو سب سے اول کفار کے ظلم سے تنگ آ کر حبش کو ہجرت کر گیا تھا۔ اُمّ سلمہؓ کے خاوند کی موت کا موجب ایک زخم ہوا، جو ان کو ایک لڑائی میں لگا تھا۔

اُمّ سلمہؓ کے بعد اُمّ حبیبہؓ سے آپ نے نکاح کیا۔ یہ قریش کے مشہور سردار ابوسفیان کی لڑکی تھیں۔ آپ مع اپنے خاوند کے اس دوسرے گروہ میں شامل تھیں، جو ہجرت کر کے حبش کو چلا گیا تھا۔ وہاں ان کا خاوند عیسائی ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ لیکن وہ اسلام پر قائم رہئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

اس کے بعد آپ کا نکاح اُمّ المؤمنین زینب بنت جحش سے ہوا۔ ان کو زید بن حارثہ نے بوجہ بے اتفاقی کے طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

اس کے بعد اُمّ المؤمنین زینبؓ سے نکاح ہوا، جو اُمّ المساکین کے نام سے مشہور تھیں۔ آپ کا خاوند اُحد کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ آپ خود بھی نکاح سے دو تین ماہ بعد ہی فوت ہو گئیں۔

اُمّ المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی مہاجرات میں سے تھیں اور بیوہ ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

اب اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس قدر عورتیں آپ کی ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔ وہ سب کی سب ایسی تھیں، جو ابتداء میں مسلمان ہوئی تھیں اور آخر کفار کے ہاتھوں سے طرح طرح کے دکھ اٹھا کر جلا وطنی اختیار کر کے دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی تھیں۔ وہ سب کی سب قریش کے شریف خاندانوں سے تھیں۔ ایک طرف تو وہ اپنے گھر بار کو چھوڑ چکی تھیں اور اپنی جائیداد اور آسائش کو قربان کر کے انہوں نے صرف دین کی خاطر جلا وطنی قبول کی تھی۔ اب دوسری مصیبت یہ آ پڑی

کہ ان کے خاوند، جو محنت مشقت کر کے ان کو کھلاتے تھے، وہ بھی مر گئے یا جنگوں میں شہید ہو گئے۔ اس بیکسی کی حالت میں ان کی تکالیف کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کیا جائز تھا کہ ان عورتوں کو کفار کی طرف واپس بھیج دیا جاتا، تاکہ وہ طرح طرح کے دکھ دے کر ان کو مار ڈالتے۔ یا کیا یہ درست تھا کہ ان کو بغیر خبر گیری کے چھوڑ دیا جاتا، تا وہ خستہ حال ہو کر تباہ ہو جاتیں۔ نہیں نہیں اسلام یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو، جنہوں نے مذہب اور دین کی خاطر طرح طرح کے دکھ اٹھائے تھے، یوں ذلت اور کسمپرسی کی حالت میں تباہ ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا یا خود اپنے ہاتھوں سے دشمنوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ جو ظلم چاہیں ان پر کریں۔ ان کی اس بیکسی کی حالت پر رحم کھا کر ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی ازواج مطہرات ہونے کا شرف بخشا، تا جس عزت کو انہوں نے گھر بار چھوڑ کر دین کی خاطر چھوڑا تھا، اس سے بھی دہ چند عزت ان کو اس دنیا میں دی جائے۔

اُمّ المؤمنین جویریہ اور اُمّ المؤمنین صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان عورتوں میں سے تھیں، جو قوم کے سرداروں کی لڑکیاں تھیں اور جنگوں میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ ان میں سے اول الذکر ایک کافر کی بیوہ تھیں، جو لڑائی میں مارا گیا تھا۔ مال غنیمت میں وہ ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ ثابت نے بہت سا روپیہ رہا کرنے کے معاوضہ میں ان سے مانگا، جو وہ نہ دے سکتی تھیں۔ چنانچہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور سارا قصہ آنحضرتؐ کے روبرو بیان کیا کہ میں اپنی قوم میں سردار کی لڑکی ہوں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جائے تا کوئی اور فساد نہ ہو۔ اور خود روپیہ دے کر آپؐ نے اس سے نکاح کر لیا۔ کیونکہ عربوں کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ ایک رئیس کی لڑکی ہو کر کسی کم درجہ کے آدمی کے نکاح میں جائے۔

اُمّ المؤمنین صفیہؓ خیبر کی لڑائی میں ہاتھ آئی تھیں۔ پہلے وحیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قیدی عورتوں میں سے ایک مجھے دی جائے۔ جس پر آپ نے اس کو کہا، جسے چاہو لے لو۔ اس نے صفیہ کو چنا۔ مگر لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ وہ ایک سردار کی لڑکی ہے اور مناسب نہیں کہ آپ کے سوا کسی دوسرے کے قبضے میں آئے یا وہ اس سے نکاح کرے۔ اس پر آپ نے اس سے نکاح کیا۔

ان آخری دونوں نکاحوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی کہ اس تعلق سے ایک پوری قوم فساد سے رک جائے۔ اور اس طرح پر وہ قومیں، جن کی عمریں جنگوں میں گذرتی ہیں، ایک ہو جائیں۔ یہ امر کہ اس ذریعہ سے آپ نے پوری پوری کامیابی حاصل کی،

ایسا بدیہی اور تاریخی حقیقت ہے کہ یہاں پر اس کی تفصیل بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔

اغراض اولاد

اگرچہ اس دارالابتلاء میں خداتعالیٰ نے اولاد کو بھی فتنہ میں ہی داخل رکھا ہے، جیسا کہ اموال کو، لیکن اگر کوئی شخص صحت نیت کی بنا پر محض اس غرض سے اور سراسر وجد اور فکر سے طالب اولاد ہو کہ تا اس کے بعد اسکی ذرّیت میں سے کوئی خادم دین پیدا ہو، جس کے وجود سے اسکے باپ کو بھی دوبارہ ثواب آخرت کا حصہ ملے، تو خاص اس نیت اور اس جوش سے اولاد کا خواہشمند ہونا نہ صرف جائز بلکہ اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ میں سے ہے جیسا کہ اس خواہش کی تحریک اس آیت کریمہ میں پائی جاتی ہے۔ **وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا**۔ یعنی اے خدا ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ لیکن سچ مچ اور واقعی طور پر بھی جوش پیدا ہونا اور اس للّٰہی جوش کی بنا پر اولاد کا خواہشمند ہونا ان ابرار اور اخیار اور اتقیاء کا کام ہے، جو اپنے اعمال خیر کے آثارِ باقیہ دنیا میں چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔

ابنائے روزگار کی رسم اور عادت کے طور پر خواہشمند اولاد ہونا اور یہ خیال رکھنا کہ ہماری موت فوت کے بعد ہماری اولاد وارث بنے اور شرکاء ہماری جائیداد پر قابض نہ ہونے پائیں، بلکہ ہمارے بیٹے ہمارے ترکہ پر قبضہ کریں اور شریکوں سے لڑتے جھگڑتے رہیں اور ہمارے مرنے کے بعد دنیا میں ہماری یادگار رہیں۔ یہ خیال سراسر شرک اور فساد اور سخت معصیت سے بھرا ہوا ہے۔ جب تک یہ خیال دل سے باہر نہ ہو لے، کوئی شخص سچا موحّد اور سچا مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ہمیں ہر روز خداتعالیٰ کی طرف قدم بڑھانا چاہئے اور جن امور کو وہ فتنہ قرار دے، بغیر تحقیق صحت نیت اس کو اپنی درخواست سے اپنے اوپر نازل نہیں کرانا چاہئے۔ جو شخص خداتعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے، وہ اس کے اندرونی پاک جوشوں اور مطہر و نیت کو خوب جانتا ہے، بلکہ درحقیقت پاک دل انسان کے اندرونی جوش اس کی طرف سے ہوتے ہیں اور پھر وہ ان کو پورا بھی کر دیتا ہے۔ جس وقت دیکھتا ہے کہ ایک للّٰہی حالت کا آدمی اس کے دین کی خدمت کے لئے اپنا کوئی وارث چاہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو وارث عنایت کرتا ہے۔ اس کی دعائیں پہلے ہی سے قبول شدہ کے حکم میں ہوتی ہیں۔

الغرض طلب اولاد محض خدمت دین کے لئے چاہئے۔ ورنہ جو شخص محض دنیاوی لالچ کے لئے طالب اولاد ہو وہ طالب فتنہ ہے۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ "درویشے زنے حاملہ داشت۔ مدت حمل او بسر آمد۔ درویش راہمہ عمر فرزند نیامدہ بود۔ گفت اگر خدائے عزوجل مرا پسر بخشد جز ایں خرقہ کہ در بردارم ہر چہ در ملک من است ایثار درویشاں کنم۔ اتفاقاً زنش پسر آورد۔ درویش شادمانی کردہ وسفرہء

یاراں بموجب شرط نہاد۔ پس از چند سال کہ از سفرِ شام باز آمدم بمحلت آں درویش بگذشتم و چگونئ حالش پرسیدم۔ گفتنہ پسر خمر خوردہ است و عربدہ کردہ وخون کسے ریختہ واز شہر گریختہ۔ پدر رابعلّت آں سلسلہ درنائے و بند بر پائے نہادہ اند۔ گفتم ایں بلا را بدعا از خدا خواستہ است۔ ترجمہ۔ ایک فقیر کی بیوی امید سے تھی اور اس کے ایام قریب الاختتام تھے۔ فقیر نے، جس کے ہاں ساری عمر میں کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا، کہا کہ اگر خدا تعالیٰ مجھے بیٹا عطا کرے، تو اس گوڈڑی کے سوا، جو میں نے پہن رکھی ہے، جو کچھ میری ملکیت میں ہے، فقیروں کو بخش دوں گا۔ اتفاقاً اس کی بیوی کو لڑکا تولد ہوا۔ فقیر نے خوشی کی اور جیسا کہ رسم تھی دوستوں اور یاروں کے ساتھ دعوت کا دستر خوان بچھایا۔ چند سال کے بعد جب کہ میں سفر شام سے واپس آیا تو اس فقیر کے گھر میں میرا گذر ہوا اور اس کا حال دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ حوالات میں محبوس ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس باعث سے محبوس ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے شراب پی کر لڑائی جھگڑا کیا، کسی کو مار ڈالا اور شہر سے بھاگ گیا۔ باپ کو اس سبب سے گردن اور پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی۔ میں نے کہا۔ اس بلا کو اس نے خدا تعالیٰ سے مانگ کر لیا تھا۔

نکاح میں تعیین مہر کا راز

۱۔ نکاح میں یہ بات متعین ہوئی کہ مہر مقرر کیا جائے، تاکہ خاوند کو اس نظم و جوڑ کے توڑنے میں مال کے نقصان کا خطرہ لگا رہے۔ اور بلا کسی ایسی ضرورت کے، جس کے بغیر اس کو چارہ نہ ہو، اس پر جرات نہ کر سکے۔ پس مہر کے مقرر کرنے میں ایک قسم کی پیش بندی ہے۔

۲۔ نکاح کی عظمت بغیر مال کے، جو شرمگاہ کا بدلہ ہوتا ہے، ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ لوگوں کو جس قدر مال کی حرص ہے اور کسی چیز کی نہیں ہے۔ لہٰذا اسی کے صرف کرنے سے ایک چیز کا مہتمم بالشان ہونا معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس کے مہتمم بالشان ہونے سے ولی کی آنکھیں اس شخص کو اپنے لخت جگر عورت کا مالک ہوتے ہوئے دیکھنے سے ٹھنڈی ہو سکتی ہیں۔

۳۔ مہر کے سبب نکاح اور زنا میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ۔ ترجمہ۔ یعنی بذریعہ اپنے مالوں کے تم اپنی عفت کی حفاظت کرنے والے بنو اور صرف مستی نکالنے والے نہ بنو۔ یہی وجہ ہے کہ رسوم سلف میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وجوب مہر کو بدستور باقی رکھا۔

مہر حسب حیثیت مقرر ہونے کی وجہ

جیسا کہ انسانوں کی دنیاوی حیثیتیں مختلف ہیں ایسے ہی ان کے اخراجات وضروریات بھی متفاوت ہیں۔اس امر کو مدنظر رکھ کر شریعت اسلامیہ نے کوئی معین مقدار مہر کی مقرر نہیں کی، بلکہ مہر کی تعداد ومقدار حیثیت پر موقوف ہے۔یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج مطہرات کے مہر مختلف تھے،سب یکساں نہ تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے مہروں کو پسند نہیں کرتے تھے۔مگر ایک بار جب ایک عورت نے کہاقَنَاطِیر الْمُقَنطَرَة یعنی ڈھیر بھرا موال مہر ہو،تو خدا تعالیٰ نہیں روکتا،تو عمرؓ کون روکنے والا ہے۔اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ عمر سے زیادہ تو مدینہ کی عورتیں فقہ کی سمجھ رکھتی ہیں۔اس عورت نے اس امر کا استنباط آیت ذیل سے کیا تھا۔وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوا مِنْهُ شَیْئًا، اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۔ترجمہ۔یعنی اگر تم بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور تم دے چکے ہو ایک کو مال کا ڈھیر تو اس میں سے کچھ مت لو۔کیا تم اس مال کو واپس لینا چاہتے ہو۔یہ مال واپس لینا ناحق اور صریح گناہ ہے۔

بہر حال مہر حسب حیثیت ہوتا ہے،جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر ایک صحابی کو کہا کہ تیرے پاس کچھ ہے۔اس نے کہا نہیں۔پھر آپ نے فرمایا کہ اچھا لوہے کی ایک انگوٹھی ہی لے آ۔جب اس نے اس سے بھی انکار کیا اور کہا کہ صرف تہ بند ہے۔تو اس کا مہر بِمَا مَعَکَ مِنَ الْقُرْآن مقرر ہوا۔اس پر فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تیری قرآن دانی کے بدلے اور بعض کہتے ہیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے بدلے۔

بہر حال مہروں کا اندازہ انسان کے حالات پر ہوتا ہے۔چار سو درہم یا دوسو درہم یا پانچ سوٹکا سلطانی۔یہ کوئی شرعی حدود یا قیود نہیں ہیں۔ہماری اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ مہر کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔بلکہ مہر کا مقرر کرنا لازم اور واجب ہے۔اس کے بغیر نکاح ہی نہیں ہوتا۔

مہر کی دو قسمیں ہیں۔ایک معجّل بمعنی جلدی کیا گیا۔یعنی مرد عورت کو جلدی ادا کر دے، کیونکہ یہ دَین ہے۔اور درصورت عدم ادائے دَین (قرضہ) عاقبت میں سخت مواخذہ ہوگا۔ہاں اگر عورت بخش دے،تو البتہ بریّت ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔پہلے تو مرد باعث سہل انگاری اور عدم تقاضا عورتوں کے مہر ادا نہیں کرتے۔اور اگر کسی نے ہمت ونیت ادائے مہر کی کر لی،تو عورتیں بوجہ خام خیالی کے اپنی زندگی میں مہر نہیں لیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ جو کوئی لے گی،وہ نکاح سے باہر ہو جائے گی اور مرد قابو میں نہ رہے گا۔

دوسری قسم مہر کی مؤجّل ہے یعنی مہلت وفرصت سے دیا گیا۔اس کی کوئی حد مقرر ہو یا جب

استطاعت ہو، تب مرد ادا کردے۔

کیا لڑکی دینے والے کی خدمت لازم ہے

عقل وانصاف اس امر کے مقتضی ہیں کہ لڑکی دینے والے کے ساتھ حتی الامکان احسان کرنا چاہئے، کیونکہ جو اپنے لخت جگر اور اپنے جسم کے ایک ٹکڑے کی پرورش کر کے پھر اس کو اپنے سے الگ کر کے دوسرے کے حوالہ کر دیتے ہیں، وہ مستحق ہیں کہ ناکح ان کے ساتھ احسان ومروت سے پیش آئے۔ مجھے ایسے لوگوں پر سخت تعجب آتا ہے، جو کہتے ہیں کہ جہاں لڑکی دی جائے وہاں سے اس کے والدین کو روٹی کھانی بھی حرام ہے۔ معلوم نہیں ایسے من گھڑت مسئلے کہاں سے نکل آتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم سے تو یہ ثابت ہے کہ لڑکی دینے والا اپنے داماد سے خدمت کرائے، تو داماد کو کرنی چاہئے اور اگر وہ اس امر کے بدلہ میں کچھ مانگے، تو حرام نہیں ہے۔ **قال اللہ تعالیٰ حکایةً عن شعیب علیہ السلام .**

قَالَ اِنِّیۡ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ ھٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِکَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡکَ ۔ترجمہ۔یعنی کہا شعیب علیہ السلام نے، اے موسیٰ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک تجھ کو اس شرط پر بیاہ دوں کہ تو آٹھ برس میری نوکری کرے۔ پھر اگر تو اس نوکری کے دس برس پورے کرے، تو یہ تیری طرف سے احسان ہوگا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف مالایطاق ڈالوں۔

یہ قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اسی حکمت کے لئے بیان فرمایا ہے کہ یہ قابل عمل ہے۔ قرآن کریم کا کوئی بیان قابل عبرت باتوں اور نصائح سے خالی نہیں ہے۔

تعیین ولیمہ کی وجہ

ولیمہ یعنی نکاح کے بعد جو دعوت کی جاتی ہے، اس کی تقرری کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔

ا۔اس سے نکاح اور اس بات کی اشاعت اور شہرت ہوتی ہے کہ ناکح بیوی سے دخول کرنا چاہتا ہے۔ یہ اشاعت ضروری ہے تاکہ نسب میں کسی کو وہم کرنے کی بھی گنجائش نہ ہو اور نکاح وزنا میں تمیز بادی الرائے میں معلوم ہو جائے اور لوگوں کے سامنے اس عورت کے ساتھ جائز تعلق متحقق ہو جائے۔

۲۔اس سے بیوی اور اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک پایا جاتا ہے، کیوں کہ مال کا خرچ کرنا اور لوگوں کا دعوت کے لئے جمع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ خاوند کے نزدیک بیوی کی وقعت

اورعزت ہے۔اورمیاں بیوی کے مابین اس قسم کے امورالفت قائم کرنے میں خاص طور پراس کے اول اجتماع میں ضروری ہوتے ہیں۔

۳۔ایک جدید نعمت کا حاصل ہونا۔اظہارشکروسروروخوشی کا سبب ہےاور مال کے خرچ کرنے پرآدمی کوآمادہ کرتا ہے۔اوراس خواہش کی پیروی کرنے سے سخاوت کی عادت وخصلت پیدا ہوتی ہے اوربخل کی عادت جاتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد ہیں۔چنانچہ سیاست مَدَنِیہ اورامورمنزلیہ اورتہذیب نسل اور احسان کے متعلق کافی فوائداورمصالح ولیمہ میں مودع ہیں۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رغبت اورحرص دلائی اورخودبھی اس پرعمل کیا۔جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی کوئی حد مقررنہیں کی،اس طرح ولیمہ کی بھی کوئی حد مقررنہیں کی۔آپ نے حضرت صفیہؓ کے ولیمہ میں لوگوں کو مالیدہ کھلایا تھا۔اورآپ نے بعض دوسری بیویوں کا ولیمہ دو(۲)مَدّ جَو سے کیا۔اورفرمایا۔ اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلٰی الْوَلِیْمَۃِ فَلْیَاتِھَا ۔ترجمہ۔یعنی جب تم میں سے کسی کوولیمہ کی مسنون دعوت میں بلایا جائے،تو چلا آئے۔

نکاح وولیمہ میں اباحت دف وراگ کی حکمت

راگ گانااوردف بجانا ولیمہ وغیرہ کے موقعہ پرتمام عرب وعجم کےلوگوں کی عادات اورخصلتوں میں داخل ہے۔یہ سروراورخوشی کے حال کا اقتضاء ہےاوران امورمیں سےنہیں ہے،جن سے دنیاودین خراب ہوجائیں۔ان چیزوں میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ جورسوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے تمام ملک حجاز اورتمام آباد بستیوں میں فرح وسرور پیدا کرنے والے مروج تھے،ان میں سے جو مخرب دنیاوعاقبت تھے،ان کوآنحضرتؐ نے موقوف فرماکران سے منع فرمایااور جومضرنہ تھےان سے درگذرکیا۔لہٰذا فرمایا۔ اِعْلَنُوْا اَلنِّکَاحَ وَ اضْرِبُوْا عَلَیْہِ بِالدَّفْ ۔ترجمہ۔یعنی نکاح کااعلان کرواور اس پردف بجاؤ۔

ولیمہ وغیرہ میں دف اظہارسرورکی غرض سے بجانا اورگانا مباح ہے،بشرطیکہ گندے گیت نہ ہوں،ورنہ حرام ہے۔اورحُدی،جواونٹوں کے اندرجولانی پیدا کرنیکی غرض سے پڑھی جاتی ہے،وہ بھی مباح ہے۔کیونکہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے دنیااورآخرت سے بےفکری ہوجائے۔بلکہ وہ ملال کودورکرنیوالی چیزیں ہیں۔اورآلات جنگ سے بازی کرنا مثلاً تیراندازی کرنا یا گھوڑے کادوڑانا، پلٹانا یا نیزہ بازی کرنا فی الحقیقت یہ چیزیں کھیل میں داخل نہیں ہیں،کیونکہ ان سے مقصود شرعی حاصل ہوتا

ہے۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو آپکی مسجد میں ایک بار حبشیوں نے پٹہ کھیلا تھا۔

خدا نے اشیاء کی حلت و حرمت کا یہ قاعدہ رکھا ہے کہ جو چیزیں روح و جسم انسانی کے لئے مضر ہوں، وہ حرام ہیں۔اور جو مفید ہوں، وہ حلال ہیں۔اور جو مضر و مفید نہ ہوں، وہ مباح ہیں۔

نکاح میں تقرری گواہ و اعلان کی وجہ

سب انبیاء و ائمہ دین اس بات پر متفق ہیں کہ نکاح کو شہرت دی جائے، تاکہ حاضرین کے سامنے اس میں اور زنا میں تمیز ہو جائے۔اس کے علاوہ اس امر کو مزید شہرت اور عروج دینے کے لئے مدار منزلی قرار دینے کی خاطر ولیمہ کیا جائے اور لوگوں کو اس میں دعوت دی جائے اور دف بجا کر خوشی میں اس بات کا اظہار کیا جائے۔نسبتوں کی تقریب پر جو شکر وغیرہ بانٹتے ہیں، وہ بھی اسی غرض کے لئے ہوتا ہے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی خبر ہو جائے اور بعد میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔

تعیین عقیقہ اور بچے کا سر منڈانے کی وجہ

اہل عرب اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے۔عقیقہ میں بہت سی مصلحتیں تھیں، جن کا رجوع ملیہ اور مدنیہ اور نفسیہ کی طرف تھا۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برقرار رکھا۔خود بھی اس پر عمل کیا اور اوروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔

۱۔منجملہ ان مصلحتوں کے ایک یہ ہے کہ عقیقہ میں اولاد کی نسبت کی اشاعت ہوتی ہے۔

۲۔از انجملہ سخاوت کے معنے بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

۳۔از انجملہ ایک یہ ہے کہ نصاریٰ میں جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا، تو اسکو زرد پانی سے رنگا کرتے تھے اور اس کو عمودیہ کہتے تھے، یعنی بپتسمہ۔ان کا کہنا تھا کہ اس کے سبب وہ بچہ نصرانی ہو جاتا ہے۔اس نام کے ساتھ مشاکلت کے طور پر اللہ پاک نے صِبْغَةَ اللهِ وَ مَنْ اَحْسَنَ مِنَ اللهِ صِبْغَةً فرمایا۔مناسب معلوم ہوا کہ ملت حنفیہ یعنی دین محمدیؐ میں بھی ان کے اس فعل کے مقابل میں کوئی ایسا فعل پایا جائے، جس فعل سے اس فرزند کا حنیفی اور ملت ابراہیمی و اسمٰعیلی کا تابع ہونا معلوم ہو۔

۴۔جس قدر افعال حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما الصلوات والسلام کے ساتھ مختص تھے اور ان کی اولاد میں چلے آتے تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذبح کرنے پر آمادہ ہونا اور پھر خدا تعالیٰ کا اس کے فدیہ میں ذبح عظیم کے ساتھ انعام کرنا ہے۔اور ان دونوں شرائع میں سے زیادہ مشہور حج ہے، جس کے اندر سر منڈانا اور ذبح

کرنا ہوتا ہے۔ پس ان باتوں میں ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ملت حنفی پر آگاہ کرنا اور اس بات کی اطلاع دینا ہوتا ہے کہ اس فرزند کے ساتھ اس ملت کا برتاؤ کیا گیا۔

۵۔ ازانجملہ ایک یہ مصلحت ہے کہ اسکے شروع میں اسکے ساتھ یہ فعل کرنے سے اسکے خیال میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ گویا اس نے اپنے فرزند کو خدا کی راہ میں دیدیا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا اور اس میں سلسلہ احسان اور نیازمندی وفرمانبرداری کو حرکت دینا ہے۔ جیسا کہ صفاومروہ کے مابین سعی کرنے میں بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **مَعَ الْغُلَامِ عَـقِيْقَةٌ فَـاهْرِقُوْا عَنْهُ دَمًا وَ اَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى** ۔ ترجمہ۔ یعنی لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے۔ پس اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس کی طرف سے اس کے ازار کو دفع کرو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **اَلْـغُلَامُ مُـرْتَهَـنٌ بِعَقِيْقَةٍ يُذَبَّحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَ يُسَمّٰى وَ يُحْلَقُ** ۔ ترجمہ۔ یعنی لڑکا اپنے عقیقہ میں مرہون ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بدلہ ساتویں دن قربانی دی جائے اور نام رکھا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے۔ **اَمَاطَةَ الاَذٰى** یعنی سر مُڈانے میں حجاج کے ساتھ مشابہت ہے۔

حضرت ابن عربیؒ فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں۔ **اِذَا تَعَيَّنَ الدَّمُ فَلَا يَسْقُطُ عَمَّنْ تَعَيَّنَ عَلَيْهِ كَـمَا تَعَيَّنَ ذَبْحُ وَلَد اِبْرَاهِيْمَ الْخَلِيْل عَلىٰ اِبْرَاهِيْم وَ لَم يَسْقُطْ عَنْهُ الدّمُ اَصْلاً فَفَدَاهُ اللّٰهُ بِـذِبْـحٍ عَـظِيْـمٍ وَ هُـوَ الْـكَبْشُ حَيْثُ جَعَلَ بَدْلَ اِفْسَادِ بِنْيَةِ نَبِى مُكَرَّمٍ فَحَصَلَ الدَّمُ لِاَنَّهُ وَجَـبَ وَ بَـعْـدَ اَنْ وَجَبَ فَلَا يَرْتَفَعُ فَصَارَتْ صُوْرَةَ وَلَد اِبْرَاهِيْم صُوْرَةُ كَبْشٍ فَذُبِحَتْ صُوْرَةَ الْكَبْشِ وَ لَيْسَ وَلَدَ اِبْرَاهِيْمَ صُوْرَةُ الْاِنْسَان وَهٰذَا سَبَبُ الْعَقِيْقَةُ الَّتِىْ كُلُّ اِنْسَانٍ مَرْهُوْنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ** ۔ ترجمہ۔ یعنی جب قربانی معین ہوچکی، تو جس پر معین ہوجائے، اس سے ساقط نہیں ہو سکتی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مقررہ ہو چکی تھی۔ اور وہ ان سے ہرگز ساقط نہ ہوئی۔ پس خدا نے اس کے بدلہ میں ایک دُنبہ قبول فرمالیا۔ اور وہ فدیہ ایک دُنبہ تھا، جس کو خدا نے ایک مکرم ومعظم نبی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بنیاد وجود بگڑنے کے بدلہ میں معین فرمایا تھا۔ پس وہ قربانی کی صورت حاصل ہوگئی، کیونکہ وہ واجب ہوچکی تھی۔ اور جب قربانی واجب ہوجائے، تو وہ ساقط نہیں ہوتی۔ پس حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے کی صورت (عالم مثال) میں ایک دُنبہ کی صورت میں منتقل ہوگئی۔ لہٰذا دُنبہ کی صورت میں ذبح کرنے سے اسمٰعیلی قربانی ادا ہوگئی۔ کیونکہ عالم مثال میں ابراہیم کے بیٹے کی صورت انسانی صورت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنے عقیقہ کے ساتھ مرہون ہے۔

بہر حال اس سے ہویدا ہوا کہ عقیقہ دینے میں ایک یہ فائدہ ہے کہ جو امراض وعوارض مہلکہ مولود کو لاحق ہونے والی ہوتی ہیں، وہ قربانی انکا معاوضہ وہ جاتی ہے۔ اور وہ ہلاکت سے بچ جاتا ہے۔

میں نے اس امر کا خود تجربہ کیا۔ مورخہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کی شب کو میں نے رویا میں دیکھا کہ میں ایک بڑے سیلاب میں ہوں اور وہاں اس سیلاب میں میری زوجہ اُم سعید الرحمٰن وعبدالرؤف وعبد الرحیم بھی عبدالرحیم کو اٹھائے ہوئے موجود ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں تو اس سیلاب سے باہر نکل گیا ہوں، لیکن میری زوجہ مع بچہ کے اس سیلاب کے گردابوں میں آ گئی اور ان دونوں کے لئے خطرناک صورت پیدا ہوگئی۔ اس سیلاب میں ایک طرف آدمیوں کی شکل میں ملائکہ بھی کھڑے ہوئے دیکھے اور میرے خیال میں آیا کہ وہ قضاء وقدر کے ملائکہ ہیں۔ میں نے بیدار ہوکر سب کی طرف سے کچھ تھوڑا سا صدقہ دیا۔ ۱۳ ربیع الثانی کی ظہر کو میری زوجہ کے ہاتھ پر دفعتہً ایک زہریلا اور خطرناک دُمل یعنی پھوڑا نمودار ہوا، جس سے اس کو سخت درد شروع ہوگیا۔ میں نے اس کو کہا کہ ایک رویا میں تمہاری حالت خطرہ میں دیکھی ہے۔ میں نے کسی قدر صدقہ تو دیا ہے۔ لیکن تم خود بھی بدست خود صدقہ ادا کرو۔ چنانچہ اس نے بھی تھوڑا سا صدقہ دیا۔ بالآخر ۱۵ ربیع الثانی کی شب میں اس کو اس پھوڑے کا درد ذات الجنب وغیرہ عوارض کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور اس کی حالت قرب المرگ ہوگئی۔ چونکہ چھوٹے بچے عبدالرحیم کو بوجہ اس کی والدہ کی بیماری کے علیحدہ کر رکھا تھا اور بہت دیر تک اس کو دودھ نہ ملا تھا، اس لئے اس کی حالت بھی قابل رحم ہو رہی تھی۔ کئی معالجات کئے گئے مگر مؤثر نہ ہوئے۔ بالآخر میں نے تین دنبے قربانی کر دیئے اور تھوڑا سا معالجہ بھی ساتھ کیا گیا۔ وہ مؤثر ہوا اور ۱۶ ربیع الثانی کو والدہ عبدالرحمٰن کو صحت ہوگئی۔ یہ سب رویہ والے سیلاب کا معاملہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اس قربانی کے ذریعہ رفع فرمایا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

ساتویں روز تعیین عقیقہ و نام رکھنے کا سبب

عقیقہ دینے میں ساتویں روز کی تخصیص اسلئے ہے کہ ولادت وعقیقہ میں کچھ فاصلہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سارا کنبہ زچہ اور بچہ کی خبر گیری میں مصروف ہوتا ہے، پس ایسے وقت میں مناسب نہیں ہے کہ ان کو عقیقہ کا حکم دے کر ان کی مشغولیت میں اضافہ کیا جائے۔ اور نیز بہت سے لوگوں کو اسی وقت بکری دستیاب نہیں ہوسکتی، بلکہ تلاش کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر پہلے ہی روز عقیقہ مسنون کیا جائے، تو لوگوں کو مشکل ہوگی۔ لہٰذا سات روز کا فاصلہ ایک کافی اور معتد بہ مدت ہے۔ اور ساتویں روز نام رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ اس سے پہلے بچے کا نام رکھنے کی بھلا کیا حاجت ہے۔ نام رکھنے میں بھی مہلت چاہئے۔ تاکہ خوب غور وتدبر کر کے اچھا سا نام رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ عجلت کے سبب کوئی خراب نام مقرر کر

دیں۔دوسری بات یہ ہے کہ ہر امر مہتم بالشان کی تکمیل چھٹے دن کے بعد ہوتی ہے۔

بچے کے سر کے بالوں کا چاندی کے ساتھ تصدّق کرنے کا راز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو حضرت حسن کے متعلق فرمایا کہ اے فاطمہ اس کے سر کے بالوں کو منڈوادو اور ہموزن اس کے بالوں کے چاندی خیرات کردو۔ چاندی خیرات کرنے میں یہ سبب ہے کہ بچے کی حالت جنینہ سے منتقل ہو کر طفلیت کی طرف آنا خدا تعالیٰ کی نعمت ہے، جس پر شکر واجب ہے۔اور بہترین شکر یہ ہے کہ اس کے بدلہ میں کچھ صدقہ کیا جائے۔اور جنین کے بال نشاۃ جنینہ کا بقیہ تھے، جن کا دور کرنا نشاۃ طفلیہ کے استقلال کی نشانی ہے۔اس لئے واجب ہوا کہ ان کے بدلے میں چاندی دی جائے۔اور چاندی اس لئے کہ یہ کم گراں ہے اور غریبوں کو بھی دستیاب ہے۔ دوسری کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ مولود کے بالوں کے برابر دے سکیں۔

لڑکے کا عقیقہ دو بکرے اور لڑکی کا ایک بکرا دینے کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔**عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَ عَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ** ۔ترجمہ۔ یعنی لڑکے کے لئے دو بکریاں اور لڑکی کے لئے ایک بکری عقیقہ میں دینی چاہئے۔اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک بہ نسبت لڑکیوں کے لڑکوں کا نفع زیادہ ہوتا ہے۔لہٰذا دو کا ذبح کرنا زیادتی اور اس کی عظمت کے مناسب ہے۔حضرت ابن قیمؒ اس بارے میں لکھتے ہیں۔ **اَمْرُ التَّفْضِيْلِ فِيْهَا تَابِعٌ لِشَرْفِ الذَّكَرِ وَ مَا مَيَّزَه' اللّٰهُ بِهٖ عَلٰی الْاُنْثٰی وَ لَمَّا كَانَتِ النِّعْمَةُ بِهٖ عَلٰی الْوَلَدِ اَتَمَّ وَ السُّرُوْرُ وَالْفَرْحَةُ بِهٖ اَكْمَلَ كَانَ الشُّكْرُ عَلَيْهِ اَكْثَرُ فَاِنَّه' كُلَّمَا كَثُرَتِ النِّعْمَةُ كَانَ شُكْرُهَا اَكْثَرُ.** ترجمہ۔یعنی لڑکے کے لئے دو اور لڑکی کے لئے ایک بکری عقیقہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ لڑکے کو لڑکی پر فضیلت ہے۔کیونکہ جبکہ لڑکے کے وجود سے والد پر تمام و کمال نعمت اور سرور و خوشی زیادہ ہوتی ہے۔تو اس پر مزید شکر واجب ہے۔کیونکہ جب زیادہ نعمت ملے، تو زیادہ شکر کرنا لازم ہے۔

اختلافی نوٹ از مرتب۔لڑکے کے لئے دو بکریاں اور لڑکی کے لئے ایک بکری عقیقہ میں دینے کا ارشاد فرائض میں سے نہیں ہے۔ بلکہ دستور الرسم کے مطابق ہے۔اگر کوئی باپ اپنی لڑکی کی پیدائش پر دو بکریوں کا عقیقہ دینا چاہئے، تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

مولود کو گڑھتی دینے کی وجہ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلّٰی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُؤْتٰی

بِالصِّبْيَانِ فَيَتَبَرَّكُ عَلَيْهِمْ وَ يُحَنِّكُهُمْ ۔ترجمہ۔یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ بچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے جاتے تھے۔آپ ان پر برکت کی دعا فرماتے اور انکو گڑھتی دیتے تھے۔گڑھتی نیک انسان سے لینا مسنون ہے تا کہ اس کا اثر بچے کی طبیعت میں منتقل ہو جائے۔

عورت کے نکاح میں اجازت ولی کی حکمت

۱۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ ۔ترجمہ۔یعنی ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نکاح میں عورتوں کو حکم کرنا روا نہیں ہے، کیونکہ وہ ناقصات العقل ہوتی ہیں اور ان کی فکر ناقص ہوتی ہے۔اس لئے بسا اوقات مصلحت کی طرف ان کو راہبری نہ ہو سکے گی۔

۲۔دوسری وجہ یہ ہے کہ غالباً وہ حسب کی حفاظت نہ کریں گی اور بسا اوقات ان کو غیر کفو کی طرف رغبت پیدا ہو سکتی ہے۔اور اس میں قوم کے لئے عار ہے۔پس ضروری ہوا کہ ولی کو اس باب میں کچھ دخل دیا جائے تا کہ یہ مفسدہ بند ہو۔

۳۔اعتبار کی رو سے لوگوں کا عام طریق یہ ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہوتے ہیں۔اور تمام بندوبست انہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور سارے خرچ مردوں کے پلے سے ہوتے ہیں اور عورتیں ان کی مقید ہوتی ہیں۔چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ترجمہ۔یعنی مرد عورتوں پر قوی ہیں۔اس لئے کہ خدا نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

۴۔نکاح کے اندر ولی کی شرط مقرر ہونے میں ولیوں کی عزت وحرمت ہے۔اور عورتوں کا اپنا نکاح خود بخود کرنے میں ان کی بے عزتی ہے، جس کا مدار بے حیائی پر ہے اور اس میں ولیوں کی مخالفت اور ان کی بے قدری ہے۔

۵۔یہ بات واجبات میں سے ہے کہ نکاح کو زنا سے شہرت کے ساتھ امتیاز ہو۔اور شہرت کی بہتر صورت یہ ہے کہ عورت کے ولی نکاح میں موجود ہوں۔

اختلافی نوٹ از مرتب۔نکاح کا ولی کے بغیر نہ ہونے کا حکم نا کتخدا عورتوں کے بارے میں ہے، جن کو پہلی بار اس مرحلے سے گذرنا پڑ رہا ہے۔یہ حکم مطلقہ عورت اور بیوہ کے بارے میں نہیں ہے، جو اس مرحلے سے پہلے بھی گذر چکی ہے اور جو زندگی کے تجربے سے سبق سیکھ چکی ہے۔اگر عورت کا نکاح دوسری یا تیسری بار ہو رہا ہے، تو اس کے لئے ولی کا ہونا ضروری نہیں قرار دیا گیا۔اس بات سے یہ امر بھی کھل جاتا ہے کہ نا تجربہ کار اور ناپختہ کار لڑکی کے لئے ولی کا ہونا اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔اس سے عورت کا ناقص العقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

عورتوں میں عدل کی حکمت

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ **اِذَا کَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ اِمْرَاتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَ شِقُّه' سَاقِطٌ** ۔ترجمہ۔یعنی جب کسی مرد کی دوعورتیں ہوں اور وہ ان میں برابری نہ روا رکھے،تو قیامت کے روز جب آئے گا،تو اس کی ایک طرف جھکی ہوئی ہوگی۔

ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ عمل کی جزا اس کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔سو جیسا کہ یہاں پر انسان ایک ہی طرف کو جھکا ہوا تھا،آخرت میں اس کو نمایاں طور پر اپنا ایک رُخہ میلان نمودار ہو کر اس کے لئے موجب ایذا ہوگا۔

مرد پر بعض قریبی عورتیں حرام ہونے کی وجہ

ا۔سلامتِ مزاج کا یہ اقتضا ہے کہ آدمی اس عورت کی جانب راغب نہ ہو،جس سے وہ خود پیدا ہوا ہے یا جس سے وہ عورت پیدا ہوئی ہے یا وہ دونوں ایسے ہوں،جیسے ایک باغ کی دو شاخیں۔جن کی ہم بستری کی ضرورت کے ذکر کرنے میں حیا آجاتی ہے۔

۲۔جب اقارب خود قریبی عورتوں سے نکاح کرنے لگیں،تو کوئی شخص ان عورتوں کی طرف سے اقارب سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کرنیوالا باقی نہیں رہتا۔ باوجودیکہ عورتوں کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کوئی شخص انکی طرف سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کرنے والا ہو۔اسکی نظیر وہ ہے جو قرآن کریم میں یتیم لڑکیوں کے متعلق مذکور ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس امر کو بیان فرمایا ہے۔یہ ارتباط طبعی طور پر مرد اور اسکی ماں،بہن،بیٹی،پھوپھی،خالہ،بھتیجی،بھانجی میں واقع ہوا ہے۔

۳۔ازانجملہ رضاعت موجب حرمت ہے،کیونکہ دودھ پلانے والی عورت مثل ماں کے ہوجاتی ہے۔اسلئے کہ وہ اخلاط بدن کے اجتماع اور اس کی صورت کے قائم ہونے کا سبب ہوتی ہے۔پس وہ بھی فی الحقیقت ماں کے بعد ماں ہے۔اور دودھ پلانے والی کی اولاد بہن بھائیوں کے بعد اس کے بہن بھائی ہیں۔پس اس عورت کا مالک ہوجانا اور اس کو اپنی جورو بنالینا اور اس کے ساتھ جماع کرنا ایسی بات ہے،جس سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہے۔

۴۔ازانجملہ اقارب میں قطع رحم ہونے سے احتراز لازم ہے۔کیونکہ دوسوکنوں میں ہمیشہ حسد رہتا ہے اور انکا باہمی بغض انکے اقارب کے ساتھ بغض کا سبب ہوتا ہے۔اور اقارب میں بغض کا ہونا نہایت قبیح اور شنیع امر ہے۔اسلئے سلف کے چند گروہوں نے دو چچا کی بیٹیوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا

ناپسند کیا ہے۔ اوران دوعورتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اگران میں سے ایک مرد فرض کی جائے، تو دوسری اس پر حرام ہے۔ جیسے دو بہنیں اور پھوپھی۔ بھتیجی و خالہ۔ بھانجی۔ اوراسی اصل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتبار کیا ہے اور اپنی بیٹی اور غیر کی بیٹی میں جمع کرنا حرام فرمایا۔ کیونکہ سوکن کا حسد اور خاوند کا اس کو اختیار کرنا بسا اوقات سوکن اور اس کے کنبہ کی ناخوشی کا سبب ہوتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا کفر کو پہنچاتا ہے۔

۵۔ ازانجملہ دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ہے، کیونکہ ان میں بھی سوکن پنے کا حسد عداوت پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے اور یہ امر خدا تعالیٰ کو منظور نہیں ہے۔ اور علی ھذا القیاس۔ اس قسم کی قریبی عورتوں کا ایک شخص کے نکاح میں ہونا حرام ہوا۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں لَا یُجْمَعُ الْمَرْاَۃُ وَ عَمَّتُھَا وَ لَا بَیْنَ الْمَرْاَۃِ وَ خَالَتِھَا ۔ترجمہ۔ یعنی نہ ایک عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع کرو اور نہ ایک عورت اور اس کی خالہ کو جمع کرو۔

۶۔ ازانجملہ مصاہرت باعث حرمت ہے۔ اس لئے اگر لوگوں میں اس قسم کا دستور جاری ہو کہ ماں کو اپنی بیٹی کے خاوند کے ساتھ اور مردوں کو اپنے بیٹوں کی بیویوں کی طرف اور اپنی بیویوں کی بیٹیوں کی طرف رغبت ہو، تو ایسا تعلق حرام ہے۔

کیا مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم اہل کتاب مرد سے ہوسکتا ہے

عنوان الصدر ایک استفتاء ہے، جو کہ ملک مصر کے ایک عربی رسالہ "الھلال" مورخہ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوا ہے۔ اس استفتاء کی اصل عبارت درج ذیل ہے۔

اِسْتَفْتَاءٌ مِّنْ عُلَمَاءِ الْمُسْلِمِیْن

قَدْ اَبَاحَتِ الشَّرِیْعَةُ الْاِسْلَامِیَّةُ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّتَّخِذَ زَوْجَةً کِتَابِیَّةً (مَسِیْحِیَّةً اَوْ یَھُوْدِیَّةً) وَ یُؤْخَذُ مِنَ الْقُرْآنِ الْکَرِیْمِ وَالسُّنَّةِ الشَّرِیْفَةِ اَنَّہ' لَیْسَ ھُنَاکَ نَصٌّ صَرِیْحٌ یَقْضِیْ عَلٰی الرَّجُلِ الْکِتَابِیِّ اَنْ لَا یَتَزَوَّجَ اِحْدَیٰ الْمُسْلِمَاتِ، وَ اِذَا کَانَتِ الشَّرِیْعَةُ الْمَذْکُوْرَةُ قَدْ حَرَّمَتْ ذٰلِکَ ، فَمَا حُکْمُھَا فِیْ فَتَاةٍ مِنْ بَلَادٍ بَعِیْدَةٍ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ قَدْ اَعْجَبَھَا الْاِسْلَامُ فَاعْتَنَقَتْہُ وَ لَیْسَ فِیْ وَسْعِھَا صَحِیًّا وَ لَا مَالِیًا اَنْ تَسْتَبْدِلَ بَلَادَھَا بِبَلَادٍ اُخْرَیٰ یَقْطِنُھَا الْمُسْلِمُوْنَ ، ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِکَ آنَ اَوَانَ زَوَاجِھَا فَتَھَافَتَ عَلَیْھَا الطُّلَّابُ مِنْ اَھْلِ تِلْکَ الْبَلَادِ وَ کُلُّھُمْ کُفُوٌ لَھَا لٰکِنَّھُمْ یَدِیْنُوْنَ بِدِیْنٍ غَیْرِ دِیْنِھَا فَھَلْ یَجُوْزُ اَنْ یَتَزَوَّجَھَا اَحَدُ ھٰؤُلَاءِ اَمْ تَبْقَیٰ کَرَاھِبَةٍ فِیْ بِلَادِ ھَامَعَ مَرَاعَاةِ تَحْرِیْمِ ذٰلِکَ. اِذْ لَا

رَهْبَانِيَّةَ فِی الْاِسْلَامِ ، وَ اِذَا کَانَتِ الشَّرِیْعَۃُ الْاِسْلَامِیَّۃُ تَجِیْزُ لِتِلْکَ الْفَتَاۃِ اَنْ یَّتَزَوَّجَھَا اَحَدُاُ ولَئِکَ فَمَا حُکْمُھَا فِیْ اَوْلَادِھِمَا ذَکُوْراً اَوْ اِنَاثاً فِی التَّابِعِیَّۃِ اَوِ الْمِیْرَاثِ، ھذا ما نرجو درجه فی الھلال فعسیٰ ان لا ینجل علینا اھل العلم برائھم فی ذالک ولھم عنی و عن الانسانیة الشکر الجزیل. علی احمد الشھیدی. بنظارة الحربیة. مصر القاھرة ۔ترجمہ۔تحقیق اسلامی شریعت نے مسلمان مرد کے لئے مباح کیا ہے کہ کتابی عورت یعنی عیسائن یا یہودن سے نکاح کرلے۔(علاوہ ازیں) قرآن کریم اور سنت نبویہ سے ماخوذ ہوتا ہے کہ اس امر میں کوئی نص صریح (موجود) نہیں ہے کہ کتابی مرد یعنی عیسائی یا یہودی شخص کسی مسلمان عورت سے نکاح نہ کرے۔اور اگر (بالفرض) شریعت نے مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد سے حرام کردیا ہے،تو اس نوجوان عورت کے متعلق کیا حکم ہے، جو مسلمانوں کے ملک سے دور رہتی ہے اور اس کو اسلام پسند آگیا اور وہ وہاں ہی مسلمان ہوگئی۔مگر اس کی بدنی و مالی طاقت ایسی نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر مسلمانوں کے ملک میں جاسکے۔بعد ازاں اس کے نکاح کا وقت پہنچتا ہے۔اور اس ملک کے لوگ، جو اس عورت کے کفو وہم قوم ہیں مگر غیر مسلم ہیں،اس کے پاس بارادہء نکاح آمد ورفت کرنے لگے۔پس کیا جائز ہوسکتا ہے کہ ان غیر مسلم لوگوں میں سے کوئی شخص اس عورت سے نکاح کرلے، یا وہ اپنے ملک میں ستی (رہبانیہ) رہے، جب کہ شریعت اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔کیا شریعت اسلامیہ اس عورت کو اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے۔پھر ان کے ازدواج سے پیدا ہونے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں ان کی متابعت و میراث کے بارے میں کیا حکم ہے۔امید ہے کہ آپ اس استفتاء کو الھلال میں درج فرمادینگے۔اور ہم اہل علم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق اپنی اظہار رائے کا ہم پر بخل نہیں کریں گے۔ان کا میری طرف سے اور بنی نوع انسان کی طرف سے بے حد شکرادا کیا جاتا ہے۔علی احمد شہیدی۔نظارۃ الحربیہ۔مصر القاھرہ۔

جواب۔ا۔ایک عورت یا مرد، جس نے اپنی قوم کے مذہبی اعتقادات و رسوم و اعمال کو اسلئے ترک کردیا ہو کہ وہ اس کیلئے زندگی دارین میں مضر ثابت ہوئے ہوں، تو آیا اس کیلئے جائز ہے کہ کسی نفسانی خواہش کی مجبوری کی غرض سے پھر اس قوم کے افراد سے ازدواج جیسا میل ملاپ پیدا کرے، جس سے اس کو اسی پہلی حالت کی طرف عود کرنا وگندہ ہونے کی قوی توقع ہو؟ ہرگز جائز نہیں ہے۔

۲۔ازدواج کا اثر طرفین پر بڑا قوی ہوتا ہے۔پس جو مسلمان عورت ایک ایسے شخص سے نکاح کرے، جس کے اعتقادات و اخلاق اسلام کے برخلاف ہوں، تو بالضرور ایسے شخص کا اثر اس عورت پر

پڑے گا اور اس کے اخلاق حمیدہ کے لئے مخرب ہوگا۔ لہٰذا ایسا نکاح ہرگز جائز نہیں۔

۳۔ ایک اشرف وافضل مرد یا عورت، جس کو اس وقت ایک چیز کی اشد ضرورت ہے، مگر وہ دور و دراز ممالک سے نہایت عمدہ ونفیس واعلیٰ و پائیدار و حسب دلخواہ مل سکتی ہے اور اس کے ملنے کی امید قوی ہے، اگرچہ بالفعل اس کے ملنے کے لئے کوئی سامان مہیا نہ ہوں۔ اور اس کے اپنے شہر میں اس نوع کی اشیاء بکثرت موجود ہوں، جن سے کچھ قدر حاجت براری تو ہوسکتی ہے، مگر وہ نہایت ہی ردی و ناپائیدار ہوں اور ان کے استعمال سے ان اشیاء کی طرح اس کو بھی ردی، گندہ و بیمار ہونے کی قوی امید ہو، تو اب سوال یہ ہے کہ وہ شخص یا عورت کیا کرے؟ اول الذکر یعنی اس چیز کی امید پر رہے، جو دور دراز ممالک سے مل سکتی ہے یا اس اپنے ملک کی ہی ردی اشیاء میں سے ایک لے کر گذران کرے۔ جواب یہی ہے کہ وہ ممالک بعیدہ والی چیز کا انتظار کرے اور اس کے حصول کے لئے سعی کرے۔ یہی حال مسلمہ عورت و کافر مرد کے ازدواج کا ہے۔

سوال۔ شاید کوئی کہے کہ یہود و نصرانی کافر نہیں ہوتے۔ اسی جہت سے خدا نے اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز فرمایا ہے۔

جواب۔ واضح ہو کہ انبیاء میں سے کسی ایک کو نہ ماننے والے مرد و عورت کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پکا کافر کہا ہے۔ سو یہود تو دو نبیوں حضرت عیسیٰؑ و حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر ہیں۔ اور عیسائی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان کے منکر ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد ذیل ملاحظہ کرو۔ **اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً ط اُولٰئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ط وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَاباً مُّھِیْناً.** ترجمہ۔ جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کا اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ ڈالیں اور کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں بیچ میں ایک راہ۔ ایسے لوگ اصل کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور نصاریٰ کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔** ترجمہ۔ یعنی تحقیق وہ لوگ کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ خدا تیسرا ہے تین میں سے۔

دیکھو آیات مذکورہ بالا میں صاف آ چکا ہے کہ جو شخص کسی ایک نبی کا منکر ہو وہ کافر ہے۔ اور ایسا ہی تثلیثی مذہب والے تمام افراد مرد و زن کو خدا تعالیٰ قرآن کریم میں کافر کہتا ہے اور کافر مردوں و عورتوں

اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے ازدواج کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد ذیل ملاحظہ کرو۔

یَـا اَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ آمَنُوْا اِذَا جَاءَ کُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ط اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِـاِیْـمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ ط لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَ لَا هُمْ یُـحِـلُّـوْنَ لَهُنَّ ۔ترجمہ۔اے ایمان والو، جب تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن کو چھوڑ کر آئیں، تو ان کو جانچ لو۔ اللہ بہتر جانتا ہے ان کے ایمان کو۔ پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں، تو ان عورتوں کو کافر مردوں کی طرف نہ بھیجو۔ نہ یہ مسلمان عورتیں ان کافر مردوں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر مرد ان مسلمان عورتوں کے لئے حلال ہیں۔

اور یہ جو آیا ہے کہ اہل کتاب عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ اہل کتاب عورتیں، جن کے خاوند اہل کتاب میں سے ہوں اور وہ عورتیں خود مسلمان ہو جائیں، تو وہ عورتیں مسلمان مردوں کے لئے حلال ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے حضرت مسیح کو ابن اللہ و ثالث ثلاثہ کہنے والی عورتوں۔ اور قـالـت الیهود عزیز ابن اللہ کہنے والی اور ہمارے پیارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و کینہ رکھنے والی عورتوں سے ایک مؤحد مسلمان کا نکاح جائز ہو سکے۔ اگر یہ امر جائز ہوتا، تو خدا تعالیٰ قرآن کریم میں یوں نہ فرماتا کہ مشرک عورتیں مؤمن مردوں کے لئے ہرگز جائز نہیں۔ پس خوب غور کرو کہ یہودن و عیسائن عورتیں بروئے حوالہ قرآن کریم مشرکہ و کافرہ ہیں یا نہیں۔ اگر وہ مشرکہ و کافرہ نہیں، تو ان سے نکاح کرلو۔

جبکہ عورتوں کے متعلق یہ امر ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمہ عورت کا نکاح ایک ایسی قوم کے مرد سے جائز ہو سکے، جس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان پر میرا غضب ہوا، ۔ وہ مغضوب علیہم ہیں۔ وہ میرے اور میرے دوستوں کے پکے دشمن اور ضال و مضل ہیں۔ کیا ایسے عقیدہ والی عورتوں کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح یا کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی ایسے عقیدہ والے مرد سے جائز ہوسکتا ہے۔ جس عقیدہ کے متعلق خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ تَـکَـادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَ تَـنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۔ترجمہ۔نزدیک ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں اس قوم پر خدا تعالیٰ کے غضب کے سبب جو کہ خدا کے لئے بیٹا تجویز کر کے اس کا ابن اللہ کہتے ہیں۔ کیا ایسا عقیدہ رکھنے والے مرد سے مسلمہ عورت کا نکاح جائز ہوسکتا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَا تُـنْکِحُو الْمُشْرِکَاتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ وَ لَا تُنْکِحُو الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا ۔ترجمہ۔یعنی نکاح نہ

کرومشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں، اور نکاح نہ کرو مسلمان عورتوں کا مشرک مردوں سے جب تک وہ مرد مؤمن نہ ہولیں۔

ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو ماریہ قبطیہ سے نکاح کیا تھا، وہ مسلمان ہو چکی تھیں۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں۔ اِخْتِلَافُ الدِّیْنِ مَانِعٌ مِنْ اِبْتِدَاءِ النِّکَاحِ فَکَانَ مَانِعاً مِنْ دَوَامِہٖ کَالرَّضَاعِ۔ترجمہ۔یعنی دین کا اختلاف ابتدائے نکاح سے مانع ہے۔پس اختلاف دین ہمیشہ کے لئے رضاعت کی طرح ازدواج سے مانع ہے۔

قال الزهری لم یبلغنی ان امراة هاجرت الی الله و رسوله و زوجها کافر مقیم بدار الکفر الا فرقت هجرتها بینها و بینا زوجها الا ان یقدم زوجها مهاجرا قبل ان تنقضی عدتها ۔ترجمہ۔زہری کہتا ہے کہ مجھے کوئی ایسی روایت نہیں پہنچی کہ کسی عورت نے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی ہو اور اس کا خاوند دار کفر میں مقیم ہو۔سوائے اس کے کہ اس کی ہجرت نے اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان جدائی ڈالی۔مگر یہ کہ اس کا خاونداس کی عدت گذرنے سے پہلے ہجرت کر کے آجائے۔اگر عدت گذر جائے، تو وہ عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جاتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ مرد کا فر و عورت مسلمان ہو، تو ان کی اولاد اپنے باپ سے وراثت لے گی، خواہ وہ بچے بلوغت کے بعد مسلمان ہی ہو جائیں یا کہ اپنے والد کے پیرو کار رہیں۔

اِنَّمَا اُمَّھَاتُ النَّاسِ اَوْعِیَةٌ مُسْتَوْدَعَاتٌ وَ لِلْاَحْسَابِ اٰبَاءُ
فَاِنْ یَّکُنْ لَھُمْ مِنْ اَصْلِھِمْ شَرَفٌ یُفَاخِرُوْنَ بِہٖ فَالطِّیْنُ وَالْمَاءُ

ترجمہ۔تحقیق لوگوں کی مائیں صرف ظروف ہیں جو کہ جائے امانت نطفہ ہیں اور نسب تو باپوں پر ہوتا ہے۔پس جس کا نسب ہوگا اسی سے اولاد کو وراثت بھی ملے گی۔اور اگر لوگوں کو اپنی اصل اور بزرگی پر فخر ہے، تو ان کی اصل مٹی اور پانی ہے، جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے بیان مذکور کا مطلب یہ ہے کہ کافر مرد و مسلمان عورت کے ایسے ازدواج کی اولاد باپ سے حصہ لے سکتی ہے کہ پہلے دونوں میاں بیوی (مرد و عورت) کافر ہوں اور پھر ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے۔اور ان کی اولاد کے دینی امر کا یہ حال ہے کہ بلوغت کے بعد جس طرف وہ راغب ہوں وہی ان کا دین و مذہب ہوگا۔

ایسی عورت، جسکے متعلق استفتاء میں ذکر ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدی سے روکے اور تقویٰ اختیار کرے۔اور تقویٰ و عفت اختیار کرنے سے بالآخر ایسی عورتوں و مردوں کے لئے خدا تعالیٰ

کا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہ حسب دلخواہ ان کا جوڑا مہیا کرے گا۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ **فَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ** ۔ترجمہ۔یعنی تقویٰ وعفت اختیار کریں وہ مرد و عورتیں جن کے پاس سامانِ نکاح موجود نہیں۔ پس اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ ان کو سارے اسباب نکاح اپنے فضل سے مہیا کر کے غنی ولا پرواہ و بے محتاج کر دے گا۔ یہ ہے خدا تعالیٰ کا فتویٰ اس عورت کے متعلق جس کا استفتا میں ذکر ہے۔

قرآن کریم میں جو اہل کتاب عورتوں کا نکاح مسلمان مردوں سے جائز ٹھہرایا گیا ہے، اس سے وہ عورتیں مراد ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کی اتاری ہوئی توریت وانجیل کے ماننے والی ہوں اور مؤحد ہوں، نہ کہ آجکل کی محرفہ بائیبل اور عیسائیوں کے بناوٹی مجموعوں کے موافق مشرکہ وتثلیث کی قائل ومعتقد ہوں۔ بلکہ مؤحد مسلمان ہوں اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی نہ رکھتی ہوں، گو ان کے پہلے خاوند یہودی یا عیسائی زندہ ہوں، کیونکہ وہ مسلمان ہونے سے یہود وعیسائیوں کے لائق نہیں رہتیں۔ اور ایسا بھی ہرگز جائز نہیں ہوسکتا کہ جبراً کسی یہود یا عیسائی سے اس کی عورت چھین لی جائے، حالانکہ وہ عورت اپنے پہلے مذہب یہودیت ونصرانیت پر قائم ہو۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت برضائے خود مسلمان ہوکر مسلمان سے نکاح کرے۔

بالفرض اگر مسلمان مرد کا نکاح برضائے فریقین کسی یہودن وعیسائن سے جائز ہوسکتا ہے، تو اس کی ایک وجہ توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مرد کو غالب وعورت کو مغلوب قرار دیا ہے۔ تو ایسے نکاح و ازدواج سے یہ صورت ہوگی کہ توحید کا نقشہ بالا وغالب اور شرک وکفر کو نیچے ومغلوب کر کے دکھایا گیا، جس میں یہ ایما ہے کہ توحید شرک پر غالب ہے۔ اور واقع میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ چونکہ مرد کی تاثیر قوی ہوتی ہے، اس لئے عورتیں، خواہ یہودن یا عیسائن ہوں، وہ مسلمان ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کے برعکس ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مسلمہ عورت کا نکاح یہودی یا عیسائی مرد سے کسی مجبوری کے سبب جائز ہو سکے۔ کیونکہ یہ امر حکمت الٰہی کے برخلاف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نکاح جائز ہوتا، تو یہ نقشہ یوں دکھائی دیتا کہ شرک بالا وتوحید نیچے ومغلوب ہوتی۔ لہٰذا یہ امر قانون قدرت وحکمت الٰہی کے سرسر برخلاف ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح یہودی یا عیسائی مرد سے جائز ہو سکے۔ کیونکہ اس طرح سے توحید کو مغلوب اور شرک کو غالب قرار دینا پڑتا ہے اور اس امر سے خدا کی غیرت اور اس کا قانون قدرت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وافضلیت مانع ہیں۔ کیونکہ ایسے ازدواج افضل الرسل وخاتم الانبیاء سید وُلدِ آدم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے ومغلوب دکھانا پڑتا ہے، سو یہ امر خدا کو منظور نہیں ہے۔

یار احمد شو کہ تا غالب شوی　　یار مغلوباں مشو تو اے غوی

سوال۔تم نے مسلمان عورت کا نکاح عیسائی یا یہودی مرد سے ناجائز قرار دینے کی وجوہات میں سے ایک یہ وجہ بھی بتائی ہے کہ ایسا کرنے سے توحید و حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب اور شرک و یہودیت کو غالب قرار دینا پڑتا ہے۔پس جبکہ ایسا ہے تو تم خود کیوں برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہو کر زندگی بسر کر رہے ہو، جو کہ عیسائی گورنمنٹ ہے۔کیا غیر مسلم مذہب والی حکومت کے ماتحت ہونے سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر شان نہیں ہوتی۔

جواب۔خداتعالیٰ نے انسان کو دو چیزوں جسم و روح کا مجموعہ بنایا ہے اور ان ہر دو کی حفاظت کے لئے الگ الگ دو قسم کے انسان مقرر فرمائے ہیں۔حفاظت جسم کے لئے سلاطین اور ان کا عملہ و اراکین سلطنت اور روحانی حفاظت کے لئے انبیاء اور ان کے نواب و خلفاء مقرر ہوئے۔ہر کسے را بہر کارے ساختند۔سو ہمارے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بنی آدم کو روحانی ہلاکتوں سے بچانے کی غرض سے ہوئی تھی۔اور آپ نے اہل اسلام کے لئے یہ کوئی خاص حکم نہیں فرمایا کہ وہ مسلمان سلاطین کی حکومت کے سوا کسی اور حکومت کے ماتحت نہ رہیں۔بلکہ آپ نے پہلے پہل صحابہ ءکرام کو کفار مکہ کی ایذا دہی کے سبب سے مکہ سے ہجرت کرنے اور نجاشی بادشاہ حبش کی عیسائی گورنمنٹ میں جا کر رہنے کا امر فرمایا، جو کہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔یہ بات اس امر پر دال ہے کہ اہل اسلام کا گروہ کثیر بالآخر عیسائی گورنمنٹ کے ماتحت میں ہوگا۔اور اس بادشاہ کا اہل اسلام کے ذریعہ بغیر کسی جبر و اکراہ کے مسلمان ہو جانا اور ان کے ذریعہ اس کو نجات دارین حاصل ہونا اس امر پر دال ہے کہ جس قدر کسی حکومت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کثیرہ آباد ہو، اسی قدر اس کو امن ہوگا۔اور آنحضرتؐ کا ایسا کام کرنے میں یہ ایما بھی ہے کہ آنحضرتؐ کا بروز اعظم القائم بامر اللہ حضرت محمد مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ظہور کسی ایسی ہی حکومت میں ہو۔اور بالآخر اسی طرح جس طرح نجاشی شاہ حبش بغیر جبر و اکراہ کے برضامندی خود مسلمان ہو گیا تھا، ایسا ہی آخری زمانہ میں القائم بامر اللہ کی تاثیرات انفاس قدسیہ سے بغیر جبر واکراہ اسلام کی طرف عام اور خاص لوگوں کو بکثرت رجوع و میلان ہو اور خدا نے اَطِیْعُوْا اُوْلِی الْاَمْرِ کہہ کر حکومت مسلم و غیر مسلم کی خصوصیت نہیں فرمائی۔

ضمیمہ نمبر ۱

درباب نکاح واولاد پنجم زن

ذیل میں چیف کورٹ پنجاب کے ایک فیصلہ کا مکمل متن درج کیا جاتا ہے، جس میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ آیا ایک مسلمان کو چار بیویوں کی موجودگی میں پانچویں بیوی سے شادی کرنیکا حق پہنچتا ہے اور کیا اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد باپ کے ورثہ کی حقدار ہے یا نہیں۔(مرتب)

بحث وکلاء وعلماء در باب نکاح واولاد پنجم زن وفیصلہ ججان چیفکورٹ پنجاب

باجلاس مسٹر جسٹس جانسٹن صاحب بہادر ومسٹر جسٹس لال چند صاحب بہادر

خورشید جان و یک کس دیگر مدعا علیہم اپیلانٹان بنام عبدالحمید خان ودیگر کسان مدعیان رسپانڈنٹان

اپیل دیوانی نمبر ۹۷۰ بابت ۱۹۰۶ء

خلاصہ مقدمہ۔ شریعت محمدیؐ۔ از دواج ہمراہ زن پنجم۔ جوازیت شادی قسم مذکور۔ صحیح النسبی ایسی اولاد کی جو شادی ناجائز سے پیدا ہو۔

قرار دیا گیا کہ بروئے شرع محمدیؐ از دواج ہمراہ زوجہ پنجم بموجودگی چار زندہ زوجگان کے ناجائز ہوتا ہے، مگر باطل نہیں ہوتا۔ اور بنابریں ایسے نکاح کی اولاد صحیح النسب ہوتی ہے اور بطور وارث جائز اپنے والد کے جانشین بننے کی مستحق ہوتی ہے۔ عزیز النساء خاتون بنام کریم النساء خاتون کا حوالہ دیا گیا۔ انڈین لار پورٹ۔ کلکتہ۔ جلد ۲۳۔ صفحہ ۱۳۰۔

اپیل اول بنا راضی ڈگری شیخ رکن الدین صاحب ڈسٹرکٹ جج اٹک۔ مؤرخہ ۲۸ جون ۱۹۰۶ء

مسٹر روشن لال منجانب اپیلانٹاں حاضر ہے۔ مسٹر فضل حسین رسپانڈنٹاں حاضر ہے۔

فیصلہ عدالت مذکور لال چند صاحب بہادر حاکم نے صادر کیا۔ لال چند صاحب بہادر حاکم

مدعیان رسپانڈنٹان مقدمہ ہذا پسران سردار محمد ابراہیم خان ہیں، جو ایک افغان اسیر سلطانی تھا۔ جو بمقام حسن ابدال بماہ اگست ۱۹۰۴ء فوت ہوا۔ مدعا علیہم اپیلانٹان اس کی بیوہ خورشید جان اور اس کا پسر عبدالرحمٰن ہیں، جو پسر کہ قریباً دو ماہ بعد وفات سردار مذکور پیدا ہوا۔ سردار محمد ابراہیم خان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک کل خاندان نہایت امن سے اور شرائط صلح کے مطابق رہا۔ اور ایک مشترک سارٹیفکیٹ وراثت بحق اس کے چھ پسران کے، جنمیں عبدالرحمٰن مدعا علیہ اپیلانٹ شامل تھا، حاصل کیا گیا) مگر تھوڑا عرصہ بعد فریقین لڑ پڑے۔ ہر دو مدعیان بالغ نے ایک نالش فوجداری بتاریخ ۱۵ جون ۱۹۰۵ء زیر دفعہ ۳۸۰ و ۴۱۱ مجموعہ تعزیرات ہند برخلاف مدعا علیہ نمبر ا خورشید جان و کئی دیگر اشخاص رجوع کی، جن کی نسبت یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے عورت مذکور کی بد دیانتی سے نقدی و پارچات و زیورات کے نکال

لینے میں اعانت کی تھی۔ کاروائی فوجداری کے دوران مدعیان کوان کے وکیل نے یہ مشورہ دیا کہ مدعاعلیہم سردارابراہیم خان کی وراثت میں سے کسی حصہ لینے کے مستحق نہ تھے۔ کیونکہ جب خورشید جان مدعاعلیہ نمبرا سے سردار موصوف نے ۱۹۰۲ء میں نکاح کی تھا۔ اس وقت اس کی چار زوجگان زندہ تھیں اور بدیں وجہ بروے شرع محمدیؐ مشارٌ الیہا کا ازدواج اس کے ہمراہ بالکل ناجائز تھا۔ اس پر مدعیان نے استغاثہ فوجداری کو چھوڑ دیا۔ اور نالش ہذا بتاریخ ۳۱ اگست ۱۹۰۵ء واسطے استقرار اس امر کے رجوع کی کہ مدعا علیہم وارثان سردار ابراہیم خان نہ تھے، کیونکہ نمبرا کا ازدوراج ہمراہ سردار بروے شرع محمدیؐ ناجائز تھا۔

مدعاعلیہم نے اپنے جواب دعویٰ میں صریح طور پر اس امر سے انکار نہ کیا کہ سردار ابراہیم خان کی چار زوجگان زندہ تھیں، جب کہ اس نے مدعاعلیہ نمبرا سے شادی کی، مگر یہ عذر کیا کہ بروے قانون و رواج نکاح جائز تھا۔ مگر جب مدعاعلیہ نمبرا کی شہادت بطور گواہی لی گئی، تو اس نے اس امر سے انکار کیا کہ جب اس کے ہمراہ سردار نے شادی کی تھی، تو اس کی چار زوجگان زندہ نہ تھیں۔ مشارٌ الیہا نے ظاہر کیا کہ اس کو علم نہ تھا کہ بی بی مستورہ اس وقت سردار کی زوجہ تھیں۔ اور بیان کیا کہ بی بی مریم اس کی زوجہ نہ تھی، بلکہ اس کے بھائی کی بیوہ تھی۔ مگر اس نے تسلیم کیا کہ نازکو اور تاج بی بی زوجگان سردار اس وقت تھیں۔ صاحب ڈسٹرکٹ جج نے بعد تحقیقات یہ تجویز کیا کہ جب سردار نے مدعاعلیہ نمرا سے نکاح کیا تو مشارٌ الیہا اس کی پانچویں یا چھٹی زوجہ تھی۔ اور کہ بدین وجہ اس کا نکاح ناجائز تھا۔ اور بنابریں مدعاعلیہم بروے شرع محمدی جائز وارث سردار نہ تھے۔ چنانچہ صاحب ڈسٹرکٹ جج نے بلا کرنے کسی تحقیقات نسبت رواج کے ڈگری دعویٰ صادر کی اور فی الحقیقت کوئی ثبوت رواج فریقین نے پیش نہ کیا۔

مدعاعلیہم اپیل کرتے ہیں اور صاحب ڈسٹرکٹ جج کی اس تجویز کی تردید کرتے ہیں کہ مدعاعلیہ نمبرا زوجہ پنجم تھی اور نکاح بروئے شرع محمدیؐ ناجائز تھا۔ بوقت پیشی مقدمہ وکیل مدعاعلیہم نے یہ بھی عذر کیا کہ گو نکاح ناجائز ہو، تو بھی کم از کم مدعاعلیہ نمبر۲ شرع محمدیؐ کے مطابق وراث بننے کا مستحق تھا۔

سوال واقع کی نسبت کوئی گنجائش اس امر کے شبہ کی نہیں ہے کہ سردار ابرہیم خان کی چار زوجگان زندہ تھیں، جب کہ اس نے مدعاعلیہ نمبرا سے شادی کی۔ اس امر سے خاص طور پر مدعاعلیہم نے اپنے عذرات میں انکار نہ کیا۔ گویا اس کو واضح طور پر مدعیان نے اپنے عرضی دعویٰ میں بیان کیا تھا۔ علاوہ بریں معتبر اور بلاواسطہ شہادت سے یہ بات ثابت ہے کہ بی بی مستورہ اور بی بی مریم سردار کی منکوحہ زوجگان تھیں اور وہ مدعاعلیہ نمبرا کے نکاح کے وقت زندہ تھیں اور کوئی بلاواسطہ شہادت نہیں ہے، جس سے ظاہر ہو کہ بی بی مریم سردار کے برادر کی بیوہ تھی، جیسا کہ مدعاعلیہ نے بطور گواہ اپنے اظہار میں بیان کیا۔ لہٰذا

ہم صاحب ڈسٹرکٹ جج سے اتفاق رائے کرتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ خورشید جان مدعا علیہ نمبر ا بوقت نکاح خود اگر چھٹی زوجہ سردار موصوف نہ تھی، تو کم از کم پانچویں تھی۔

مزید براں ہم کو کوئی معقول وجہ واسطے واپسی مقدمہ بغرض تحقیقات نسبت رواج مبینہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ عدالت ماتحت میں کوئی شہادت یا ثبوت پیش نہیں کیا گیا تھا اور امر متنازعہ کی خاص نوعیت پر اور حیثیت فریقین پر غور کرنے کے بعد یہ امر ہرگز اغلب معلوم نہیں ہوتا کہ کسی تحقیقات مزید کی اب ہدایت کی گئی، تو کوئی شہادت جو کسی طور پر مفید یا قابل وقعت ہو، دستیاب ہوگی۔ پس سوال صاف طور پر شرع محمدیؐ کا ہے کہ آیا نکاح ہمراہ زوجہ پنجم علاوہ زوجگان کے، جو اس وقت موجود ہوں، جائز ہوتا ہے۔ اور اس کے قانونی نتائج کیا ہوتے ہیں۔

منجانب مدعا علیہم اپیلانٹان یہ بحث کی گئی کہ نکاح از یں قسم صرف ناجائز ہوتا ہے اور کہ بوجہ اس کے ناجائز ہونے کے زوجہ پنجم مستحق وراثت پانے کی نہیں ہوتی ہے۔ مگر ایسی زوجہ کی اولاد صحیح النسب ہوتی ہے اور اس امر کی مستحق ہوتی ہے کہ بطور جائز وارث پدر خود جانشین ہو۔

منجانب رسپانڈنٹان یہ حجت کی گئی کہ نکاح ہذا بالکل باطل ہے اور بنا بریں نہ تو زوجہ پنجم نہ اس کی اولاد اس امر کی مستحق ہے کہ بروئے شرع محمدیؐ بطور وارث جانشین ہو۔

منجانب اپیلانٹاں کتاب "شرع محمدی" مصنفہ امیر علی صاحب جلد دویم صفحہ ۳۱۰ پر انحصار کیا گیا۔ اور منجانب رسپانڈنٹاں کتاب "انگلو محمڈن لا" مصنفہ ولسن صاحب صفحہ ۱۳۹ پر ان کی حجت کی تائید میں ذیل کی سندات پر انحصار کیا گیا۔ یعنی کتاب مصنفہ امیر علی صاحب صفحہ ۲۶۹۔ "ٹیگور لا لیکچر" ۹۱، ۹۲ صفحات ۱۶، ۱۰۱۔ "ردالمختار" صفحہ ۳۷۹ و مقدمہ عزیز النسا خاتون بنام کریم النسا ("انڈین لا رپورٹ" کلکتہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۳۰)۔ بعد ملاحظہ سندات محولہ فریقین و بعض دیگر سندات متعلق مضمون مذکور ہم اس امر کے قرار دینے پر مائل ہیں کہ نکاح ہمراہ زوجہ پنجم ناجائز ہوتا ہے مگر باطل نہیں ہوتا۔ اور بنا بریں مدعا علیہ نمبر ۲ اس امر سے ممنوع نہیں ہے کہ وہ حقیت متروکہ پدر خود سردار محمد ابراہیم خان کا وارث بنے۔

فاضل وکیل منجانب رسپانڈنٹاں نے اس امر کی بحث کرنے کی کوشش میں کہ بروئے شرع محمدیؐ نکاح ناجائز و نکاح باطل میں کوئی تمیز نہیں کی گئی ہے۔ مگر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش کی تردید خاص اس سند سے ہوتی ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یعنی "ردالمختار" صفحہ ۳۷۹ سے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کہ فاضل مصنف نے جتایا ہے کہ ایسے مراتب کو غور میں لانے کے ذریعے جن کا اثر کسی بیع کی جوازیت پر پڑتا ہو تمیز بالا کو مختلط نہیں کرنا چاہئے۔ الا نکاح ناجائز و نکاح باطل کے مابین جو فرق ہے اس کو مشرح

نے صاف طور پر تسلیم کیا ہے اور اس نے کئی نظائر ایسے نکاحوں کی دی ہیں ،جن کو نا جائز کہا جائے گا۔ منجملہ ان کے وہ نکاح ہوتا ہے، جو زوجہ پنجم سے باقی چار زوجگان میں سے کسی ایک کے زمانہ عدت میں کیا جائے۔اور وہ نکاح بھی، جو ایک ہی وقت میں دو ہمشیر گان سے کیا جائے۔علاوہ براں اس فرق کو مصنف "درالمختار" نے جس کی کہ "ردالمختار" محض ایک شرح ہے صاف طور پر تسلیم کیا ہے اور کئی شرحان نے اس مضمون پر بحث کرتے ہوئے اس فرق کو قطعی طور پر ایسے الفاظ کے استعمال سے جتلایا ہے، جیسا کہ باطل و فاسد۔دراصل وہ مثال فاسد نکاح کی جو مصنف "درالمختار" نے دی ہے یعنی کہ جب کوئی نقص گواہاں ہو،اس امر کو قطعی طور پر گرفت کرتی ہے۔کیونکہ یہ حجت کرنا بےسود ہے کہ ایسا نکاح جو بوجہ کسی نقص گواہ یا دیگر امر ضابطہ ہیچو قسم ناقص ہو، وہ بالکل باطل ہوتا ہے۔اور نہ کہ محض ایک نا جائز نکاح۔پس ضرور ہے کہ اس امر کو بلا کسی شبہ اور تنازعہ کے تسلیم کیا جائے کہ شرح محمدیؐ ایک بڑا فرق نکاح باطل اور فاسد میں تسلیم کرتی ہے اور جو نکاح ہائے بہ سبب کسی نقص کے فاسد ہوتے ہیں۔اور وہ ضرور نہیں کہ شروع ہی سے باطل ہوں۔

پس جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے سوال یہ ہے کہ آیا نکاح، جو زوجہ پنجم کے ہمراہ علاوہ چار زوجگان زندہ کیا جاوے،وہ بروے شرع محمدیؐ باطل ہوتا ہے یا کہ محض فاسد نکاح کی اولاد صحیح النسب نہ ہوگی۔ایسی اولاد کی صحیح النسبی کی تائید میں سندات کا حوالہ دینا ضروری نہیں ہے۔ اِلّا اقتباس ذیل از "ٹیگور لکچر ہائے"۹۱، ۹۲،صفحہ ۱۲۹ فقرہ ۱۲۴۲۷۔اس امر کو شک و شبہ کے مرحلہ سے عبور کرا دیتا ہے۔اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شروع سے اخیر تک شادی باطل و شادی فاسد میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔

دفعہ۳۔متعلق صور ہائے نسب ۱۲۴۲/ ۳۴۲ ایک شخص کسی عورت سے بطور ازدواج فاسد نکاح کرتا ہے اور بعد ازاں وہ اس سے مباشرت کرتا ہے۔اور عورت ازاں بعد چھ مہینہ پر بچہ جنتی ہے یعنی عین چھ ماہ بعد ساعت ازدواج تو اس بچہ کا نسب (بقول ابوحنیفہ و ابو یوسف) شخص متذکرہ صدر سے قائم ہو گا۔اگرچہ تولید ساعت مباشرت سے چھ مہینے کے اندر ہوئی ہو۔اس رائے کی تائید اس بحث میں کی گئی ہے، جو کتاب "اینگلو محمڈن لا" مصنفہ ولسن صاحب میں بصفحات ۸۷، ۹۷ حسب ذیل مندرج ہے۔

صفحہ ۸۷۔ پدریت قانونی رشتہ ہوتا ہے، جو پدر اور طفل کے درمیان ہو۔حقوق و فرائض جنکا انحصار ان رشتہ ہائے قانونی پر ہوتا ہے۔وہ (ج) حقوق وراثت باہمی ہوتے ہیں،جن کا ذکر باب ۸ میں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۷۹۔ پدریت ایسے شخص سے قائم ہوتی ہے، جو باپ بیان کیا جائے بذریعہ ثبوت یا قیاس قانونی اس امر کے کہ طفل اس کے نطفہ سے ایسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا، جو وقت حمل اس کی جائز زوجہ تھی اور جن کو نیک نیتی سے اور معقول طور پر اپنی زوجہ جائز سمجھتا تھا نہ کہ کسی دیگر طریق پر۔

نسبت ایسی صورت کے، جن میں ولدیت بطور نتیجہ ایسے نکاح کے قائم ہوتی ہے، جو دراصل فاسد تھا۔ اگرچہ اس کو بوقت مباشرت جائز یقین کیا جاتا تھا۔ دیکھو نیز کتاب مصنفہ بیلی صاحب۔ جلد پنجم دفعہ چہارم۔

الّا اس امر کو زیادہ وضاحت سے (اگر زیادہ وضاحت ممکن ہے) کتاب ڈائجسٹ مصنفہ بیلی صاحب میں بہ صفحہ ۳۹۲ بیان کیا گیا ہے۔

پدریت کے قائم کرنے میں تین درجے ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ نکاح جائز ہو یا نکاح فاسد، جو ایسے نکاحوں کے معنوں میں آسکے، جو کہ جائز ہوتا ہے۔ نکاح فاسد، جو تکمیل کو پہونچایا گیا ہو، نکاح ہائے جائز سے اپنے بعض نتائج میں شامل ہو جاتا ہے۔ جن میں ایک نتیجہ پدریت کا قائم کرنا ہوتا ہے۔

ایضاً فتاوی عالمگیری۔ صفحہ ۴۴۶۔ **فی النکاح الفاسد ثبت نسب الولد المولود** ۔ معنے یہ ہیں کہ نکاح فاسد میں نسب یعنی صحیح النسبی اولاد کی قائم ہوتی ہے۔

اس لئے اس امر کے شبہ کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے کہ اگر نکاح ہمراہ زوجہ پنجم محض فاسد ہوا اور شروع سے باطل نہ ہو تو مدعا علیہ نمبر ۲ اپنے باپ سردار محمد ابراہیم خان کا جائز وارث ہوگا۔ پس امر تنقیح طلب اور زیادہ تنگ ہو کر صرف بمنزلہ اس واحد مسئلہ کے رہ جاتا ہے کہ آیا نکاح پنجم بروئے شرح محمدیؐ باطل ہوتا ہے یا فاسد ہوتا ہے۔ جہاں تک ہم دریافت کر سکے ہیں سندات نسبت اس امر کے شاہد بالکل متفق نہیں۔ الّا ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ وزن تحقیق طور پر بتائید نکاح کے صرف فاسد ہونیکے ہیں۔

منبع شرح محمدیؐ یعنی القرآن نسبت اس مضمون کے بالکل خاموش ہے۔ آیت متعلق سوال تعداد زوجگان حسب ذیل ہے (اور اگر ڈرو تم کہ انصاف نہ کرو گے تم یتیم لڑکیوں کے حق میں، تو نکاح کرو، جو تم کو خوش آویں، عورتیں دو دو تین تین چار چار)۔ کتاب اینگلو محمڈن لا مصنفہ ولسن صاحب۔ صفحہ ۳۲۔ اس عبارت کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ اسکے ذریعے تعداد کی غایت حد چار مقرر کی گئی ہے نہ کہ زیادہ۔ دیکھو کتاب مصنفہ ولسن صاحب صفحہ ۳۲ و ٹیگور لا لیکچر ہائے ۹۱، ۹۲ و ٹیگور لیکچر ہائے بابت ۱۸۷۳ء صفحہ ۳۱۶ جن میں ہدایہ کی سند کا حوالہ بتائید اس امر کے دیا گیا ہے کہ اس کے رو سے تعداد صرف چار تک محدود کی گئی ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ اس تعبیر کو، جو کئی شرحان نے کی ہے، بطور صحیح تعبیر کے قبول کیا جائے۔

الاّ اس قدر اظہار رائے کرنا شاید جائز ہوگا کہ بادی النظر میں یہ عبارت اپنی شرائط میں ایسی مانع نہیں ہے جیسے کہ وہ عبارت، جس کے رو سے نکاح ہمراہ بعض خاص رشتہ داران امھات وغیرہ ممنوع ٹھہرایا گیا ہے۔عبارت مؤخرالذکر حسب ذیل ہے۔ٹیکورلیکچر ہائے ۹۱۔۹۲ فقرہ جات ۱۱۶ و ۱۲۰۔تم کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی والدہ وغیرہ سے اور زوجگان پسرانِ خود سے، جو تمہاری پشت سے پیدا ہوئے ہیں، نکاح مت کرو۔اورتم کو یہ بھی منع کیا جاتا ہے کہ دو ہمشیرگان زوجہ مت بناؤ بجز اس صورت کے جو ابتک گذر چکی ہے۔پس عبارت قرآن شریف کو چھوڑ کر، کیونکہ وہ امر متنازعہ کی نسبت کوئی قطعی نیتجہ پیدا نہیں کرتی ہے، کوئی گنجائش شک کرنیکی موجود نہیں ہے کہ بموجب سند ابوحنیفہ اس قسم کا نکاح جیسا کہ مقدمہ ہذا میں متنازعہ ہے، نکاح ناجائز قرار دیا جائے گا۔اس مضمون پر مفصل بحث کتاب ڈائجسٹ مصنفہ بیلی صاحب میں بصفحات ۱۵۰۔لغات ۱۵۵ کی گئی ہے۔

باب سوم ڈائجسٹ مذکور میں بصفحہ ۲۳ یہ جتلایا گیا ہے کہ عورتوں کے نو اقسام ہوتے ہیں، جو ناجائز یا ممنوع ہوتے ہیں۔منجملہ چوتھا قسم ان عورتوں کا ہوتا ہے، جن کو جائز طور پر اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔ اوران میں نوع اول وہ ہے، جس میں کوئی مرد جائز طور پر چار سے زیادہ زوجگان کسی ایک وقت میں نہیں رکھ سکتا ہے۔صفحہ ۳۰۔

صفحہ ۱۵۰ پر یہ جتلایا گیا ہے کہ نکاح فاسد وہ ہوتا ہے، جس میں جوازیت کی شرط میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ان معنوں میں ہر ایک نکاح، جو خلاف قانون ہو اور بنابریں ہر ایک نکاح جو مابین کسی مرد کے اوران نو (۹) اقسام کی عورتوں میں سے کسی ایک کی ہو، جو اس کے لئے ممنوع ہیں یا حرام ہیں، ناجائز ہوتا ہے۔لیکن جب کسی مسلم نے اپنی محرمات میں سے کسی ایک کے ہمراہ نکاح کیا ہو اور اس عورت کے بطن سے بچہ پیدا ہو، تو اس کا نسب بقول ابوحنیفہ ومحمدؒ اس سے قائم نہیں ہوتا۔کیونکہ ان کی رائے میں نکاح باطل ہوتا ہے۔حالانکہ بقول ابوحنیفہ بچے کا نسب اس شوہر سے قائم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی رائے میں نکاح صرف ناجائز ہوتا ہے۔ہمارے نزدیک یعنی فرقہ حنفی کے نزدیک محرمات ایسی عورتیں ہوتی ہیں، جن کے نکاح کرنے سے مرد کو بوجہ نسب یا قرابت یا رضاع ہمیشہ ممانعت ہوتی ہے خواہ وہ رشتہ بذریعہ مباشرت ناجائز کے بھی ہو۔چنانچہ اس میں والدہ و دختر عورت شامل ہیں۔

عورت مجوسی کو بذریعہ اسلام جائز بنالیا جاتا ہے یا بذریعہ قبول کرنے مذہب عیسائی یا مذہب یہودیان۔اور ایسی عورت کو، جس سے تین دفعہ انکار کیا گیا ہو، بذریعہ تکمیل شادی ہمراہ شوہر دویم و انقضائے عدّت اور عورت متعددہ دیگر شخص کو بذریعہ انقضائے محض میعاد عدت۔چنانچہ ان عورات میں

سے کسی کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی مرد کے واسطے ہمیشہ کے لئے ممنوع ہیں۔ بنابریں وہ محرمات نہیں ہوتی ہیں۔ مشابہت استدلال سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام دیگر عورات سے، جو کسی مرد کے لئے حرام یا ممنوع ہوتی ہیں، صرف وہی عورات، جن کو بوجہ نسب یا قرابت یا رضاع ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، اس کی محرمات ہوتی ہیں۔ پس صرف انہی کی نسبت یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ جو شادی ان کے ہمراہ کی جاوے وہ حسب رائے ابوحنیفہ ومحمدؒ باطل ہوگی۔

انتخاب بالا سے، جو صریحاً فتاویٰ عالمگیری کی سندات پر مبنی ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ مطابق رائے ابوحنیفہ کل خلاف قانون نکاح فاسد ہوتے ہیں۔ اور بقول اس کے دو شاگردوں کے ایسے نکاح ہائے، جو بوجہ نسب قرابت رضاع ہمیشہ کے لئے ممنوع ہیں، باطل ہوتے ہیں نہ کہ باقی اقسام ناجائز نکاح ہائے کے۔ اس فرق کی نسبت پھر بحث صفحہ فقرہ اخیر میں کی گئی ہے۔ مرد عورت میں دو قسم کی ناجائز مباشرت ہوتی ہے۔ یعنی ایک وہ، جو بذاتہٖ ناجائز ہو۔ اور دوسری وہ، جو بلحاظ کسی دیگر امر کے ناجائز ہو۔ فعل مقدم الذکر میں زنا ہوتا ہے اور فعل مؤخر الذکر زنا نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ مرد کو کوئی حق نسبت عورت کے حاصل نہ ہو، یا درحالیکہ ایسا حق حاصل ہو، وہ عورت ہمیشہ کے لئے اس کو ممنوع ہو، تو مباشرت بذاتہٖ ناجائز ہوتی ہے۔ اور جبکہ ممانعت عارضی ہو، تو مباشرت بوجہ کسی شے کے ناجائز ہوتی ہے۔

باب سوئم کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ منجملہ ان نو (۹) اقسام عورات کے، جو کسی مرد کے واسطے ناجائز یا حرام ہوتی ہیں، چھٹی ساتویں اور نویں قسموں کا تصفیہ ان امر کے ظاہر کرنے سے کیا گیا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے ممنوع نہیں ہوتی ہیں۔ اور کہ نوع چہارم (جو یہی نوع مقدمہ ہذا میں متنازعہ ہے) اور نوع ششم کا اس طور پر تصفیہ بذریعہ سندات خاص یا بذریعہ مشابہت ادلال اس طور پر کیا گیا ہے کہ ان کے ہمراہ مباشرت، جبکہ اس کی اجازت از روئے استحقاق منجانب مرد کے ہو، بمنزلہ زنا نہیں ہوتی ہے، جو قریباً وہی بات ہے۔ (صفحہ جات ۱۵۳، ۱۵۴) صریح طور پر یہی رائے امیر علی صاحب نے اپنی کتاب "شرع محمدی" میں بصفحات ۳۱۸، ۳۱۹ اختیار کی ہے۔ مثلاً تعلقات، جو خلاف قانون ہوتے ہیں، وہ شروع سے باطل ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ کوئی حقوق اور فرائض دیوانی مابین فریقین پیدا نہیں ہوتے۔ وہ نکاح جو ان درجوں میں منعقد کئے جائیں، جو ازروئے شرع محمدی ممنوع ہیں، وہ ان نکاحہائے کی ذیل میں آتے ہیں، جو شروع سے باطل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق کوئی حقوق نہیں ہوتے اور انکا کوئی اثر قانونی نہیں ہوتا ہے۔ بقول امام ابو یوسف ومحمدؒ جن کی رائے نافذ ہیں تعلق مذکور کی ناجوازیت میں۔ اس امر سے بھی کوئی فرق نہیں آتا ہے کہ نکاح نیک نیتی سے اور بصورت عدم واقفیت

ان اسباب کے کیا گیا تھا، جن کے رو سے فریقین ایک دوسرے کی نسبت حرام تھے۔ اگر ایسے نکاح سے کوئی اولاد ہو تو اس کو مطابق عام مسئلہ مسایل حنفیہ کے حیثیت صحیح النسبی کی حاصل نہیں ہوتی۔ گو عورت کو پھر شادی کرنے سے پہلے رواجی میعاد عدت کی ملحوظ رکھنی ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ جیسا کہ پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے حسب قول ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے ہے۔ کیونکہ مطابق قول ابوحنیفہ ہر ایک نکاح، جس میں بوجہ خلاف قانون یا خلاف قاعدہ یا کسی نا قابلیت کے حائل ہونے کے کوئی نقص کسی ایک وجہ یا دوسری سے عاید ہوتا ہے، وہ صرف فاسد ہوتا ہے۔ اور اولاد ہر حالت میں صحیح النسب ہوتی ہے۔

وہ نکاح، جن میں کوئی اصلی نقص قسم متذکرہ بالا عائد ہو کر ان کو ناقص اور خلاف قانون نہیں بنا دیتا ہے، وہ ایک مختلف صورت پر مبنی ہیں۔ ایسی صورتوں میں تکمیل نکاح عام طور پر اس نقص کو دور کر دیتا ہے، جو نکاح کی جوازیت کے بارہ میں ہوتا ہے۔ جو اطفال معاہدہ کی موجودگی کی اثناء میں حمل میں آتے ہیں اور تولد ہوتے ہیں وہ صحیح النسب قرار دیئے جاتے ہیں۔ ازاں بعد نظائر فاسد نکاح ہائے قسم بالا ہیں۔ اور منجملہ ان کے نظیر ذیل کو "ردالمحتار" سے نقل کیا گیا ہے۔ نکاح ہمراہ زن پنجم وکیل منجانب رسپانڈنٹ نے یہ ظاہر کیا کہ مثال آخری کا مفصل طور پر حوالہ نہیں دیا گیا تھا۔ اور جو مثال مصنف "ردالمحتار" نے بیان کی تھی، وہ نکاح کے ہمراہ پانچویں زوجہ کے در اثنائے عدّت زوجہ چہارم تھی۔ یہ صحیح ہے۔ الاّ اس سے کوئی اثر اس رائے کی صحت پر نہیں پڑتا ہے، جو امیر علی صاحب نے نسبت اس اختلاف کے اختیار کی ہے۔ جو ابوحنیفہ اور ان کے دو شاگردوں کی رایوں میں ہے۔ اور یہ رائے بالکل مطابق اس رائے کے ہے، جس کا اظہار "ڈائجسٹ" مصنفہ بیلی صاحب میں کیا گیا ہے، جس کا ہم نے مفصل طور پر اقتباس کیا ہے۔ وکیل منجانب رسپانڈنٹان نے بحث کرنے کی اس طور پر کوشش کی کہ بقول شاگرد ہائے موصوف جملہ نکاحہائے باطل ہوتے ہیں۔ اور اس نے اخیر فقرہ مندرجہ ۳۱۸ کا حوالہ دیا ہے، جو عبارت بقول امام ہائے سے شروع ہوتا ہے، جس کا اوپر پورا پورا اقتباس کیا گیا ہے۔ الاّ یہ کوشش صریحاً بے سود ہے اور اسکی کوئی بنا کھڑے ہونے کی نہیں ہے۔ ناجوازیّت تعلق، جس کا حوالہ فقرہ ہذا میں دیا گیا ہے، متعلق درجہ ہائے ممنوع کے ہے، جیسا کہ فقرہ مقدم میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور فاضل وکیل اس امر کے نا قابل تھا کہ کوئی واحد سند اس حجت کی تائید میں پیش کرتا۔ بموجب مسلّمہ مسائل ہر دو شاگردان ان کے جملہ ناجائز نکاحہائے باطل ہوتے ہیں، جو ایک ایسی حجت ہے، جو صاف طور پر سند فتاوی عالمگیری کے مخالف ہے، جس طور پر کہ اس کا حوالہ "ڈائجسٹ" مصنفہ بیلی صاحب میں دیا گیا ہے۔ اس بحث کا جو صفحہ ۲۶۹

کتاب مذکور میں نسبت سوال مشابہت نکاح کی گئی ہے، جس پر تقریر میں انحصار کیا گیا تھا، کوئی تعلق امر متنازعہ سے نہیں ہے اور وہ بالکل نا قابل اطلاق ہے۔ برخلاف اس کے ایک انتخاب صفحہ ۳۱۷ پر کتاب عنایہ کا دیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی مباشرت بذاتہٖ ناجائز ہو، یا یوں کہو کہ قطعی طور پر ناجائز ہو، تو وہ زنا ہوتی ہے۔ مگر جب کہ مباشرت بوجہ کسی دیگر امر کے ناجائز ہو، مثلاً بصورت ممانعت عارضی، تو وہ زنا نہیں ہوتی۔ اس رائے کی معقول تائید اس بحث سے ہوتی ہے، جو ٹیگور لیکچر ہائے ۹۱-۹۲ جلد دویم صفحہ ۱۰۰ پر کی گئی ہے۔ جیسا کہ انتخاب ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقرہ ۱۷۵ ممانعت از دواج دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو مدامی ممانعت ہوتی ہے اور دوسری غیر مدامی ممانعت یعنی ممانعت عارضی۔ فقرہ ۱۷۶ مدامی ممانعت بذریعہ نسبت یا رضاع یا صہریّت (یعنی تعلق جماع خواہ جائز ہو یا غیر جائز) قائم ہوتی ہے۔ فقرہ ۱۷۷ وہ عورات، جو بذریعہ نسب حرام ہیں، وہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے نساء کے نام سے مخصوص کیا ہے جبکہ وہ فرماتا ہے۔ ذیل کی عورات تمہارے واسطے حرام ہیں، یعنی تمہاری مائیں (علیٰ ہذا تا اخیر آیت) قطع نظر تفصیل متعلق ایسی عورات کے، جو بوجہ رضاع وصہریّت مدامی طور پر ممنوع ہیں۔ اور جنکی بابت بحث فقرہ جات ۱۷۹ الغایت ۱۲۰۲ میں کی گئی ہے۔

مضمون زیر بحث مقدمہ ہذا کی تشریح فقرہ ۱۲۰۳ میں کی گئی ہے حسب ذیل ہے۔ فقرہ ۱۲۰۳ اب در بارہ ایسی عورات کے، جو مدامی طور پر ممنوع نہیں ہیں (بلکہ عارضی طور پر) ایسی عورات سات اقسام کی ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی وہ عورت ہوتی ہے، جو جائز تعداد سے فاضل ہو اور جائز تعداد مرد حرّ کیلئے چار عورات ہوتی ہیں، خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام۔

اگر کوئی مرد حُر پانچ عورات سے یکے بعد دیگرے نکاح کرے، تو وہ نکاح ہائے، جو پہلی چار عورات کے ہمراہ ہوں، جائز ہوتے ہیں اور نکاح ہمراہ زوجہ پنجم جائز نہیں ہوتا۔ الّا اگر ہر پانچ عورات سے بذریعہ ایک عقد کے نکاح کرے، تو ان میں سے ہر ایک کا نکاح فاسد ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر فاسد بمعنی باطل استعمال کیا گیا ہے۔

فقرہ ۱۲۰۳ محض ایک کھلا ترجمہ بزبان انگریزی فقرہ ۳۰۳ فتاویٰ قاضی خان کا ہے، جس کا ابتدائی متن بھی لیکچر ہائے مذکور کے اخیر میں طبع کیا گیا ہے۔

اس موقعہ پر اس عین عربی عبارت فتاویٰ قاضی خان کا انتخاب کرنا مفید ہوگا، جو متعلق سوال جوازیّت یا ناجوازیّت نکاح پنجم کے ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہے۔ **وَ اِذَا تَزَوَّجَ الْحُرُّ خَمْسًا علٰی التَّعَاقُبِ جَازَ نِکَاحُ الْاَرْبَعِ الْاَوَّلِ وَ لَا یَجُوْزُ نِکَاحُ الْخَامِسَةِ وَاِنْ زَوَّجَ خَمْسًا فِیْ عقْدَةٍ**

فَسَدَ الْکُلُّ ۔ جو عبارت اس موقعہ پر استعمال کی گئی ہے، وہ آسانی سے قابل تفہیم ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد مرد پانچ عورات سے یکے بعد دیگرے نکاح کرتا ہے، تو پہلی چار کا نکاح جائز ہوتا ہے۔ اِلاَّ نکاح پانچویں کا جائز نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر چہار سے بذریعہ ایک عقد کے نکاح کرتا ہے، تو وہ عقد فاسد ہوتا ہے۔ فاضل مصنف "ٹیگور لیکچر ہائے" نے لفظ فاسد کی، جو یہاں پر استعمال کیا گیا ہے، تعبیر یہ کی ہے کہ وہ بمعنے باطل ہے خواہ یہ صورت ہو یا نہ ہو۔ اِلاَّ یہ ظاہر ہے کہ بصورت پانچ پے در پے نکاحوں کے لفظ استعمال شدہ لَا یَجُوْزُ ہے کہ پانچویں جائز نہیں ہوتی یعنے ناجائز ہے۔ ایک نہایت صاف اور سیدھی سند بتائید حجت مدعا علیہم کی ہے۔ اور اس سے عبور کرنا ہم کو قریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ خود عبارت متن سے یہ امر خارج از شبہ ہو جاتا ہے۔

باب کے شروع میں ایک فرق درمیان ممانعت ہائے دائمی و عارضی کے کیا گیا ہے اور نکاح پنجم کو ذیل مؤخر الذکر میں لکھا گیا ہے۔

پدریّت کے سوال پر مصنف نے اپنی کتاب کے فقرہ ۳۴۲ میں (لیکچر ہائے کے فقرہ ۱۲۴۲ میں) بحث کی گئی ہے اور اس جگہ اس امر کو واضح طور پر جتلایا گیا ہے، جیسا کہ اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے بذریعہ نکاح فاسد شادی کرے اور اس سے مباشرت کرے، تو طفل کا نسب (بقول ابوحنیفہ و ابو یوسف) اسی سے قائم ہوگا۔ امر اختلاف ان ہر دو صاحبان اور محمدؒ میں صرف یہ ہے کہ آیا چھ ماہ تاریخ نکاح سے شمار ہونے چاہئیں یا تاریخ مباشرت سے۔

یہ ایک ایسی صاف سند ہے، جیسی کہ طلب کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ یہ امر بلا شک و شبہ قائم ہو جاتا ہے کہ نکاح پنجم محض ناجائز ہوتا ہے اور کہ ایسے نکاح کی اولاد مطابق متفق الرائے ابوحنیفہ اور اس کے دو شاگردوں کے صحیح النسب ہوتی ہے، جو بحث صفحہ ۱۰۱ لیکچر ہائے میں کی گئی ہے جس پر وکیل رسپانڈنٹ نے اپنی تقریر میں انحصار کیا، وہ متعلق ممانعت دائمی بوجہ نسب رضاع کے ہے اور اس امر کی نسبت ہرگز اطلاق پذیر نہیں ہے، جو مقدمہ ہذا میں متنازعہ ہے۔

وہ عبارت عربی، جس کا ہم نے "فتاویٰ قاضی خان" سے انتخاب کیا ہے، لفظ بہ لفظ "فتاویٰ عالمگیری" میں صفحہ ۳۹۱ پر اس دفعہ کے تحت میں، جس میں محرمات بالغیر کا ذکر ہے، مندرج ہے۔ اور اس کتاب میں اس دفعہ کی تحت میں، جو متعلق نتائج نکاح ہائے فاسد صفحہ ۴۶۶ پر مندرج ہے (جس کا اوپر اقتباس کیا جا چکا ہے)، یہ جتلایا گیا ہے کہ بصورت نکاح فاسد کے طفل کی پدریّت قائم ہو جاتی ہے اور اختلاف صرف متعلق طریقہ شمار ایام کے ہے، جو مقدمہ ہذا کے لئے غیر اہم ہے۔ لہٰذا جو نتیجہ مصنف

"فتاویٰ عالمگیری" نے نکالا ہے، وہ عین مطابق ہماری رائے کے ہے، جو" فتاویٰ قاضی خان" میں مندرج ہے یعنی کہ پانچواں نکاح پے در پے والا جائز نہیں ہوتا ہے اور کہ پانچوں نکاح، جو ایک عقد کے ذریعہ کئے جائیں، فاسد ہوتے ہیں۔ اور نکاح فاسد میں صحیح النسبی قرار دی جاتی ہے۔ ذیل میں وہ پوری پوری عبارت درج کی گئی ہے، جو اس سوال کے متعلق ہے، جس طور پر کہ " فتاویٰ عالمگیری" میں صفحہ ۴۶۶ پر درج ہے، جیسا کہ سرکاری مترجم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ فصل ہشتم متعلق نکاحہائے فاسد وشرائط متعلقہ آں۔

جب کوئی نکاح فاسد پایا جائے، تو قاضی کو چاہیئے کہ شوہر اور زوجہ کے مابین تفرقہ کر دے۔ اگر کوئی مباشرت نہ ہوئی ہو، تو زوجہ کسی مہر کی مستحق نہ ہوگی اور نہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ میعاد عدت کو پورا کرے۔ مگر اس صورت میں کہ شوہر اور زوجہ کے مابین مجامعت ہوئی ہو، تو زوجہ اس مہر کو حاصل کرے گی، جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ یا جو اس کے خاندان میں مروج ہو (مہر المثل) یعنی جو ان ہر دو میں کمتر ہو۔ مہر صرف اس صورت میں دلایا جائیگا، جبکہ وہ مقرر کیا گیا۔ اِلاّ اگر وہ مقرر نہ ہوا ہو، تو اس کو مہر المثل ملے گا۔ خواہ اس کی تعداد کچھ ہی ہو۔ اس صورت میں عورت کے لئے میعاد عدت پوری کرنی ہو گی۔ اور صرف وہی مجامعت مانی جائے گی، جو کی گئی ہو اور مرد نے اپنے عقد کے منشاء کو پورے طور پر حاصل کیا ہو۔ میعاد عدت اس وقت سے شمار ہو گی، جبکہ شوہر اور زوجہ کے درمیان تنسیخ نکاح عمل میں آ چکی ہو۔ اس رائے کو ہر سہ اماموں نے اختیار کیا تھا (دیکھو" کتاب محیط") پدریت ایسے شخص کی، جو بطور اولاد نکاح فاسد پیدا ہو، قائم ہو گی۔ اور میعاد نسب بقول امام محمدؒ (جس پر خدا کی رحمت ہو) وقت مباشرت سے شمار ہو گی۔ اور اس سے فتویٰ دیا گیا ہے۔ یہی رائے ابواللیث نے" کتاب اربعین" میں اختیار کی ہے۔ بطور نکاح فاسد کوئی قاعدہ نافذ اختیار نہیں کیا جاتا، تاوقتیکہ مجامعت عمل میں نہ آئی ہو۔ اگر کوئی شخص کوئی ناجائز نکاح کرے اور ہمراہ زوجہ خلوت کرے، جس کے بطن سے طفل متولد ہو اور وہ مرد اس عورت کے ہمراہ مجامعت کرنے سے انکاری ہو، تو اس امر پر امام ابو یوسف کی (ان پر رحمت ہو) دو رائے ہیں۔ ایک رائے کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے تولد شدہ طفل کا نسب قائم ہو جائیگا اور مہر واجب الادا ہو جائیگا اور عدت ضروری ہو جائیگی۔ اِلاّ دوسری رائے میں وہ فرماتے ہیں کہ نسب قائم نہیں ہوتا ہے اور مہر اور عدت ضروری نہیں ہوتے ہیں۔ بصورت کہ مرد نے ہمراہ اس عورت کے خلوت نہ کی ہو، تو طفل تولد شدہ اس کے نطفہ سے پیدا ہوا تصور نہیں کیا جائیگا۔ (دیکھو" کتاب محیط")

ہم نے قبل ازیں "درالمختار" اور" ردالمختار" کا حوالہ دیا ہے کہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان

شرحوں کے مصنفان صاف طور پر نکاح فاسد اور نکاح باطل کے مابین فرق کو تسلیم کرتے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات، جو ان کی شرحوں سے کئے گئے ہیں، صریحاً اس رائے کی تائید کرتے ہیں کہ زوجہ پنجم کے ہمراہ نکاح کرنے سے کوئی مرد قصوروار مستوجب حدّ یعنی سزا کا بروئے شرع محمدی نہیں ہوتا ہے۔ اور اس لئے پانچویں زوجہ کے ہمراہ مجامعت کرنا زنا نہیں ہوتا ہے۔ اور ایسے نکاح کی اولاد صحیح النسب ہوتی ہے۔ ہم ان اقتباسات کو اختیار کرتے ہیں، جو فیصلہ عزیز النساء خاتون بنام کریم النساء خاتون میں فیصلہ کے اخیر پر صفحات ۱۶۹ الغایت ۱۷۱ پر مندرج ہیں۔

اگر وہ شخص، جو مباشرت کرے، نسب کا ادّعا کرے، تو نسب قسم اول میں قائم ہو گا۔ یعنی بصورت شک نسبت محل اور نسب صورت دوئم میں قائم نہ ہو گا۔ یعنی بصورت شک نسبت قول۔ اور بصورت شبہ العقد بھی کوئی سزا نہیں ہے۔ بقول امام ابوحنیفہ مثلاً جب کوئی شخص کسی محرم کے ہمراہ مباشرت کرے، جس سے کہ اس نے نکاح کیا ہو۔ اِلاّ ابو یوسف اور محمدؒ نے قرار دیا ہے کہ اگر وہ مرد ناجوازیّت کے بارہ میں آگاہ تھا، تو وہ مورد حدّ کا ہوگا۔ اور اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ (خلاصہ)

اِلاّ جملہ مشرحان رائے ابوحنیفہ کو فوقیت دیتے ہیں اور بنابریں رائے مذکور کے مطابق فتویٰ دے دینا قابل ترجیح ہے۔ اور ایسا ہی قاسم نے اپنی کتاب موسومہ "تصحیح" میں بیان کیا ہے۔

اِلاّ کتاب کوہستانی میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ فتویٰ بموجب رائے ابو یوسف و محمدؒ دیا جاتا ہے۔ اور "فتح القدیر" میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ قسم شبہ العقد متعلق اس جماعت کے ہے، جس شبہ المحل کہا جاتا ہے۔۔ اور شبہ المحل میں نسب اسی طور پر قائم ہوتا ہے، جیسے کہ قبل ازیں بحث کی گئی ہے۔ یا مثلاً مجامعت بصورت ایسے نکاح کے، جو بغیر گواہان ہوا ہو، اور اس صورت میں کوئی سزا بوجہ شبہ نکاح کے نہیں ہے۔

"شرح ردالمختار" نسبت فقرہ بالا حسب ذیل ہے۔

مثلاً جب کوئی شخص محرم کے ہمراہ مجامعت کرے، جس سے کہ اس نے شادی کی ہو، کے معنے یہ ہیں کہ جس کے ہمراہ اس نے عقد ازدواج کیا ہو۔ اور مصنف "تنویر الابصار" نے لفظ محرم کو عام طور پر بلا کسی شرط کے استعمال کیا ہے اور بدیں وجہ لفظ محرم میں وہ عورات شامل ہیں، جو بوجہ نسب یا رضاع یا صہریت ممنوع ہیں۔ اور مصنف "تنویر الابصار" ایما کرتا ہے یا مفہوماً بیان کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی منکوحہ سے نکاح کر لیوے یا ایک ہی عقد کے ذریعے پانچ عورات سے نکاح کرے اور مجامعت کرے، تو ان صورتوں میں کوئی حد نہیں ہے۔ اور یہ امر (مطابق نہایت پسندیدہ تعبیر کے) باتفاق رائے ان سب اماموں کے ہے۔ وجہ عدم موجودگی حد بقول ابوحنیفہ صاف ہے۔ اور وجہ برائے

عدم موجودگی حدّ بقول ابو یوسف و محمدؒ ہے، اور بقول ان کے شک صرف اس وقت دور ہوتا ہے، جبکہ محارم کے درمیان شادی ایک ایسی ہو، جس کی ناجوازیّت کے متعلق اجتماع رائے ہو اور جو دائمی طور پر ناجائز ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ امر بالا "فتح القدیر" میں بیان کیا گیا ہے، جس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ قانون دان، جن کی تواریخ اور جن کی تصنیفات معتبر ہیں مثلاً ابو منظر، انہوں نے بیان کیا ہے کہ بقول ہر دو شاگردان موصوف مرد مورد حدّ کا صرف ان صورتوں میں ہوگا، جبکہ عورتیں محرمات سے ہوں۔ ورنہ بصورت عورات دیگر کے مثلاً عورت مجوسی و زوجہ پنجم و زوجہ متعدد دیگر کس۔ یہ بھی بحوالہ دیگر سندات کے جتلایا گیا ہے کہ محرم کے معنے بقول ہر دو شاگردان موصوف مدامی ممنوع ہیں۔ اِلّا مصنفان موصوفہ صدر کی رایوں سے مزید انتخابات کرنا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ انتخابات مندرجہ بالا بلاشک وشبہ اس مر کو ثابت کرتے ہیں کہ بصورت نکاح ہمراہ زوجہ پنجم حد قائم نہیں ہوتی ہے۔ اس صورت میں، جبکہ پانچ عورات کا نکاح بذریعہ ایک عقد کے ہو، جو بقول قاضی خان فاسد ہوتا ہے۔ مگر جس کی فاضل مصنف "لیکچر ہائے ٹیگور" ۹۱، ۹۲ نے یہ کی ہے کہ وہ بمعنے باطل یا کالعدم ہے۔

اس رائے کی تائید "ردالمختار" کے صفحہ ۳۷۹ کی آخری دو سطور کے ملاحظہ سے ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ مباشرت کا اثر نکاح موقوف اور نکاح فاسد میں یکساں ہوتا ہے۔ یعنی کہ سزا چھوڑ دی جاتی ہے اور نسب قائم ہوتی ہے اور زوجہ اس امر کی مستحق ہوتی ہے کہ کم سے کم مقدار مہر کی وصول کرے۔ جو عبارت صفحہ ۳۸۰ پر پہلی دو سطور میں مندرج ہے اس میں کوئی نظائر نکاح فاسد کی نہیں دی گئی ہیں۔ اِلّا صریحاً ایسی مثالیں دی گئی ہیں، جن میں شادی جائز کے ہمراہ کوئی باطل شرط شامل ہو اور منجملہ ان کے یہ مثالیں دی گئی ہیں کہ جب دو ہمشیرگان کے ہمراہ بذریعہ ایک عقد کے نکاح کیا جائے یا ہمشیرہ زوجہ سے اس کی عدت کے زمانہ میں نکاح کیا جائے۔ یا زوجہ مطلقہ سے نکاح کیا جائے یا زوجہ پنجم سے باثنائے عدت زوجہ چہارم نکاح کیا جاوے۔ ان نظائر سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے جیسا کہ وکیل منجانب رسپانڈنٹان نے نکالنے کی کوشش کی کہ نکاح ہمراہ زوجہ پنجم بالکل باطل ہوتا ہے۔

عملی طور پر کوئی بحث بابت امر متنازعہ کتاب "اینگلو محمڈن لا" مصنفہ ولسن صاحب یا "ہدایہ" میں نہیں کی گئی ہے۔ اور بدیں وجہ، جو حوالہ جات ان سندات کی تقریر میں دیئے گئے ہیں، وہ کوئی کارآمد نہیں ہیں اور کوئی وقعت نہیں رکھتے ہیں۔ اِلّا ایک مقدمہ کا حوالہ کتاب "اصول وسابقہ نظائر شرع محمدی" مصنفہ میکناٹن صاحب میں صفحہ ۲۶۰ پر دیا گیا ہے، جو عین مطابق اس رائے کے ہے، جس کا اوپر "فتاویٰ قاضی خان" سے اقتباس کیا گیا ہے۔ مقدمہ، جو بیان کیا گیا ہے، حسب ذیل ہے۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کسی مسلمان نے چار عورات سے نکاح کیا، جو ٹھیک ٹھیک طور پر اس کی کنیز کان کہی جا سکتی ہیں، تو اس کا نکاح ہمراہ ان کے کالعدم ہوگا۔ اور اس کا نکاح مابعد ایک عورت آزاد کے دراصل نکاح پنجم نہ ہوگا۔ اور وہ نکاح بحسین حیات کنیز کان کے صحیح ہوگا۔ اِلّا اگر وہ چار عورات ٹھیک طور پر اور قانوناً اس کی کنیز کان نہ ہوں، تو ان کے ہمراہ نکاح از روئے قانون جائز ہوتا ہے۔ اور نکاح ما بعد ہمراہ زوجہ پنجم نکاح پنجم ہوتا ہے۔ اور بدیں وجہ فاسد ہوتا ہے۔ اِلّا مہر بعد تکمیل نکاح فاسد واجب الادا ہوتا ہے۔ اسی طرح پر نکاح فاسد کا نسب شوہر سے قائم ہوتا ہے۔

اب ان دو جوڈیشل فیصلہ جات پر غور کرنا باقی ہے، جن کا حوالہ وکیل رسپانڈنٹان نے دیا ہے۔ یعنی محمد الہداد خان بنام محمد اسمٰعیل خان (۱) وعزیز النساء خاتون بنام کریم النساء خاتون (۲) فیصلہ اول میں سوال تسلیم بروئے شرع محمدیؐ پر بحث کی گئی ہے اور وہ متعلق نہیں ہے۔ مگر فیصلہ مؤخر الذکر کسی قدر متعلق ہے۔

مقدمہ کلکتہ میں سوال متنازعہ یہ ہے کہ آیا نکاح ہمراہ ہمشیرہ زوجہ، جو جائز طور پر منکوحہ تھی، جائز تھا یا نہیں۔ اور یہ قرار دیا تھا کہ نکاح قسم مذکور باطل تھا اور اولاد نکاح مذکور غیر صحیح النسب تھی، یہ تجویز کیا گیا کہ نکاح قسم مذکور صاف طور پر قرآن شریف میں منع کیا گیا ہے اور کہ اس کو عام طور پر مصنفان ومشرحان شرع محمدی نے نکاح باطل تصور کیا ہے اور کہ وہ دراصل ان عورتوں کی قسم میں آتا ہے، جو بوجہ قرابت ممنوع ہیں۔ اور کہ ایک نظیر سابق کا حوالہ "اصول ونظائر شرع محمدی" مصنفہ میکناٹن صاحب میں صفحہ ۲۶۷ پر دیا گیا تھا، جس سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ نکاح باطل تھا اور اولاد غیر صحیح النسب تھی۔ اس امر کی تائید میں کہ نکاح باطل نہ تھا، بلکہ صرف فاسد تھا، سند صرف ایک فقرہ مندرجہ "فتاویٰ عالمگیری" تھا، جو ایک دوسری کتاب کی سند پر مبنی تھا، جسکا پتہ نہ ملا۔ اور بحالات مذکور یہ قرار دیا گیا کہ وہ ایک ہی سند "فتاویٰ عالمگیری" میں ذکر کی گئی تھی اور جس کی نسبت یہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ گذشتہ آٹھ سو سالوں میں اس کو کسی دیگر مشرح نے قبول کیا تھا۔ اور جو دیگر شروحات کی متعدد مختلف الرائے اور قرآن شریف کی واضح ممانعت کی برخلاف تھی اور جس کے رو سے نکاحہائے قسم مذکور بدرجہ مساوات نکاح ہمراہ زوجہ پسر وخوش دامن کے ہو جاتے تھے، وہ ایسی مکتفی نہ تھی کہ اس تجویز کو بجا ٹھہراوے کہ اس قسم کا نکاح صرف فاسد تھا اور باطل نہ تھا۔ اگر وہی دلیل مقدمہ حال پر قابل اطلاق ہوتی، تو یقیناً وہی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا۔ اِلّا حالات مقدمہ ہذا بالکل مختلف ہیں، جیسا کہ شروع میں جتلایا گیا ہے۔ قرآن شریف میں نکاح ہمراہ زوجہ پنجم کو اس ذیل میں نہیں رکھا گیا ہے جیسا کہ ایسے نکاح کو جو بوجہ نسب یا قرابت یا رضاع کے ممنوع

ہو۔نکاح ہمراہ زوجہ پنجم کے مضمون پر بحث ایک مختلف مقام میں اور مختلف آیت میں کی گئی ہے۔اور جو عبارت استعمال کی گئی ہے، وہ کم از کم بادی النظر میں ایسی مانع اور ایسی از قسم فرمان نہیں ہے جیسی کہ بصورت نکاح ہمراہ زوجہ کی ہمشیرہ کے بوقت پیشی مقدمہ کسی ایسی واحد سند کا بھی حوالہ نہ دیا گیا، جس میں کسی مشرح نے نکاح مذکور کو براہ راست باطل بیان کیا ہو یا ظاہر کیا ہو۔ برخلاف اس کے فتاویٰ قاضی خان میں، جس میں کہ نکاح ہمراہ ہمشیرہ زوجہ صاف طور پر باطل بیان کیا گیا ہے۔نکاح زوجہ پنجم کو ناجائز بیان کیا گیا ہے اور لفظ فاسد تک بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔اس طرح جب کہ کتاب مصنفہ میکناٹن صاحب میں صفحہ ۲۵۷ پر ایک نظیر پائی جاتی ہے، جس کے رو سے نکاح ہمراہ ہمشیرہ زوجہ کے بالکل باطل تصور کیا گیا ہے۔ایک نظیر صفحہ ۲۶۰ پر ایسی درج ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح ہمراہ زوجہ پنجم ناجائز ہے اور اولاد نکاح قسم مذکور جائز وارث ہوتی ہے۔اس مضمون پر بحث کرنے کے بعد بیلی صاحب و امیر علی صاحب بھی اس رائے پر پہونچے ہیں درحالیکہ کتاب "اینگلو محمڈن لا" مصنفہ ولسن صاحب میں اور "ہدایہ "و کتب مصنفہ گریڈی و ہملٹن صاحب میں اس مضمون کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔بحالات موجودہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جو سند براہ راست " فتاویٰ قاضی خان" میں دی گئی ہے اور جس کی تائید" فتاویٰ عالمگیری" سے اور ایک نظیر مندرجہ کتاب میکناٹن صاحب سے ہوتی ہے، وہ ضرور اس صورت میں غالب آنی چاہئے جب کہ کوئی رائے مخالف کسی دیگر مشروحات میں نہیں ہے۔ایک مستند رائے فیصلہ عظیم النساء خاتون میں صفحہ ۱۴۴ پر درج ہے، جو مخالف رائے ہذا ہے۔مگر وہ مستند رائے صریحاً ضمناً بیان کی گئی تھی، کیونکہ اس مقدمہ میں کوئی سوال متنازعہ اس بارے میں نہ تھا کہ ایسے نکاح کا قانونی اثر اور اس کی قانونی ماہیّت کیا ہوتی ہے جو ہمراہ زوجہ پنجم علاوہ چار زوجگان کے کیا جاوے اور اس امر کا حوالہ صرف بذریعہ مشابہت تفریض کردہ شدہ دیا گیا ہے۔لہٰذا ہمارے رائے میں یہ قرار دیا جانا چاہئے کہ نکاح خورشید جان ہمراہ سردار محمد ابراہیم خان فاسد تھا اور باطل نہ تھا۔اور کہ بدیں وجہ مدعا علیہ نمبر۲ پسر صحیح النسب ہے اور وہ اپنے برادران کے ہمراہ یعنی مدعیان رسپانڈنٹان اپنے والد کی حقیّت کا بطور واثت حصہ پانا کا مستحق ہے۔ اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے ہم نے مدعیان کے اس فعل کو غور میں نہیں لیا ہے کہ اس نے مدعا علیہ نمبر۲ کو بطور وارث جائز تسلیم کر لیا تھا اور نہ اس امر کو کہ سردار محمد ابراہیم خان کا نسب سلطانی تھا، نہ اس دلیل کو، جس پر وکیل رسپانڈنٹ نے اصرار کیا ہے یعنی کہ اگر کوئی تجویز بحق مدعا علیہ نمبر۲ کی گئی، تو اس سے کثیر الازدواجی کو تقویت ہوگی۔ بلکہ ہم نے مدعی کے فعل کو بالکل خارج از حساب رکھا ہے، کیونکہ یہ بیان کیا گیا تھا کہ تسلیم بوجہ غلط فہمی قانونی ہوئی تھی۔اگرچہ جس نتیجہ پر کہ ہم ابھی پہونچے ہیں اس کی یہ قوی تائید

از روئے قرائن ہے کہ خود مدعیان نے کاروائی سارٹیفکیٹ وراثت میں مدعا علیہ نمبر۲ کی صحیح النسبی کو فی الحقیقت تسلیم کیا تھا۔ہم نے اس دلیل کو کوئی وقعت نہیں دی ہے کہ اگر مدعا علیہ نمبر۲ کامیاب ہوگا،تو کثیر الازدواجی کو تقویت ہوگی۔ کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ بوجہ اس منظوری مذہبی کے، جو قرآن شریف میں مندرج ہے،جس کے رو سے تعداد نکاحہائے چار زوجگان تک محدود کی گئی ہے۔اور بلحاظ اقتصادی حالت لوگوں کے اس امر کا کافی اطمینان ہے کہ نکاح پنجم اگر کبھی ہوگا تو شاذ و نادر صورتوں میں ہوگا۔ بہر حال قانون کی تعبیر بہ نفس خود بر بنائے ایسی سندات کے کرنی ہوتی ہے،جن کی نسبت یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان میں اسلام کے اصلی فائدوں کا مناسب لحاظ رکھ کر تعبیر کی گئی ہے۔مگر ایک امر صاف ہے یعنی کہ منشائے اسلام بہ مثل منشائے دیگر قوانین اس امر کے برخلاف ہے کہ بچوں کو ولدالحرام قرار دیا جائے۔ بلکہ از روئے اسلام بعض خاص صورتوں میں اور بپابندی بعض خاص قیود و تحدیدات کے یہ اجازت دی گئی ہے کہ نسب بذریعہ تسلیم بھی قائم کیا جائے۔اس کا بار ثبوت ان اشخاص پر ہوگا، جو یہ بیان کریں کہ کوئی طفل، جو بطور اولاد ایک جائز عقد نکاح ہمراہ ایک عورت کے پیدا ہوا، جو عورت کہ نکاح کے بالکل لائق ہے اور نا قابل ازدواج نہیں ہے، جیسے کہ محرمات ہوتی ہیں، وہ دراصل صحیح النسب اس وجہ پر نہیں ہے کہ اس تعداد سے،جس کی واضح طور پر قرآن شریف میں اجازت دی گئی ہے،تجاوز کیا گیا۔

ہماری رائے میں رسپانڈنٹان کسی صحیح سند کے حوالہ سے جو براہ راست معلق ہو اس بار ثبوت سے سبکدوش ہونے میں ناکام رہے ہیں۔ بلکہ جیسا قبل ازیں بیان کیا گیا ہے غلبہ وزن یقینی طور پر مخالف جانب میں ہے۔لہٰذا اگر ہمارے فاضل برادر متفق ہوں تو بروئے تجاویز مندرجہ صدر ہماری رائے میں اپیل منجانب مدعا علیہ نمبر۱ ڈسمس ہونا چاہئے۔اور یہ ہدایت ہونی چاہئے کہ فریقین اپنا اپنا خرچہ جملہ عدالتہا آپ برداشت کریں۔

جانسٹن صاحب بہادر حاکم۔ہم عام طور پر طرز دلیل و نتائج اپنے ہم جلیس سے اتفاق کرتے ہیں۔حکم اجلاس ڈویژن وہی ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔اپیل منظور کیا گیا۔ ۳۱ اگست ۱۹۰۷ء

(چودہویں صدی)

شریعت اسلام کا فیصلہ اس امر کے متعلق یہی ہے کہ جس عورت سے نکاح جائز نہیں ہے اس کی اولاد اگر اسی مرد سے پیدا ہو جائے،جس پر وہ عورت حرام تھی،تو وہ اولاد صحیح النسب نہ ہوگی۔**الولد للفراش و للعاھر الحجر**۔قانون انگریزی بھی اسی کے مطابق ہے۔**دفعہ ۱۰۸**۔اگر ایسی عورت سے نکاح کیا جائے،جس سے جائز نہیں ہے،تو اس سے جو اولاد پیدا ہو، وہ صحیح النسب نہ ہوگی۔(فضل)

کیا لونڈیاں جسقدر کوئی چاہے بے تعداد بغیر نکاح اپنی ہمبستری کے لئے رکھ سکتا ہے؟

سوال ۔اگر ہمبستری کے لئے جس قدر کوئی چاہے لونڈیاں بغیر نکاح رکھ لے،تو اس میں اور کنجر بازی میں کیا فرق ہے؟

جواب ۔واضح ہو کہ قرآن شریف وسنت مستعملہ واحادیث صحیحہ نبویہ ؐمیں لونڈی کے ساتھ نکاح کے متعلق ہدایات آئی ہیں ۔اگر بغیر نکاح اور بے تعداد وطی کیلئے لونڈیاں رکھنی جائز ہوتیں،تو اس کی نظیر صحابہ کرام میں ملتی۔ ہاں اسلام سے پہلے منجملہ اور بدرسموں کے یہ بھی ایک بدرسم زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے اندر مروج تھی ۔اسلام نے آکر اس قبیح رسم کی بیخ کنی کر دی ۔اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اس فعل کا مرتکب ہو،تو اس کی ناواقفی کا اسلام ذمہ دار نہیں اور نہ خدا اور رسول کے ذمہ یہ الزام آتا ہے۔

قرآن کریم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آقا کو یہ اختیار تھا کہ جس قدر لونڈیاں چاہے اپنی صحبت کے لئے رکھ لے ۔اور جس وقت جس لونڈی سے چاہے،صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی مملوکہ ہے،وطی کرے ۔اگر یہ امر جائز ہوتا تو قرآن کریم میں اس کے برخلاف آیات نازل نہ ہوتیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَ مَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلاً اَنْ یَنْکِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ مِنْ فَتَیَاتِکُمُ الْمُؤْمِنَاتِ. وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ بَعْضُکُمْ مِنْ بَعْضٍ فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَ اٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحصنَاتٍ غَیْرَ مُسَافِحَاتٍ وَ لَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ. فَاِذَا اُحْصِنَ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَناتِ مِنَ الْعَذَابِ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌلَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** ۔ترجمہ۔اور تم میں سے جس کو مسلمان آزاد عورتوں سے نکاح کرنیکا مقدور نہ ہو،تو مسلمان لونڈی سے، جو تمہارے قبضہ میں آچکی ہیں،نکاح کرلے۔اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے(آزاد اور غلام) تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہی ہو۔ پس لونڈی کے اہل کے اذن سے انکے ساتھ نکاح کرلو اور دستور کے مطابق انکے مہر انکے حوالے کردو۔ بشرطیکہ وہ نکاح کی قید میں ہو کر رہیں ،نہ کھلی بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ چھپی آشنائی رکھنے والی۔ پھر اگر وہ قید نکاح میں رہنے کے بعد ارتکاب زنا کا کریں،تو ان کی سزا آزاد بیاہی عورت کی سزا سے نصف ہے۔ یہ اجازت (لونڈیوں سے نکاح کرنیکی تم میں سے ان کیلئے ہے جسکو اندیشہ ہو کہ (اگر وہ نکاح کریگا تو) کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے گا۔اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے حق میں

زیادہ اچھا ہے۔ اور اللہ بڑا حفاظت کرنے والا اور مہربان ہے۔

ان آیات سے کئی باتیں صاف ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ لونڈی قید نکاح میں ہو کر رہے اور نہ کبھی بدکاری بازاری عورتوں کی طرح کرے اور نہ چھپے آشنا رکھے، یعنی جیسے بعض عورتیں گھروں میں رہ کر زنا کرتی ہیں۔ دوسرا ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت اور کن شرائط کے ماتحت ایک آزاد مرد ایک لونڈی سے نکاح کرسکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ لونڈی اگر خاوند کے سوا کسی دوسرے سے تعلق رکھے گی، تو اس کو مرتکب زنا سمجھ کر سزا دی جائیگی۔

اب قرآن کریم سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آقا کو اختیار تھا کہ جس وقت جس لونڈی سے چاہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی مملوکہ ہے، وطی کرے۔ یہ ایک غلط نتیجہ ہے جو اس آیت سے نکالا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ. ترجمہ۔ یعنی وہ مومن نجات یافتہ ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر ان کو حفاظت اپنی شرمگاہوں کی اپنی ازواج اور ملک یمین سے شرط نہیں ہے۔ اس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ازواج کو ماملکت ایمانہم سے الگ بیان کرنیکا مطلب یہ ہے کہ ماملکت ایمانہم کو بغیر زوجیت میں لانے کے آقا کو ان سے وطی کرنا جائز تھا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ازواج اور مملوک یمین کو الگ بیان کرنے کا منشاء صرف اس امتیاز کو ظاہر کرنا تھا، جو آزاد عورتوں اور لونڈیوں میں رکھا گیا۔

اس امتیاز کی شہادت قرآن کریم سے بھی ملتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ اجازت نہیں دی گئی کہ آزاد مرد لونڈیوں سے نکاح کریں۔ بلکہ سخت مجبوری کی حالت میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ایک شخص ضرورت نکاح کی بھی رکھتا ہو، پھر اسے کوئی آزاد عورت خواہ وہ غریب ہی ہو، نہ مل سکتی ہو، پھر اسے ڈر بھی ہو کہ اگر نکاح نہ کیا تو بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا۔ تب وہ لونڈی سے نکاح کرلے۔ مگر پھر بھی ساتھ فرما دیا ہے کہ صبر کرو تو بہتر ہے۔ پس جب خود قرآن شریف نے آزاد عورتوں اور لونڈیوں کی حیثیت میں اس قدر فرق رکھا ہے اور لونڈی کے ساتھ نکاح کی صرف مجبوری کی حالت میں اجازت دی ہے، تو پھر کیا ضروری نہ تھا کہ لونڈیوں کا ذکر ازواج یعنی آزاد عورتوں سے الگ کیا جاتا۔ لفظ زوج میں جہاں ایک طرف خاوند یا بیوی ہونے کا مفہوم موجود ہے، ساتھ ہی ایک برابری کا مفہوم بھی موجود ہے۔ کیونکہ زوج جوڑے کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ دونوں چیزیں ایک سی اور ایک دوسرے کی ہم پلہ ہوں۔ لیکن چونکہ لونڈی کی حیثیت کی مساوات خاوند کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی اس واسطے اس کو ازواج سے الگ کر کے بیان کیا۔ قرآن شریف نے آزاد مردوں کے لئے ازواج کے علاوہ لونڈیوں کو بھی جائز

ٹھیرایا، تو اس کا منشاء یہ نہ تھا کہ لونڈیاں بلا نکاح ہی گھروں میں ڈالی لی جائیں یا جس کی مِلک ہوں، وہ بلا نکاح ان سے وطی کرے۔ بلکہ منشاء اس حکم کا یہ تھا کہ آزاد مردوں کو یہ اجازت ہے کہ ضرورت کے وقت لونڈیوں میں سے بھی بیویاں بنالیں یعنی ان کو اپنے نکاحوں میں لے آئیں۔

اب اس دعویٰ کے دلائل بیان کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف نے خود ہی تمام مؤمنوں کو صاف اور صریح الفاظ میں یہ حکم دیا کہ وہ اپنے عباد یعنی غلاموں اور اِماء یعنی لونڈیوں کے نکاح کر دیں۔ اب یہ دعویٰ کہ قرآن شریف لونڈیوں کے آقاؤں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ صرف ان کے مملوکہ ہونیکی وجہ سے وطی کرلیا کریں، پہلے حکم کے خلاف ہے۔ اگر یہ اجازت تھی تو پھر انکے نکاحوں کے حکم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ دونوں باتیں خود ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں کہ ایک طرف آقا کو کہا جائے کہ تم اپنی لونڈیوں کا نکاح کسی دوسرے سے کردو اور دوسری طرف اسے کہا جائے کہ تم بلا نکاح خود اس سے وطی کرلیا کرو۔ اگر لونڈی کے محض مملوکہ ہونیکی وجہ سے آقا کو اس کے ساتھ وطی کا حق پیدا ہو جاتا تھا اور مِلک ہی قائم مقام نکاح تھی، تو پھر نکاح کا حکم کیوں دیا۔ کیونکہ جب ایک ایسی صورت موجود ہے کہ ایک مرد اور عورت میں میاں بیوی کا تعلق موجود ہے، تو پھر اسکے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ تم اس لونڈی کا نکاح کسی اور سے کردو خلاف عقل ہے۔ اس طرح یہ کم ازکم چار موقعہ قرآن کریم میں ایسے موجود ہیں، جن میں بڑی صفائی اور وضاحت سے لونڈیوں کے نکاح کا حکم یا بیان ہے۔ یعنی سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۲، جس میں یہ ارشاد ہے کہ نکاح کرنے کے وقت آزاد مشرکہ پر مسلمان لونڈی کو ترجیح دی جائے۔ سورہ نور کی ۳۲ آیت، جس میں صاف حکم ہے کہ اپنے غلام اور لونڈیوں کے نکاح کر دیا کرو۔ سورہ نساء کی تیسری آیات، جس میں لونڈیوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ اور اسی سورت کی انتیسویں اور تیسویں آیتیں، جن میں وہ حالات بیان کئے گئے ہیں، جن کے ماتحت ایک آزاد مسلم مسلمہ لونڈی سے نکاح کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ بخاری شریف کی معتبر حدیث ذیل اس امر کی مؤید ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔ **قَالَ رَسُوْلَ اللہِ صَلّٰی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا رَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَہٗ وَلِیْدَہٗ فَعَلَّمَھَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَھَا وَاَدَّبَھَا فَاَحْسَنَ تَادِیْبَھَا ثُمَّ اَعْتَقَھَا وَ تَزَوَّجَھَا فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اَیُّمَا رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَ اٰمَنَ بِنَبِیِّہٖ وَ اٰمَنَ بِیْ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اَیُّمَا مَمْلُوْکٌ اَدّٰی حَقَّ مَوَالِیْہِ وَحَقَّ رَبِّہٖ فَلَہٗ اَجْرَانِ ۔**
ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس لونڈی ہو، پھر وہ اسے تعلیم دے اور نہایت عمدہ تعلیم دے اور اس کو اخلاق سکھلائے اور نہایت عمدہ اخلاق سکھلائے، پھر اس کو آزاد کرے

اور پھر اس سے نکاح کرے، تو اس کو دوگنا اجر ملے گا۔ اور جو شخص اہل کتاب میں سے اپنے نبی پر ایمان لائے اور مجھ پر ایمان لائے، اس کو دوگنا اجر ملے گا۔ اور جو غلام اپنے آقا کا حق ادا کرے اور اپنے رب کا حق ادا کرے، اس کو دوگنا اجر ملے گا۔

اب ان الفاظ سے یہ مطلب نہیں کہ جو شخص اپنے نبی پر ایمان لاتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتا، وہ نافرمان ہے۔ اور غلام، جو اپنے آقا کے احکام کی فرمانبرداری کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کرتا، وہ بھی بے فرمان ہے۔ اس طرح جو شخص لونڈی کو بغیر تعلیم دینے اور آزاد کرنے کے اور بغیر نکاح کرنے کے وطی کرتا ہے، وہ بھی نافرمان ہے۔

باب الطلاق

حکمت طلاق زن

واضح ہو کہ طلاق عربی لفظ ہے، جس کے معنے اردو زبان میں کھولنے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت اسلام میں مرد کا اپنی عورت کو اپنے نکاح سے خارج کر دینا ہے۔ جس کا مطلب تفصیل ذیل سے بخوبی معلوم ہوگا۔

واضح ہو کہ مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے، جس میں مرد کی طرف سے مہر اور تعہّد نان ونفقہ اور اسلام اور حسن معاشرت شرط ہے۔ اور عورت کی طرف سے عفت اور پاک دامنی اور نیک چلنی اور فرمانبرداری شرائط ضروریہ میں سے ہیں۔ اور جیسا کہ تمام معاہدے شرائط کے ٹوٹ جانے سے قابل فسخ ہو جاتے ہیں، ایسا ہی یہ معاہدہ بھی شرطوں کے ٹوٹنے کے بعد قابل فسخ ہو جاتا ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ اگر مرد کی طرف سے شرائط ٹوٹ جائیں، تو عورت خود بخود نکاح کے توڑنے کی مجاز نہیں ہے، جیسا کہ وہ خود بخود نکاح کرنے کی مجاز نہیں، بلکہ حاکم وقت کے ذریعہ سے نکاح کو توڑ سکتی ہے، جیسا کہ ولی کے ذریعہ نکاح کرا سکتی ہے۔ اور یہ کمی اختیار اس کی فطرتی شتابکاری اور نقصان عقل کی وجہ سے ہے۔ لیکن مرد جیسا کہ اپنے اختیار سے معاہدہ نکاح کا باندھ سکتا ہے، ایسا ہی عورت کی طرف سے شرائط ٹوٹنے کے وقت طلاق دینے میں بھی خود مختار ہے۔ سو یہ قانون فطرتی قانون سے مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے۔ گویا اسکی تصویر ہے، کیونکہ فطرتی قانون نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر ایک معاہدہ شرائط قرارداد کے فوت ہونے سے قابل فسخ ہو جاتا ہے۔ اور اگر فریق ثانی فسخ سے مانع ہو، تو وہ اس فریق پر ظلم کر رہا ہے، جو فقدان شرائط کی وجہ سے فسخ عہد کا حق رکھتا ہے۔ جب ہم سوچیں کہ نکاح کیا چیز ہے، تو بجز اس کے اور

کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ ایک پاک معاہدہ کی شرائط کے نیچے دو انسانوں کا زندگی بسر کرنا ہے۔اور جو شخص شرائط شکنی کا مرتکب ہو، وہ عدالت کے رو سے معاہدہ کے حقوق سے محروم ہونے کے لائق ہو جاتا ہے۔ اور اسی محرومی کا نام دوسرے لفظوں میں طلاق ہے۔ لہٰذا ایک ایسی پوری پوری جدائی ہے، جس سے مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بد اثر نہیں پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی کی منکوحہ ہو کر نکاح کے معاہدہ کو کسی اپنی بد چلنی سے توڑ دے، تو وہ اس عضو کی طرح ہے، جو گندہ ہو گیا اور سڑ گیا۔ یا اس دانت کی طرح ہے، جس کو کیڑے نے کھا لیا اور وہ اپنے شدید درد سے ہر وقت تمام بدن کو ستاتا اور دکھ دیتا ہے۔ تو اب حقیقت میں وہ دانت دانت نہیں ہے اور نہ وہ متعفن عضو حقیقت میں عضو ہے۔ اور سلامتی اس میں ہے کہ اس کو اکھیڑ دیا جائے اور کاٹ دیا جائے اور پھینک دیا جائے۔ یہ سب کاروائی قانون قدرت کے موافق ہے۔ عورت کا مرد سے ایسا تعلق نہیں ہے، جیسے اپنے ہاتھ اور پاؤں کا۔ لیکن تاہم اگر کسی کا ہاتھ یا پاؤں کسی ایسی آفت میں مبتلا ہو جائے کہ اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے اس پر اتفاق کرے کہ زندگی اس کے کاٹ دینے میں ہے، تو بھلا تم میں سے کوئی ہے کہ ایک جان کے بچانے کے لئے کاٹ دینے پر راضی نہ ہو۔ پس ایسا ہی اگر تیری منکوحہ اپنی بد چلنی اور کسی مہاپاپ سے تجھ پر وبال لا دے، تو وہ ایسا عضو ہے کہ بگڑ گیا ہے اور سڑ گیا ہے اور اب وہ تیرا عضو نہیں ہے۔ اس کو کاٹ دے اور گھر سے باہر پھینک دے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا زہر تیرے سارے بدن میں پھیل جائے اور تجھے ہلاک کرے۔ پھر اگر اس کاٹے ہوئے اور زہریلے جسم کو کوئی پرندہ یا درند کھا لے، تو تجھے اس سے کیا کام۔ کیونکہ وہ جسم تو اس وقت سے تیرا جسم نہیں رہا، جبکہ تو نے اس کو کاٹ کے پھینک دیا۔

طلاق کے بارے میں بنیادی ہدایات

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلاً۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا۔ فَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَماً مِنْ اَھْلِہٖ وَ حَکَماً مِنْ اَھْلِھَا اَنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحاً یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْماً خَبِیْراً ۔ ترجمہ۔ جن عورتوں کی طرف سے ناموافقت کے آثار ظاہر ہو جائیں، تم ان کو نصیحت کرو اور خوابگاہوں میں ان سے جدا ہو جاؤ اور ان کو (بے اعتنائی) کی مار دو۔ (یعنی جیسی جیسی صورت اور مصلحت پیش آئے)۔ پس اگر وہ تمہاری تابعدار ہو جائیں، تو تم بھی طلاق وغیرہ کا نام نہ لو اور تکبر نہ کرو کہ کبریائی خدا کے لئے مسلم ہے (یعنی دل میں یہ نہ کہو کہ مجھے کیا حاجت ہے، میں دوسری بیوی کر سکتا ہوں۔ بلکہ تواضع سے پیش آؤ کہ تواضع خدا کو پیاری ہے)۔ اگر میاں بیوی کے

درمیان شقاق کا اندیشہ ہو، تو ایک منصف خاوند کی طرف سے اور ایک منصف بیوی کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر منصف صلح کرنے کے لئے کوشش کریں گے، تو خدا تعالیٰ توفیق دے دیگا۔

ترتیب وطریقہء طلاق

جب عورت باوجود سمجھانے بجھانے کے نہ سمجھے اور گستاخی اور غلطی سے باز نہ آئے، تو طلاق بلحاظ عدت دینی شروع کرنی چاہیئے۔ ہر طہر کے بعد ایک طلاق دینی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص ایک ہی طہر میں تین بار عورت کو طلاق دیدے، تو ایسی طلاق اہل حدیث کے نزدیک کامل نہیں ہوسکتی۔ وہ شخص اس عورت سے از سر نو نکاح کرسکتا ہے۔ اور جو تین طلاقیں بلحاظ عدت یعنی ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے، حتیٰ کہ تیسرے طہر کے بعد بھی طلاق دیدے، تو وہ عورت پہلے خاوند سے نکاح نہیں کرسکتی۔ سوائے اس صورت کے کہ جب خود ہی دوسرا خاوند اس کو طلاق بحسب منشائے خود دیدے یا وہ مرجائے، تو وہ عورت پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ حلالہ شریعت محمدیہؐ میں حرام ہے اور اس فعل کے مرتکبوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون فرمایا ہے۔ حلالہ کی نیت وارادہ سے نکاح ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ زنا ہوتا ہے۔ اور احادیث ذیل، جو فوری طلاق ثلاثہ کے جواز میں مروی ہیں، وہ مجروح ہیں۔

اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِابْنِ عَبَّاسٍ اِنِّی طَلَقْتُ مِائَۃَ تَطْلِیْقَۃً فَمَا ذَا تَرَیٰ عَلَیَّ. فَقَالَ لَہُ اِبْنِ عَبَّاسٍ طُلِقَتْ مِنْکَ بِثَلَاثٍ وَ سَبْعَ وَ تِسْعُوْن اتَّخَذْتَ بِھَا آیاتِ اللّٰہِ ھُزْوَاً. رَوَاہُ مَالِک **بلاغا و فیہ عن محمد بن ایاس البکری انہ طلق رجل امراتہ ثلاثا قبل ان یدخل بھا ثم بدا لہ ان ینکھا فجاء لتستفتی فذھبت معہ و سالہ فسال عبد اللہ ابن عباسؓ و ابا ھریرۃ عن ذالک فقالا نری ان ینکحھا حتی تنکح زوجا غیرک قال انما کان طلاقی واحدۃ قال ابن عباسؓ ارسلت من یدک ما کان لک من فضل و عن معاویۃ ابن عیاش الانصاری انہ کان جالسا عند عبد اللہ ابن زبیر و عاصم ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھم قال فجاء ھما محمد ابن ایاس البکری فقال ان رجلا من اھل البادیۃ طلق امراتہ ثلاثا قبل ان یدخل بھا فماذا تریان . فقال عبد اللہ ابن زبیر ان ھذا الامر ما لبغ لنا فیہ قول فاذھب الی عبد اللہ ابن عباس و ابی ھریرۃ فانی ترکتھما عند عائشۃ فاسئلھما ثم اتینا فاخبرنا .فذھب فسالھما فقال ابن عباسؓ لابی ھریرۃ افت یا ابا ھریرہ فقد جائک معضلۃ فقال ابو ھریرۃ الوحدۃ تبینھا و الثالث تحرمھا حتی تنکح زوجا غیرہ وقال ابن عباس مثل ذالک وقال مالک علے ذالک الامر عندنا.**

عن مجاهد قال كنت عند ابن عباسؓ فجاء ہ رجل فقال انه طلق امراته ثلاثا قال فسكت حتى ظننت انه رادها اليه قال ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثم قال يا ابن عباس يا ابن عباس و ان الله قال و من يتق الله يجعل لح مخرجا و انک لم نتق الله فلا اجدلک مخرجا عصيت ربک و يانت منک امراتک رواه ابو داؤد. قال النووی فی شرح المسلم و احتج الجمهور و لقوله تعالیٰ وَ مَنۡ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَه‘ لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللهُ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا. (الآية) قالو معناه ان المطلق قد يحدث له ندم فلا يمكنه تدارکه بوقوع لبيتوته فلو كانت الثلاث لم يقع طلاقه هذا الارجعيا فلا يندم ۔ترجمہ۔ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کو کہا کہ میں نے اپنی عورت کو ایک سو طلاقیں دے دی ہے۔اس امر میں آپ میرے لئے کیا فتویٰ دیتے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ نے اس کو فرمایا کہ تیری عورت تین طلاقوں سے تجھ سے جدا ہوگئی اور ستانویں طلاقوں کے بولنے سے تو نے خداتعالیٰ کی آیات کا ٹھٹھا کیا۔روایت کیا اس کو مالک نے۔اور محمد بن ایاس بکری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو دخول سے پہلے یعنی طہر میں تین طلاقیں دے دیں۔پھر اس شخص نے چاہا کہ اس عورت سے نکاح کرے۔پس وہ فتویٰ پوچھتا ہوا آیا اور میں اس کے ساتھ چلا گیا۔اس نے عبداللہ بن عباسؓ اور ابی ھریرۃؓ کے پاس آ کر فتویٰ پوچھا۔حضرت ابن عباس اور ابی ھریرۃ نے فرمایا۔ہم نہیں فتویٰ دیتے کہ تو اس عورت سے نکاح کرے، جب تک وہ عورت تیرے سوا کسی اور شخص سے نکاح نہ کر لے۔اس نے کہا کہ میں نے ایک دفعہ تین طلاقیں دی ہیں اور ان سے میری نیت ایک طلاق ہی کی تھی۔ حضرت ابن عباس نے اس کو فرمایا۔چھوڑ دیا تم نے اس فضیلت کو اپنے ہاتھ سے جو تیرے لئے تھی۔اور معاویہ بن عیاش انصاری سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن زبیر اور عاصم بن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور ان کے پاس محمد بن ایاس بکری آیا اور کہا کہ ایک دیہاتی گنوار شخص نے اپنی عورت کو دخول سے پہلے یعنی طہر میں تین طلاقیں دے دی ہیں۔اس امر میں آپ کی کیا رائے ہے۔عبداللہ بن زبیر نے فرمایا کہ اس امر میں ہمارے پاس کوئی قول واجب التعمیل نہیں پہنچا۔اس لئے تم عبداللہ بن عباس و ابی ھریرۃ کے پاس چلے جاؤ۔میں ان کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔ان کے پاس جا کر ان سے یہ مسئلہ دریافت کر۔پھر ہم آئے اور ہم نے اطلاع کی اور اس نے یہ مسئلہ ان سے پوچھا۔ابن عباس نے ابی ھریرۃ کو فرمایا اے ابا ھریرۃ اس کو فتویٰ دے، کیونکہ تیرے پاس یہ مشکل مسئلہ پیش ہوا ہے۔حضرت ابی ھریرۃ نے فرمایا کہ ایک طلاق عورت کو مرد سے جدا کر دیتی ہے۔اور تین طلاقیں عورت کو مرد پر حرام کر

دیتی ہیں، جب تک وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے۔ اور حضرت ابن عباس نے بھی ایسا ہی فرمایا۔ اور مالک نے فرمایا کہ یہی امر ہمارے نزدیک ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ میں ابن عباس کے پاس تھا۔ جب ان پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دیدی ہیں۔ اس پر وہ چپ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ آپ اس عورت کو میرے پاس لوٹانا چاہتے ہیں۔ پھر کہا (تم میں سے ایک) چلتا ہے اور حماقت پر سوار ہوتا ہے۔ پھر آ کر کہتا ہے۔ اے ابن عباس اے ابن عباس اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے، اس کے لئے خلاصی کی راہ خدا بنا دیتا ہے۔ اور تو نے خدا ترسی نہیں کی، پس میں تیرے لئے کوئی راہ خلاصی کی نہیں دیکھتا۔ تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ سے جدا ہوگئی۔ روایت کیا اس حدیث کو ابوداؤد نے۔ نووی نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ جمہور نے اس قول سے حجت نکالی ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی حدوں سے گذر جائے، تو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ تم نہیں جانتے کہ شاید خدا تعالیٰ اس کے لئے کوئی راہ مخلصی کی یعنی مرد و عورت کے ملاپ کی صورت پیدا کر دے۔ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق دینے والے کو بسا اوقات ندامت و پشیمانی لاحق ہوتی ہے، مگر جدا ہونے کے باعث محض ندامت سے اس کا تدارک نہیں ہوسکتا۔ اور اگر یکدفعہ ثلاثہ سے طلاق واقع نہ ہوتی اور فوری طلاق بھی قابل رجوع رہتی، تو طلاق دہندہ کو ندامت کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

اہل حدیث کہتے ہیں کہ احادیث مذکورہ بالا آیات قرآن کریم واحادیث نبویہ صحیحہ سے معارض و متناقص ہیں، جنکو ہم آئندہ اوراق میں درج کرینگے۔ اور متقی کے لئے تدارک بالندامت سے سہولت کے پیدا ہونے کا طریق ثلاثہ قروء سے پہلے ہے، جس کو خدا تعالیٰ نے مطلقہ وطلاق دہندہ کے لئے مدت انتظار رکھا ہے۔ اگر فوری طلاق ثلاثہ سے عورت پہلے خاوند کی طرف رجوع نہ کرسکتی، تو خدا تعالیٰ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۔ اور بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ نہ فرماتا۔ بلکہ مطلقات وطلاق دہندوں میں فوری طلاق ثلاثہ کو مستثنیٰ فرماتا۔ اور ظاہر فرمایا جاتا کہ جن عورتوں کو تین طلاقیں یکدفعہ مل جائیں، ان کو ثلاثہ قروء کے انتظار کی کچھ ضرورت نہیں۔ وہ اپنے خاوند کی طرف رجوع نہیں کر سکتی ہیں۔ مگر قرآن کریم میں تو یوں آیا ہے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ۔ یعنی طلاق دو مرتبہ دی جاتی ہے، جو قابل رجعت ہے۔ پس اگر دو طلاقوں کے بعد، جو غالباً دو ماہ میں واقع ہوں گی، مرد و عورت میں صلاح ہو سکے، تو اچھے دستور سے مرد عورت کو اپنے پاس آباد کرے۔ اور اگر صلاح نہ ہو سکے، تو بھلائی سے اس کو رخصت کر دے۔ یہ تیسری طلاق ہے۔ اب اس

کے بعد وہ عورت پہلے مرد طلاق دہندہ کونہیں مل سکتی۔اور ہر ایک طلاق ایک ماہ کے بعد یا ایک طہر کے بعد ہوتی ہے، جس میں عورت سے جماع نہ کیا گیا ہو اور **تجاوز من حدود الله** کا یہ مطلب ہے کہ عورت کو ناحق طلاق نہ دی جائے۔جس شخص نے تین طہر تک دوراندیشی سے کام نہ لیا اور عورت کو تیسری طلاق بھی تیسرے طہر کے بعد دے دی، اب اس کے بعد اس کے لئے کوئی مخرج اور راہ ملاپ و موافقت نہیں۔وہ عورت اس مرد سے مدام کے لئے جدا ہوگئی۔ بہت سی احادیث صحیحہ بھی بیان ہو چکی ہیں کہ یکدفعہ طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔اور ایسی طلاق میں پہلے خاوند سے نکاح ہوسکتا ہے۔اب ہم سوال و جواب کے رنگ میں طلاق ثلاثہ کے متعلق کچھ مسائل لکھتے ہیں، جن میں اکثر علماء حیرت زدہ ہوتے اور گرداب میں پڑتے ہیں۔

ضمیمہ نمبر۲

کیا ایک وقت میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں؟

سوال ۔کیا یکدفعہ تین طلاقیں دینے سے طلاق ہوسکتی ہے یا نہیں۔اور کیا پہلا خاوند اپنی ایسی مطلقہ ثلاثہ جورو کی طرف رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب ۔اہل حدیث کے نزدیک ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے سے طلاق کامل نہیں ہو سکتی۔ان کا کہنا ہے کہ بموجب سنت واحادیث نبویہ تین ماہ میں طلاق ہونی چاہئے۔بعض فقہاء نے ایک بار تین طلاقیں دینے کو جائز رکھا ہے۔لیکن اس میں یہ رعایت رکھی ہے کہ یکدفعہ تین طلاقیں دینے کے بعد اگر پہلا خاوند رجوع کرنا چاہے، تو وہ اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔اور بعض فقہاء کے نزدیک فوری تین طلاقیں کامل ہو جاتی ہیں اور ان کے نزدیک ایسی عورت پہلے خاوند سے رجوع نہیں کرسکتی۔

ہم ذیل میں ایک مباحثہ دو مولویوں (م اور ف) کے درمیان در باب طلاق ثلاثہ یکدفعہ سوال و جواب کے رنگ میں درج کرتے ہیں۔ناظرین حق کا خود موازنہ کرلیں۔

م ۔آیات قرآن عظیم و احادیث رسول کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تین طلاقیں دفعۃً واحدۃً دی جائیں، تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔اور محققین کا اسی پر اتفاق ہے۔

ف ۔نہیں، بلکہ طلاق ثلاثہ دفعۃً دینے سے تین واقع ہو جاتی ہیں۔ جب آپ کسی سے تین بولو گے، تو وہ تین سمجھے گا اور ایک کہو گے تو ایک۔ایسا ہی جب کوئی شخص اپنی عورت کو خطاب کر کے ایک طلاق۔دوسری طلاق۔تیسری طلاق سنا دے اور وہ عورت سن لے، تو اس پر تین طلاقیں اسی وقت واقع

ہو جاتی ہیں۔اور بجز حلالہ یہ عورت پہلے شوہر کی طرف رجوع نہیں کر سکتی۔جمہور علما وفقہا وائمہ کا اسی پر اتفاق واتحاد ہے کہ فوری تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہو جاتی ہیں۔آپ ایک دو تین کو ایک کے حساب میں کس طرح لاتے ہیں۔مثلاً میں ابھی آپ کے اور حاضرین مجلس کے روبرو ایک دو تین بولا ہوں۔اب ایسا کوئی ہے، جو ان تین الفاظ کو، جو جدا جدا بولے گئے ہیں، ایک کر کے دکھائے۔ایک بجائے ایک کے اور تین بجائے تین کے ہوتے ہیں۔جبکہ دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں ہے کہ تین بجائے ایک سمجھے، تو خدا تعالیٰ سمیع علیم، دانا و بینا و شنوا ہے، وہ تین کو تین کے حساب میں رکھے گا نہ کہ تین کو ایک کر دے گا۔آپ یا کوئی شخص تین بول کر ہمارے آگے تو اصرار بر انکار کرے تو کرے مگر خدا تعالیٰ کے آگے کس طرح انکار کر سکتا ہے کہ میں ایک ہی لفظ بولا ہوں نہ تین۔کیا خدا تعالیٰ بھی دھوکہ وفریب میں آ سکتا ہے۔قرآن واحادیث میں یہ سفید جھوٹ کہاں سما سکتا ہے کہ تین کو ایک کے حساب میں لگالو۔کیا یہ بھی عیسائیوں کی تثلیث کا گورکھ دھندا ہے، جو وہ کہتے ہیں روح القدس۔باپ۔بیٹا تینوں خدا ہیں اور وہ تینوں ایک ہے۔جب ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ تین کا ایک کس طرح ہو سکتا ہے، تو آخر وہ لاچار ہو کر کہتے ہیں کہ یہ سرّ الٰہی اور عقدہ لا ینحل ہے، جس کو مسیح نے سمجھا تھا۔اس پر ایمان لانا لازم ہے۔اب بتاؤ کیا طلاق ثلاثہ فوری بھی سرّ الٰہی وعقدہ لا ینحل میں داخل ہو گیا ہے کہ تین کو ایک سمجھا جائے۔آخر بتاؤ تو سہی کہ آپ تین کو ایک کس طرح سمجھتے ہیں۔

م۔ایک دفعہ تین طلاقیں دینا خدا اور رسول نے حرام ٹھیرایا ہے۔اور خدا اور رسول نے طلاق میں عدت رکھنا واجب ٹھیرایا ہے۔طلاق میں عدت نہ رکھنا ناقض ومخالف امر الٰہی ہے۔پس جو بات ناقض ومخالف امر الٰہی ہو، وہ پوری وکامل نہیں ہو سکتی۔جس کام کا کامل کرنا خدا تعالیٰ نے تین ماہ کے بعد موقوف رکھا ہوا اور اس عرصہ سے پہلے اسکی تکمیل منع فرمائی ہو، اس کو یکدم کون پورا کر سکتا ہے اور کس طرح اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صریحاً فرما دیا کہ ایک طہر میں ایک طلاق دینی چاہیئے، تو جو شخص خلاف حکم خدا ورسول کرے اور ایک کی جگہ تین طلاقیں ایک ہی وقت میں دیدے، اس کی ایک طلاق واقع ہوگی اور دو لغو ٹھیریں گی۔اسکی مثال ایسی ہے کہ کسی حاکم نے اپنے محکوم کو حکم دیا ہو کہ میرے سامنے فلاں شخص سے فلاں فلاں تاریخ میں ایک ایک بات کرو اور زیادہ مت بولو۔اگر تم اسکی خلاف ورزی کرو گے، تو مستوجب سزا ٹھہرو گے۔پس جب وہ تاریخ معین پر ساری باتیں ایک ہی وقت میں برخلاف حکم حاکم بیان کر دیگا، تو وہ عدول حکمی کے جرم میں ماخوذ ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ طلاق ثلاثہ فوری دینے والا قرآن وحدیث نبویہ میں گنہگار ٹھہرایا گیا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طلاق میں

عدت کا مدنظر رکھنا واجب ولازم ٹھہرایا ہے۔ اور بلحاظ عدت طلاق نہ دینا حدود الٰہی سے تجاوز کرنا ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَ اَحْصُوْا الْعِدَّۃَ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَ لَا یَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ وَّ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْھُنَّ وَ اَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ ۔ترجمہ۔اے پیغمبر مسلمانوں سے کہو کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینی چاہو، تو ان کو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔ اور طلاق کے بعد ہی سے عدت گننے لگو اور اللہ تعالیٰ سے، جو تمہارا پروردگار ہے، ڈرتے رہو۔ عدت میں ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں۔ سوائے اس کے وہ کھلم کھلا بے حیائی کا کام کر بیٹھیں، تو ان کے نکال دینے میں مضائقہ نہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدوں سے باہر قدم رکھا، تو اس نے آپ ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔ اے وہ شخص جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، تو نہیں جانتا کہ شاید اللہ تعالیٰ طلاق کے بعد ملاپ کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ پھر جب عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کو آئیں، تو یا تو رجوع کر کے سیدھی طرح ان کو اپنی زوجیت میں رکھے رہو یا سیدھی طرح ان کو رخصت کرو۔ اور جو کچھ بھی کرو اپنے لوگوں میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ کر لو۔

اور نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ بُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا ۔ ترجمہ۔ اور ان کے شوہر اگر ان کو اچھی طرح رکھنا چاہیں، تو وہ اثنائے عدت میں ان کو اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔ وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ ثَلَاثَۃَ قُرُوْءٍ ۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ وَ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَیْتُمُوْھُنَّ ۔ترجمہ۔ اور چاہیئے کہ جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ رجوع کی امید کے لئے تین حیض تک انتظار کریں اور ان تین حیضوں میں، جو قریباً تین مہینے ہیں، جن میں دو دفعہ طلاق واقع ہو گی یعنی ہر ایک حیض کے بعد خاوند عورت کو طلاق دے۔ اور جب تیسرا مہینہ آئے، تو خاوند کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے کہ اب یا تو تیسری طلاق دے کر احسان کے ساتھ دائمی جدائی اور قطع تعلق ہے یا تیسری طلاق سے رک جائے اور عورت کو حسن معاشرت کے ساتھ اپنے گھر میں آباد کرے۔ اور یہ جائز نہیں ہو گا کہ جو مال طلاق سے پہلے عورت کو دیا تھا، وہ واپس لے لے اور اگر تیسری طلاق، جو تیسرے حیض کے بعد ہوتی ہے، دیدے، تو اب وہ عورت اسکی عورت نہیں رہی اور

جبتک وہ دوسرا خاوند نہ کرلے (اور اس سے طلاق نہ پائے) تب تک نیا نکاح پہلے شوہر سے نہیں ہوسکتا۔
اب ان آیات سے صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ طلاق بلحاظ عدت ہونی چاہئے اور مطلقہ کو بامید رجوع تین حیض یا تین ماہ تک انتظار کرنا چاہئے۔ اگر عورت کو فوری طلاق ثلاثہ کے بول دینے سے پہلے خاوند سے رجوع نہ ہوتا، تو خدا تعالیٰ تین حیض تک عورت کو انتظار میں نہ رکھتا۔ اور حدیث نبوی میں عدت کے متعلق یوں حکم آیا ہے۔ عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَنَّہٗ طَلَّقَ اِمْرَاَتَہٗ وَ ھِیَ حَائِضٌ فِیْ عَھْدِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فَسَئَلَ عُمَرُ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ ذٰلِکَ. فَقَالَ مُرْہُ فَلْیُرَاجِعْھَا ثُمَّ لِیَتْرُکْھَا حَتّٰی تَطْھُرَ ثُمَّ تَحِیْض ثُمَّ تَطْھُرَ ثُمَّ اِنْ شَاءَ اَمْسَکَ بَعْدُ وَ اِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ اَنْ یَّمَسَّ فَتِلْکَ الْعِدَّۃُ الَّتِی اَمَرَ اللّٰہُ اَنْ تُطَلَّقَ لَھَا النِّسَاءُ متفق علیہ و فی روایۃ لمسلم مرہ فلیراجعھا ثم لیطلقھا طاھرا اوحاملا و فی روایۃ اُخْرٰی للبخاری وحسبت تطلیقۃ واحدہ. وعن محمود ابن لبید رضی اللہ عنہ قال اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امراتہ ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال اَیُلْعَبُ بکتاب اللہ و انا بین اظھرکم حتی قام رجل فقال یا رسول اللہ اَلا اقتلہ. رواہ النسائی و رواتہ موثقون ۔
ترجمہ۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں طلاق دیدی۔ پس حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس امر کے متعلق ذکر کیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو کہو کہ عورت سے رجوع کرلے، پھر چھوڑ دے، حتیٰ کہ وہ حیض سے پاک ہو۔ پھر اس کو حیض آئے، پھر حیض سے پاک ہو۔ پھر اگر چاہے تو عورت کو رکھ لے۔ اور اگر عورت اور مرد میں ملاپ نہ ہو، تو چاہے تو اس کو یعنی عورت کو جماع سے پہلے طلاق دیدے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ طلاق میں عورتوں کے لئے عدت رکھی جائے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں آئی ہے۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو کہو کہ عورت سے رجوع کرے، پھر اس کو پاک ہونے کے بعد یا حمل میں طلاق دے۔ اور بخاری کی ایک روایت ہے کہ یہ ایک طلاق شمار ہوگی۔ محمد بن لبید سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دی گئی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیں۔ آپ نہایت غضبناک ہوکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ آیا وہ شخص کتاب اللہ کے ساتھ مسخرا پن کرتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا یا رسول اللہ کیا میں اس شخص کو قتل کردوں۔ روایت

کیا اس حدیث کو نسائی نے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ الغرض قرآن کریم و احادیث نبویہ نے طلاق دینے کی ترتیب وعدت بتا دی اور اس کا خلاف حرام قرار دیا۔

ف۔ تین طلاق کا ایک دفعہ دینا کہاں حرام لکھا ہے؟

م ۔قرآن کریم کی آیات مذکورہ بالا میں جو ترتیب اللہ تعالیٰ نے طلاق کے متعلق بیان فرمائی ہے، اس کا خلاف حرام ہے۔ اور حدیث مذکور، جس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ تین طلاقیں دینے پر غصہ ظاہر فرمایا ہے، اس امر پر دال ہے۔ اور کل فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یکدفعہ تین طلاقیں دینا حرام ہے۔

ف۔ آپ ایک کتاب فقہ کا نام لیں، جس میں لکھا ہے کہ یکدفعہ تین طلاقیں دینا حرام ہے۔

م۔ ایک کیا بیسیوں کتب فقہ کا حوالہ ابھی دیتا ہوں۔ مگر ایک بات کا آپ مجھے مختصر جواب دیں۔

ف۔ بولو وہ کیا ہے۔

م۔ طلاق کی کتنی قسمیں ہیں؟

ف۔ طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) احسن (۲) سنت (۳) بدعت۔ طلاق ثلاثہ ایک دفعہ دینا بدعت ہے، مگر واقع ہو جاتی ہے۔ اور طہر وعدت سے دینا سنت ہے۔

م۔ آپ کسی کتاب کا حوالہ دیں۔

ف۔ قدوری میں لکھا ہے۔ **الطلاق علی ثلاثة اوجه احسن و سنة و بدعة اما احسن الطلاق فهو ان یطلق الرجل امراته تطلیقةً واحدةً فی طهرٍ لم یجامعها فیه و یترکها حتی تنقضی عدتها. و طلاق السنة و هو ان یطلق المدخول بها ثلاثا فی ثلاثة اطهار. و طلاق البدعة و هو ان یطلق الرجل امراته' ثلاثا بکلمة واحده او فی طهر واحد فاذا فعل ذلک و قع الطلاق و بانت منه و کان عاصیاً** ۔ترجمہ۔ یعنی طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ احسن۔ سنت اور بدعت۔ احسن یہ ہے کہ کوئی مرد عورت کو ایسے طہر میں طلاق دے، جس میں اس نے عورت سے جماع نہ کیا ہو اور پھر اس کو چھوڑ دے حتیٰ کہ عدت گذر جائے۔ اور طلاق مسنون یہ ہے کہ مرد عورت مدخولہ کو تین طہروں میں تین طلاقیں دے۔ اور طلاق بدعت یہ کہ مرد عورت کو ایک ہی کلمہ سے ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دیدے۔ جب کوئی ایسا کام کرے، تو اس کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اور اس کی عورت اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ شخص خدا کا نافرمان ٹھہرتا ہے۔ یہ مسئلہ قدوری۔ کنز۔ شرع وقایہ۔ ہدایہ۔ فتاوی قاضی خان۔ عالمگیری۔ درمختار۔ ان سب کتابوں میں لکھا ہے۔

م۔اچھا بولو بدعت آپ کے نزدیک حلال ہے یا حرام۔**و عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرُ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ وَ خَيْرُ الْهَدْىِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ وَّ شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ** ۔ترجمہ۔جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب باتوں سے اچھی بات اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے اور سب ہدایتوں میں سے اچھی ہدایت سنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں نئی باتوں کا نکالنا برا کام ہے اور ہر ایک بدعت گمراہی ہے۔

اب غور کرو کہ حدیث مذکور میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک بدعت کو گمراہی قرار دیتے ہیں۔کیا جس بات کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم گمراہی قرار دیتے ہیں، وہ آپ کے نزدیل حلال ہے یا حرام ہے۔ یقیناً سمجھ لو کہ فوری طلاق ثلاثہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے،اور گمراہی حرام ہے۔ کتابوں کا آپ نے خود حوالہ دیدیا ہے،جن میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ طلاق ثلاثہ دینا بدعت ہے۔پس جو چیز حرام ہے، وہ واجب العمل کیونکر ہوسکتی ہے۔

ف۔(حیران وسراسیمہ ہوکر تھوڑی دیر دریائے خاموشی میں غرق ہوگئے۔کوئی معقول جواب نہ بنا۔مگر حاضرین مجلس کے روبرو خاموش رہنا ان کو اپنی سخت رسوائی معلوم ہوئی اور بالآخر بول پڑے) طلاق ثلاثہ یکدفعہ دینے کے متعلق آپ قرآن وحدیث سے لفظ حرام نکال کر دکھادو۔

(بعض حاضرین مجلس) بس مولوی صاحب فیصلہ ہوگیا ہے۔طلاق ثلاثہ یکدفعہ دینا بدعت ہے اور بدعت حرام ہے۔

م۔ذرہ ٹھہر جاؤ۔مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی کسر باقی ہے۔ان کی کسر نکالنے دو۔مولوی صاحب آپ کے نزدیک خمر۔زنا۔چوری حلال ہے یا حرام؟ قرآن وحدیث سے جواب دو اور لکھ دو کہ فلاں جگہ زنا وخمر وچوری کے بارے میں حرام کا لفظ لکھا ہے۔

ف۔آپ پہلے میرا جواب دے لو۔

م۔گھبرائیں نہیں میں ابھی آپ کا جواب عرض کئے دیتا ہوں۔صرف آپ بالفعل میری معروض کا حوالہ قرآن وحدیث سے دیں۔

ف۔خمر۔زنا۔وسرقہ حرام ہیں۔

م۔قرآن وحدیث سے حرام کا لفظ بتلاؤ، جہاں لکھا ہے کہ یہ امور حرام ہیں۔یہ امور حرام تو ہیں، مگر آپ کو لفظ پرستی کی اب سزا مل رہی ہے۔

ف۔ (اب مولوی صاحب عالم سکوت میں ہیں اور قرآن کریم واحادیث کی ورق گردانی کر رہے ہیں)

م۔ جو لفظ پرست قوم قبل ازیں ہوگذری ہے، وہ ناکام رہی ہے۔ مولوی صاحب کہاں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

(مؤلف) آپکا ایسا کہنا ناواجب اور بےموقعہ ہے۔ ظاہر نہ ہوتو باطن کہاں سے پیدا ہو۔ ہر ظہر رابطنی است۔

(حاضرین) مولوی صاحب چلو فیصلہ ہوگیا۔ یہ لفظ نہیں مل سکتا۔ تین چار گھنٹے گذر چکے ہیں۔

م۔ مولوی صاحب آپ بتاؤ تو سہی کہ آپ کے نزدیک یہ اموریعنی خمر، زناوسرقہ حرام بھی ہیں یا نہیں۔

ف۔ بےشک حرام ہیں۔

م۔ کیوں حرام ہیں۔

ف۔ ان اشیاء کے خصائص بد ہیں۔

م۔ اچھا بس اب یادرکھو کہ خصائص کے لحاظ سے ہی یکدفعہ طلاق ثلاثہ حرام ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی　　یا برائے فصل کردن آمدی

مولوی صاحب رخصت ہونے لگے، تو مولوی م نے اہل مجلس سے کہا کہ مولوی صاحب کو ذرہ ٹھہراؤ، تاکہ میں مفصل طور پر چند باتیں ان کو طلاق ثلاثہ فوری کے بارے میں گوش گزار کردوں۔

ف۔ مولوی صاحب بیٹھ گئے۔

م۔ خداتعالیٰ کی پاک ومقدس کتاب قرآن مجید بآواز بلند پکار رہی ہے کہ طلاق عدت سے دی جائے۔ عدت کا شمار طلاق میں لازم وفرض ہے، جیسا قبل ازیں بھی قرآن واحادیث سے ظاہر کیا گیا ہے۔ حدیث میں، جو ابن عمر سے مروی ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدت کی تشریح بیان فرمادی کہ اس طرح طلاق دی جائے اور اس طرح عدت رکھی جائے۔ جس امر کی پابندی ضروری تھی، اس کے لئے خداتعالیٰ نے تاکید فرمادی اور نبی علیہ السلام نے اس کی صورت بیان فرما کر عملدرآمد کرکے دکھادیا کہ اس صورت میں جب اس کا عمل درآمد ہوگا تو عمل کامل ہوگا ورنہ ناقص ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یکدفعہ طلاق ثلاثہ دینے والے کو رجوع کرایا ہے۔ دیکھو اس حدیث کو جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے اور ابورکانہ والی حدیث کو دیکھو، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ طلاق

ثلاثہ دینے والے نے اپنی عورت سے رجوع کیا ہے۔ پھر ابن عباس سے روایت ہے۔ **کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة** ۔ترجمہ۔یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے عہد میں اور دو سال حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں فوری تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔

ف۔آپ اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں؟

م۔بے شک یہ حدیث صحیح ہے۔

ف۔اس حدیث کے آخر میں لکھا ہے کہ آخر حضرت عمرؓ نے لوگوں کی شتابکاری دیکھ کر یک دفعہ طلاق ثلاثہ دینے والے کی طلاق کو طلاق ثلاثہ ٹھہرایا اور عورت کو پہلے خاوند سے رجوع منع فرمایا۔اور یہی امر نافذ و جاری رہا اور حدیث ماسبق کو منسوخ قرار دیا۔چنانچہ یہاں پر ساری حدیث نقل کی جاتی ہے۔**و عن ابن عباس قال کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وا بی بکر و سنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم اناء ة فلو امضیاه علیهم فامضاه. رواه مسلم** . ترجمہ۔ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت اور زمانہ خلافت اولیٰ یعنی حضرت ابوبکر کے زمانہ میں اور دو برس تک حضرت عمر کی خلافت میں یہ معمول تھا کہ جب دفعۃً وَاحدۃً تین طلاقیں دی جائیں،تو ایک طلاق واقع ہوتی تھی۔حضرت عمر نے فرمایا کہ لوگ ایسے کام میں عجلت وشتابی کرنے لگے ہیں،جسمیں انکو آہستگی برتنی چاہیئے۔پس اگر اسکو نافذ کردیں تو مناسب ہوگا۔اور آپ نے اسکو نافذ قرار دیدیا۔جمہور صحابہ اور تابعین اور انکے بعد ائمہ مجتہدین کی یہی رائے ہے کہ ایسی حالت میں تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔

م۔میں ایک مختصر عرض کرتا ہوں۔آپ اس کا جواب دیں کہ شریعت اسلامی کا شارع کون تھا۔

ف۔شریعت اسلام کے شارع حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

م۔کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب بھی شریعت اسلامی کے شارع تھے۔

ف۔لاحول۔حضرت عمر نبی تو نہ تھے جو شارع شریعت ہوتے۔کسی شریعت کا لانا نبی کا کام ہوتا ہے۔آپ تو حضرت عمر کو شارع کہنے سے کافر ہوگئے۔

م۔میرا بھی یہی اعتقاد ہے کہ حضرت عمر نہ شارع تھے نہ نبی۔وہ ایک جلیل القدر صحابی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین دوم تھے۔مگر آپ جیسے بےفکر و غافل انسان کہہ دیا کرتے کہ حضرت عمر بھی شارع تھے۔

ف۔جو شخص حضرت عمر کو شارع کہے وہ کافر مرتد ہے۔ایسا شخص حضرت عمر کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ٹھہراتا ہے، حالانکہ نص قرآن و حدیث صریح سے ثابت ہو چکا ہے کہ نبوت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔اور نہ یہ امر کسی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت عمر شارع تھے۔ آپ حضرت عمر پر افترا کرتے ہو، جو ان کو شارع شریعت اسلامی ٹھہراتے ہو۔

م۔جلد بازی کسی کام میں اچھی نہیں۔ ہر امر میں فکر اور غور سے کام لیا کرو۔جلدی کر کے نادانی سے اپنے آپ کو مرتد و کافر ٹھہرانا آپ جیسے لوگوں کا کام ہے۔دیکھو آپ نے خود اقرار کیا ہے کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کرایا اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا اور حضرت ابوبکر کے سارے عہد خلافت اور حضرت عمر کے دوسال عہد خلافت میں جاری و مروج رہا آخر اس کو حضرت عمر نے منسوخ کر دیا۔حالانکہ یہ مسلم عقیدہ ہے کہ کسی شریعت کا لانا و منسوخ کرنا نبی کا کام ہوتا ہے۔پس آپ نے بغیر فکر و سوچ حضرت عمر کو قولاً و اعتقاداً نبی قرار دیدیا، جو کہتے ہو کہ حضرت عمر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو توڑ دیا۔یہ کیسی بے ادبی کا کام ہے، جو تم حضرت عمر کی طرف منسوب کرتے ہو۔اور کہتے ہو کہ حضرت عمر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک کلام و فعل کو منسوخ کر دیا۔خود اقرار کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین فوری طلاقوں کو ایک ہی طلاق ٹھہرایا۔اور حضرت ابوبکر کے عہد میں بھی فوری طلاق ثلاثہ دینے والے کی طلاق ایک ٹھہرائی گئی اور حضرت عمر کے دو سال خلافت تک یہی عملدرآمد رہا۔مگر پھر حضرت عمر نے اس امر کو منسوخ و ناجائز ٹھہرایا۔اور فوری تین طلاقیں دینے والے کو اس کی عورت سے ابداً رجوع منع کر دیا۔حالانکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو یہ عملدرآمد ہوا۔اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت کا پاک وجود ایسی بے ادبی سے پاک تھا۔یہ آپ جیسے حضرات کا عقیدہ فاسدہ ہے، جو قابل اصلاح ہے۔

ف۔حضرت عمر نے کوئی کام منسوخ نہیں کر دیا۔بلکہ لوگوں سے یہ عمل کرایا ہے کہ ان کی یکدفعہ طلاق ثلاثہ کو تین قرار دیا ہے۔

م۔مولوی صاحب ہوش کرو اور سوچو۔کیا حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف کچھ کر سکتے تھے؟ کیا وہ عملاً حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو توڑ کر نبی بننا چاہتے تھے؟ حضرت عمر کی طرف کسی فعل کی نسبت کرنا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف عملدرآمد کیا ہو، یہ حضرت عمر کی سخت بے ادبی ہے۔تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر آخرت در پیش آ گیا۔وفات نبوی کے بعد ہزاروں اہل عرب و اعراب و اہل بادیہ مرتد ہو گئے۔صحابہء کرام کو جان

و مال کا خطرہ ہر وقت لاحق ہو گیا۔ چاروں طرف سے مخالفوں کے ساتھ مل کر مرتدوں نے بھی مدینہ پر حملے شروع کر دیئے۔ صحابہ ءکرام نے حضرت ابو بکر خلیفہ اول کو مشورۃً عرض کیا کہ چونکہ اکثر لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور مخالفوں کا جمگھٹا زیادہ ہو گیا ہے، لشکر اسامہ کا شام کی طرف جانے سے آپ کی پیٹھ خالی رہ جائے گی۔ مبادا مخالفین کچھ گزند نہ پہنچائیں اور مدینہ پر حملہ کریں۔ بالفعل جیش اسامہ کو شام سے روکا جائے۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نافذ شدہ امر کو رد نہیں کر سکتا۔ اگر ایک آدمی بھی میرے ساتھ نہ رہے، اور جب تک میرے تن میں جان ہے، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کو ٹال نہیں سکتا۔ لشکر اسامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے موجب شام کو چلا جائے۔ میری کیا طاقت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کو رد کروں اور پھیر دوں۔ غور کرو اور سوچو کہ سارے صحابہ ءکرام اور حضرت عمر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے فنا تھا کہ وہ مدام قول و فعل نبوی کی اطاعت و اتباع میں ایک دوسرے سے سبقت چاہتے تھے۔ اور خلفاء اربعہ اس اتباع نبوی میں سب سے اول درجہ پر تھے۔

ف۔ پھر کیا یہ حدیث غلط ہے یا موضوع ہے؟

م۔ نہ غلط ہے اور نہ موضوع ہے۔ صرف سمجھ کا پھیر ہے۔

ف۔ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ حضرت عمر نے ایسا کام کیا۔ طلاق ثلاثہ فوری کو تین ہی ٹھہرایا اور یہی حکم نافذ فرمایا۔ اور کسی صحابی نے بھی اس امر کر رد نہ کیا۔ صحابہ کی حکومت و خلافت جمہوری تھی۔ اگر حضرت عمر غلطی پر ہوتے تو دوسرے صحابی اور اہل علم حضرت عمر کو اس امر سے مانع ہوتے اور ان کو یہ امر کبھی نافذ نہ کرنے دیتے۔

م۔ پہلے یہ بتاؤ کہ حضرت عمر کو مقیم الشریعۃ مانتے ہو یا ناسخ الشریعت۔

ف۔ حضرت عمر مقیم شریعت محمدیہ و قائم علیٰ شریعت الاسلامیہ تھے۔

م۔ اچھا جب آپ کا یہ اعتقاد ہے، تو آپ کو مبارک ہو اور جان لو کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے غلط عملدرآمد و خلاف سنت نبوی و شریعت محمدیہ کے ایک جزو میں خلل دیکھا، لہٰذا اس خلل کو حکمت و القاء الٰہی سے لوگوں کو توبیخاً و سزا دینے کے لئے یہ امر نافذ فرمایا کہ لوگ عورتوں کی مدامی جدائی دیکھ کر فوری طلاق ثلاثہ کے بول دینے سے رک جائیں۔ اور اصلی شریعت الٰہیہ پر قائم ہو جائیں اور طلاق عدت سے دیا کریں اور سنت نبوی پر عملدرآمد جاری ہو۔ حضرت عمر ابن خطاب محی السنّت النبویہ تھے، قاطع السنّت نہ تھے جو فعل نبوی کے برعکس کوئی کام کرتے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات مریضوں کو حکیم وڈاکٹرلوگ بیہوش ونیم جان کر کے ان کے بدن کی اصلاح ومعالجہ کیا کرتے ہیں۔ بلکہ بعض خلل یافتہ اعضا کو الگ یا پس وپیش کر کے پھر اصلی حالت پر لاتے وقائم کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی یہ مراد نہیں ہوتی ہے کہ انسان کو بالکل ہلاک کر دیں۔ پس یہی طریقہ وعمل اگر خلیفہ دوم وجانشین نبویؐ یعنی حضرت عمرؓ نے کیا ہو، تو اس خلل یافتہ جزو کو درست کرنے کے لئے کیا ہوگا۔ نہ یہ کہ (نعوذ باللہ) اصلی سنت کو ہی مفقود کر دیا ہو۔

اے حاضرین مجلس انصافاً بولو کہ یہ مکالمہ ومخاطبہ جو میرے اور مولوی صاحب کے درمیان ہوا ہے، اس سے آپ لوگوں نے کیا نتیجہ نکالا ہے اور آپکی رائے کا میلان ورجحان کس طرف قائم ہوا ہے۔

(حاضرین) آپ کا پاسا صحیح ہے۔

ف۔ آپ یہاں کے تیس چالیس آدمیوں کی گواہی کا اسناد اپنی تقریر کی صحت پر پیش کرتے ہو، جن میں اکثر آدمی بے علم ہیں اور تھوڑے ہیں جو کچھ قدر بھی علم رکھتے ہیں اور وہ شریعت کے مسائل سے بالکل بے علم ہیں۔ مگر آئمہ اور صحابہ کرام اور بڑے بڑے علمائے متقدمین اور جمہور علمائے متاخرین کے اسناد کو آپ پس پشت ڈالتے ہو، حالانکہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ ایک دفعہ طلاق ثلاثہ دینے سے عورت قابل رجعت نہیں رہتی۔ بڑے بڑے عالموں وفاضلوں کے فیصلہ کی آپ تردید کرتے ہو۔ کیا وہ جھوٹے فتوے دیتے رہے ہیں۔ آپ جیسے ایک فرد کا فیصلہ وفتویٰ علماء وفضلا کے جم غفیر کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتا ہے۔

م۔ صحابہ وعلماء وآئمہ کا فوری طلاق ثلاثہ کے وقوع پر کبھی اجماع نہیں ہوا۔ اگر اس امر میں ان کا اجماع واتحاد واتفاق ہوتا، تو پھر اس بارے میں ان کا کوئی قول مخالف ومتناقص نہ پایا جاتا۔ اور درحقیقت صحابہ کرام وآئمہ عظام کا اسی پر اتفاق واتحاد تھا، جو کچھ قرآن کریم وعملدرآمد نبویؐ سے ثابت ہوا ہے، جیسا کہ قبل ازیں میں عرض کر چکا ہوں۔ جو قابل رجعت ہے۔ قرون اولیٰ ثلاثہ وقرون ثلاثہ کے بعد کے احوال سے جو لوگ بذریعہ تاریخ واقف ہوئے ہیں وہ خوب سمجھ لیتے ہیں کہ قرون اولیٰ ثلاثہ گذرنے کے بعد ایسے بہت سے لوگ گذرے ہیں، جنہوں نے اپنے اقوال واعمال کو رواج دینے کے لئے احادیث موضوعہ گھڑی ہیں اور ائمہ عظام کی طرف سے اقوال واسناد خود بنا کر کتابوں میں درج کر دیئے ہیں اور بزرگان دین پر افترا پردازیاں کرتے رہے۔ جمہور کی رائے کا کوئی چنداں اعتبار نہیں ہوا کرتا اور نہ ان کی کثرت قابل اسناد ہے۔ بلکہ ادلّہ قویہّ قابل اسناد ہوا کرتی ہیں۔

اگر کثرت کے اتفاق رائے کو قابل اسناد و لائق اعتبار ٹھہراتے ہو، تو حضرت امام حسین علیہ

السلام کے قاتلوں کی کثرت تھی، بلکہ بعض ان میں ایسے بھی تھے، جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ جملہ انبیائے کرام واولیائے عظام کے مخالفوں کی کثرت مسموع ومسلّم ہوئی ہے۔ آئمہ اربعہ کو دکھ وایذا پہنچانے والوں کی کثرت بیان کی جاتی ہے۔

سنو حق پر چلنے والوں کی تعداد بظاہر ہمیشہ تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْر ۔یعنی میرے شکر گذار بندے تھوڑے ہیں۔ دراصل خاصان خدا کی ظاہری قلت خدا کے نزدیک کثرت گنی گئی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کو قرآن کریم میں امت یعنی ایک بڑا گروہ بیان فرماتا ہے۔ بادشاہ ایک فرد ہے، مگر اس کے نام کی عظمت کثرت پر دال ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جمہور عوام کے اقوال متفاوتہ ومتناقضہ ومتخالفہ کو دیکھ کر یا سن کر قابل اسناد و دستاویز ٹھہرانا سخت غلطی ہے۔ جب کسی امر میں گروہ کثیر کا اجتہاد وآراء کا دخل شروع ہو جائے، تو وہ بات اپنی اصل حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ توریت وانجیل اسی وجہ سے بگڑ گئی ہیں کہ ان میں یہود ونصاریٰ کا دخل ہو گیا۔ یہی حال بہت سے شرعی مسائل کا ہو گیا ہے۔ مگر الحمدللہ قرآن کریم اور پھر سنت پھر احادیث نبویہ ہیں۔ قرآن کریم حاکم اور احادیث محکوم ہیں۔

بعض مؤلفوں نے اپنی کتب کو رواج دینے کے لئے ایسا بھی کیا ہے کہ لکھ دیا ہے کہ فلاں صحابی یا محدث یا امام کا فلاں مسئلہ پر ایسا اتفاق ہے، مگر بالآخر محققین کی چھان بین سے صحابی ومحدث وامام مشارٌ الیہ کا اتفاق اس مسئلہ کے برخلاف معلوم ہوا۔ اور مؤلف کا افترا ثابت ہوا۔ بخارا میں ایک شخص نے حقہ وغیرہ کے متعلق بہت سی احادیث وضع کر ڈالی تھیں۔ جب اس کو محدثین نے آ پکڑا، تو اس نے اقرار کیا کہ یہ حدیثیں میں نے کسی کتاب سے نقل نہیں کی ہیں، بلکہ خود وضع کی ہیں اور ان کے وضع کرنے میں میری نیک نیتی ہے کہ لوگ حقہ چھوڑ دیں۔

ایک دفعہ ایک واعظ ایک بڑی مجلس میں ایک حدیث نبوی بیان کر رہا تھا اور اس کا اتصال اس زمانہ کے علامہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بیان کرتا تھا۔ اتفاق سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس مجلس میں آ گئے تھے۔ واعظ کی غلط بیانی کو سن کر آپ ضبط نہ کر سکے اور کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے واعظ صاحب اصل حدیث یوں ہے اور احمد بن حنبل میں ہی ہوں۔ راوی سے مجھے اصل حدیث یوں پہنچی ہے۔ واعظ نے بدلگامی سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو چند بے نقط سنا دیئے اور خاموش کر دیا۔ اور کہا امام احمد بن حنبل کا ہمنام ہونے سے تم وہی امام احمد بن حنبل نہیں بن گئے۔ وہ ایک بڑے پایہ کا آدمی اور جلیل القدر شخص ہے اور تم کوئی مسافر اور کم مایہ آدمی ہو۔ بالآخر چونکہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا اس مقام پر کوئی

تعارف نہ تھا اس لئے ان کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ جس طرح حضرت احمد بن حنبلؒ کی زندگی میں ہی ان کی طرف غلط بیانی شروع ہوگئی تھی ایسا ہی دیگر آئمہ پر لوگوں نے بہت افترا بازیاں کی ہیں۔ آئمہ تو درکنار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہزار ہا احادیث لوگوں نے ایسی گھڑی ہیں، جن کو آنحضرتؐ نے نہیں فرمایا اور جن کو احادیث موضوعہ کہا جاتا ہے۔ دیکھو کتاب "موضوعات" سیوطی وغیرہ۔ ہمارا دلی اعتقاد ہے کہ آئمہ عظام، جو بڑے جلیل القدر اور اعلیٰ درجہ کے عالم وفاضل و ماہر قرآن واحادیث تھے، بہت سی غلط روایتیں لوگوں نے ان کے نام پر ان کی طرف سے چلائی ہیں۔ اگر آئمہ عظام وصحابہ کرام زندہ ہوتے، تو ان مفتریوں کے منہ پر تھوکتے، جو افترا بازیوں سے باز نہیں آتے اور قرآن واحادیث کے مقابل پر ان کی فرضی باتوں کو نقل کئے جاتے ہیں۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قدیم سے اہل حدیث یعنی جو لوگ حدیث نبوی پر اپنے عملدرآمد کو منحصر سمجھتے ہیں، وہ فوری طلاق ثلاثہ دینے سے عورت کا پہلے خاوند سے رجوع کرنا ثابت کرتے ہیں اور درحقیقت ایسے ہی لوگوں کا عملدرآمد زیادہ ترصحیح ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جنہوں نے قرآن واحادیث کے عملدرآمد کی کوئی پرواہ نہیں رکھی ہوئی ہے۔ اور اقوال متضادہ و روایات متناقصہ اور علماء کے اقوال مختلفہ کے ڈھیر جمع کر رکھے ہیں۔

ف۔ اگرچہ فوری طلاق ثلاثہ بدعت ہے اور بقول آپ کے حرام ہے، مگر اس کے وقوع کا کونسا امر مانع ہے۔

م۔ فوری طلاق ثلاثہ بدعت ہے اور کوئی بدعت قائم مقام سنت نہیں ہوسکتی۔ ہر بدعت ضلالت ہے اور ضلالت قائم مقام ہدایت نہیں ہوتی۔ آپ خود ہی بتاؤ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بدعت کو بجائے سنت وضلات کو بجائے ہدایت قائم مقام سمجھا ہے۔ جب کہ یہ امر دین اسلام میں نہیں ہے، تو پھر بدعت کو بجائے سنت اور ضلالت کو قائم مقام ہدایت کیوں ٹھہراتے ہو۔ کوئی فعل حرام بجائے حلال نہیں ہوسکتا۔

ف۔ اگر کوئی شخص بجائے حلال کے حرام روٹی وغیرہ کھائے تو بھی سیر ہوسکتا ہے اور وہ حرام بھی رزق ہی کہلاتا ہے۔

م۔ مولوی صاحب برائے خدا صریح نص قرآن کریم وسنت واحادیث نبویہ کے بالمقابل فلسفہ گوئی چھوڑ دو۔ توبہ کرو، یہ روش خدا کو منظور نہیں۔ اس وقت آپ کی حالت اس مسئلہ کے متعلق اَلْغَرِیْقُ یَتَشَبَّثُ بِکُلِّ حَشِیْشٍ (ڈوبنے والا گھاس کے ہر تنکے کو پکڑتا ہے) والی ہے۔ اگر حرام بجائے حلال

مفید ہوتا، تو مرتکب حرام کو مؤاخذہ ومعاتبہ وعذاب کیوں ہوتا۔ مؤاخذہ وعذاب الہٰی گونا گوں اشکال میں ظاہر ہو کر مرتکب فعل حرام کی سیری وقوت کو زائل کر دیتا ہے اور اس کی سیری جو حرام سے ہوئی تھی وہ باعث گرسنگی ہوگی۔

این جہاں کوہ است وفعل ماندا این ندا با باز مے گرد و بما

شریعت محمدیہ کسی امر حرام کو قائم مقام حلال نہیں ٹھہراتی۔ اِلاّ بعض اوقات مضطر کے لئے حرام مباح ہوا ہے۔ مگر وہ کسی امر کی جا بجا نہیں، کیونکہ مردار جب ہی مباح ہوتا ہے کہ حلال بالکل مفقود ہو۔ اگر ایسی مثالوں پر آ گئے، تو زنا کو قائم مقام نکاح سمجھ کر حلال کا نام ہی اڑا دو گے۔

اس کے بعد مولوی صاحب (ف) رخصت ہو گئے اور بعد ازاں مولوی صاحب (م) نے ایک تقریر کی اور بعض مؤلفوں کا حوالہ دیا، جو ذیل میں درج ہے۔ اور کہا کہ جو شخص اسلامی شریعت کی کتابوں پر نظر ڈالے گا، تو یقیناً بعض اس قسم کی آراء بھی اس کی نظر سے گذریں گی کہ طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ساتھ انفصال کی نسبت نہ ہو۔ "شرح التعلیقین" سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو غصے یا نزاع کی حالت میں ایک کلمہ یا چند کلمات کے ساتھ طلاق دے، تو وہ طلاق واقع نہیں ہوتی اور اس بارہ میں انہوں نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔ منجملہ ان کے حضرت علیؓ کا یہ قول ہے کہ جو شخص غصے یا جھگڑے کی وجہ سے شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کرے گا، تو خدا قیامت کے دن اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔

ہم ایسے زمانہ میں ہیں جب کہ لوگ طلاق کے الفاظ کو بطور ہذیان اور یاوہ گوئی کے بولنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ایک شخص دوسرے سے جھگڑتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اگر تو نے ایسا نہ کیا، تو میری بیوی پر طلاق ہے۔ اور وہ اس کے خلاف کرتا ہے۔ اس صورت میں علماء کی طرف سے یہ فتویٰ ملتا ہے کہ طلاق واقع ہوگئی ہے اور زن وشوئی کا تعلق منقطع ہو گیا ہے، حالانکہ اس کی بیوی غریب کو اس واقعہ کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ نہ شوہر سے بغض ونفرت رکھتی ہے اور نہ وہ اس سے جدائی کی خواستگار ہوتی ہے، بلکہ اکثر اوقات اس کے لئے یہ جدائی سخت نا قابل برداشت مصیبت ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد بھی اکثر اوقات اپنی بیوی کے ساتھ محبت کرنے والا ہوتا ہے اور ایک ایسے لفظ کی وجہ سے، جو انفصال کی نیت سے نہیں بولا گیا تھا بلکہ دوسرے شخص پر ایک کام لازم کر دینے کی نیت سے کہا گیا تھا، وہ اس سے جدا ہو جاتی ہے، تو وہ سخت رنج وعذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شوہر خانگی امور میں اپنی بیوی سے جھگڑتا ہے اور غصہ کے وقت حرف

طلاق اس کی زبان سے نکل جاتا ہے، جس سے صرف تہدید اور تخویف مقصود ہوتی ہے اور رشتہ زن وشوئی کا منقطع کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں بھی یہی فتویٰ ملتا ہے کہ طلاق ہوگئی اور اس کے بعد ان دونوں پر وہ تمام بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اکثر ایسا دیکھا جاتا ہے کہ ایک گنوار کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور جب گاؤں کا مقدم یا پولیس کا مہتمم اس سے دریافت کرتا ہے، تو وہ انکار کرتا ہے اور طلاق کی قسم کھاتا ہے کہ میں نے نہیں چرایا، حالانکہ اس نے چرایا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کہا جاتا ہے کہ طلاق واقع ہوگئی۔ حالانکہ اس قسم سے وہ صرف اپنے آپ کو بری کرنا چاہتا ہے، اس کی اس کے سوا اور کوئی نیت نہیں ہوتی۔ اور اس حلف کے وقت اس کے دل میں خیال بھی نہیں گذرتا کہ وہ اپنی بیوی سے ناراض ہے اور اس کے ساتھ معاشرت کو ناپسند کرتا ہے۔ پس ایسی حالت میں جبکہ عام طور پر اخلاق فاسد ہو گئے ہیں اور عقلوں میں فتور پیدا ہو گیا ہے، مناسب ہوگا کہ بعض آئمہ کے اس قول پر عملدرآمد کیا جائے کہ طلاق کے واسطے بھی دو آدمیوں کی گواہی شرط ہے، جس طرح کہ وہ نکاح کیلئے شرط ہے جیسا کہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، جو سورۃ طلاق میں آئی ہے، جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ وَ اشۡهِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ ۔ ترجمہ۔ یعنی اپنوں میں سے دو عادل گواہ مقرر کرلو۔

کیا یہ شہادت کا صریح حکم نہیں ہے، جو ان تمام امور مثلاً طلاق و رجعت، امساک اور فراق کو شامل ہے، جو اس سے پہلے مذکور ہوئے ہیں۔ کیا شارع کا یہ منشا نہیں کہ طلاق کا واقع ہونا عام لوگوں میں مشہور ہونا چاہئے تاکہ اس کا ثابت کرنا آسان ہو۔ ہم کس لئے یہ بات قرار نہ دیں کہ طلاق کے وقت دو گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے، جس کے بغیر طلاق صحیح نہ ہوگی۔ اس طریقہ سے ان تمام طلاقوں کا سدّ باب ہو جائے گا، جو بلا قصد و بلا ارادہ محض غصہ کے عالم میں ایک کلمہ کے زبان سے نکلنے کے باعث واقع ہو جاتی ہیں۔ اس حکم پر عملدرآمد کرنا درحقیقت قرآن کے حکم کی موافقت اور قوم کی مصلحت کی رعایت ہے۔ بے شک خداوند تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس زمانہ میں امت اس نوبت کو پہنچ جائے گی، اس لئے اس نے یہ آیت نازل فرمائی تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے اور بے شک ہماری حالت ایسی ہے کہ ہم کو اس آیت سے کام لینا چاہئے، بلکہ اگر گورنمنٹ یہ چاہتی ہے کہ قوم کے لئے کوئی بہتری کا سامان مہیا کرے، تو اس کا فرض ہے کہ طلاق کے لئے حسب ذیل قانون نافذ کردے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے، ہماری اس کتاب کو نکاح خواں علماو نمبرداروں کے اندر رواج دلادے۔

دفعہ اول

جو شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ قاضی یا اس کے ایجنٹ کے حضور میں حاضر ہو اور وہ جھگڑا بیان کرے، جو اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان واقع ہوا ہو۔

دفعہ ۲

قاضی یا اسکے ایجنٹ کو لازم ہے کہ وہ شوہر کو ان امور کی ہدایت کرے، جو قرآن اور حدیث میں وارد ہوئے ہیں کہ طلاق خدا کے نزدیک سخت ناپسند ہے اور طلاق کے ناگوار نتائج کو بیان کر کے جو آئندہ پیش آنے والے ہیں انکو نصیحت کرے اور اسکو حکم دے کہ وہ اس بارہ میں ایک ہفتہ غور و فکر کرے۔

دفعہ ۳

اگر شوہر ایک ہفتہ گذرنے کے بعد بھی طلاق دینے کے ارادے پر قائم رہے، تو قاضی یا اسکے ایجنٹ کو لازم ہے کہ وہ ایک پنچ بیوی کے کنبے سے اور ایک شوہر کے کنبے سے یا دو معتبر اجنبی شخص، اس صورت میں کہ ان کے عزیز و قریبی اشخاص موجود نہ ہوں، اس غرض سے بھیجے تا کہ وہ بیوی اور شوہر کے مابین صلح کرا دیں۔

دفعہ ۴

اگر پنچوں کو بھی صلح کرانے میں کامیابی نہ ہو، تو ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بیان قاضی یا اس کے ایجنٹ کے روبرو پیش کریں، جس کے بعد شوہر کو قاضی طلاق دینے کی اجازت دے۔

دفعہ ۵

کوئی طلاق صحیح نہ ہوگی جب تک کہ وہ قاضی یا اس کے ایجنٹ کے روبرو اور دو گواہوں کی موجودگی میں نہ دی جائے۔ اور دستاویز کے بغیر اس کا ثبوت قبول نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۶

پہلی طلاق، جو بلحاظ عدت شروع ہو اور تیسری طلاق، جو تین ماہ کے بعد دینی چاہئے، قاضی یا اس کے ایجنٹ کے روبرو ہونی چاہئے۔ اگر تیسری طلاق سے پہلے بیوی و خاوند آپس میں رضامند ہو جائیں، تو قاضی کو اطلاع دے کر رجوع کر لیں۔

دفعہ ۷

جب تیسری طلاق تین ماہ یا تین طہر کے بعد قاضی یا اس کے ایجنٹ کے روبرو واقع ہو جائے، تو قاضی اس مرد و عورت کی طلاق کی اطلاع تحصیل میں کر دے۔ اور اپنے رجسٹر میں بھی درج کرے۔

جو شخص ان آیتوں پر، جو شاہد اور پنچ مقرر کرنے کی نسبت وارد ہوئی ہیں، غور کرے گا، اسکو معلوم ہو جائیگا کہ ایسا قانون، جیسا کہ وہ ہے، شریعت کی مصلحتوں پر پوری طرح منطبق ہے اور کسی طرح اس کے خلاف نہیں ہے۔ اس قانون پر کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ ایسا قانون شوہر کے اس حق میں دست اندازی کرتا ہے، جو اسکو طلاق دینے کا حاصل ہے، کیونکہ شوہر کیلئے اب بھی طلاق کا حق بدستور باقی ہے۔ اور نکاح کے تعلق کا باقی رکھنا یا اس کو توڑ دینا صرف اسکی مرضی پر منحصر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ امر ہے کہ طلاق سے پیشتر تحکیم اور نصیحت کی شرط لگا دی گئی ہے، جس سے شوہر کے حقوق پر کسی قسم کی دست اندازی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ غور وفکر کا ایک ذریعہ ہے، جو بیوی اور اسکے بچوں بلکہ خود شوہر کی مصلحت کیلئے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ہم نے اکثر شوہروں کو دیکھا ہے کہ وہ بلا سمجھے بوجھے طلاق دے دیتے ہیں۔ اور پھر پچھتاتے اور نہایت کمینہ اور دنی حیلوں کے استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء اور فقہاء خیال فرما سکتے ہیں کہ اس سیدھے سادے طریقہ سے قوم کو جو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوگا، وہ یہ ہے کہ طلاق کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ حکم الٰہی کا اتباع اور تحکیم کے نہایت اہم حکم کا عملدرآمد ہوگا، جو اس وقت تک معطل رہا ہے اور جس کا نافذ ہونا بھی نہیں سنا گیا۔ خصوصاً ہماری قوم میں جس کے افراد یہاں تک فاسد ہو گئے ہیں کہ مرد طلاق کی قسم کھا لیتا ہے، حالانکہ وہ کھاتا پیتا چلتا پھرتا ہنستا بولتا اور جھگڑا کرتا ہے۔ اور اس کی بیوی غریب، جو گھر کی چار دیواری میں بیٹھی ہوتی ہے، اس بے خبر کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے شوہر کا دوسرے شخص کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ سب سے پہلے جس امر پر غور کرنا لازمی ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری شرع شریف نے مسئلہ طلاق میں ایک عام اصول قرار دیا ہے، جس کی طرف احکام طلاق کے تمام فروعات کو راجع ہونا چاہئے۔ اور وہ یہ ہے کہ طلاق فی نفسہ حرام ہے اور ضرورت کے لئے مباح ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آئمہ کے اقوال میں اس امر کے بے شمار شواہد موجود ہیں، جن میں سے ہم بعض اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ **فَاِنْ کَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا** ۔ ترجمہ۔ اور اگر تم کو اپنی بیوی کسی وجہ سے ناپسند ہو، تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت خیر و برکت دے۔

اور نیز فرمایا۔ **وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِنْ اَهْلِهَا اَنْ يُرِيْدَ اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا** ۔ ترجمہ۔ اور اگر تم کو میاں بیوی میں کھٹ پٹ کا اندیشہ ہو، تو ایک پنچ مرد کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک پنچ عورت کے کنبے میں سے۔ اگر پنچوں کا دلی ارادہ میاں بیوی میں

اصلاح کر دینے کا ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کے سمجھانے بجھانے سے دونوں میں موافقت کرا دے گا۔

اور نیز فرمایا۔ **وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا** ۔ترجمہ۔ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو، تو میاں بیوی دونوں میں کسی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کر لیں۔ اور اگر ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرو اور سخت گیری سے بچے رہو، تو خدا تعالیٰ تمہارے ان نیک کاموں سے باخبر ہے۔ وہ تم کو اس کا اجر دے گا۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ **عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ اَلطَّلَاقُ** ۔ رواه ابو داؤد و ابن ماجة وصححه الحاكم ۔ ترجمہ۔ خداوند تعالیٰ کے نزدیک طلاق مبغوض ترین مباحات میں سے ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نکاح کرو اور طلاق مت دو، کیونکہ طلاق سے خدا کا عرش بھی ہل جاتا ہے۔

ابن عابدین کے حواشی میں وارد ہوا ہے کہ اصل طلاق میں حرمت ہے۔ یعنی طلاق فی نفسہٖ حرام ہے، مگر کسی عارض کی وجہ سے مباح ہو جاتی ہے۔ یہی معنی ہیں فقہاء کے اس قول کے کہ اصل طلاق میں حرمت ہے اور اباحت صرف خلاص کی ضرورت سے ہے۔ پس اگر وہ بلا سبب دی جائے، جسمیں خلاص کی ضرورت نہ ہو، تو وہ بالکل حماقت اور نادانی اور سراسر گدھا پن اور کفران نعمت اور عورت اور اس کی اولاد اور عزیزوں کو تکلیف دینا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ **فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا** ۔ ترجمہ۔ اگر وہ تمہاری اطاعت اور فرمانبرداری کریں تو طلاق دینے کا ارادہ نہ کرو۔

جن لوگوں نے فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے یہ بات دیکھی ہوگی کہ بالعموم تمام آئمہ کی اس عظیم الشان اصول پر نظر گئی ہے، جو حتی الامکان طلاق کا دائرہ تنگ کرنے والا ہے۔ مسئلہ وقوع طلاق میں، جب کہ اس کے ساتھ نیت نہ کی گئی ہو، فقہاء نے اس عام اصول کو نظر انداز کر دیا ہے، جس پر اکثر شرعی احکام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور جس کی کتاب اور سنت نے تصریح کی ہے اور جس کی بنیاد پر مجبور اور غافل اور مخطی کو غیر مکلّف قرار دیا ہے۔ مگر فقہاء نے طلاق کو اس عام اصول کے دائرہ سے خارج رکھا ہے اور مجبور اور غلطی کرنے والے اور ہنسی کرنے والے اور مدہوش کی طلاق واقع ہونے کا حکم لگایا ہے۔ حالانکہ مدہوش کی یہ تعریف کرتے ہیں، جو آسمان سے زمین کو تمیز نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی رائے دینے

والوں نے نیت کا اعتبار نہیں کیا، جو مذہب اسلام کے احکام کی اصل اصول ہے، جیسا کہ حدیث **اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ** سے معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح ان فقہاء نے شارع کی اس غرض کی طرف التفات نہیں کیا ہے کہ طلاق فی نفسہٖ حرام ہے اور وہ خدا کے نزدیک مبغوض ترین مباحات میں سے ہے۔ایسے حالات میں طلاق کے نافذ ہونے کے لئے انہوں نے کچھ اسباب بیان کئے ہیں، جن کو اس مقام پر نقل کرتا ہوں۔ان کی نسبت فیصلہ کرنا ناظرین کی رائے پر چھوڑا جاتا ہے۔

کتاب ذیلعی میں لکھا ہے کہ ہنسی کرنے والے اور غلطی کرنے والے کی طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیونکہ اس صورت میں طلاق کا لفظ شوہر کی زبان پر جاری ہوا ہے۔اور جو شخص طلاق پر مجبور کیا جائے، اس کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔کیونکہ اس نے دو برائیوں میں سے ایک کو دانستہ اختیار کیا ہے۔مگر مدہوش کی طلاق واقع ہونے کا یہ سبب بتایا جاتا ہے کہ اس نے معصیت کا ارتکاب کیا اور وقوع طلاق اس کے لئے بطور زجر و توبیخ کے ہے۔مگر ہم نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ یکدفعہ ایک ہی مجلس میں طلاق کامل واقع ہی نہیں ہوتی، پھر مخطی اور ہنسی کرنے والے اور مدہوش کی طلاق کس طرح واقع ہو سکتی ہے، کیونکہ ایسی فوری طلاق اصول شریعت اور مصلحت عامہ کے بالکل برخلاف ہے۔

جو لوگ اصلاح کے خواستگار ہیں، ان کو مناسب ہے کہ وہ ان احکام پر عملدرآمد کریں اور یہ قرار دیں کہ جو طلاق ایسے حالات میں دی جائے وہ نافذ نہ ہوگی۔

بعض علماء کبار نے اس امر پر بڑے زبردست دلائل پیش کئے ہیں کہ جب تین طلاقیں دفعۃً واحدۃً دی جائیں، تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔علامہ شوکانی نے اس مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ مدلل طور پر ثابت کیا ہے اور اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔اسی طرح حافظ ابن قیم "اغاثۃ اللہفان" اور "اعلام الموقعین" میں اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے۔

ابن عابدین میں وارد ہوا ہے کہ امامیہ سے منقول ہے کہ تین لفظوں سے اور حیض کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ یہ بدعت محرمّہ ہے۔ابن عباس سے مروی ہے کہ ایسی حالت میں صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔اور یہی قول ابن اسحاق اور طاؤس اور عکرمہ کا ہے، کیونکہ مسلم میں وارد ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوّت اور زمانہ خلافت اولیٰ اور دو برس تک حضرت عمر کی خلافت میں یہ معمول تھا کہ جب دفعۃً واحدۃً تین طلاقیں دی جاتیں، تو ایک واقع ہوتی تھی۔عمرؓ نے فرمایا لوگ ایسے کام میں جلدی کرنے لگے ہیں، جس میں انکو آہستگی برتنی چاہئے۔پس اگر ہم اس کو نافذ کر دیں، تو مناسب ہوگا۔اور آپ نے اسکو نافذ فرما دیا۔اس مسئلہ میں اس قدر احادیث

وارد ہوئی ہیں، جنکو دیکھنے کے بعد کچھ بھی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ایک جم غفیر اہل ظاہر اور علماء کی ایک جماعت کثیرہ ،جس میں اہل تشیعہ بھی داخل ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ جب ایک وقت میں تین طلاقیں دی جائیں، تو صرف ایک واقع ہوتی ہے۔**و عن ابن عباسؓ قال طَلَقَ ابو رکانة اُمَّ رکانة فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم اَرْجِعْ امْرَاتَکَ فقال انی طَلَّقْتَها ثلاثا قال قد علمت راجعها رواه ابو داؤد و فی لفظ لِاَحْمَدَ طَلَقَ ابو رکانة امراته فی مجلس واحد ثلاثا فحزن علیها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم فانها واحدة** ۔ترجمہ۔ابن عباس سے روایت ہے کہ ابو رکانہ نے رکانہ کی ماں کو طلاق دیدی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ اپنی عورت سے رجوع کر لے۔ابو رکانہ نے کہا میں نے اپنی عورت کو ایک دفعہ تین طلاقیں دے دی ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ میں نے جان لیا ہے کہ تو نے اپنی عورت کو ایک دفعہ تین طلاقیں دی ہیں۔اپنی عورت سے رجوع کر لے۔روایت کیا اس حدیث کو ابوداؤد نے اور احمد سے یوں روایت ہے کہ ابو رکانہ نے اپنی عورت کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیں اور پھر غمگین ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ یہ ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل آیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تین طہر کامل گذرنے سے پہلے طلاق کامل واقع ہی نہیں ہوسکتی۔**وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ. وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ** ۔ ترجمہ۔مطلقہ عورتیں بامید رجوع تین طہر تک انتظار کریں۔کیونکہ تین طہروں کے اندر یعنی طلاق دینے کے بعد بھی جو دو طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔اگر مرد و عورت میں صلح ہو جائے، تو پہلے ہی خاوند اپنی عورت سے رجوع کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اب اس جگہ ان آیتوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یکدفعہ تین طلاقیں بول دینے سے اگر تینوں واقع ہو جاتیں اور عورت پہلے خاوند کی طرف رجوع نہ کرسکتی، تو پھر خدا تعالیٰ تین حیض تک کا انتظار کرانا فوری مطلقہ ثلاثہ سے اٹھا دیتا۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کسی جگہ ایسا نہیں فرمایا، بلکہ آیت **بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ** اور **وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ** میں صاف ظاہر فرما دیا کہ تین حیض کامل گذرنے تک مطلقہ پہلے خاوند سے رجوع کرسکتی ہے۔

چنانچہ شارح" کنز و بحر الرائق "وغیرہ نے بھی اس طرف تھوڑا سا اشارہ کیا ہے۔چنانچہ لکھا ہے **والمطلقات لا یکون الا بالصریح ثم قال عز و جل و بُعُلُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ. ای**

ازواجھن اولی بمراجعتھن فی ذلک ای فی التربص کذا فی التیسیر. فدلت الآیة علی ان طلاق الرجعی لا یرفع النکاح فان اللہ تعالیٰ سماہ بَعْلًا بعد الطلاق ۔(شرح کنز ۔ص۱۱۲) ۔ترجمہ۔یعنی یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **والمطلقات**۔پس واضح ہو کہ مطلقہ ہو کر عورتیں وہی ہیں، جن کو ظاہراً خاوند کی طرف سے طلاق ملی ہو۔ پھر خدا تعالیٰ نے ان مطلقہ عورتوں کے حق میں فرمایا کہ ان کے خاوند رجوع کرنے کے زیادہ حقدار ہیں مدت انتظار میں جو تین طہر تک ہے۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ طلاق رجعی نکاح کو نہیں اٹھاتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو طلاق کے بعد بھی خاوند کہا ہے اور طلاق رجعی تین طہر کے اندر تک محدود ہے۔ اگر کسی شخص نے عورت کو دو طہروں میں دو طلاقیں دیں اور تیسری طلاق تیسرے طہر کے بعد نہ دے، تو وہ طلاق رجعی ہے اگرچہ مدت تین چار ماہ یا زیادہ گذر جائے۔

ان لوگوں کا جواب جو فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے کے قائل ہیں

اب ہم ان اقوال واحادیث کو درج کرتے ہیں، جن سے بعض لوگ فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

امام طحاوی کہتا ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب نے فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے کا امر نافذ فرمایا، تو سب لوگوں کو اس سے مطلع کیا۔ چنانچہ طحاوی کی عبارت ذیل میں مع ترجمہ لکھی جاتی ہے۔

فخاطب عمر رضی اللہ عنہ بذالک الناس جمیعا و فیھم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم ینکرہ منھم واحد و لم یدفعہ دافع فکان ذالک اکبر الحجة فی نسخ ما تقدم من ذالک لانہ لما کان کذالک ایضا اجماعھم علیٰ القول جماعا یجب بہ الحجة و کان اجماعھم برئیا من الوھم والزلل ۔ترجمہ۔پس حضرت عمر بن خطاب نے سب لوگوں کا خطاب کیا اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بھی موجود تھے۔ پس ان میں سے کسی انکار کرنیوالے نے اس امر سے انکار سے نہ کیا اور نہ کسی نے جھگڑا کیا۔ پس یہ ایک بڑی دلیل ہے اسبات پر کہ طلاق ثلاثہ کے ایک ہی مجلس میں نہ واقع ہونے والی حدیث منسوخ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے جو ایک فعل اتفاق سے کیا وہ قابل حجت ہے۔ ایسا ہی اس قول پر ان کا اتفاق وایکا بھی اجماع ہے۔ یہ بھی قابل حجت ہے اور جیسا کہ ان کا اجماع نقل ہر وہم ولغزش سے بری وپاک ہے، ایسا ہی رائے پر ان کا اجماع وہم ولغزش سے پاک ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ جو فعل رسول اللہؐ کے زمانہ میں وحضرت ابوبکر کے سارے عہد خلافت وحضرت

عمر کی خلافت کے دوسال میں جاری رہا، وہ فعل اب کس طرح منسوخ ہوسکتا تھا۔ کیا کوئی ایسی حدیث بھی مل سکتی ہے، جس میں لکھا ہو یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا ہو کہ یہ فعل فلاں زمانہ تک یوں ہی جاری رہے اور دوسال خلافت عمر کے بعد منسوخ سمجھا جائے اور آئندہ فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونیکا امر نافذ ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ جس فعل پر صحابہ نے آنحضرتؐ کے ساتھ اتفاق واتحاد کیا، اس کو حضرت عمر نے توڑا نہیں اور فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونیکا امر، جو حضرت عمر نے نافذ فرمایا، اس کا سبب حضرت عمر نے سب کے آگے کھول کر بیان فرمادیا کہ اصل بات وہی ہے، جو خدا ورسول نے بیان فرمائی۔ اور اس فرمودہء خدا وعلمدر آمد نبویؐ پر لوگوں کو قائم کرنیکے لئے یہ حکم بطور تنبیہہ وسزا جاری فرمایا کہ جب لوگ دیکھیں گے کہ فوری طلاق ثلاثہ کے بول دینے سے عورت بالکل ہاتھ سے جاتی ہے، تو وہ اس فعل شنیع سے رک جائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص طلاق دینا چاہے گا، تو بموجب فرمودہ خدا ورسول عدت سے عورت کو طلاق دے گا۔ چنانچہ حدیث مندرجہ ذیل سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے۔

عن عبد الله ابن طاؤس عن ابیه عن ابن عباس رضی الله عنهم قال کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و سنتین من خلافة عمرؓ طلاق الثلاث واحدة فقال عمرؓ ان الناس استعجلوا فی امر کانت لهم فیه اناء ة فلو امضیناه علیهم. رواه مسلم و فیه عن طاؤس ان ابا الصهباء قال لابن عباسؓ اتعلم انما کانت الثلاث تجعل واحدة علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و ثلاثا من امارة عمرؓ فقال ابن عباسؓ نعم و فیه ایضا عن طاؤس ان ابا الصهباء قال لابن عباسؓ هات من هنالک الم یکن الطلاق الثلاث علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر واحدة فقال قد کان ذالک فلما کان فی عهد عمر تتابع الناس فی الطلاق فاجازه علیهم ۔ ترجمہ۔ عبداللہ بن طاؤس اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور حضرت ابوبکر کے عہد میں اور دو سال حضرت عمر کی خلافت میں تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔ پس حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ اس کام میں جلدی کرنے لگے ہیں، جس کام میں ان کو مہلت کرنی چاہئے تھی (یعنی لوگوں پر لازم ہے کہ طلاق عدت سے دیں) پس اس غلطی کو روکنے کے لئے اگر ہم طلاق ثلاثہ کا حکم نافذ ہی کردیں، تو لوگ طلاق ثلاثہ فوری سے رک جائیں گے۔ پس بدیں لحاظ حضرت عمر نے وقوع فوری طلاق ثلاثہ کا حکم نافذ فرمایا۔ روایت کی یہ حدیث مسلم نے۔ اور مسلم میں یہ بھی لکھا ہے۔ طاؤس سے روایت ہے کہ صہباء کے

باپ نے ابن عباس کو کہا کیا تو جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور حضرت ابی بکر کے عہد خلافت میں اور تین سال حضرت عمر کی خلافت میں فوری طلاق ثلاثہ کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا۔ پس ابن عباس نے کہا ہاں یہ بات واقعی درست ہے کہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اور مسلم میں ہی یہ روایت ہے۔ طاؤس کہتا ہے کہ صہباء کے باپ نے ابن عباس کو کہا کہ صدر اول و دوم وسوم کی باتیں بیان کر۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم اور حضرت ابی بکر کے عہد میں تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی تھی۔ ابن عباس نے کہا ہاں یہی بات تھی۔ پس جب حضرت عمر کے زمانہ میں لوگ طلاق ثلاثہ یک دفعہ بول دینے کے عادی ہوگئے، تو حضرت عمر نے ان پر طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے کا امر نافذ فرمادیا۔

اب ناظرین احادیث مذکورہ بالا کو خوب غور سے پڑھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ ان سے وہی بات معلوم ہوتی ہے، جو ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں۔ کیونکہ حضرت عمر نے اپنے فیصلہ کا سبب بیان کر دیا ہے کہ لوگ ایسے کام میں جلدی کرنے لگے ہیں، جس میں ان کو آہستگی برتنی چاہئے تھی۔ پس گویا کہ حضرت عمر نے ان کو روکنے کی غرض سے بطور تنبیہہ وسزا کے اس طلاق کو نافذ قرار دیا ہے۔ اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت عمر کے اجتہاد کا یہی منشا ہے کہ عام لوگ تین طلاقوں کے بک دینے کے عادی ہورہے ہیں اور اس کو اپنی قسموں اور حلفوں اور عام بول چال میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا حضرت عمر نے لوگوں کو سنت نبوی پر قائم کرنے کی غرض سے یہ کام کیا۔ ورنہ یہ بات تو بالکل ناممکن ہے کہ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے برخلاف کریں۔ کیونکہ آنحضرت نے فوری طلاق ثلاثہ کو ایک ہی ٹھہرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن حنبل جیسے عظیم الشان علماء نے حضرت عمر کے فیصلہ پر عمل نہیں کیا، بلکہ انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اپنا دلیل راہ و پیشرو ٹھہرایا ہے۔ اور جو احادیث حضرت ابن عباس سے وقوع طلاق ثلاثہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہیں، وہ مجروح ہیں۔ کیونکہ مسلم کی حدیث میں صاف لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اقرار کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت ابی بکر و عمر کے دوسال خلافت میں طلاق ثلاثہ فوری ایک ہی طلاق شمار کی جاتی تھی۔ اور یہ حدیث قرآن کریم کی آیت پر منطبق ہے۔ پس اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔

بعض لوگوں نے حضرت ابن عباس کی صحیح حدیث کی یوں تاویل کی ہے، جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔ **واختلف العلماء فی جوابه و تاویله فالاصح ان معناه انه کان فی الاول اذا قال لها انت طالق انت طالق انت طالق و لم ینو تاکید و لا استینا فایحکم بوقوع طلقة لقلة الاستیناف بذالک فحمل علی الغالب الذی هو اراده التاکید فلما**

كـان فـی زمـن عـمـر رضی اللہ عنه و كثر استعمال الناس بهذه الصنيعة و غلب منهم الاستيناف لها حملت عند الاطلاق على الثلاث عملا بالغالب السابق الى الفهم منها فـی ذالک الـعصر و قيل المراد ان المعتاد فی الزمن الاول كان طلقة واحدة و صار الـنـاس فـی زمـن عـمـرؓ يـواقعون الثلاث دفعة فنفذه عمرؓ فعلٰی هذا يكون اخبارا عن اختـلاف عـادة الناس لامن تغير حكم فی مسئلة واحدة ۔ترجمہ۔اوراختلاف کیا ہے فوری طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے پر فتویٰ دینے والے علماء نے اس حدیث کے جواب وتاویل میں۔اور صحیح تر یہ بات ہے کہ پہلے لوگوں کا یہ طریق تھا کہ جب کوئی اپنی عورت کو کہتا کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہےاوراس لفظ سے تاکیداورنئ طلاق کی نیت نہ کرتا،تو نئ نیت کی کمی کے باعث ایک طلاق کے واقع ہونے کا حکم کیا جاتا تھااوراکثر اس طلاق ثلاثہ کوارادہ تاکید پرگمان کیا جاتا تھا(یعنی طلاق کے لفظ کے تین بارادا کرنے سے فقط تاکید مراد ہوتی تھی (مرتب)۔پس جب حضرت عمر کے زمانہ میں لوگوں کا یہ فعل بہت ہو گیا تھا اورنئ نئ طلاق کے دینے کا رواج عام ہو گیا،تو اس زمانہ میں دفعۃً تین طلاق بولنے سے طلاق ثلاثہ کا گمان کیا جاتا تھا۔اور بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت ابوبکر کے زمانہ میں لوگوں کی عادت ایک ہی طلاق بولنے کی تھی اور حضرت عمر کے زمانہ میں تین طلاقوں کے بولنے پر امروقوع طلاق کا نافذ فرمایا۔پس بدیں لحاظ ایک ہی مسئلہ میں اختلاف حکم کا باعث لوگوں کی عادات مختلفہ کو ظاہر کررہا ہے۔

ہم کہتے ہیں ان تاویلوں کو یہی حدیث اوردوسری احادیث وآیات قرآن کریم ردّکررہی ہیں۔ اگر پہلے زمانہ اوردوسرے زمانہ کے لوگوں کے الفاظ میں تغیر ہوتا،تو وہ الفاظ بھی احادیث میں مذکور ہوتے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین یکدفعہ طلاقوں کو ایک ہی طلاق ٹھہرایا،تو یہ الفاظ تھے یا کہ طلاق اس طرح سے دی جاتی تھی اور حضرت عمر کے زمانہ میں لوگوں کے الفاظ میں یوں ہوتے تھے۔

اصل بات وہی ہے جس کے سبب حضرت عمر نے اس حدیث کے اخیر میں بیان فرما دیا کہ لوگ اس بدعت کے عادی ہو گئے ہیں اورایسے فعل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ ظاہر فرمایا ہے۔لہٰذا حضرت عمر نے لوگوں کو فعل نبوی پر قائم کرنے کے لئے یہ کام کیا کہ جب لوگ عورت کو بالکل ہاتھ سے جاتی دیکھیں گے،تو طلاق ثلاثہ سے رک جائیں گے۔حضرت عمر نے اس لئے دیگر اصحاب نبوی سے اس امر میں مشورہ کرکے یہ امر نافذ فرمایا۔چونکہ سارے صحابہ کو یہ فعل پسند آیا،اس لئے کسی نے انکار نہ کیا۔ کیونکہ اس کی اصل نیت بخیر تھی۔ورنہ اگر کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ حضرت عمر فعل نبوی کی مخالفت کرنا چاہتے

ہیں،تو ان کی رائے سے ایک بھی متفق نہ ہوتا۔مگر حضرت عمر نے صحابہ کو بتا دیا تھا کہ یہ کام سنت نبوی پر قائم کرنے کی غرض سے کیا جارہا ہے۔

اب واضح رہے کہ جو احادیث عبد اللہ بن عمر اور ابن عباس سے دفعۃً طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے پر روایت کی جاتی ہیں، وہ ان احادیث سے متناقص ومخالف ہیں، جو عبداللہ بن عمر اور ابن عباس سے مروی ہیں، جن میں لکھا ہے کہ دفعۃً طلاق ثلاثہ سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔جبکہ ایک ہی شخص سے دو معارض ومخالف اقوال واحادیث روایت کی گئی ہوں،تو ان میں سے صحیح تر وہ ہوگی، جو قرآن کریم سے موافق ہو۔پس جبکہ قرآن کریم نے طلاق میں شمار عدت کوفرض ولازم ٹھہرایا ہے اور عملدرآمد نبیؐ سے بھی یہی امر ثابت ہوتا ہے،تو وہی حدیث صحیح ٹھہر سکتی ہے، جس میں عدت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔قرآن کریم بہرحال حاکم واحادیث محکوم ہیں۔جو احادیث تاویل سے بھی قرآن کریم سے موافق نہ ہوسکیں، وہ احادیث نبوی میں شمار نہ کی جائیں۔وہ موضوع ہیں۔قرآن واحادیث ایک ہی چشمہ صافی سے نکلے ہیں اور ہر دو کلام الٰہی ہیں۔قرآن وحی جلی ہے اور احادیث وحی خفی ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا کلام خدا کا کلام تھا اور اس میں تناقص واختلاف کو راہ نہیں۔گفتن او گفتن اللہ بود۔گرچہ از حلقوم عبداللہ بود۔

طلاق ثلاثہ فوری کے ایک ہی ہونے پر ایک اور زبردست دلیل ذیل ہے۔مسند امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی صفحہ ۴۸ پر حدیث ذیل لکھی ہے۔ اَلْمُطَلَّقَةُ ثَلَاثًا لَهَا السُّكْنىٰ وَ النَّفَقَةُ۔ترجمہ۔یعنی مطلقہ ثلاثہ فوری کے لئے خاوند طالق پر مکان رہائش اور خرچ دینا لازم ہے۔شارح ملا علی قاری لکھتا ہے کہ خواہ وہ عورت حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو مکان ونفقہ طالق پر لازم ہے۔اس سے صاف ثابت ہورہا ہے کہ مطلقہ ثلاثہ فوری قابل رجعت نہ ہوتی،تو طالق پر مکان ونفقہ لازم نہ ہوتا۔چنانچہ اعلام الموقعین جلد دوم صفحہ ۱۵۸ میں ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔اَلْمُطَلَّقَةُ الْبَائِنَةُ لَا نَفَقَةَ لَهَا وَ لَا سُكْنىٰ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ترجمہ۔یعنی مطلقہ بائنہ کے لئے طالق پر خرچ اور مکان رہائش بموجب سنت نبیؐ لازم نہیں ہے۔پس اس سے صاف ثابت ہوگیا کہ چونکہ مطلقہ ثلاثہ فوری کے لئے حق رجوع ہے،اس لئے اس کا نفقہ وسکونت طالق کے ذمہ ہے اور مطلقہ ثلاثہ متفرق کے لئے حق رجوع نہیں رہتا۔اس لئے اس کا نفقہ وسکونت طالق کے ذمہ نہ پڑا۔

آج کل کی عدالتہائے دیوانی وججان چیف کورٹ نے فیصلہ مقدمات کیلئے فوری طلاق ثلاثہ کو ایک ہی طلاق تسلیم کیا ہے۔چنانچہ ولیم میکناٹن صاحب "اصول نظائر شرع محمدی" کے باب ۷ صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ بموجب اس مسئلہ کے، جو زیادہ تر تسلیم کیا گیا ہے، طلاق بائن اس صورت میں صادق آتی

ہے، جب اس کی تکرار تین مرتبہ ہو۔ اور یہ ضرور ہے کہ بعد طلاق ہر مرتبہ کے ایک مہینے کا فصل ہو اور شوہر کو اختیار رہے کہ اس عرصہ میں اس کو صراحتاً یا کنایتاً زوجہ گردانے یعنی جب تک مطلقہ پر تین ماہ کا عرصہ نہ گذر جائے، تب تک اس کا رجوع اپنے شوہر سے ہو سکتا ہے۔

طلاق کا تین تک محدود ہونے کی وجہ

طلاق کو صرف تین کے اندر محدود کرنے میں یہ راز ہے کہ وہ کثرت کی شروع حد ہے اور نیز اس میں فکر کرنا اور سوچنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور سے لوگوں کو اس کی مصلحت معلوم نہیں جب تک وہ عورت کے مِلک سے نکلنے کا مزہ نہیں چکھ لیتے۔ اور تجربہ کے لئے اصل ایک مرتبہ ایک چیز کا عمل میں لانا ہوتا ہے۔ اور دوسے تجربہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور تیسری طلاق کے بعد نکاح شرط کرنا تحدید اور انتہاء کے معنے ثابت کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے اگر بغیر دوسرے نکاح کے اس سے رجوع درست ہوتا، تو اس کا حال رجعت کا سا تھا۔ اس لئے کہ مطلقہ سے نکاح کرنا بھی ایک قسم کی رجعت ہے۔ اور عورت جب تک خاوند کے گھر میں اور اس کے قبضہ میں اور اس کے اقارب کے سامنے ہے، تب ہو سکتا ہے کہ خاوند اس کی رائے پر غالب رہے۔ اور خواہ مخواہ وہ اس چیز کو پسند کرے، جس کی خوبی اس عورت کے سامنے لوگ بیان کریں۔ لیکن جب وہ ان سے بالکل جدا ہوگئی اور زمانہ کی سردی و گرمی کا مزہ چکھ لیا اور اس کے بعد اس شخص سے راضی ہوگئی، تو وہ رضامندی فی الواقع رضامندی ہے۔ اور نیز اس میں مفارقت کا مزہ چکھانا اور بلا کسی ضروری مصلحت کے معلوم کئے خواہش نفسانی کے تابع ہونے کا عذاب دینا ہے۔ اور نیز اس میں مطلقہ ثلاثہ کا ان کی آنکھوں میں عزت دینا ہے اور اس بات کا جتانا ہے کہ تین طلاقوں پر وہی شخص دلیری کر سکتا ہے، جو بغیر ذلت اور حد سے زیادہ بے عزتی کے بعد اپنے نفس کو اس کی جانب سے امید کے قطع کرنے پر قائم کرے۔

طلاق رجعی کا دو تک محدود ہونے کی وجہ

اہل جاہلیت جس قدر چاہتے تھے طلاقیں دینے کے بعد رجوع کر لیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس میں عورت پر بے حد ظلم تھا۔ لہٰذا آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۔ یعنی طلاق دو بار ہے، جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ پھر اگر تیسری طلاق دے دے، تو اس کے بعد جب تک وہ عورت برضائے خود کسی اور خاوند سے نکاح نہ کر لے پہلے کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے ساتھ صحبت کرنے کی بھی شرط لگائی ہے۔ اور اس جگہ ہماری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ وہ

عورت حلالہ کی غرض سے دوسرے سے نکاح کرے گی، بلکہ خانہ آبادی کی غرض سے۔

تین طلاق دینے اور نکاح ثانی کے بعد پہلے مرد پر اس عورت کے حلال ہونیکی وجہ

یہ سوال حضرت ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ پر وارد ہوا تھا۔ اس پر جو جواب آپ نے اپنی کتاب **اعلام الموقعین عن رب العالمین** میں درج فرمایا ہے۔ ہم اسکا یہاں پر ترجمہ لکھ دیتے ہیں۔

تین طلاقوں کے بعد مرد پر عورت کے حرام ہونے اور دوسرے نکاح کے بعد پہلے مرد کے لئے جائز ہونے کی حکمت کو وہی جانتا ہے، جس کو اسرار شریعت اور مصالحہ کلیہ الٰہیہ سے واقفیت ہو۔ لہٰذا واضح ہو کہ عورت کا حلال ہونا مرد سے روکنے اور منع کے بعد خدا تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتوں اور بڑے احسانات میں سے ہے۔ تو اس نعمت کا شکر اور اس کے حقوق کی رعایت اور اس کو زائل نہ کرنا اس پر واجب ہوا۔ اور اس امر میں شریعتیں بحسب مصالح ہر زمانہ وامت کے لئے مختلف رہی ہیں۔ شریعت توریت نے طلاق کے بعد، جب تک عورت دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے، پہلے مرد کا رجوع اس کے ساتھ جائز رکھا تھا۔ اور جب وہ دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی، تو پہلے شخص کو اس عورت سے کسی صورت میں رجوع جائز نہ تھا۔ اس امر میں جو حکمت مصلحت الٰہی ہے وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ جب مرد جانتا تھا کہ میں نے عورت کو طلاق دیدی، تو اس کا اختیار اپنا ہو جائیگا۔ اور اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا بھی جائز ہے اور یہ کہ جب اس نے دوسرا نکاح کر لیا، تو مجھ پر ہمیشہ کے لئے یہ عورت حرام ہو جائے گی۔ تو ان امور خاصہ کے تصور سے مرد کا عورت سے تعلق وتمسک پختہ ہوتا تھا اور عورت کی جدائی کو ناگوار جانتا تھا۔ شریعت توریت بحسب حال مزاج امت موسوی نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ تشدد اور غصہ اور اس پر اصرار کرنا ان میں بہت تھا۔ پھر شریعت انجیلی آئی تو اس نے نکاح کے بعد طلاق کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ جب مرد کسی عورت سے نکاح کر لیتا تھا، تو اس کے لئے عورت کو طلاق دینا ہرگز جائز نہ تھا۔

پھر شریعت محمدؐیہ آسمان سے نازل ہوئی جو کہ سب شریعتوں سے اکمل وافضل واعلیٰ اور پختہ تر ہے۔ اور انسانوں کے مصالح معاش ومعاد کے مناسب اور عقل کے موافق ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس امت کا دین کامل کیا اور ان پر اپنی نعمت پوری کی اور طیبات میں سے اس امت کے لئے وہ چیزیں حلال ٹھہرائی ہیں، جو کسی امت کے لئے حلال نہیں ہوئی تھی۔ اور مرد کے لئے جائز ہوا کہ بحسب ضرورت چار عورتوں تک سے نکاح کر لے۔ پھر اگر مرد وبیوی میں نہ بن سکے، تو مرد کو اجازت دی کہ اس کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کر لے۔ کیونکہ جبکہ پہلی عورت موافق طبع نہ ہو یا اس سے کوئی فساد واقع ہو اور وہ اس سے باز نہ آئے، تو شریعت اسلامیہ نے ایسی عورت کو مرد کے ہاتھ و پاؤں وگردن کی زنجیر بنا کر

جکڑنا اوراس کی پیٹھ توڑنے کا بوجھ بنانا نہیں ٹھہرایا اور نہ اس دنیا میں مرد کے ساتھ ایسی عورت کو رکھ کراس کو دوزخ بنانا چاہا ہے۔

زن بد در سرائے مرد نکو دوزخ اوست ہمدریں سرائے او

لہٰذا خدا نے ایسی عورت کی جدائی مشروع فرمائی ہے اور وہ جدائی بھی اس طرح مشروع فرمائی کہ مرد عورت کو ایک طلاق دے، پھر عورتیں طہر یا تین ماہ تک اس مرد کے رجوع کا انتظار کرے، تا کہ اگر عورت سدھر جائے اور شرارت سے باز آ جائے اور مرد کو اس عورت کی خواہش ہو، یعنی خدائے مصرف القلوب عورت کی طرف مرد کے دل کو راغب کر دے، تو مرد کو عورت کی طرف رجوع ممکن ہو سکے اور مرد کیلئے رجوع کرنے کا دروازہ مفتوح رہے، تا کہ مرد عورت سے رجوع کر سکے اور جس امر کو غصہ و شیطانی جوش نے اس کے ہاتھ سے نکال دیا تھا، اس کو مل سکے۔ پھر بھی جانبین کے طبعی غلبات و شیطانی چھیڑ چھاڑ کا اعادہ ممکن تھا، اس لئے دوسری طلاق مدت مذکورہ کے اندر مشروع ہوئی۔ تا کہ عورت بار بار کی طلاق کی تلخی کا ذائقہ چکھ کر اور خرابی خانہ کو دیکھ کر امورات قبیحہ کا اعادہ نہ کرے، جن سے اسکے خاوند کو غصہ آئے اور اس کیلئے جدائی کا باعث ہو۔ اور مرد بھی عورت کی جدائی محسوس کر کے عورت کو طلاق نہ دے۔

اور جب تیسری طلاق کی نوبت آ پہنچے، تو اب یہ وہ طلاق ہے کہ جس کے بعد خدا کا یہ حکم ہے کہ اس مرد کا رجوع اس عورت مطلقہ ثلاثہ سے نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جانبین کو کہا جائے کہ پہلی اور دوسری طلاق تک تمہارا رجوع آپس میں ممکن تھا، اب تیسری طلاق کے بعد رجوع نہ ہو سکے گا، تو اس سے وہ سدھر جائیں گے۔ جب مرد کو یہ تصور ہوگا کہ تیسری طلاق اس کے درمیان اور اس کی بیوی کے درمیان بالکل جدائی ڈالنے والی ہے، تو وہ طلاق دینے سے باز رہے گا۔ کیونکہ جب اس کو اس بات کا علم ہوگا کہ اب تیسری طلاق کے بعد یہ عورت مجھ پر شخص ثانی کے شرعی معروف و مشہور نکاح اور اس کی طلاق کی عدت کے سوا حلال نہ ہو سکے گی۔ اور پھر دوسرے شخص کے نکاح سے عورت کا لوٹنا بھی نامعلوم ہوگا۔ اور یہ کہ جب تک دوسرا خاوند اس کے ساتھ کامل دخول نہ کر چکے اور پھر دوسرا خاوند مر جائے یا اس کو برضائے خود طلاق دے دے اور وہ عورت عدت میں رہے، تب تک وہ اس کے ساتھ رجوع نہ کر سکے گا۔ تو اس وقت مرد کو اس رجوع عورت کی ناامیدی کا خیال اور ان امورات کے محسوس کرنے سے ایک دوراندیشی پیدا ہو جائے گی اور وہ خدا تعالیٰ کے ناپسندترین امر حلال یعنی طلاق دینے سے باز رہے گا اور مرد و عورت کو عدم رجوع کی واقفیت ہوگی، تو آپس میں انکی اصلاح ہو سکے گی۔

اور نکاح ثانی کے متعلق نبی علیہ السلام نے اس طرح کی تاکید فرمائی کہ وہ نکاح مدام کے لئے

ہو۔ اگر دوسرا شخص اس عورت سے اپنے پاس مدامی طور پر رکھنے کے ارادہ سے نکاح نہ کرے، بلکہ حلالہ کے لئے نکاح کرے، تو آنحضرتؐ نے اس شخص پر لعنت فرمائی۔ اور جب پہلا شخص اس قسم کے حلالہ سے اس عورت کو اپنی طرف لوٹائے، تو اس پر بھی لعنت فرمائی۔ **عن ابن عباس لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المحلل و المحلل له** ۔ترجمہ۔ یعنی رسول خداؐ نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت فرمائی۔ شرعی حلالہ وہ ہے کہ ازخود ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ جس طرح پہلے خاوند نے عورت کو طلاق دی تھی، اسی طرح دوسرا بھی طلاق دے یا مر جائے، تو عورت کا رجوع بعد عدت پہلے خاوند کی طرف ممکن ہے۔

اتنی سخت رکاوٹوں کے بعد عورت کا پہلے خاوند کی طرف رجوع مشروع ہونے کی وجہ بیان مذکور سے ظاہر و باہر ہے کہ اس میں عزت و عظمت امر نکاح و شکر نعمت الٰہی، اور اس کا دوام و عدم جدائی ملحوظ ہے۔ کیوں کہ جب خاوند کو عورت کی جدائی سے اس کے وصل ثانی تک اتنی رکاوٹیں درمیان میں حائل ہونے والی متصور ہوں گی، تو وہ تیسری طلاق تک نوبت نہیں پہنچائے گا۔

"ان الشارع حرمها عليه حتى تنكح زوجاً غيره عقوبة له و لعن المحلل و المحلل له لمناقضتهما ما قصده الله سبحانه من عقوبته و كان من تمام هذه العقوبة ان طول مدة تحريمها عليه فكان ذٰلک ابلغ فيما قصده الشارع من العقوبة فانه اذا علم انها لا تحل له حتى تعتد بثلاثة قروء ثم يتزوجها آخر نكاح رغبة مقصود لا تحليل موجب للعنة و يفارقها و تعتدمن فراقه ثلاثه قروء آخر طال عليه الانتظار وعيل صبره فامسک عن الطلاق الثلاث و هذا واقع على وفق الحكمة و المصلحة والزجر فكان التربص بثلاثة وقروء فى الرجعة نظرا للزوج و مراعاة لمصلحته لما لم يوقع الثالثه المحرمة لها عليه و ههنا كان تربصها عقوبة له و زجر ا لما وقع الطلاق الحرم لما احل الله له و اكدت هذه العقوبة بتحريمها عليه الا بعد زوج و اصابة و تربص ثانٍ" ۔

ایلاء کی مدت چار ماہ مقرر ہونے کی وجہ

خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَاؤُا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ. فَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ** ۔ترجمہ۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے جدا ہونے کے لئے قسم کھا لیتے ہیں، وہ طلاق دینے میں جلدی نہ کریں بلکہ چار مہینے انتظار کریں۔ سوا گر وہ

اس عرصہ میں اپنے ارادے سے باز آ جائیں، تو خدا تعالیٰ کو غفور و رحیم پائیں گے۔ اور اگر طلاق دینے پر پختہ ارادہ کرلیں، تو یاد رکھیں کہ خدا سننے اور جاننے والا ہے۔ ایلاء کے معنے قسم و سوگند کھانے کے ہیں۔

اہل جاہلیت اس بات کا حلف یعنی قسم اٹھایا کرتے تھے کہ اپنی بیویوں سے کبھی یا ایک مدت دراز تک جدا رہیں گے۔ اس میں عورتوں پر نہایت ظلم اور ضرر تھا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے چار مہینے سے زیادہ مدت ایلاء منع فرمائی۔ ایلاء کی مدت چار ماہ مقرر ہونے میں بہت سے راز ہیں۔ از انجملہ چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس مدت کے معین کرنے کی یہ وجہ ہے کہ اتنی مدت میں خواہ مخواہ نفس کو جماع کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر انسان ماؤف نہ ہو، تو اس کے چھوڑنے سے ضرر پہنچتا ہے۔

۲۔ یہ مدت سال کا ایک ثلث حصہ ہے اور نصف سے کم کا انضباط ثلث کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور نصف مدت کثیرہ شمار کیا جاتا ہے۔

۳۔ اگر ایلاء کی مدت زیادہ ہوتی، تو مرد لاپرواہ ہو کر عورت کے نان و نفقہ کو ٹال دیتا اور یہ امر عورت کے لئے سخت مضر ہے کہ وہ کہاں سے کھاتی اور کہاں سے پہنتی اور کہاں پر رہتی۔

۴۔ اغلب ہے کہ ابتدائے ایلاء یعنی اس سے پہلے مرد نے عورت سے جماع کیا ہو، جس سے احتمال حمل ہوسکتا ہے۔ اندریں صورت برات رحم چار ماہ میں بالکمل وجوہ معلوم ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متوفی عنہا زوجہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر ہوئی ہے۔ کیونکہ چار ماہ شناخت حمل کے لئے اور دس دن سوگ خاوند کے لئے ہیں۔ چونکہ ان ہر دو صورتوں میں عورت کو مرد سے جدائی رہتی ہے، تو اس مدت میں بالکمل وجہ اور پورے طور سے ہر کسی کو شناخت حمل ہوسکتا ہے۔ اگر حمل معلوم ہوا اور اندریں صورت بھی مرد کا طلاق دینے کا ارادہ مصمم ہو تو عدت وضع حمل تک ہے۔

۵۔ خدا نہیں چاہتا کہ عورت کو اپنے خاوند سے چار ماہ سے زیادہ جدا رکھا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ ایلاء سے پہلے مرد نے عورت سے جماع کیا ہو اور رجوع کے بعد حمل محسوس ہو، تو مرد عورت کی غور و پرداخت کرے۔ اور اس کو دلاسا دے کر راضی کرلے۔ کیونکہ چار ماہ کا اختتام کا زمانہ جنین میں نفخ روح کا زمانہ ہے۔ پس اگر عورت پر اس زمانہ میں کوئی غم و ہم نہ ہو اور خوش ہو تو بچہ خوش خلق ہوگا اور صحیح و تندرست پیدا ہوگا۔ ورنہ بدخلقی و بداطواری اور کئی عوارض کا نفخ بھی اس کے ساتھ ہی بچہ میں ہوگا، جو بعد پیدائش اس میں نمایاں ہوں گے۔

۶۔ چار ماہ کے رجوع کے بعد اگر حمل محسوس ہو، تو جماع سے کنارہ اور عورت سے مدارا چاہئے اور اس کو خوش رکھنا لازم ہے، ورنہ صحبت جائز ہے تاکہ آئندہ صورت قرار حمل ہو اور تعطل لازم نہ آئے،

کیونکہ خدا تعالیٰ کو یہی امر منظور ہے اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی کثرت اولاد پر فخر ہے۔ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَاِنِّی مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ۔

۷۔ خدا تعالیٰ جو دانائے رازنہاں وآشکارا ہے۔ ایلاء کی مدت چار ماہ مقرر کرنے میں اس نے بغرض رعایت عورت یہ راز رکھا ہے کہ بالعموم فطرتی طور پر تندرست جوان عورت کو چار ماہ سے زیادہ اپنے مرد کی جدائی گراں و ناگوار گذرتی ہے۔ اور وہ غالبًا اس مدت تک پھر اپنے مرد سے وصال چاہتی ہے۔ چنانچہ حضرت جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ "تاریخ الخلفاء" میں لکھتے ہیں۔ اخرج ابن جریح قال اخبرنی مَنْ اُصَدِّقُه، ان عمرؓ بینما هو یطوف سمع امراۃً تقول شعراً

تطاول هذا الیل و اسود جانبه و ارقنی ان لا خلیل اُلاعبُه

فلو لا حذار الله لا شئی مثله لزعزع من هذا السریر جوانبه

فقال عمر و مالکِ قالت اغزیت زوجی منذ اشهر و قد اشتقت الیه. قال آرُدتِّ سواً. قالت معاذ الله قال فاملکی علیک نفسک فانما هو البرید الیه فبعث الیه ثم دخل علیٰ حفصه فقال انی سائلک عن امر قد اهمنی فافرجیه عنی. کم تشاق المراۃ الی زوجها فخفضت راسها و استحیت قال فان الله لا یستحیی من الحق فاشارت بدها ثلاثة اشهر و الاربعة اشهر فکتب عمر ان لا تحبس الجیوش فوق اربعة اشهر ۔ ترجمہ۔ یعنی ابن جریح کہتا ہے۔ مجھے خبر دی اس شخص نے جس کی بات کو میں سچ جانتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ ایک رات مدینہ منورہ کی گلیوں میں اپنی خلافت کے زمانہ میں بپاس خاطر رعیت گشت کر رہے تھے۔ کہ سنا ایک عورت شعر ذیل پڑھتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے۔ یہ ظالم رات دراز ہوگئی اور اس کے اطراف سخت تاریک وسیاہ ہوگئے ہیں اور مجھے اس خیال نے بیدار کر دیا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ملاعبت کروں یعنی کھیلوں و جماع کروں۔ اگر مجھے خدائے بے مثل و بے مانند کا ڈر نہ ہوتا، تو میری اس چارپائی کی طرفیں ہلائی جاتیں۔ پس حضرت عمر نے اس عورت کو آواز دے کر کہا کہ تو کیا چاہتی ہے۔ اس عورت نے کہا کہ آپ نے میرے خاوند کو کئی ماہ سے غزا پر بھیجا ہوا ہے اور اب مجھے اپنے خاوند کے ملنے کا اشتیاق ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کیا بدخیال رکھتی ہے۔ اس عورت نے کہا، خدا کی پناہ میرا خیال بدنہیں ہے۔ پس حضرت عمر نے اس کو فرمایا کہ تو اپنے آپ کو ضبط میں رکھ ابھی تیرے خاوند کو بلانے کے لئے قاصد روانہ کیا جائیگا۔ پس حضرت عمر نے اس کے خاوند کو بلانے کے لئے قاصد کو روانہ کر دیا کہ گھر آجائے۔ پھر حضرت بی بی حفصہ کے پاس گئے اور حفصہ کو کہا کہ

میں تجھ سے ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔اس کا جواب دے کر میرے غم کا بوجھ ہلکا کر دے۔وہ یہ ہے کہ کتنی مدت کے بعد عورت کو اپنے خاوند کے وصال کا شوق پیدا ہوتا ہے۔حفصہ نے اپنا سر نیچے کر لیا اور شرما گئی۔حضرت عمر نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ سچی بات سے نہیں شرماتا۔پس حفصہ نے اپنے ہاتھ سے تین اور پھر زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت تک کا اشارہ کیا۔یعنی مرد کو چاہئے کہ تین ورنہ چار ماہ تک ضرور اپنی عورت سے ملے۔پس حضرت عمر نے لشکروں کا افسروں کے نام خط لکھ کر روانہ کئے اور تاکید کی کہ کسی سپاہی کو چار ماہ سے زیادہ لشکر میں بند نہ رکھا جائے۔یعنی ہر سپاہی کو ہر چار ماہ کے بعد گھر کے لئے رخصت کا عام حکم نافذ فرمایا۔

ایک دوسری روایت میں بالفاظ ذیل یہ تذکرہ لکھا ہے۔ **ان عمر ابن الخطاب خرج ذات ليلة يطوف بالمدينة و كان يفعل ذالک کثيرا . اذ مره بامراة من نساء العرب مغلقا عليها بابها و هی تقول . شعرا .**

تطاول هذا اليل تسری کواکبه و ارقنی ان لا ضجيع الاعبه
فو الله لو لا الله تخشی عواقبه لزعزع من هذا لسرير جوانبه
و لکنی اخشی رقيبا مؤکلا بانفسنا لا يغتر الدهر کاتبه
محافة ر بی والحياء يصدنی و اکرم بَعُلی ان تناول مراکبه

فکتب الی عماله بالغزو ان لا يحمر احد اکثر من اربعة اشهر ۔ترجمہ۔حضرت ابن خطاب ایک رات مدینہ منورہ کے کوچوں میں گشت کرتے اور رعیت کا احوال دریافت کرتے تھے اور اکثر آپ اس طرح رات کو گشت کیا کرتے تھے، جب ایک کوچے سے گذرنے لگے اور عربی عورت کی آواز حویلی کے اندر سے آپ کو سنائی دی، جس نے حویلی کو دروازہ بند کیا ہوا مندرجہ ذیل شعر گا رہی تھی۔ یہ رات لمبی ہوگئی اور ستارے آسمان میں چکر لگا رہے ہیں اور اس رات میں مجھے اس خیال نے بیدار کر دیا ہے کہ میرے ساتھ کوئی سونے والا نہیں، جس کے ساتھ میں ملاعبت کروں۔خدا کی قسم اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا اور بدی کے انجام کا خطرہ نہ ہوتا، تو میری اس چارپائی کی طرفیں ہلائی جاتیں۔لیکن میں اپنے رقیب موکل یعنی خدائے حافظ ونگہبان وحاضر وناظر سے ڈرتی ہوں، کیونکہ وہ ہماری جانوں پر ہر وقت حاظر وناظر ہے۔خدا کا خوف وشرم مجھے بدی سے روکتے ہیں۔میرا خاوند بہت باعزت آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی سواری پر کوئی اور شخص سوار ہو۔پس حضرت عمر نے غزا میں گئے ہوئے سرداروں وافسروں کو لکھا کہ کسی سپاہی کو لشکر میں چار ماہ سے زیادہ نہ روکا جائے۔

مفقود الخبر کی زوجہ کی عدت چار سال چار ماہ و دس دن مقرر ہونیکی وجہ

جوعورت کسی شخص کے نکاح میں بندھی ہو، اس کے تمام حوائج اور نفقات کی تکمیل خاوند کے ذمہ ہوتی ہے۔ پس جب اس عورت کا خاوند گم ہوجائے اور کئی سال تک مفقود الخبر رہے، تو اس عورت کی ذات پر خاوند کے گم ہوجانے کے سبب سخت مشکلات پڑتی ہیں اور بسا اوقات اس کی حالت اضطرار تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس عورت کو خاوند کی خبر کے آ جانے تک صبر کرنا چاہئے، تو اس حالت میں وہ عورت نہ تو بیوہ ہوتی ہے اور نہ ہی خاوند والی۔ اور یہ بات بالکل خلاف قیاس و عقل و نقیض شرع اسلام ہے کہ عورت کو ایسی حالت پر مجبور کیا جائے اور وہ ساری زندگی اسی طرح گذار دے۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوسکتا ہے کہ پہلے یہ سوال کیا جائے کہ آیا ایسی عورت، جس کا خاوند مفقود الخبر ہوا اور اس کی مفقود الخبری کی مدت ابتدائی عدد جمع قلّت سے متجاوز ہوجائے، تو کیا وہ مصیبت زدہ و مبتلائے بلا ہے یا نہیں؟ پس جواب یہ ہوگا کہ بے شک ایسی عورت سخت مصیبت زدہ و مبتلائے بلا ہے اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنا اور اسکی امداد واجب و لازم ہے۔

جب کہ امداد کرنی لازم ہے تو اس کی ہمدردی و امداد اس طریق سے کی جانی چاہئے جو خدا تعالیٰ کا پسندیدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ چار سال تک اس عورت کے خاوند کی جستجو کی جائے اور وہ عورت اتنی مدت تک اپنے زوج مفقود الخبر کا انتظار کرے۔ پس اگر وہ چار سال تک متواتر مفقود الخبر رہے، تو وہ عورت اس مدت کے بعد اگر چاہے، تو چار ماہ دس دن عدت میں رہ کر حسب فتویٰ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے شخص سے نکاح کرسکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فتویٰ مطابق حکم و رضائے الٰہی ہے، جو واجب التعمیل ہے اور اس سے تجاوز منشاء الٰہی کے برخلاف ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ** ۔ترجمہ۔یعنی سبقت کرنے والے اسلام لانے میں اور پہلے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ لوگ، جنہوں نے ان کی پیروی کی، خدا تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کی پیروی کرنے والوں پر اپنی رضا ظاہر کی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مہاجرین میں سے تھے۔ پس ان کے اس فتویٰ میں ان کی پیروی کرنی رضائے الٰہی کے موافق ہے اور اس سے تجاوز خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

مؤلف کے نزدیک اہل ضرورت کو لازم ہے کہ اگر کسی کو ایسا واقع پیش آجائے، تو فسخ نکاح اول و اجازت نکاح ثانی کی منظوری حاکم وقت سے بھی حاصل کرلیں۔ تا کہ آئندہ فساد نہ ہو۔

ا۔ قانون تشریعی و قانون قدرت اس امر کے مقتضی ہیں کہ مفقود الخبر شخص کی زوجہ پر نکاح ثانی کرنے کے لئے بالضرور کوئی ایسی مدت مقرر ہونی چاہیئے، جس سے زوج اول کے حقوق ضائع نہ ہوں اور نہ ایسی دراز مدت ہو، جس کو سن کر بیچاری مصیبت زدہ عورت کی مصیبت اور بھی زیادہ ہو اور وہ زندہ درگور کی طرح ہو جائے۔ بلکہ ایسی مدت ہو، جس میں حتی الامکان حقوق جانبین محفوظ رہنے کا قوی مظنہ ہو اور جس کی امید پر مفقود الخبر کی زوجہ اپنے آپ کو سہارا دے رکھے اور اس کی مصیبت کم ہو۔ سو اس امر کے لئے چار سال کا عدد قلت و کثرت دونوں طرفوں کے بیچ میں ہے۔ اس سے زیادہ معیاد کا مقرر کرنا گویا اس عورت کی مصیبت کو زیادہ کرنا اور اس کو نا امید بنانا ہے۔ **وَ اِنَّہ' لَا یَائِیَسُ مِنْ رُوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ**۔ ترجمہ۔ اور خدا تعالیٰ کی روح سے نا امید نہیں ہوتے، سوائے کافر قوم کے۔

اس سے زیادہ میعاد کے مقرر کرنے میں یہ نقص شرعی و فطرتی لازم آتا ہے کہ جس امر کے لئے خداوند کریم نے عورت کی فطرت و سرشت بنائی ہے، اس کو بیکار و معطل ٹھہرانا پڑتا ہے۔ اور یہ امر خداوند تعالیٰ کو ہرگز منظور نہیں ہے۔ اور شریعت اسلامیہ میں ہرگز جائز نہیں ہے کہ انسانی نسل کو کسی جائز بلکہ اس کے واجب التعمیل امر سے تادم زیست کسی ایسے انسان کی خاطر روک دیا جائے، جس کی زندگی و موت کی کوئی خبر نہیں ہے۔ کیا خدا تعالیٰ نے عورت کو عبث پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ فرماتا ہے۔ **اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاکُمْ عَبَثاً وَ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ**۔ ترجمہ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آ ؤ گے۔

اب ہم اس امر کے متعلق محققین سلف کی تحقیقات اور علمائے زمانہ موجودہ کے فتوے درج کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے مفقود الخبر کی زوجہ کے متعلق جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہی ٹھیک ہے۔ **قد ثبت عن عمر ابن الخطاب انه اجل امراته اربع سنين و امرها ان تتزوج فقدم المفقود بعد ذالک فخيره عمر بين امراته و بين مهرها**۔ ترجمہ۔ حضرت عمر بن خطاب سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے مفقود الخبر کی زوجہ کو چار سال کی مہلت دی۔ بعد ازاں اس کو امر کیا کہ دوسرے شخص سے نکاح کر لے۔ اس کے بعد اگر مفقود الخبر آیا، تو اس کو اختیار دیا کہ چاہے تو اپنی عورت واپس لے لے یا اس عورت کا مہر زوج ثانی سے وصول کر لے۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔ **من خالف عمر لم يهتد ما اهتدىٰ اليه عمر و لم يكن له من الخبرة بالقياس الصحيح مثل خبرة عمر**۔ ترجمہ۔ یعنی جس نے حضرت عمر کی مخالفت کی وہ حضرت عمر کی طرح صحیح رائے پر قائم نہ ہو سکے گا اور اس کو حضرت عمر کے صحیح قیاس کی مثل اور کوئی صحیح علم نہ

ملے گا۔

مؤلف "اعلام الموقعین" لکھتے ہیں۔ **المفقود المنقطع خبره ان قيل امراته تبقى الى ان يعلم خبره بقيت لا ايما ولاذات زوج الى ان تبقى من القواعد او تموت والشريعة لا تاتى بمثل هذا فلما اجل اربع سنين و لم يكشف خبره حكم بموته ظاهراً. مسئلة المفقود هى مما يقف فيها تفريق الامام على اذن الزوج اذا جاء كما يقف تصرف الملتقط على اذن المالک اذا جاء من قال انها تعاد الى الاول بكل حال او تكون مع الثانى بكل حال فكلا القولين خطاء اذ كيف تعاد الى الاول و هو لا يختار ها و لا يريدها و قد فرق بينه و بينها سائغا فى الشرع و اجاز هو ذالک التفريق فانه و ان تبين للامام بخلاف ما اعتقده فالحق فى ذالک للزوج فاذا جاز ما فعله الامام زال المحذور و اما كونها زوجة الثانى بكل حال مع ظهور زوجها و تبين ان الامر بخلاف ما فعل الامام فهو خطاء ايضا فانه مسلم لم يفارق امراته و انما فرق بينهما بسبب ظهرانه لم يكن كذالک و هو يطالب امراته فكيف يحال بينه و بينها و هو لو طلب ما له او بدله رد اليه فكيف لا ترد اليه امراته و اهله اعز عليه من ما له** ۔ترجمہ۔گم شدہ شخص، جس کی خبر منقطع ہو، کے بارے میں اگر کہا جائے کہ اس کی عورت خبر آنے تک بیٹھی رہے، تو اس صورت میں وہ عورت نہ بیوہ ہوگی اور نہ خاوند والی قرار دی جاسکے گی، یہاں تک کہ وہ آیسہ ہوجائے یا مرجائے۔ اور شریعت اسلامیہ میں ایسی بات نہیں پائی جاتی۔ اگر چار سال کی مہلت دی جائے اور اس عرصے میں کچھ پتا نہ چلے، تو بظاہر اس کو وفات یافتہ سمجھا جائے۔ مفقود الخبر کا مسئلہ ایسا ہے جس میں امام کا زوجہ کو اس کے خاوند سے جدا کرنا خاوند کی واپسی پر اس کے اذن و اجازت پر موقوف ہے، جیسا کہ ملی ہوئی گمشدہ چیز پر تصرف اس کے اصلی مالک کی واپسی پر اس کی اجازت پر موقوف ہے۔

جو شخص کہتا ہے کہ مفقود الخبر کی زوجہ کو بہر حال نکاح ثانی کے بعد پہلے خاوند کی طرف لوٹا دیا جائے یا یہ کہ وہ بہر حال دوسرے خاوند کے ساتھ رہے، تو یہ دونوں قول درست نہیں ہیں۔ عورت کو پہلے خاوند کی طرف کیونکہ لوٹایا جائے اگر وہ اس کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہو اور نہ اس کو چاہتا ہو۔ بداں حال کہ شرعی جدائی ان دونوں میں ہوچکی ہو اور خاوند نے اس جدائی کو تسلیم کرلیا ہو۔ البتہ اگر امام کے علم میں آجائے کہ معاملہ الٹ ہے، تو پھر خاوند کو حق حاصل ہے۔ لیکن اگر خاوند امام کی ایما شدہ جدائی کو تسلیم کرلے، تو پھر بات ٹل جاتی ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ اسے ہر حال میں دوسرے شخص کی

زوجہ قرار دیا جائے باوجود اس امر کے کہ اس کا پہلا خاوند آ چکا ہو اور یہ بات کھل چکی ہو کہ اس کی رائے جدائی کے برخلاف ہے۔ پس یہ چیز بھی ایک خطا ہے، کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس نے اپنی عورت سے علیحدگی اختیار نہیں کی اور ان کی جدائی اس کی پیٹھ پیچھے قرار پائی۔ جب کہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنی عورت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس کیسے اس کے اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈالی جاسکتی ہے۔ اگر وہ اپنا گمشدہ مال یا اس کا بدل مانگے، تو وہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کی عورت اس کو واپس نہ دی جائے، جبکہ عورت مال سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے۔

مفقود الخبر کے متعلق انجمن مستشار العلماء لاہور کا فتویٰ

اب ہم اس امر میں اپنے استفتاء پر مختلف اذواق کے علماء کے فتوے درج کرتے ہیں۔

سوال۔ **یا علماء الاسلام و فضلائے امة خیر الانام ما تفتون فی عدة امراة فقدت زوجها. بینوا بالبینات توجروا بالحسنات و افتوا بالادلة القویة و البراهین القطعیة۔** (ترجمہ۔ اے علماء اسلام وفضلائے امت خیر الانام کیا فتویٰ دیتے ہیں آپ ایک عورت کی عدت کے بارے میں جس کا خاوند مفقود الخبر ہو۔ کھلے دلائل سے واضح کریں اور نیکیوں کا انعام پائیں۔ اور قوی دلائل اور قطعی براہین کے ساتھ فتویٰ دیں)۔

الجواب۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک ایسی عورت کو اپنے نکاح کرنے میں اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے، جب تک کہ اس کے مفقود شوہر کے ہم عمر اشخاص عموماً وفات پا جائیں۔ علمائے احناف نے امام ممدوح کے اس قول کی تشریح میں مختلف اقوال فرمائے۔ بعضوں نے فرمایا ہے کہ اس مفقود کی نوے (۹۰) برس کی عمر ہو جانے تک اس کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ بعضوں نے اس کی ایک سو بیس (۱۲۰) اور بعضوں نے ایک سو بیس برس کی عمر ہو جانے تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ احناف متاخرین نے فرمایا ہے کہ کم سے کم اس مفقود کی ساٹھ برس (۶۰) کی عمر ہو جانے کا انتظار کرے۔ شیخ ابن ہمام نے ستر برس (۷۰) کی عمر ہو جانے تک انتظار کرنے تجویز فرمایا ہے۔

امام مالک نے فرمایا ہے کہ شوہر کے مفقود الخبر ہونے کے بعد سے چار برس گذر جانے پر قاضی یا مجسٹریٹ کو چاہئے کہ درخواست گذرنے پر اس مفقود شوہر سے اس کی عورت کو علیحدہ ہو جانیکا حکم دیدے اور اس حکم سے چار ماہ دس دن گذر جانے کے بعد شرعاً جہاں چاہئے وہ عورت اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ اور اس کے بعد اگر پہلا شوہر آ بھی جائے، تو پھر وہ عورت اس کو نہیں مل سکتی۔ **و لا یفرق بینه و بین عرسه. قال مالک رحمة الله علیه اذا مضیٰ اربع سنین یفرق القاضی بینهما ان طلبت**

ثم تعتد عدة الوفاة فلها التزوج بزوج آخر. فان عاد الزوج لا سبيل له عليها. و هكذا روی قضاء عمر رضی الله عنه فی من استهواه الجن فی المدینة. ابو المکارم شرح مختصر الوقایة جلد ۳. ص ۱۹۴. و هو ای المفقود حی فی حق نفسه بالاستصحاب حتی لا تنکح امرا ته و قال مالک و الشافعیؒ فی قول اذا مضیٰ اربع سنین یفرق القاضی بینهما ان طلبت ثم تعتد عدة الوفاة فلها التزوج بزوج آخر فان عاد الزوج لا سبیل له علیها و هکذا روی قضا عمر رضی الله تعالیٰ عنه فی الذی استهواه الجن. مجمع الانهر شرح ملتقی الابحر جلد اول ۷۲۰۔ علمائے احناف نے ضرورت کے موقعوں پر برخلاف اپنے مذہب کے امام مالک وغیرہ آئمہ اہل سنت کے مذہب پر فتویٰ دینا درست فرمایا ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں۔ قال القهستانی و فیه ایماء الی ان له ان یاخذ من خلاف جنسه عبد المجنانسة فی المالیة و هذا اوسع فیجوز الاخذ به و ان لم یکن مذهبنا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة کما فی الزاهدی. رد المختار جلد ۳. ص ۳۸۱. قلت هذا اقل ما قیل فیه عندنا فیما رایت. نعم مذهب مالکؒ والقدیم من مذهب الشافعی تقدیره باربع سنین لا کن فی حق عرسه لا غیر فتنکح بعد ها کما فی النظم فلو افتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علیٰ ما اظن کما فی القهستانی. الدر المنتقیٰ شرح الملتقیٰ. جلد اول ۷۲۱.

پس عورت مندرجہ سوال کی حالت اگر فی الواقع قابل رحم ہے تو ہماری رائے میں شرعاً حسب مذہب امام مالکؒ جو امام شافعیؒ سے بھی منقول ہے حاکم وقت کی اجازت کے بعد چار ماہ دس دن گذر جانے کے پیچھے شرعاً جہاں چاہے وہ عورت اپنا نکاح کر سکتی ہے اور ایسا کرنے میں اس پر کوئی شرعی مؤاخذہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبه العبد المذنب المفتی محمد عبد الله ٹونکی

الجواب صحیح. فضل حق عفی عنه

هذا الجواب للضرورة المذکورة انسب. محمد یار عفی عنه امام مسجد طلائی. لاهور

المجیب مصیب. احمد علی عفی عنه. پروفیسر اسلامیه کالج لاهور

صح الجواب. محمد حسن عفی عنه

الجواب صحیح. خاکسار اصغر علی روحی پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاهور۔

مفقود الخبر کے متعلق علامہ نورالدین صاحب کا فتویٰ

میں مفقود الخبر کے لئے وہی فتویٰ دیتا ہوں، جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ مؤطا میں موجود ہے۔ اور اگر وہ گذارہ سے تنگ ہو، تو چار برس کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں صاف لکھا ہے۔ لَاتُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا ۔ اور فرمایا کہ لَاتُضَارُّوْهُنَّ ۔ میرے نزدیک جو شخص ان آیات کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی بی بی کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کام حکام کے متعلق ہیں، ہم ہرگز مجاز نہیں۔ یہ کام حکومت کے ذمہ ہیں، اسی کے ذریعہ ہونے چاہئیں۔ والسلام۔ نورالدین

مفقود الخبر کی زوجہ وو راثت کے متعلق گورنمنٹ ہند کا قانون

میں نے مفقود الخبر کے متعلق قانونی کتب حکومت موجودہ کو بھی ملاحظہ کیا، جن سے معلوم ہوا کہ مسلمان مفقود کی زوجہ اور اس کی وراثت کے متعلق اس گورنمنٹ موجودہ کا فتویٰ بھی قریباً وہی ہے، جس پر شریعت اسلام کا فیصلہ ہوا ہے۔ دیکھو "مجموعہ نظائر شرح محمدی"۔ الہ آباد۔ مدراس۔ کلکتہ۔ بمبئی۔

دفعہ ۱۳۸ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی وارث گم ہوا ہو اور قبل انقضائے مدت مفقود الخبری کے ترکہ تقسیم کیا جائے، تو اس کا حصہ محفوظ رکھا جائیگا۔ اگر قبل انقضائے مدت مذکورہ وہ آ جائے، تو وہ حصہ اس کو دیدیا جائیگا۔ اگر نہ آیا نہ خبر معلوم ہوئی، تو دیگر ورثاء پر تقسیم ہو جائیگا۔ اگر بعد تقسیم وہ آ جائے، تو دیگر ورثاء سے اپنے حصہ لے لیگا۔ بشرطیکہ ان کے قبضہ میں ہو۔ اور جو کہ ان کے قبضہ میں باقی نہ رہا ہو، تو اس کی بابت مؤاخذہ نہ ہوگا۔

دفعہ ۱۳۹۔ شرعاً مفقود الخبری اس وقت متصور ہوگی کہ گم شدہ کی موت و زندگی کی خبر نہ معلوم ہو اور نہ یہ معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے اور اس کی پورے نوے برس کی عمر ہو چکی ہو۔ مگر قانون انگریزی میں مدت مفقود الخبری تاریخ گم شدگی سے سات برس ہے۔ ایکٹ نمبر ۱۔ ۲ ۱۸۷۲ء۔ دفعہ ۱۰۸۔

دفعہ ۱۴۰۔ مفقود الخبر کا حصہ اس وقت تک تقسیم وراثت سے محفوظ رہیگا کہ جب تک میعاد شرعی کے بموجب اس کی مفقود الخبری پوری نہ ہو جائے۔

(راقم) میعاد شرعی وہی ہے، جس پر علمائے اسلام کا فتویٰ ہے۔ (دیکھو انڈین لاء رپورٹ۔ الہ

آباد جلد ۲۔ ص ۲۲۵۔ وویکلی نوٹ الہ آباد ۱۸۸۲ء۔ صفحہ ۱۰۵۔

دفعہ ۱۴۱۔ ایک مقدمہ میں ہائیکورٹ الہ آباد نے تجویز کیا ہے کہ مقدمات متعلقہ شرع محمدی محکومہ دفعہ ۲۴۔ ایکٹ ۱۸۷۱ء سے قاعدہ مفقود الخبر ی مندرجہ دفعہ ۱۰۸ قانون شہادت میعادی ہفت سالہ متعلق ہے۔ دیکھو "انڈین لاء رپورٹ "الہ آباد جلد ۷۔ ص ۲۹۷۔ مظہر علی وغیرہ۔

مفقود الخبر کے متعلق علامہ مولوی عبدالحی مرحوم لکھنوی کا فتویٰ

ما قول اهل التحقيق ابقاهم الله تعالىٰ فى امراة المفقود هل لها التزوج باخر بعد انتظار اربع سنين و تربص اربعة اشهر و عشرة ايام علىٰ ما قضىٰ به الناطق بالحق و الصواب امير المؤمنين عمر ابن الخطابؓ و افتى به علماء المدينة الطيبه عليهم الرضوان ام لا. بينوا الحق و الصواب توجر وا يوم الحساب ۔ترجمہ۔ کیا فرماتے ہیں اہل تحقیق مفقود الخبر شخص کی عورت کے حق میں۔ آیا اس عورت کو انتظار چار سال ومہلت چار ماہ ودس دن کے بعد جائز ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کر لے۔ جیسا کہ اس امر کا فیصلہ حضرت امیر المؤمنین عمر ابن الخطابؓ نے کیا اور اسی پر علمائے مدینہ منورہ نے فتویٰ دیا۔ اظہار حق کر کے یوم الجزاء کو ثواب پاؤ۔

الجواب۔ **هو المصوب. قد اختلف فيه فى عهد الصحابة فجمعٌ من الصحابة والتابعين الى ان زوجة المفقود تنتظر حتى ياتيها خبر موت او طلاق كما فى فتح القدير. ذهب علىؓ الى انها امراته حتى ياتيها البيان . و روى عبد الرزاق عن ابن جريح قال بلغنا ان ابن مسعود وافق علياً على ان امراة المفقود تنتظر ابدا. و اخرج ابن ابى شيبه عن ابى قلابة و جابر ابن سعيد و الشعبى و النخعى كلهم قالوا ليس لها ان تتزوج حتىٰ يستبين موته. انتهىٰ. هذا هو مذهب الحنفية. و قد اختلفوا فى تقدير المدة اختلافاً فاحشا علىٰ ما يعلم من مطالعة كتبهم و اورد والتائيد مذهبهم كما فى الهداية وغيره حديثا مرفوعا ان امراة المفقود امراتة حتى ياتيها البيان. انتهىٰ. لكنه حديث لا يصح الاحتجاج بسنده فقد ذكر الذيلعى و ابن حجر فى تخريج احاديثها و العينى فى شرح الهداية انه خبر اخرجه الدارقطنى فى سننهٖ عن سوار ابن مصعب حديثا محمد ابن شرحبيل عن المغيرة ابن شعبة قال ابن ابى حاتم فى العلل سالت ابى عن حديث رواه سوار عن محمد عن المغيرة فقال ابى هذا حديث منكر و**

محمد متروک والحدیث یروی عن المغیرة مناکیر و اباطیل و ذکره عبد الحق فی احکامه من طریق الدارقطنی و علله محمد بن شرحبیل و قال انه متروک و قال ابن القطان فی کتابه سواراشهر فی المتروکین . انتهیٰ. و ذهب جمع منهم الی جواز التزوج بعد اربع سنین و تربص اربعة اشهر وعشرا اخرجه ابن ابی شیبة و عبد الرزاق و الدارقطنی و مالک فی المؤطا بطرق متعددة عن عمر ابن الخطاب . ورویٰ عبد الرزاق عن ابن عمرو ابن عباس مثله علی ما بسطه ابن حجر و الزیلعی وغیرهما و به قالت المالکیة و غیرهم و هو قوی من حیث الدلیل و اصول الحنفیة ایضاً تقضے الافتاء به فان قول الصحابی فیما لا یعقل بالرای فی حکم المرفوع عندهم فلا جرم جوز الحنفیة ایضاً الافتاء به فی موضع الضرورة کما فی جامع الرموز بعد فکر مذهب مالک فلو افتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علیٰ ما اظن. و ذکر ابن وهبان فی منظوماته انه لو افتی به فی موضع الضرورة یجوز. انتهیٰ. و مثله فی رد المختار و غیره. واللہ اعلم. هذا مختصر الکلام والتفصیل یستدعی بسطاً بسیطاً فی المرام و خیر الکلام ما قل و دل.

حرره الراجی عفو ربه القوی ابو الحسنات محمد عبد الحی لکهنوی

اسی کتاب کے صفحہ ۴۸۷ پر مولوی عبدالحی صاحب لکھتے ہیں۔"مسئلہ مفقود الخبر میں حنفیہ کے نزدیک عندالضرورت بتقلید مالک وشافعیہ بعد چار برس کے نکاح ثانی کردینا درست ہے۔ جامع الرموز میں ہے۔ قال مالک و الاوزاعی الی اربع سنین فینکح عرسه بعدها کما فی النظم فلو افتی فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علی ما اظن۔انتهیٰ۔اوررد المختار میں ہے۔ذکر ابن وهبان فی منظومه انه لوافتی بقول مالک فی موضع الضرورة یجوز ۔ انتهیٰ۔اورامام مالک کے نزدیک بعد گذر جانے چار برس کے عدت وفات لازم ہے۔اس کے بعد نکاح جائز ہے۔ بعداس کے اگر زوج اول آجائے،اس کو کچھ حق نہ ہوگا اگر ثانی نے صحبت کی ہو۔مؤطا وشرح زرکانی میں ہے۔مالک عن یحییٰ بن سعید ان عمر ابن الخطاب قال ایما امراة فقدت زوجها فلم یدر این هو فانها تنتظر ثم تعتد اربعة اشهر و عشرا ثم تحل للازدواج. و روی نهو ه عن علی عثمان مالک و ان تزوجت بعد انقضاء عدتها فدخل بها زوجها او لم یدخل بها فلا سبیل لزوجها الاول الیها اذا جاء او شک انه

حتیّ لان الحاکم اباح للمراۃ التزوج مع امکان حیاتہ قال مالک و ذالک الامر عندنا فالعقد بمجردہ یفتیھا ثم رجع مالک من ھذا قبل موتہ بعامٍ و قال لا یفتیھا علی الاول الا بدخول الثانی غیر عالم بحیاتہ و اخرجہ ابن القاسم و اشھب و قال فی الکافی ھو الاصح من طریق الاثر لانھا مسئلۃ قلدنا فیھا عمرؓ۔انتھیٰ۔

پس حنفیہ بھی اسی کے موافق فتویٰ دے سکتے ہیں۔کوئی ضرورت تفریق قاضی وحاکم کی نہیں۔ اورایک روایت حضرت عمرؓ سے عبدالرزاق وبیہقی وغیرہ نے یہ بھی کی ہے کہ انہوں نے بعد آنے زوج اول کے اس کو اختیار دیا درمیان اس کے کہ اپنی زوجہ لے لیوے یا مہر واپس کرالے اورزوجہ کو نہ لے۔ واللہ اعلم۔**حررہ عبد الحی لکھنوی۔**

مفقود الخبر کے لئے علی حائری اثناعشری لاہوری کا فتویٰ بھی چارسال کا ہے۔

عورت کے لئے تقرری عدت کی وجہ

تقرری عدت کی سب سے بڑی وجہ رحم کا احوال معلوم کرنا ہے۔ چنانچہ جس عورت کو قبل از جماع طلاق ملے اس کے لئے کوئی عدّت مقرر نہیں ہے۔خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوھُنَّ فَمَا لَکُمْ عَلَیْھِنَّ مِنْ عِدَّۃٍ تَعْتَدُّوْنَھَا فَمَتِّعُوْ ھُنَّ وَ سَرِّحُوْھُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلاً** ۔ترجمہ۔یعنی اے ایماندارو،جب تم مؤمنہ عورتوں سے نکاح کرلو،پھر ان کو جماع کرنے سے پہلے طلاق دیدو،تو تمہارے لئے ایسی عورتوں پر کوئی عدت کا حق نہیں ہے کہ گنتی پوری کرواؤ۔پس ان کو کچھ مال دے کر اچھی طرح سے رخصت کرو۔

وہ عورت جسکو خاوند نہ آباد کرے نہ طلاق دے اسکے لئے قرآن کریم نے کیا علاج تجویز کیا ہے؟

عنوان الصدر امر کے لئے آیات ذیل قرآن کریم میں آئی ہیں۔ **فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَ لَا تُمْسِکُوْھُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوْا وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہ‘ وَلَا تَتَّخِذُوْا آیٰاتِ اللہِ ھُزُوًا** (۱۳/۲) ترجمہ۔یعنی اپنی عورتوں کو اچھے دستور سے رکھو یا اچھے دستور سے رخصت کردو۔اورانکو ضرردینے کی غرض سے نہ روک رکھو۔اورجس نے ایسا کیا،پس وہ اپنی جان کا ظالم ہے۔اورخداتعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ سمجھو۔

اس آیت سے صاف ہویدا ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو نہ آباد کرے نہ طلاق دے،تو وہ ظالم

ہے۔اور ظالم اگر مظلوم پر کوئی نالش کرے، تو وہ قابل سماعت نہیں۔ بلکہ اس میں قابل ملامت وہی شخص ہے، جو فعل ظلم کا مرتکب ہے۔

دوسری آیت اس سلسلے کی یہ ہے۔ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۱۵/۵) ترجمہ۔سارے کے سارے ایک ہی عورت کی طرف مت جھک پڑو اور دوسری عورت کو لٹکن کی طرح مت چھوڑ دو۔قرآن کا ایسی عورت کے لئے حکم ہے کہ بذریعہ عدالت اپنے حقوق کا مطالبہ کر کے انہیں حاصل کرے۔قرآن کریم کی آیت مذکورہ بالا کے الفاظ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه' سے صاف ہویدا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو عرصہ دراز تک دانستہ چھوڑنے کے بعد اس بیوی پر قبضہ کے لئے دعویٰ کرے، تو اس کے حقوق زوجیت نافذ نہیں ہو سکتے۔

سوال۔اگر عورت ہی بوجہ افعال شنیعہ ظالم ہو، تو پھر مرد کو کیوں ظالم قرار دیا جائے؟

جواب۔مرد کو اس لئے ظالم قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ایسی عورت کو کیوں طلاق نہیں دیتا۔ ہاں طلاق دینے سے پہلے سمجھانا چاہئے کہ وہ افعال بد سے باز آ جائے۔ وگرنہ رخصت۔

عورت کو خاوند کا سوگ چار ماہ دس دن رکھنے کی وجہ

اس حکمت کی تشریح فرق عدت موت وعدت طلاق میں عنقریب آئیگی اور بقدر ضرورت یہاں بھی کسی قدر لکھی جاتی ہے۔(اقتباس) "واعلموا ان الاحداد على الزوج تابع للعدة و هو من مقتضياتها و مكملاتها فان المراة انما تحتاج الى التزين و التجمل و التعطر لتحبب الى زوجها و نزدلها نفسه و يحسن ما بينهما من العشرة فاذا فات الزوج و اعتدت منه و هى لم تصل الى زوج آخر فاقتضىٰ تمام حق الاول و تاكيد المنع من الثانى قبل بلوغ لكتاب اجله ان تمنع مما تصنعه النساء لازواجهن مع ما فى ذالك من سد الذريعة الى طمعها فى الرجال و طمعهم فيها بالزينة و الخضاب و التطيب فاذا بلغ الكتاب اجله صارت محتاجة الى ما يرغب فى نكاحها فابيح لها من ذالك ما يباح لذات الزوج فلا شئى ابلغ فى الحسن من هذا المنع والاباحة و لو اقترحت عقول العالمين لم تقترح شيئا احسن منه "۔ترجمہ۔واضح ہو کہ خاوند کا سوگ تابع عدت کے ہے اور یہ سوگ عدت کے مقتضا اور اسکے مکملات میں سے ہے، کیونکہ عورت کو اپنے خاوند کی زندگی میں اسلئے زینت وتجمل وتعطر کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کی محبوب ومرغوب رہے اور ان دونوں میں حسن معاشرت ہو۔ پس جب خاوند مر جائے، تو وہ اس کی جانب سے عدت میں رہے اور دوسرے شخص

سے نکاح نہ کرے۔ پس خاوند کے سارے حقوق کی حفاظت اور میعاد عدت کامل ہونے سے پہلے ممانعت نکاح کا مقتضا ہے کہ عورت کو ان امور سے منع کیا جائے، جو عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے کیا کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ امر اس بات کا مسدود کرنے والا ہے، جس سے عورت کو مردوں کی طمع ہو اور اس کی زینت و خضاب و عطر کے ملاحظہ سے اس کی طرف مردوں کی چشم طمع بیدار ہو سکے۔ پس جب عدت ختم ہو جائے، تو وہ ان امور کی محتاج ہوئی، جو محرک و راغب فی النکاح ہیں۔ پس اس عورت کو وہ امور مباح ہوئے، جو خاوند والی عورت کیلئے مباح ہوا کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز اس حسن کو نہیں پہنچ سکتی جو اس ممانعت و اجازت میں ہے خواہ دنیا کی اجتماعی عقول مل کر تجویز کریں، وہ اس سے بہتر اصول پیش نہ کر سکیں گے۔

عدت موت و عدت طلاق میں اختلاف کی وجہ

سوال۔ جب کہ رحم کے خالی یا حامل ہونے کا علم ایک ہی عدت مقرر کرنے سے معلوم ہو سکتا تھا، تو پھر مختلف عدتوں کے مقرر ہونے کی وجہ کیا ہے؟

جواب۔ مختلف عدتوں کی وجہ ان مصالح الٰہی سے معلوم ہو سکتی ہے، جن کے لئے یہ مشروع کی گئی ہیں۔ عدت کے مشروع ہونے میں چند مصلحتیں ہیں، جس کی تفصیل ذیل میں درج ہو گی۔

۱۔ رحم کے خالی ہونے کا علم حاصل کرنا، تاکہ دو شخصوں کا نطفہ ملجانے سے اختلاط نسب ہو کر باعث فساد نہ ہو۔ عدم تقرری عدت کی وجہ سے ایسے فساد اور بگاڑ پیدا ہوتے ہیں، جن کو شریعت اور حکمت الٰہی دونوں نہیں چاہتے۔

۲۔ امر تقرری عدت کی وجہ عقد نکاح کی بزرگی و رفع قدر و اظہار شرافت ہے۔

۳۔ طلاق دینے والے کے لئے لمبا زمانہ مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مرد طلاق دینے کے امر سے نادم ہو کر عورت کی طرف رجوع کر سکے۔

۴۔ تقرری عدت کی وجہ حق خاوند کے ادا کرنے اور خاوند کے فوت ہونے کی تاثیر کا اظہار ہے۔ اور یہ امر زینت اور آراستگی کے ترک کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے عورت پر خاوند کا سوگ اپنے بیٹے اور والدین سے زیادہ رکھنا مشروع ہوا۔

۵۔ تقرری عدت کی وجہ۔ احتیاج حق خاوند اور مصلحت زوجہ اور حق پسر اور واجب حق الٰہی پر قائم ہونے کے لئے ہے۔

شارح علیہ السلام نے عقد نکاح کے پورا ہونے یعنی موت کو قائم مقام دخول ٹھہرایا ہے، کیونکہ نکاح ساری عمر کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ عدت محض برات رحم کا علم حاصل کرنے کے لئے

نہیں ہوتی، بلکہ یہ امر عدت کے بعض مصالح وحکمتوں میں سے ہے۔

اقسام عدت

(۱) عدت حاملہ وضع حمل تک (۲) عدت بیوہ چار ماہ دس دن (۳) عدت مطلقہ تین طہر (۴) عدت آیسہ یعنی جس کو حیض نہ آتا ہو۔اس کی عدت تین ماہ ہے۔

عدت بیوہ کا دوسری عدتوں سے مختلف ہونے کی وجہ

عدت بیوہ چار ماہ اور دس دن مقرر ہے،خواہ دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو،جیسا کہ قرآن کریم اور سنت صحیحہ کی اس پر دلالت ہے اور لوگوں کا بھی اس پر اتفاق ہے۔کیونکہ موت عقد نکاح کی حد کی انتہا اور انقضا واختتام کا مقام ہے،جس سے احکام وراثت واستحقاق مہر قائم ہوتے ہیں۔اس جگہ محض حصول علم رحم مقصود نہیں ہے،جیسا کہ بعض فقہاء کا گمان ہے کہ قبل دخول کے مہر واجب ہو جاتا ہے۔اور برات رحم کا علم ایک ہی حیض سے حاصل ہو جاتا ہے اور چھوٹی اور آیسہ اور طہر والی کو مدت میں برابر ٹھہراتے ہیں۔ جبکہ یہ امر ہے تو ایک گروہ فقہاء کا خیال ہے کہ عدت کا حکم محض اطاعت الٰہی کیلئے ہے،اس میں عقل کو دخل نہیں ہے۔یہ بات چند وجوہات کی بنا پر باطل ہے، کیونکہ قرآن شریف میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے،جس کی وجہ ومطلب وحکمت معقول نہ ہو۔ہاں سمجھدار سمجھ جاتے ہیں اور بعض پر یہ بھید پوشیدہ رہتا ہے۔

۱۔عدت محض عبادات میں سے نہیں ہے۔کیونکہ عدت چھوٹی اور بڑی اور عاقلہ اور دیوانہ اور مسلمہ وذمیہ کے حق میں لازمی ہے اور اس میں نیت کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔رعایت حقوق زوجین وپسر ورعایت حق خاوند ثانی اس میں ظاہر ہے۔

۳۔خاوند کی وفات میں اس قسم کے لحاظات معتبر کئے گئے ہیں تا کہ دونوں میں نکاح کا ادب اور وقعت باقی رہے اور دوامی حقوق اور معاہدہ مصاحبت کی کسی قدر وفاداری ادا ہو سکے۔اور نسب میں اشتباہ بھی نہ ہو سکے۔

سب سے باصواب یہ بات ہے کہ اس میں عدت نکاح کے ختم ہونے کی حرمت وعزت ملحوظ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس امر میں رعایت حق خاوند اور اس کی حرمت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔

حق خاوند کی حرمت وعزت کا لحاظ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و حرمت کے حقوق کی وجہ سے آپ کی وفات کے بعد آپ کی عورتوں سے اور لوگوں پر مدام کے لئے نکاح کرنا حرام ہو گیا۔کیونکہ آپ کی دنیا والی عورتیں ہی آخرت میں بھی آپ کی ازواج مطہرات ہوں گی۔

اس لئے آپ کے بعد کسی کو بھی ان سے نکاح کرنا حلال نہیں ٹھہرا۔

مگر یہ امر دوسروں کے لئے نہیں ہے، کیونکہ یہ امر ان کے حق میں معلوم نہیں ہے۔ اگر ہر خاوند کے مرنے سے عورت کو دوسرا نکاح کرنا حرام ہوتا، تو بغیر نفع معلوم اس کو سخت ضرر لاحق ہوتا۔ زمانہ جاہلیت میں احترام حق خاوند اور عزت عقد نکاح میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ سال بھر عورت دوسرا نکاح نہ کر سکتی تھی اور نہ گھر سے باہر نکلنے کی مجاز تھی۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ان سے یہ بوجھ اپنی شریعت حقہ کے ذریعہ، جو محض نعمت و رحمت و مصلحت و حکمت الٰہی پر مبنی ہے، تخفیف کر دیا۔

چار مہینے اور دس دن کی عدت حکمت و مصلحت الٰہی پر مبنی ہے۔ ایسی مدت کا تقرر ضروری تھا، جس سے رحم میں بچے کا ہونا یا نہ ہونا معلوم ہو سکے۔ کیونکہ چالیس دن تک رحم میں نطفہ ہوتا ہے، پھر چالیس دن تک لہو (خون) کی پھٹکی ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد چالیس دن میں بچہ تیار ہوتا ہے اور یہ پورے چار مہینے ہوتے ہیں۔ پھر اس مدت کے بعد چوتھے طہر میں روح پھونکی جاتی ہے، جس کا اندازہ دس دن ہے تا کہ حمل ہو تو حرکت سے ظاہر ہو سکے۔

الغرض شارع نے بیوہ کی عدّت چار مہینے اور دس دن اس لئے مقرر کی کہ چار مہینے کے تین چلے ہوتے ہیں اور اس مدت کے اندر جنین میں جان پڑتی ہے اور وہ حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور دس دن اس پر زیادہ کئے گئے تا کہ وہ حرکت پورے طور پر ظاہر ہو جائے۔ اور نیز یہ مدت حمل معتاد کی نصف ہے، جس میں حمل پورے طور پر ظاہر ہو جاتا ہے اور ہر شخص دیکھ کر جان سکتا ہے۔ اور مطلقہ کی عدت طہر یا حیض کے ساتھ اور بیوہ کی چار مہینے دس روز اس لئے مقرر کی گئی کہ مطلقہ میں حقدار یعنی خاوند اپنے اختیار پر قائم ہوتا ہے، جو نسب کی مصلحت اور قرائن کو جانتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ عورت کو اس چیز کا حکم دیا جائے، جو اس کے لئے خاص ہے اور خاوند پر وہ امین سمجھی جائے اور لوگ اس عورت کا حال معلوم نہیں کر سکتے، جب تک وہ خود بیان نہ کرے۔ اور بیوہ کا خاوند موجود نہیں ہوتا اور کوئی دوسرا شخص اس کا باطنی حال اور فریب معلوم نہیں کر سکتا، جس طرح خاوند پہچان سکتا ہے۔ پس ضرور ہوا کہ اس کی عدت ایسی مقرر کی جائے، جس کے معلوم کرنے میں قریب و بعید سب برابر ہوں اور حیض کو بھی وہ ثابت کر دے، کیونکہ غالباً یا دائماً اس قدر طہر بڑا نہیں ہوتا۔

عدت مطلقہ۔ عدت مطلقہ میں یہ تعلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ عدت بالاتفاق جماع کے بعد واجب ہوتی ہے، نہ محض برات رحم کے علم سے۔ کیونکہ برات رحم ایک حیض سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اگرچہ برات رحم کا علم عدت کے بعض ضروری مقاصد میں سے ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عدت محض

اطاعت الٰہی کے لئے ہے۔عدت کی حکمتیں تب معلوم ہوسکتی ہیں جب وہ حقوق معلوم ہوں، جواس میں ہیں۔عدت میں (۱) ایک تو خدا تعالیٰ کا حق ہے اور وہ اس کے حکم کی اطاعت اور اس کی طلبِ رضاء کا حق ہے۔اور (۲) دوسرا طلاق دینے والے خاوند کا حق ہے۔اور یہ حق اس کے رجوع کرنے کے لئے لمبا زمانہ ٹھہرانے کا ہے۔(۳) تیسرا حق زوجہ کا ہے اور یہ حق اس کا استحقاق نفقہ وسکونت کا حق خاوند پر ہے جب تک کہ عورت عدت میں ہو۔(۴) چوتھا حق بچے کا ہے۔ یہ حق بچے کے ثبوت نسب کی احتیاط کے لئے ہے تا کہ اس کا نسب دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ نہ ہو جائے۔(۵) پانچواں حق دوسرے خاوند کا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنا پانی دوسرے کی کھیتی کو نہ دے۔

اور شارع علیہ السلام نے ہر ایک کیلئے مناسب احکام مرتب فرمائے ہیں۔رعایت حق خاوند میں یہ امر قرار پایا ہے کہ زوجہ گھر سے باہر نہ جائے اور نہ خاونداس کو باہر نکالے۔اور طلاق دینے والے کا یہ حق ٹھہرایا ہے کہ عدت کے اندر زوجہ سے طلاق دینے والا رجوع کرے تو زوجہ مانع نہ ہو۔اور زوجہ کا حق خاوند پر نفقہ وسکونت کا مہیا کرنا ہے۔اور حق بچہ یہ ہے کہ اس کے نسب کا ثبوت ہو جائے اور وہ اپنے باپ سے ملحق ہو اور دوسرے سے ملحق نہ ہو۔اور دوسرے خاوند کا یہ حق ہے کہ وہ بصیرت و برات رحم کا علم ہونے کے بعد عورت سے دخول کرے۔ مبادا رحم میں پہلے شخص کا بچہ ہو اور اس طرح سے اختلاط نسب ہو جائے۔پس مطلقہ کے لئے تین طہر کا مقرر کرنا ان حقوق کی رعایت وتکمیل کے لئے ہے۔اور قرآن کریم کی اس بات پر صریح دلالت ہے کہ تقرری عدت زیادہ تر مصلحت خاوند کے لئے ہے۔

خلع کرنے والی و ہاجرہ عورت کی عدت ایک حیض مقرر ہونے کی وجہ

جو عورت اپنے خاوند سے جدا ہو جائے اور خاوند کا حق عورت کے اسیر ہونے یا ہجرت کرنے یا خلع کرنے سے منقطع ہو جائے، تو اس عورت کی عدت براءت رحم کے لئے صرف ایک حیض مقرر ہوئی اور تین حیض عدت نہ ہوئی، کیونکہ اس کا خاوند تو اب رجوع نہیں کرسکتا اور ایک حیض میں براءت رحم کا علم ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع کرنے والی عورت کو کبھی بھی تین حیض کی عدت کا امر نہیں فرمایا۔ ابوداؤد ونسائی وغیرہ لکھتے ہیں کہ ثابت بن قیس نے اپنی عورت کو ایسا مارا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔عورت کا نام جمیلہ تھا اور وہ عبداللہ بن ابی کی بیٹی تھی۔ جمیلہ کا بھائی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور ثابت بن قیس کے تشدد کا ذکر کیا۔لہٰذا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو بلوا کر فرمایا کہ جو کچھ تیرا مال جمیلہ کے پاس ہے وہ لے لو اور اس کو چھوڑ دو۔ثابت بن قیس نے اس امر کو منظور کیا۔ پس آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمیلہ کو ایک حیض کے انتظار کا حکم دیا اور بعدازاں فرمایا کہ اپنے اقربا کے

پاس چلی جائے۔ **ذکر ابو داؤد و النسائی من حدیث ابن عباس ان امراۃ ثابت بن قیس اختلعت من زوجھا فامرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعتد بحیضۃ و قال الترمذی الصحیح انھا تعتد بحیضۃ** ۔ترجمہ۔یعنی ثابت بن قیس کی زوجہ نے اپنے خاوند سے خلع کیا،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کوایک حیض عدت میں رہنے کا امر فرمایا۔ترمذی کی رائے ہے کہ یہی امر صحیح ہے کہ خلع کرنے والی عورت کی عدت ایک حیض ہے۔

زانیہ وموطوءہ بشبہ کی عدت ایک حیض تک ہونے کی وجہ

اسی دلیل مذکور پر جس عورت سے شبہ میں کسی نے جماع کرلیا ہواور زانیہ کی عدت براءت رحم کا علم حاصل کرنے کے لئے ایک حیض ٹھہرائی گئی ہے۔شیخ ابن تیمیہ وحضرت احمد ابن حنبل وابن قیم کی یہی رائے ہے۔

حیض میں عورت سے حرمت جماع کی وجہ

خدتعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔**وَ یَسۡـئَلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ قُلۡ ھُوَ اَذیً فَاعۡتَزِلُوۡا النِّسَاءَ فِی الۡمَحِیۡضِ وَ لَا تَقۡرَبُوۡھُنَّ حَتّٰی یَطۡھُرۡنَ.** ترجمہ۔پوچھتے ہیں تجھ سے حکم حیض کا،تو کہو وہ ناپاکی ہے۔سوتم حیض میں عورتوں سے کنارہ کرو اور صحبت نہ کروان سے، جب تک وہ پاک نہ ہولیں۔

جب کہ خداتعالیٰ حیض کوناپاکی وایذا بیان فرماتا ہے،تو ایسی حالت میں صحبت کرنے سے عورت کوازدیاد ایذااور مرد کوبھی ضرر پہنچنے کا قوی مظنہ ہے۔لہٰذا خدا نے حیض میں جماع منع فرمایا۔

طبی رو سے جو شخص حالت حیض میں عورت سے جماع کرے،اس کو مندرجہ ذیل امراض لاحق ہونے کا احتمال ہے۔جرب یعنی خارش۔نامردی۔سوزش یعنی جلن۔جریان۔جذام یعنی کوڑھ ولد،یعنی جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو جذام ہو جاتا ہے۔اورعورت کو مندرجہ ذیل بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔عورت کو اکثر ہمیشہ کے لئے خون جاری ہو جاتا ہے اور بچہ دان یعنی رحم باہر کولٹک جاتا ہے۔بعض عورتوں کے لئے اکثر اوقات کچا حمل گر جانے کا باعث منجملہ دیگر امور کے بڑا سبب یہی ہوتا ہے۔چونکہ حالت حیض میں جماع کرنے سے مذکورہ بالا امراض اور دیگر کئی نقصانات وعوارض پیدا ہو جاتے ہیں،جن کو خداتعالیٰ بہتر جانتا ہے۔اسلئے خداتعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کر کے حالت حیض میں جماع کرنے سے منع فرمادیا۔

وجہ حرمت حائض وحکمت اباحت وطئی مستحاضہ

حائض سے جماع حرام ہونا ومستحاضہ سے جائز ہونا باوجودیکہ دونوں نجاست کی قسم سے ہیں۔
اس میں وجہ یہ ہے کہ یہ امر شارع کی کمال حکمت میں سے ہے کہ اس نے دونوں خونوں میں فرق ظاہر کر دیا۔ کیونکہ حیض کی نجاست بہ نسبت استحاضہ کے زیادہ تر قوی ودوامی ہے۔ استحاضہ کا خون شرمگاہ کی ایک رگ سے جاری ہوتا ہے۔ اور شرمگاہ سے جریان خون استحاضہ ایسا ہے، جیسا کہ ناک سے نکسیر جاری ہوتی ہے۔ اس خون کا نکلنا مضر ہے اور اس کا بند ہونا دلیل صحت ہے۔ بخلاف حیض کے کہ اگر حیض کا خون بند ہو جائے، تو وہ موجب بیماری ہے اور اس کا جاری رہنا موجب صحت ہے۔ خون حیض واستحاضہ دونوں از روئے حقیقت وعرف وحکم وسبب برابر نہیں ہیں۔ پس یہ امر شریعت اسلامیہ کی خوبیوں ومحاسن میں سے ہے کہ دونوں خونوں میں فرق ظاہر کر دیا، جیسا کہ وہ حقیقت میں بھی الگ الگ ہی ہیں۔ مستحاضہ کے متعلق نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ **هل تدع الصلوة زمن استحاضتها فقال لا انما ذالک عرق و ليس بالحيضة فامرها ان تصلى مع هذا الدم و علل بانه دم عرق و ليس بدم حيض** ۔ ترجمہ۔ کیا عورت کو عرصہء استحاضہ میں نماز چھوڑ دینی چاہئے۔ فرمایا نہیں، کیونکہ یہ صرف عرق ہے اور حیض نہیں۔ آپؐ نے اس کو اس خون کے باوجود نماز پڑھنے کا امر فرمایا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ صرف عرق کا خون ہے اور حیض کا خون نہیں۔

ختنہ عورت کے لئے ہے یا مرد کے لئے

مخالفین کا اعتراض ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ختنہ عورت کے لئے زینت ہے۔ اور یہ امر ستر عورت کے خلاف وہتک ہے۔

جواب۔ ا۔ اس حدیث میں تخصیص ہے یعنی اس ختنہ میں بعض عورتوں کی اس بیماری کے علاج و ازالہ کی طرف ایماء ہے، جس کو علم طب میں بذر کہتے ہیں، جو بعض عورتوں کو ہو جاتی ہے، یعنی گوشت زائد بڑھ جاتا ہے اور اس کا علاج سوائے قطع کے اور کوئی نہیں۔ ورنہ ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے۔

۲۔ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ احکام شریعت کے تحت میں بہت سے اسرار ہوتے ہیں۔ ذوالمعارف ہونا ان کا خاصا ہے اور اسی امر کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ فرماتے ہیں۔ اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمْ ۔ ترجمہ۔ یعنی مجھے تمام حقائق واسرار ومعارف کو جمع کرنے والے کلمات عطا کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ صرف مردوں کا ختنہ کرنا عورتوں کے لئے باعث زینت ہے۔ اور اسی امر کی تصدیق قرآن کریم کی آیت ذیل سے بھی ہوتی ہے، جو مردوں وعورتوں کے متعلق آئی ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔ ترجمہ۔ یعنی عورتیں

تمہارے لئے لباس یعنی باعث زینت و پردہ ہیں اور تم عورتوں کیلئے لباس یعنی باعث زینت و پردہ ہو۔

(ہمارے مہربان دوست مولوی نور حسن صاحب محرر تحصیل گوجر خان کے آگے کسی مخالف نے یہی اعتراض کیا تھا، تو انہوں نے اس کو یہی جواب پیش کیا، جو مناسب اور بہت لطیف ہے۔ اور اس مسئلہ کے اندراج کے لئے بھی مولوی صاحب موصوف ہی محرک ہوئے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء)

حرمت حلالہء حوالہ کی وجہ

قرآن کریم میں اس حلالہء حلال کا ذکر ہے، جو مطلقہ ثلاثہ عورت بعد انقضائے عدّت بغیر حیلہ حوالہ پہلے خاوند کے بحسب رضائے خود کسی دوسرے شخص کے ساتھ مدام مدت العمر آباد رہنے کی غرض سے نکاح کرے اور پہلے خاوند کے ساتھ پھر نکاح کرنے کی غرض سے دوسرے خاوند سے طلاق نہ چاہے۔ اور طرفین میں تمام حقوق زوجیت کے شرائط عقد نکاح کے وقت طے ہو جائیں، یعنی ایجاب و قبول طرفین اور عورت کا مہر و نان ونفقہ، لباس، سکونت حسن معاشرت خاوند کے ذمہ عام وخاص میں مشتہر ہو۔ مگر حلالہ نکالنے والے عاریتی سانہن کے ذمہ ان شرائط میں سے کوئی بھی نہیں ہوتی۔

یہ وہ حرام حلالہ ہے جس کا نبی علیہ السلام کی بعثت سے پہلے عرب کے زمانہ جاہلیت میں رواج تھا اور اب بھی اس جاہلانہ رسم ورواج کے بعض کوتہ اندیش مرتکب ہوتے ہیں۔ چونکہ ایسا حلالہ، جسکی بنا حیلہ ہوتی ہے، نکاح نہیں بلکہ زنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ **لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ** ۔ ترجمہ۔ یعنی خداتعالیٰ لعنت کرتا ہے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر۔ یہ حدیث ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی۔ ابی داؤد۔ مسند امام احمد بن حنبل میں لکھی ہے۔

۱۔ اگر کوئی مؤخر الذکر حلالہ کو حلال جانتا ہے، تو اس سے پوچھو کہ کیا خداتعالیٰ اور اس کے رسول نے کسی شخص پر فعل مستحب یا امر جائز یا مکروہ یا چھوٹے گناہ پر کہیں لعنت فرمائی ہے یا کہ لعنت اس شخص کے لئے مخصوص ہے، جو گناہ کبیر کا مرتکب ہو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ **كُلُّ ذَنْبٍ خَتَمَ بِلَعْنَةٍ اَوْ غَضَبٍ اَوْ عَذَابٍ اَوْ نَارٍ فَهُوَ كَبِيْرَةٌ** ۔ ترجمہ۔ یعنی ہر ایک گناہ، جس کا خاتمہ لعنت یا غضب الٰہی یا عذاب یا دوزخ کے وعدہ پر ہو، وہ کبیرہ ہے۔

۲۔ اس سے پوچھو کہ کیا صحابہ کرام میں سے کوئی ایک شخص بھی کبھی محلل ہوا ہے یا صحابہ میں سے کسی نے ایسے حلالہ کا اقرار کیا ہے۔

۳۔ اس سے پوچھو کہ حضرت عمر بن خطاب نے کیوں کہا تھا کہ میرے پاس جو شخص حلالہ کرنے اور کروانے والا لایا گیا، میں اس کو سنگسار کرونگا۔ سنگساری زنا کی حد ہے۔

۴۔اس سے پوچھو کہ اگر حلالہ حلال ہوتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت میں سے کسی ایسے شخص کو کیونکر ملعون کہتے ،جس نے صحیح شرعی نکاح کر لیا ہو اور وہ اس میں کسی گناہ کبیرہ وفعل قبیح کا مرتکب بھی نہ ہوا ہو۔

۵۔اگر محلل ومحلل لہ نیکوں کے زمرہ میں شمار ہوتے ،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ملعون اور عاریتی سانہن کیوں قرار دیتے۔

۶۔عاریتی سانہن سے پوچھو کہ کیا یہ کلمہ بھی کبھی اس کو عقد کے وقت کہا گیا ہے،جیسا کہ عقد نکاح کے وقت کہا کرتے ہیں۔**بَارَكَ اللّٰهُ لَكُمَا وَ عَلَيْكُمَا وَ جَمَعَ بَيْنَكُمَا فِيْ خَيْرٍ وَ عَافِيَةٍ** ۔ ترجمہ۔یعنی تم دونوں میاں بیوی کو خداتعالیٰ برکت دے اور تم دونوں میں بخیر وعافیت ملاپ رکھے۔

۷۔عاریتی سانہن سے پوچھو کہ نکاح کی علت غائی خداتعالیٰ نے عفت،اولاد،آرام وسکونت بیان فرمائی ہے۔تم کو ان میں سے کس چیز کا حصہ ملا۔

۸۔اگر ایسا امر نکاح ہوتا اور زنانہ ہوتا تو عورت کا پہلا خاوند اور اس کے والی کیوں عاریتی سانہن کے ساتھ عورت کو نہیں رہنے دیتے ، بلکہ ان کی مرضی نہیں ہوتی ہے ان کے دل میں ، بلکہ ان کی زبانیں کہتی ہیں، یہ طعام تیرے پاس اس لئے نہیں پیش کیا گیا کہ تو اس کو سیر ہو کر کھالے۔

۹۔اہل عقول سے پوچھو کہ کیا ایسے فعل سے فلاں عورت کا فلاں مرد کے ساتھ نکاح ہو گیا ہے۔ کیا اس نکاح کو شریعت الٰہی اور عقل وفطرت انسانی قبول کر سکتی ہے۔

۱۰۔پھر اس عورت سے پوچھو کہ کیا وہ سانہن کو اپنی دائمی خاوند اختیار کرنے پر رضامند ہو گئی ہے، جو اس کی مدت العمر کے دکھوں وسکھوں،صحت ومرض،عسر ویسر میں ساتھ ہو گا۔

۱۱۔الغرض چونکہ حلالہ مؤخر الذکر میں نکاح حلال کی کوئی علت غائی نہیں ہوتی ،اس لئے وہ زنا ہے۔اور زنا کے بارے میں آیا ہے۔**لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّه‘ كَانَ فَاحِشَةً وَّ سَاءَ سَبِيْلاً**۔ترجمہ۔یعنی زنا کے نزدیک مت جاؤ۔زنا بے حیائی اور بُرا راستہ ہے۔

ہم نے محلل کو سانہن لکھا ہے ، کیونکہ زمانہ جاہلیت عرب میں یہ رسم مروج ہوئی تھی ۔اور اس وقت محلل کا یہی نام پڑ گیا تھا۔علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔ **كان يسمى فى الجاهلية التيس المستعار**۔یعنی عاریتی سانہن۔

حرمت نکاح متعہ کی وجہ

۱۔متعہ کی رسم جاری ہونے سے نسب کا غلط ملط ہونا اور اس کی تباہی و بربادی لازم آتی ہے،

کیونکہ اس مدت متعہ کے گذرتے ہی وہ عورت خاوند کے قبضہ سے خارج ہو جاتی ہے اور عورت کو اپنا اختیار ہوتا۔ اب معلوم نہیں کہ وہ جب حاملہ ہوگی تو کیا کرے گی اور عدت کا انضباط نکاح صحیح میں بھی، جس کی بنا ہمیشگی پر ہوتی ہے، نہایت دشواری سے ہوتا ہے، تو پھر متعہ کا ذکر ہی کیا ہے۔

۲۔ اس رسم میں یہ قبح بھی ہے کہ اس رسم کے جاری ہونے سے نکاح صحیح میں، جو شریعت میں معتبر ہے، اہمال لازم آتا ہے، کیونکہ اکثر نکاح کرنے والوں کی خواہش، غالباً شہوت شرمگاہ، کا پورا کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ صرف جماع کی اجرت دینے سے انسان طبیعت انسانی سے بالکل باہر ہو جاتا ہے۔ اور یہ بے حیائی ہے۔ اس کو قلب سلیم بالکل پسند نہیں کرتا۔

۴۔ ابتدائے زمانہ نبوت اور اس سے پہلے متعۃ النساء کے رواج کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام والبرکات کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی طرف سے کوئی امر اور نہی پسند نہیں فرماتے۔ لوگ کفر کرتے، شراب پیتے، لوٹتے تھے، مگر کسی کو زمانہ بعثت اوامر ونواہی کے رنگ میں مکلّف نہیں فرماتے تھے جب تک کہ کوئی حکم تبلیغ ان کے نام بخصوصیت ثابت و باعث نہ ہو۔ مکہ میں شرک ہوتا تھا، مگر جب تک یاایُّھَا الْمُدَثِّرُ قُمْ فَاتَدِرُ ۔ (ترجمہ۔ یعنی اے جبہ پوش کھڑا ہوا اور لوگوں کو آنے والے عذاب کی خبر سنا دے) نازل نہ ہوا، آپ نے کسی کو نہ روکا۔

پھر وہ لوگ شراب پیتے تھے۔ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے اور جناب الٰہی سے حکم آیا تو منع فرمایا۔ حجاب از دواج و پردہ کے لئے بعض اصحاب نے بار بار عرض کیا مگر تا صدور حکم الٰہی حجاب کا حکم نہ آیا۔ بلکہ یہ مقدس جماعت بلا اجازت دعا بھی کرے، تو مشکلات پیش آ جاتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا پر جو ارشاد الٰہی ہوا، وہ اس کلام پاک سے ظاہر ہے۔ لَا تَسْـئَلْـنِ مَا لَيْسَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیٓ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْن ۔ ترجمہ۔ یعنی اے نوح سوال نہ کر اس بات کے بارے میں جس کا تجھ کو علم نہیں ہے۔ میں تجھ کو ڈانٹتا ہوں کہ مبادا آئندہ بے خبری میں تو یہ سوال کرے۔

یہ مقام غور ہے۔ ان کے زمانہ میں کسی نے متعہ کیا تو کیا۔ اگر کسی نے عرض کیا کہ کیا مجھے اجازت ہے، تو جب تک حکم الٰہی نہ آیا، اجازت و رخصت فرما دی تو کیا۔ "مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست"۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۔ ترجمہ۔ یعنی ہر انسان کا جی فکر کرے اس چیز کے لئے، جو اس نے کل کے لئے آگے بھیجی ہے۔

جب کوئی چیز ثابت و موجود ہوتی ہے، تو اس کے لوازم بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ سورج

طلوع ہوا، تو نہار کا وجود ضروری ہوا۔ کوئی عقلمند آدمی غور کرے کہ یہ کنچنیاں محبِّ اہل بیت اور ان کے کنجر دنیا میں کس طرح پیدا ہوئے۔ متعہ کے حامی جب بولتے اور لکھتے ہیں، تو غلطی اور ناعاقبت اندیشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ متعہ کی اجازت غزوہ بدر میں ہوئی، وہ سراسر غلط ہے۔ متعۃ النساء کی تردید قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں موجود ہے۔ **وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذَالِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ** ۔ترجمہ۔ یعنی وہ لوگ جو حفاظت کرتے ہیں اپنی شرمگاہوں کی مگر اپنی بیویوں، اصیلوں یا ملک یمین بیویوں سے نہیں کہ جن سے ان کو مباشرت کرنے پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ پس جو کوئی ان بیویوں کے سوا کسی اور جگہ شہوت رانی کریں، وہ حد سے گذرنے والے اور مجرم ہیں۔

دیکھو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ازواج اور مامَلکت ایمان کے سوا جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت نہیں کرتے، وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اس حد بندی کے اندر رہتے ہیں، وہی مظفر و منصور ہیں۔ دیکھو سورۃ المؤمنون پارہ ۱۸ کا ابتداء اور سورۃ معارج میں اسی بات کو مکرر بیان کر کے شرمگاہوں کو محفوظ رکھنے والے ہی جنتوں میں معزز و مکرم ہوں گے۔

جناب الٰہی کے حضور مظفر و منصور ہونے اور معزز و مکرم بننے کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ زوجہ اور ملک یمین کے سوا اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھا جائے۔ جو کوئی اس حد بندی سے آگے بڑھا اس نے خلاف ورزی کی اور حد الٰہی توڑی۔

اب متعہ والی عورت کو دیکھنا چاہئے کہ زوجہ ہے، بی بی ہے یا ملک یمین سے ہے۔ اگر یہ متعہ والی عورت زوجہ ہے، تو چاہئے کہ زوجیت کے لوازم اس کے ساتھ ہوں، ورثہ و طلاق و عدت و نفقہ و لباس وغیرہ لوازم زوجیت اس کے لئے ثابت ہوں۔ اور اگر ملک یمین کے نیچے ہو، تو چاہئے کہ اس متعہ والی کو لوازم ملکیت، بیع، ہبہ، عتق، کتابت اور تدبر ثابت ہوں۔ خدا تعالیٰ فرمایا ہے۔ **فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ** ۔ترجمہ۔ یعنی اگر منکوحہ بیویوں میں عدل و انصاف نہ کر سکو، تو ایک ہی بیوی نکاح میں رکھو یا مملوکہ پر کفایت کرو۔ یہاں حق سبحانہ و تعالیٰ نے بیوی اور ملک یمین دو چیزوں کو رکھا اور ممنوعہ کا ذکر ترک کیا اور فرماتا ہے۔ **وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَ لَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ. فَاِذَا اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ**

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ ماَ عَلٰى اَلْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ. ذَالِکَ لِمَنْ خَشِيَے الْصَنَتَ مِنْكُمْ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَكُمْ. وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ترجمہ۔اور جوکوئی طاقت نہ رکھتا ہوتم میں سے کہ مسلمان بیویاں نکاح میں لائے،تو ان سے نکاح کرلو،جو ہاتھ کا مال ہے،تمہاری مسلمانی لونڈیاں۔اور خدا تعالیٰ کو بہتر معلوم ہے تمہارے ایمان کا احوال۔تم ایک جیسے ہو،سو ان سے نکاح کرلو،انکے لوگوں کی اجازت سے۔اور دیدو ان کے مہر موافق دستور کے۔قید نکاح میں آتیاں نہ مستی نکالتیاں اور نہ یار کرتیاں ہوں چھپ کر۔پھر جب وہ قید نکاح میں آ چکیں اور اگر پھر بے حیائی کا کام کر بیٹھیں،تو ان پر آدھی سزا ہے اس کی،جو بیویوں کے لئے مقرر ہے۔یہ اس شخص کے واسطے ہے،جو کوئی تم میں سے تکلیف میں پڑنے سے ڈرے۔لیکن اگر صبر کرو،تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔اور خدا تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

دیکھو کیسے صاف صاف ارشاد ہیں کہ اگر تم کو منکوحہ بی بی کا موقعہ نہ ملے اور تم کو نکاح کی استطاعت نہ ہو،تو مملوکہ کو اسکے اہل کے اذن سے بیاہ لو۔اگر تمتع بالنساء جائز ہوتا،تو ارشاد ہوتا کہ متعہ النساء سے کام لو۔ان تمام آیات کریمہ میں دو ہی طریق بیان فرمائے ہیں۔ایک منکوحہ بی بی زوجہ اور دوسری مملوکہ۔

احادیث کی رو سے متعۃ النساء کی حرمت

حدثنا محمد ابن عبد الله ابن لميز حدثنا ابی حدثنا عبد العزيز بن عمر حدثنا الربيع ابن سيرة الجهنی ان ابا حدثه انه كان مع رسول الله صلی الله عليه وسلم فقال يا ايها الناس انی كنت اذنت لكم فی الاستمتا ع من النساء، ان الله حرم ذالک الی يوم القيامة ،فمن كان عنده منهن شئی فليخل سبيله فی سبلها و لا تاخذوا مما اٰتيتموهن شيئا ۔(صحیح مسلم مع النووی۔۴۵۱)۔ترجمہ۔یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے لوگو میں نے تم کو متعۃ النساء کی پہلے اجازت دی تھی۔اب خدا تعالیٰ نے متعۃ النساء کو قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔پس جس کے پاس ان عورتوں میں سے کوئی ہو،تو اپنی راہ کو اس سے خالی کرے۔اور جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے،واپس نہ لو۔

حدثنا مالک ابن اسماعيل قال حدثنا ابن عيينة انه سمع الزهری يقول اخبر نی الحسن بن محمد بن علی و اخوه عبد الله عن ابيه ان عليا قال لابن عباس ان النبی صلی الله عليه وسلم نهی عن المتعة و عن لحوم الحمر الاهلية زمن خيبر. (بخاری)۔ **وعن سفيان نهی عن النكاح المتعة**۔(فتح الباری)۔ترجمہ۔حضرت علیؓ نے ابن

عباس کوفرمایا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعۃ النساء اور خرِّ اھلی کے گوشت سے خیبر کے ایام میں منع فرمایا۔اور سفیان کی روایت ہے کہ نکاح متعہ ممنوع ہو چکا ہے۔

متعۃ النساء کے خلاف ایک وجدانی دلیل

ایک شریف طبع بھلا مانس آدمی اپنی جگہ پر سوچے کہ متعۃ النساء آخر عورتوں کے ساتھ ہوگا۔اگر شرعاً متعۃ النساء جائز، بلکہ کارثواب ہے،تو آخر عورتوں کے بغیر نہ ہوگا۔ پھر ایک آدمی کسی کی بہو، بیٹی یا بہن سے نکاح میعادی کرسکتا ہے اور کرتا ہے تو اس کی اپنی بہن، بیٹی، بہو، اماں بھی کرسکتی ہے اور کرتی ہے۔اور نکاح میں تو اظہار ہوتا ہے اخفا نہیں ہوتا۔ پھر کیا شریف لوگ مجالس میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری اماں اور بیٹیوں اور بہوؤں نے اتنی بار متعہ کیا ہے۔ وجدانی رنگ میں یہ لاجواب دلیل ہے۔اور یقین ہے کہ مجالس میں جیسے ازدواج کی ترویج صریح مبارک یقین کی گئی ہے۔ایسے متعہ کے متعلق عورتیں اس مبارک باد کو برداشت نہ کرسکیں گی۔

احادیث صحیحہ اور آیات کریمہ کے سمجھنے میں قائلین متعہ کو غلطیاں لگی ہیں۔اول بعض احادیث میں متعۃ الحج کا ذکر آیا ہے۔صحابہ کرام عمرہ اور حج دونوں مناسک کا جمع کرنا متعہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جیسے جابر بن عبداللہ اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ جب میں عمرہ کرنے لگا تو کسی نے مجھے روکا،تو میں نے اسے **استمتعنا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و ابی بکر و عمر** سنایا۔یعنی ہم نے عمرہ وحج ملا کر کئے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ اور حضرت ابی بکر وعمر کے زمانہ میں لفظ **استمتعنا** کوسن کر خوش پرستوں کو غور کرنے کا موقعہ نہ ملا۔جھٹ اس کے معنے متعۃ النساء کر دیئے۔شہوت پرستی میں **حبک الشئی یعمی و یصمی** (ترجمہ۔کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا کردیتی ہے) کی مثل ان پر صادق آئی۔

عبداللہ بن مسعود اور سلمہ بن الاکوع سے احادیث میں چند روایات ہیں،جن کے الفاظ ذیل میں درج ہیں۔ **کنا ننکح بالثوب الی رجل** ۔ترجمہ۔یعنی ہم ایک کپڑا دے کر میعادی نکاح یا جماع کر لیتے تھے۔اس میں صحابی اپنے ایک فعل کا ذکر کرتا ہے، جیسے وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم شراب پی لیا کرتے تھے یا بت پرستی کرلیا کرتے تھے یا نبی کریمؐ کا مقابلہ ہم نے کیا۔ایسی باتیں زمانہ جاہلیت کے ذکر میں کی جاتی تھیں۔ پھر یہ باتیں **ان الله قد حرم ذالک** (ترجمہ۔خدا تعالیٰ نے فلاں چیز کو حرام کردیا) کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتی ہیں۔

سلمۃ ابن الاکواع کہتا ہے ایک منادی نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا۔اس

نے کہا۔ **اذن لکم ان تستمتعوا** (ترجمہ۔ تمہیں متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے)۔اس روایت میں **رخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اوطاس فی المتعة ثلاثا ثم نھی عنھا** (سال اوطاس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کرنے کی اجازت دی، پھر اس سے روک دیا)۔ہم کہتے ہیں کہ عام اوطاس مکہ معظّمہ میں بھی آپؐ نے اجازت دی اور یہ فتح مکہ بعد غزوہ اوطاس کے ہے۔مگر انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام جب تک کوئی حکم الٰہی نہ آئے کسی کو کسی فعل سے نہیں روکتے۔ یہ سب رخصتیں اوراذن اورخاموشیاں **ان اللہ قد حرم ذالک الی یوم القیامة** (ترجمہ۔خداتعالیٰ نے اس چیز کو قیامت کے روز تک کے لئے منع کردیا ہے) سے ہباءً منثوردھول کے ذرات کی طرح اڑ گئیں۔ **اذا جاء نھر اللہ لبطل نھر معقل** ۔یعنی کسی معقل نامی آدمی نے ایک نہر بنائی۔اس پر ایک قدرتی نہر آ گئی،تو عرب میں یہ مثل بن گئی کہ معقل کی نہر الٰہی نہر کے آنے سے تباہ ہوگئی۔

الغرض متعۃ النساء اور حلالہ حوالہ دونوں میعادی نکاح ہیں اور میعادی نکاحوں کو خداتعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **مُحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسَافِحِيۡنَ** ۔یعنی نکاح کرو عورتوں کو پابند کرنے کی خاطر نہ کہ ہستی مٹانے کے لئے۔ **محصنین غیر مسافحین** کا کلمہ حلالہ ومتعۃ النساء کوحرام کرتا ہے۔پس حسب قرآن کریم واحادیث صحیحہ یہ دونوں فعل اور دونوں میعادمعینہ کے نکاح حرام ہیں۔نکاح میں تعیین مدت کا حکم کسی صریح آیت اور صحیح حدیث سے ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا۔حلالہ کی نسبت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں **عن علی قال لعن رسول اللہ المحلل و المحلل لہ** ۔ ترجمہ۔یعنی روایت ہے علی مرتضیٰؓ سے کہ لعنت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ نکالنے والے اور نکلوانے والے پر۔ یہ حدیث مسند امام احمد بن حنبل میں ہے۔ترمذی اورابن قطان اورابن دقیق العید اور ابن السکن نے اس کی تصحیح کی ہے(یعنی اس کو صحیح قراردیا)۔اور یہ حدیث علی مرتضیٰ سے امام احمد اورترمذی اورابوداؤداورابن ماجہ نے روایت کی ہے۔اور **حتی تنکح زوجا غیرہ** (ترجمہ۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے) میں وہ نکاح مراد ہے،جس کوشرع اسلام نے جائز رکھا ہے۔اور شرعی نکاح پرلعنت کا حکم نہیں لگ سکتا۔معلوم ہوا کہ حلالہ شرعی نکاح نہیں۔

اورمتعۃ النساء کی نسبت ارشادنبویؐ ذیل میں ملاحظہ ہو۔ **عن علی ابن طالب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن متعة النساء** ۔ترجمہ۔یعنی علی مرتضیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا عورتوں سے متعہ کرنا۔ترمذی وغیرہ نے اس حدیث کی تصحیح کی۔اورحرمت متعہ پر صحابہ کرام کا یقین تھا۔حضرت ابن عباس قدیم ملکی روایات اور عادت کے باعث چندروز اس کو جائز سمجھتے

رہے۔مگر جب ان کو شرعی حکم کی اطلاع پہنچی، تو تجویز متعہ سے رجوع کیا۔متعہ کی حرمت پر تمام حنفیہ اور شافعیہ اور مالکیہ اور حنابلہ اور اہل حدیث اور صوفیہ کرام متفق ہے۔متعہ کی ابدی تحریم اگر دیکھنی ہو، تو دیکھو مسلم اور بخاری اور ترمذی۔

عورتوں اور مردوں کے لئے اسلامی پردہ کی وجوہات

پردہ کے متعلق اسلام نے مرد و عورت کے لئے ایسے اصول بتائے ہیں، جن کی پابندی سے ان کی عفت و عزت پر حرف نہ آئے اور وہ بدی کے ارتکاب سے محفوظ اور مصئون رہیں۔چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔(۱) قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذَالِكَ اَذْكٰى لَهُمْ وَ قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ(۲)وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَاءَ سَبِيْلاً(۳) وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا(۴) وَ رَهْبَانِيَّةٌ اِبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ترجمہ۔یعنی مؤمنوں کو، جو مرد ہیں، کہہ دے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں۔اور ایسی عورتوں کو کھلے طور پر نہ دیکھیں، جو شہوت کا محل ہوسکتی ہیں۔اور ایسے موقع پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچائیں۔ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچائیں۔یعنی بیگانہ کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں، ان کے حسن کے قصے نہ سنیں۔یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے۔ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں یعنی ان کی پُر شہوت آوازیں نہ سنیں۔اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں اور اپنی زینت کے اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں۔اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہو کر سر پر آ جائے۔یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں۔اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں۔یہ وہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچاسکتی ہے۔اور دوسرا طریق بچنے کے لئے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس سے دعا کریں تا ٹھوکر سے بچائے اور لغزشوں سے نجات دے۔زنا کے قریب مت جاؤ یعنی ایسی تقریبوں سے دور رہو، جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو، جن سے اس گناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو۔جو زنا کرتا ہے، وہ بدی کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔زنا کی راہ بہت بُری راہ ہے۔یعنی منزل مقصود سے روکتی ہے

اور تمہاری آخروی منزل کے لئے سخت خطرناک ہے۔ اور جس کو نکاح میسر نہ آئے، چاہئے کہ وہ اپنے تئیں یعنی اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچائے۔ مثلاً روزہ رکھے یا کم کھائے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے۔ اور دوسرے لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دست بردار رہیں یا خوجے (مخنّث) بنیں اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں۔ مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے۔ اس لئے وہ ان بدعتوں کو پورے طور پر نباہ نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اگر خدا کا حکم ہوتا، تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز ہوتے، تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہوکر کبھی کا دنیا سے خاتمہ ہو جاتا۔ اور نیز اگر اس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عضو مردی کو کاٹ دیں، تو یہ در پردہ اس صانع پر اعتراض ہے، جس نے وہ عضو بنایا۔ اور نیز جب کہ ثواب کا تمام مدار اس بات پر ہے کہ ایک قوت موجود ہو اور پھر انسان خدا تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے جذبات کا مقابلہ کرتا رہے اور اس کے منافع سے فائدہ اٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے۔ ثواب تو جذبہ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے۔ مگر جس میں بچے کی طرح وہ قوت ہی نہیں رہی اس کو ثواب کیا ملے گا۔ کیا بچے کو اپنی عفت کا ثواب مل سکتا ہے۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی، بلکہ انسان کو پاک دامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے۔ یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ دوسرا کانوں کو نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا۔ نامحرموں کے قصے سننا اور ایسی تمام تقریبوں سے، جن میں اس فعل بد کا اندیشہ ہو، اپنے تئیں بچانا۔ اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔

یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ، جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں، صرف اسلام ہی سے خاص ہے۔ اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انسان وہ طبعی حالت، جو شہوت کا منبع ہے، جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا، یہی ہے کہ اس کے جذبات شہوت محل اور موقع پا کر جوش مارنے سے نہیں رہ سکتے۔ یا یوں کہو کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلا تکلف تو دیکھ لیا کریں اور انکی تمام زینتوں پر نظر ڈال لیں اور ان کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کر لیں، لیکن پاک نظر سے دیکھیں۔ اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا سن لیں اور ان کے حسن کے قصے بھی سنا کریں، لیکن پاک خیال سے سنیں۔ بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور ان کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں، نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے، اور انکی خوش الحانی کی آوازیں اور ان کے حسن کے قصے نہ

سنیں، نہ پاک خیال سے اور نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہئے کہ ان کے سننے اور دیکھنے سے نفرت رکھیں، جیسا کہ مردار سے، تا کہ ٹھوکر نہ کھائیں۔ کیونکہ ضرور ہے کہ بے روک نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آئیں۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دل اور ہمارے خطرات سب پاک رہیں، اس لئے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے کہ آزادروی گناہ کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم بھوکے کتے کے آگے نرم نرم روٹیاں رکھ دیں اور پھر امید رکھیں کہ اس کتے کے دل میں خیال تک ان روٹیوں کا نہ آئے، تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو خدا نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقع ہی نہ ملے اور ایسی کوئی تقریب پیش نہ آئے، جس سے یہ خطرات جنبش کر سکیں۔

اسلامی پردہ کا یہی راز اور یہی ہدایت شرعی ہے۔ خدا کی کتاب میں پردہ سے یہ مراد نہیں کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے۔ یہ ان نادانوں کا خیال ہے، جن کو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو آزاد نظر اندازی اور اپنی زینتوں سے روکا جائے۔ کیونکہ اس میں دونوں مرد اور عورت کی بھلائی ہے۔

بالآخر یاد رہے کہ خوابیدہ نگاہ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا، اس طریق کو عربی میں غض بصر کہتے ہیں۔ اور ہر ایک پرہیزگار، جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے، اس کو نہیں چاہئے کہ حیوانوں کی طرح، جس طرف چاہے، بے محابا نظر اٹھا لیا کرے۔ بلکہ اس کے لئے اس تمدنی زندگی میں غض بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اور یہ وہ مبارک عادت ہے، جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آ جائے گی اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خلق ہے، جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں۔

وفات انبیاء کے بعد انکی بیواؤں سے دوسروں کو حرمتِ نکاح کی وجہ

انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ کو بعد مرگ بھی وہی تعلق اپنے اجسام سے رہتا ہے، جو قبل مرگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکے اجساد مثل اجسام احیاء پھولتے پھٹتے نہیں۔ چنانچہ احادیث میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی ازواج مثل ازواج احیاء اوروں سے نکاح کرنیکا اختیار نہیں رکھتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انکے اموال کو مثل احیاء انکے وارث تقسیم نہیں کر سکتے۔ اور اسی وجہ سے حدیث لَانُوْرِثُ کو معارض آیت یُوْصِیْکُمُ اللہُ اور آیت لَا تَنْکِحُوْا اَزْوَاجَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ اَبَدًا کو معارض آیت وَالَّذِیْنَ یَتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا نہیں کہہ سکتے، کیونکہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللہُ اور آیت وَالَّذِیْنَ یَتَوَفَّوْنَ کے

مصداق وہ ہیں ،جنکی ارواح کو انکے بدن کیساتھ وہ تعلق نہ رہا ہو، جو حالت حیات میں تھا۔ چنانچہ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ میں لفظ تَرَکَ اور آیت وَالَّذِيْنَ يَتَوَفُّوْنَ میں تَوَفّٰی شاہد ہے۔علیٰ ھذا القیاس آیت وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا میں لفظ تَرَكُوْا قرینہ مضمون معروض ہے، کیونکہ جیسے مضمون توفی جبھی چسپاں ہوتا ہے، جب کوئی چیز نکال لیجائے۔اور یہ بات اسیوقت صحیح ہوسکتی ہے کہ جب ارواح کو بدن سے نکال کر باہر کیا جائے، کیونکہ اَلَّـذِيْـنَ کا مصداق آیت وَالَّـذِيْـنَ يَتَـوَفُّوْنَ میں وہی ہے اور نیر وہ نہ ہوتو جسم ہو۔اور ظاہر ہے کہ جسم مورد توفی وقت مرگ نہیں ہوتا۔اسلئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگوں کی روح کو اپنے جسم سے وہ علاقہ نہیں رہتا، جو وقت حیات تھا۔ایسے ہی مضمون تَـرَکَ بھی گرفتاران محبۃ الاولادواموال کے حق میں جبھی صحیح ہوسکتا ہے، جبکہ اس خاکدان سفلی کو چھوڑ کر عالم علوی کو چلے جائیں۔سو یہ بھی جبھی متصور ہے جبکہ روح کو وہ تعلق اول نہ رہے، ورنہ وہ ترک نہیں مثل بندیوان دست و پابستہ ملاقات اولادوتصرفات اموال سے مجبور ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قیدیوں کے ازواج واموال انکی مِلک سے خارج نہیں ہوتے۔اور یہی وجہ ہے کہ سکتہ والے کی ازواج واموال بدستور اسکی مِلک میں باقی رہتے ہیں۔ان دونوں میں فرق ہے کہ قیدیوں کے اجسام مقید ہوجاتے ہیں، مگر انکا قید خانہ یہی جسم خاکی ہوتا ہے۔اسلئے وہ پھیلاؤ جو بذریعہ ظہور افعال اختیار ہوا کرتا ہے اور نور آفتاب وقمر کے پھیلاؤ کے مشابہ ہوتا ہے۔ایسی طرح بند ہوجاتا ہے، جیسے چراغ پر کسی ظرف کے رکھ دینے کے وقت اسکے نور کا پھیلاؤ بند ہوجاتا ہے۔سو یہی صورت بعینہ انبیاء علیہم السلام کی موت کی سمجھ لو۔اتنا فرق ہے کہ سکتہ میں سوائے بعض مواقع تمام اعضاء میں سے روح کھینچ لی جاتی ہے اور تمام قوائے روحانی مثل قوت سامعہ وقوت باصرہ اپنے اپنے مواقع سے کھینچ لیتے ہیں اور اسوجہ سے اگر تدبیر مناسب نہ بن پڑے، تو رفتہ رفتہ بالکل کھینچ کر باہر کردیتے ہیں۔جبکہ ارواح انبیاء کو بدن کیساتھ علاقہ بدستور رہتا ہے مگر اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہے اسلئے حیات جسمانی کو نسبت سابق اسیطرح قوت ہو جاتی ہے، جیسے ظرف مذکور کے رکھ دینے کے بعد چراغ کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی ہے۔اور سکتہ میں ایسا ہوجاتا ہے، جیسے فرض کرو کہ چراغ ٹمٹمانے لگے اور گل ہونے کو ہو۔ بہر حال ارواح انبیاء کرام کو بدستور اپنے ابدان کیساتھ تعلق رہتا ہے، بلکہ کیفیت حیات بوجہ اجتماع مدت اور ہی قوت آجاتی ہے اور مثل چراغ وظلمت ظرف محیط حیات وموت دونوں مجتمع ہوجاتے ہیں۔الغرض بقائے اجساد انبیاء کا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں اور اسی وجہ سے انکے اموال میں میراث کا جاری ہونا مقرر نہیں ہوا۔اس میں عظمت انبیاء منظور ہے۔

اختلافی نوٹ از مرتب۔ مصنف نے اس معاملے میں ایک ایسا نظریہ پیش کا ہے، جسکو کسی طریق سے بھی قابل اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ نہ تو عقل کے اعتبار سے قابل فہم ہے اور نہ ہی انسانی تجربے سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ اس دعویٰ کیلئے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجساد بعد از وفات دوسرے انسانوں کے اجساد کے برعکس پھولتے پھٹتے نہیں ہیں مصنف نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ محض یہ دعویٰ کر دینا کافی نہیں ہے۔ اگر اس سلسلے میں احادیث پائی جاتی ہیں، تو ان کو پیش کرنا چاہیئے تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اگر ایسی احادیث فی الواقع پائی جاتی ہیں، تو ان کی صحت پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیئے تھی۔ علمائے فرقہ بریلوی اس بارے میں یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر رات آپ کی بیویاں مباشرت کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ اسلئے آپؐ کی بیواؤں سے نکاح کرنا منع کیا گیا۔ قرآن کریم میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی طرح بشر تھے، اس لئے ضروری تھا کہ دوسرے بشرتوں کی مانند اپنے وقت پر وفات پائیں۔ یہ دعویٰ قرآن کریم میں کہیں پر نہیں ملتا کہ آپؐ کا جسم دوسرے انسانوں کے برعکس پھولے پھٹے گا نہیں۔ جب آپ کی پیدائش دوسرے انسانوں کی طرح ہوئی اور آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو جنا اور پالا پوسا، تو ضروری تھا کہ ایک روز آپؐ کی وفات ہو اور دوسروں کی طرح زمین میں دفن کئے جائیں اور آپ کا جسم مبارک قدرت کے قانون کے تحت خاک میں مل جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۔ ترجمہ۔ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑے گا، یعنی اس پر موت آئے گی۔ اس پہلو سے آپؐ میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ امر کہ آپؐ کی بیواؤں کو آپؐ کی وفات کے بعد شادی کرنے سے روک دیا گیا، اس کی وجہ عظمت رسول خدا کا اظہار تھا، تا کوئی شخص آپؐ کی بیوہ سے شادی کرکے آپؐ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرنے لگے۔

عورتوں کو بیک وقت ایک سے زیادہ خاوند کرنے کی ممانعت کی وجہ

ا۔ عورت اولاد کے حق میں ایسی ہے، جیسے زمین پیداوار کے حق میں۔ البتہ پیداوار کو بوجہ تشابہ اجزاء برابر حصوں میں بانٹ سکتے ہیں، اس لئے اس کی شرکت میں کچھ حرج نہیں۔ لیکن اگر ایک عورت چند مردوں میں مشترک ہو، تو اول بوجہ استحقاق نکاح ہر دم ہر کسی کو استحقاق قضائے حاجت ہوگی، جس کی وجہ سے اندیشہ فساد و عناد رہے گا۔ شاید ایک ہی وقت سب کو ضرورت ہو۔ دوسرے بعد نکاح اگر بوجہ استحقاق مذکور سب اس سے اپنا مطلب نکالتے ہیں، تو درصورت توّلد فرزند واحد کو پارہ پارہ نہیں کر سکتے، تاکہ اس طرح تقسیم کرکے اپنے پارہ کو ہر کوئی لے جائے۔ اور اگر متعدد فرزند ہوں، تو بوجہ اختلاط ذکورت

وانوثت وتفاوتِ شکل وصورت وتبائن خلق وسیرت وفرق قوت وہمت موازنہ ممکن نہیں، جو ہر کوئی ایک بچے کو لے کر اپنے دل کو سمجھا لے۔ پھر بوجہ تساوی محبت جملہ اولاد کے سبب دوسری مشکل پیدا ہو جائے گی، کیونکہ ایک بچے کے وصال سے اتنا سرور نہ ہوگا، جتنا دوسروں کے فراق سے رنج اٹھانا پڑے گا۔ پھر اس وجہ سے خدا جانے کیا کیا فتنے برپا ہوں۔غرض ہر طور اس انتظام میں خرابی نظام عالم تھی۔ ہاں اگر ایک مرد ہو اور متعدد بیویاں ہوں، تو جیسے ایک کسان متعدد کھیتوں اور زمینوں کی تخم ریزی کر سکتا ہے، ایسے ہی ایک مرد بھی متعدد بیویوں سے بچے جنوا سکتا ہے اور اس کے ساتھ اور کوئی خرابی نہیں۔عورتوں کے رنج سے چنداں اندیشہ نہیں۔قتل وجدال کا کچھ خوف نہیں۔

۲۔ بیوی موافق قواعد اہل اسلام محکوم اور مرد حاکم ہوتا ہے۔اور کیوں نہ ہو، وہ مالک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مالک کہا کرتے ہیں۔اور کیونکر نہ کہیں، باندیاں تو مملوک ہوتی ہی ہیں، بیبیاں بھی بدلیل مَہر ان کی خریدی ہوئی ہوتی ہیں۔اگر اول الذکر میں اعتناق تو یہاں طلاق یعنی جیسے باندی غلام باختیار خود قید غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ہاں مالک کو اختیار حاصل ہے، وہ چاہے تو آزاد کر دے۔ایسے ہی بیوی باختیار خود قیدِ خاوند سے رہا نہیں ہو سکتی۔البتہ خاوند کو اختیار ہے، چاہے تو طلاق دیدے۔ جیسے باندی غلام کا نان ونفقہ مالک کے ذمہ ہوتا ہے، اسی طرح بیوی کا نان ونفقہ بھی خاوند کے ذمہ ہے۔ جیسے مالک ایک اور غلام باندیاں کئی کئی ہوتی ہیں، ایسے ہی خاوند ایک اور بیویاں کئی کئی ہو سکتی ہیں۔ بالجملہ بیویاں موافق قواعد اہل اسلام مملوک اور خاوند مالک اور حاکم ہوتا ہے۔اور خاوند کی طرف سے بیع و ہبہ کا نہ ہو سکنا دلیل عدم المِلک نہیں۔اگر یہ بات دلیل عدم المِلک ہوتی، تو خدا کا مالک ہونا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بیع و ہبہ سے مِلک کا منتقل نہ ہونا بعد ثبوت مِلک، جس کا بیان ہو چکا، اسی طرح قوت مِلک پر دلالت کرتا ہے، جیسے خدا کی مِلک کا منتقل نہ ہونا اس کی مِلک کی قوت پر دلالت کرتا ہے۔اور اسی وجہ سے شوہر کو دربارہ مالکیت خدا سے مشابہت تام ہے۔ ہر چند خدا کی مِلک کے سامنے شوہر کی مِلک برائے نام ہے اور پھر اس کے ساتھ خدا کی مِلک ممتنع الانفکاک اور شوہر کی مِلک بوجہ ثبوت طلاق ممکن الزوال۔مگر پھر بھی جس قدر خدا کی مِلک سے شوہر کی مِلک مشابہ ہے، اس قدر اور کسی کی مِلک مشابہ نہیں۔الحاصل شوہر کی مِلک میں کچھ کلام نہیں، بلکہ اس کی مِلک اوروں کی مِلک سے قوی ہے۔ وہ حاکم ہے اور بیوی محکوم۔اور ظاہر ہے کہ محکوموں کا تعدد اور ان کی کثرت موجب عزت ہے۔ وہ بادشاہ زیادہ معزز سمجھا جاتا ہے، جس کی رعیت زیادہ ہو۔اور حکام کی کثرت موجب ذلت ہے۔یوں بھی طریقہ حکام کی کثرت کا نہیں۔ ہاں یہ صورت ہوتی ہے کہ نیچے سے اوپر تک جتنے حکام ہوں، ان سب کا یا اکثر کا یا بعض کا محکوم

ہونا۔عوام رعیت کو دیکھئے، وہ سب کے محکوم ہوتے ہیں اور کسی کے حاکم نہیں ہوتے۔ان سے بڑھ کر کوئی ذلیل نہیں۔اور حکام، ماتحت حکام، بالا دست کے تو محکوم ہوتے ہیں مگر رعیت کے حاکم۔وہ رعیت سے معزز اور حکام بالا دست کے مقابلے میں ذلیل ہوتے ہیں۔اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔بادشاہ سب کا حاکم ہوتا ہے اور کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔اس سے بڑھ کر کوئی معزز ہی نہیں ہوتا۔اس صورت میں اگر کسی عورت کے متعدد خاوند ہوں، تو اول تو یہ ایسی صورت ہوگی، جیسے ایک شخص تو رعیت ہو اور بادشاہ و حاکم بہت سے ہوں۔سب جانتے ہیں کہ یہ دنیا کا دستور نہیں ہے۔

۳۔مرد کیلئے بہت سی بیویاں ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔کیونکہ مرد مخدوم ہے اور بیوی خادم۔ ایک مخدوم کیلئے بہت سے خادم ہو سکتے ہیں۔مگر ایک خادم بہت سے مخدوموں کیلئے نہیں ہوسکتا۔

۴۔عورت کے اندر خدا تعالیٰ نے فطرتاً ایک شرم وحیا کا وصف ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ غیر مردوں کے سامنے آنے سے شرم کھاتی ہے۔عورت جب مرد سے بات کرنے لگتی ہے، تو شرم کے مارے بار بار اپنی آنکھیں جھکا لیتی ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ فاحشہ عورتوں کے سوا، جنکی فطری قوت حیا بالکل ضائع اور معدوم ہو جاتی ہے، باقی سب عورتیں اپنی نیچرل حالت میں مردوں سے حیا اور حجاب کرتی ہیں۔حیا کا مادہ، جو خدا تعالیٰ نے انکی فطرت میں پیدا کر رکھا ہے، ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک ہی خاوند کے لئے ہیں۔

۵۔تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرد عندالضرورت کئی بیویاں کر لے، تو سبھی کے ساتھ نبھا سکتا ہے۔مگر ایک عورت دو خاوندوں کی بی بی ہو کر کبھی نبھا نہیں سکتی۔

۶۔دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے اکثر زیادہ رہتی ہے اور یہ امر صریح دلیل ہے اس بات کی کہ ایک مرد کے لئے کئی جورواں ہو سکتی ہیں، مگر اس کے برعکس منشاء قدرت نہیں۔

۷۔مرد کو پروردگار نے عورت کی نسبت قوی اور زبردست پیدا کیا ہے اور عورت کو نازک اور ضعیف الاعضاء۔لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ قوی کئی زیردستوں کو اپنے ماتحت رکھ سکتا ہے نہ کہ برعکس۔

۸۔قدرتی تعلق کے بارے میں غور کریں، تو ایک عورت کے اگر ایک سو خاوند ہوں، تو وہ ایک حمل میں ایک یا دو بچوں سے زیادہ کو جن نہیں سکتی۔مگر ایک مرد کی چاہے جسقدر جورو ہوں، وہ سب منشاء قدرت کو پورا کر سکتی ہیں۔

۹۔عقلاء نے عورت کو اس نیچرل تعلق کی جہت سے، جو مرد و عورت میں ہے، جوتی سے تشبیہ دی ہے۔پس ایک پاؤں کی کئی جوتیاں ہو سکتی ہیں، مگر جوتی کا کئی پاؤں کے لئے ہونا کہیں بھی رائج نہیں۔

بہشت میں مردوں کو زیادہ عورتیں ملنے کا راز

اورعورتوں کے لئے ایک سے زیادہ خاوند نہ ہونیکی وجہ

ا۔انعام میں راحت کے سامان اور اعزار و اکرام کے اسباب تو دیئے جاتے ہیں ،مگر رنج و کلفت کے سامان اور تحقیر کے اسباب انعام میں نہیں دیئے جاتے۔ یہ چیزیں سزا کے لئے ہوتی ہیں۔ بہشت میں جو کچھ ہو گا بطور انعام و جزاء ہوگا۔اگر وہاں ایک مرد کو متعدد عورتیں ملیں،تو اعزار و اکرام بھی ہے اور راحت و آرام بھی۔اور ایک عورت کو متعدد خاوند ملیں،تو راحت و آرام تو کچھ زیادہ نہ ہوگا۔خاص طور پر اس صورت میں جب کہ مرد کی قوت سب عورتوں کی خواہش کے برابر یا کچھ زیادہ بڑھا دی جائے، جیسے اہل اسلام کی روایات اس پر شاہد ہیں۔کیونکہ اس صورت میں آرام و راحت و اعزار و اکرام نہ ہوگا بلکہ الٹی تحقیر و تذلیل و توہین ہوگی۔

اگر ایک عورت کے لئے کئی خاوند قرار دیئے جاتے ،تو یوں کہو کہ حاکم متعدد ہوں گے۔اور حاکم متعدد ہوئے ،تو جتنے حاکم زیادہ ہوں گے، اتنی ہی محکوم میں ذلت زیادہ ہوگی۔سو یہ تحقیر اور تذلیل اور توہین عورت کے حق میں اگر جائز ہوتی ،تو دنیا کے کسی مذہب میں شاید اس کی اجازت ہوتی۔

بہشت میں، جو جائے عزت و آرام ہے، یہ صورت تحقیر ہرگز ممکن الوقوع نہیں۔ ہاں اگر ایک خاوند سے رفع ضرورت متصور نہ ہوتی یا لذت میں کمی رہتی ،تو اس صورت میں شاید مجبوراً یہ امر ان کے لئے تجویز کیا جاتا۔مگر روایات صحیحہ اہل اسلام اس پر شاہد ہیں کہ ایک مرد کو بہشت میں اتنی قوت ہوگی کہ علی الاتصال تیس تیس عورتوں کے پاس جا سکے۔ بالجملہ ایک مرد بغرض رفع ضرورت کافی ہے،اس سے زیادہ کی حاجت نہیں،البتہ تحقیر و تذلیل زیادہ ہوگی۔اور ظاہر ہے کہ جنت جائے اعزاز و اکرام ہے موقع تحقیر و تذلیل نہیں۔

۲۔ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ جس طرح رب العالمین نے دنیا کے اندر مرد و عورت کی حالت اور فطرت میں اختلاف روا رکھا ہے۔یعنی مرد حاکم ہے اور عورت محکوم،مرد مخدوم ہے اور عورت خادم،مرد کا پاسا زبر ہے اور عورت کا زیر۔اسی طرح جنت میں بھی ان کی حالتوں میں اختلاف ہوگا۔

دنیا میں جس عورت نے کئی خاوند کئے وہ قیامت میں کس کے ساتھ ہوگی؟

سئل صلی اللہ علیہ وسلم عن المراۃ تزوج الرجلین والثلاثۃ، مع من یکون منھم یوم القیامۃ، فقال تخیر فتکون مع احسنھم خلقا۔ترجمہ۔یعنی نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ جس عورت نے دنیا میں دو یا تین تک خاوند کئے ہوں وہ قیامت میں کس کے ساتھ ہوگی۔فرمایا

اس کو اختیار دیا جائے گا۔ پس وہ اس کے ساتھ ہوگی، جس کے اخلاق (عادتیں) اچھی ہوں گی۔

عورت کے لئے کیوں ایک ہی خاوند ٹھہرایا گیا؟

سوال ۔ جب کہ مرد کے لئے چار عورتیں منکوحہ جائز ہیں، تو عورت کے لئے کیوں جائز نہ ہوا کہ ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ نکاح کرے؟

جواب ۔ یہ امر خدا تعالیٰ کی کمال حکمت اور اس کے احسان ورحمت ورعایت مصلحت عامہ میں سے ہے کہ جیسا اس کی ذات پاک ہے، ایسا ہی اس کے کام اور اس کی شریعت کی بنا بھی پاکی ومصلحت پر ہے۔ اگر عورت کے لئے مباح کیا جائے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ خاوند کرلے، تو نسب ضائع ہو جائیں اور اس عورت کے خاوندوں میں آپس میں جنگ وجدل وقتل کی نوبت پہنچے اور خطرناک بلائیں اور فتنے برپا ہوں۔ پھر اس عورت کا حال کیا ہو، جس میں کئی شریک ہوں۔

سوال ۔ مرد کی اتنی طرفداری کیوں کی جاتی ہے اور اس کو کیوں اجازت دی گئی کہ وہ اپنی قضائے شہوت وحاجت کرے اور ایک عورت سے ہوکر دوسری عورت کے پاس بحسب جوش شہوت و حاجت جائے۔ حالانکہ جیسا کہ مرد کو شہوت ہے، ایسا ہی عورت کو بھی ہے۔ عورت کو کیوں اسی طرح اجازت نہیں دی گئی؟

جواب ۔ عورت کی فطرت میں یہ امر مرکوز ہے کہ وہ در پردہ ومحجوب ومستور ہے اور عورت کے مزاج میں بہ نسبت مرد کے برودت وسردی زیادہ ہوتی ہے۔ اور عورت کی ظاہری حرکت بہ نسبت مرد کے بہت کم ہوتی ہے۔ اور مرد کو قوت وحرارت بہ نسبت عورت کے زیادہ دی گئی ہے۔ اس لئے مرد کو ایسے امور میں مبتلا کیا گیا، جن میں عورت کو مبتلا نہیں کیا گیا۔ مرد کے لئے چار منکوحہ عورتیں جائز رکھی گئیں۔ یہ امور مردوں کی خصوصیتوں میں سے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مردوں کو رسالت ونبوت، خلافت اور بادشاہی و امارت میں عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ اور مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا، تاکہ وہ عورتوں کے مصالح و بہبودی میں کوشاں رہیں اور ان کے امور معاش کے لئے چلتے پھرتے رہیں۔ اور خطرناک مقامات میں وارد ہوں اور جنگلوں وبیابانوں کو طے کریں اور اپنی جانوں کو عورتوں کے لئے محنت ومشقت میں ڈالیں۔ پس خدا تعالیٰ نے مردوں کی قدر دانی کی ہے اور ان کو وہ اختیارات دیئے ہیں، جو عورتوں کو نہیں دیئے۔ اور مردوں کو وہ طاقتیں دی ہیں، جو عورتوں کو نہیں دیں۔ جب تم مردوں کی محنت ومشقت پر غور کروگے، جو کہ عورتوں کے مصالح وبہتری میں ساعی رہتے ہیں، تو تم پر صاف عیاں ہو جائیگا کہ عورتوں کی محنت وابتلاء وغیرت مردوں کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ اور مردوں کا حصہ محنت ومشقت وتحمل وغیرت میں

زیادہ تر ہے اور یہ امر خداتعالیٰ کے کمال حکمت اور اس کی رحمت پر مبنی ہے۔ جب کہ مرد پر اس قدر بوجھ ڈالے گئے ہیں، تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ان بوجھوں کے برداشت کی طاقت بھی زیادہ رکھی گئی ہے اور وہ کئی عورتوں کو بھی رکھ سکتا ہے۔ اور جب کہ عورت پر اس قدر بوجھ نہیں ڈالے گئے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان بوجھوں کے برداشت کی طاقت نہیں رکھتی۔ اس لئے خداتعالیٰ نے عورت کی فطرت وسرشت کے مطابق ہر ایک عورت کے لئے ایک ہی خاوند تجویز فرمایا۔

عورت کی شہوت مرد سے کم ہونے کا باعث

یہ جو کہا جاتا ہے کہ عورت کی شہوت مرد سے زیادہ ہے، یہ بات درست نہیں ہے۔ جبکہ شہوت کا منبع ہی حرارت ہے، تو عورتوں کی حرارت کو مردوں کی حرارت سے کیا نسبت ہے۔ اگر ایسا امر ہوتا تو خداتعالیٰ مناکحت کا معاملہ اس کے برعکس مقرر کرتا اور عورت کو حرارت وقوت وطاقت زیادہ دی جاتی۔ اور محنت ومشقت واکتساب امور معاش کا کام عورت پر زیادہ ڈالا جاتا، جب کہ معاملہ برعکس ہے۔

عورت کو جوش شہوت کیوں زیادہ ہوتا ہے؟

سوال۔ جبکہ مرد کی نسبت عورت کو شہوت کم ہے، تو عورت کو کیوں جوش شہوت زیادہ ہوتا ہے؟

جواب۔ عورت کو بباعث فراغت ونکمّا رہنے اور ان محنتوں ومشقتوں میں نہ پڑنے سے، جو اس کو شہوت وقضائے حاجت سے روکیں ہوتی ہیں، اس پر شہوت غالب آجاتی ہے۔ اور اس کے پاس کوئی روک نہیں ہوتی۔ جو اس کے دل کو خیال فاسد سے فارغ اور نفس کو قضائے شہوت سے خالی کر دے۔ اور عورت کو بالکل ہوش شہوت سے ٹھنڈا کر دے۔ جب عورت کو ایسی آڑ نہ ملے، تو بباعث کمی طاقت وقوت واندک عقل قلت حوصلہ کے وفور شہوت کو روکنے سے عاجز آجاتی ہے۔ ایسے موقعہ پر گمان کرنے والا خیال کرتا ہے کہ عورت کی شہوت مرد کی شہوت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ جب کہ معاملہ ایسا نہیں، کیونکہ جب مرد عورت سے مباشرت کر چکتا ہے، تو عورت سست وکمزور ہو جاتی ہے اور مرد اسی وقت دوسری عورت سے بھی مباشرت کر سکتا ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک ہی رات میں اپنی ساری عورتوں کے پاس جا سکتے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی نوے عورتوں کے پاس ایک رات میں جایا کرتے تھے۔ اور یہ امر اس بات پر شاہد ہے کہ ان کے اندر ہر عورت کے پاس جانے کے وقت ایک قوت وحرارت موجود ہوتی تھی، جو باعث وطئی وجماع کی تھی۔ اور عورت میں یہ امر نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ عورت سے جب مرد جماع کر چکتا ہے، تو وہ

اسی وقت دوبارہ قضائے شہوت نہیں چاہتی۔اس کا جوش شہوت سست ہو جاتا ہے۔جب کہ مرد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔اور یہ امر قانون قدرت وشرع وفطرت کے ساتھ مطابق وموافق ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب الرق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اسلامی غلامی کی فلاسفی

اور اسلام سے پہلے غلامی کی حالت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ النَّاسَ نَوۡعَیۡنِ اَلۡاَدَانِیۡ وَ الۡاَعَالِیۡ لِیَتَّخِذَ بَعۡضُھُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِیًّا
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ مُحَمَّدِ الۡمُصۡطَفٰی وَ اَحۡمَدِ الۡمُجۡتَبٰی اَلَّذِیۡ جَعَلَہ' اَعۡدَلِ النَّاسِ
لِیَکُوۡنَ لَھُمۡ اُسۡوَۃً حَسَنَۃً وَ شَفِیۡعًا وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصۡحَابِہٖ ھُدَاۃِ طَرِیۡقِ الۡحَقّ وَ حُمَاۃِ الۡاِسۡلَام

(ماخوذ از علامہ مولوی محمد علی صاحب۔ حوالہ باب کے آخر میں دیکھیں)

امابعد۔ واضح ہو کہ، جن لوگوں نے غلامی کے خلاف لکھا ہے، انہوں نے اس کی ایسی تقبیح کی ہے اور اسے سرتاپا ایسا خوبیوں سے خالی اور مضرات سے پُر ثابت کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جو شخص ٹھنڈے دل سے اور جوش سے خالی ہو کر اس مضمون پر قلم اٹھاوے اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ہر شئے کی تہ تک پہونچے اور بدی پر اس وقت بھی لعنت بھیجنے کے لئے تیار ہو، جب وہ نیکی کا لباس پہن کر نکلے اور نیکی کی اس وقت بھی تعریف کرنے کے لئے آمادہ ہو، جب دنیا اس نیکی کو برا سمجھ رہی ہو۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ابتداء ہی میں اس غلط فہمی کو دور کرے کہ غلامی کا رواج سراسر لغو اور فضول تھا، جس سے فائدہ کوئی نہ تھا بلکہ سراسر نقصان ہی نقصان تھا۔ میں اس رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ حق یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی اپنی تدریجی ترقی میں ایسی حالتوں سے ہو گذری ہے کہ ان حالات کے ماتحت غلام بنانے میں نہ صرف وہ حق پر ہی تھی بلکہ ضروری تھا کہ ایسے حالات میں غلامی کا رواج ہوتا۔ دنیا میں بہت سے رواج

اب تک چلے آتے ہیں جن پر غور کرو تو دل پر ایک دہشت سی پیدا کرتے ہیں۔ مگر تاہم بہت سی اغراض ترقی کے لئے ان کا جاری رہنا ضروری ہے۔ جس وقت ایک فتحیاب جرنیل بڑے بڑے جہازوں کو، جن پر ہزاروں انسان ملک کے چیدہ اور بہادر نوجوان موجود ہوتے ہیں، ایک دم میں غرق کر کے سمند کی تہہ میں پہونچا دیتا ہے یا ایک بڑے شہر پر گولہ باری کر کے بیشمار بیگناہ عورتوں اور بچوں کو تباہ کر دیتا ہے، تو کبھی اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آتا۔ مگر ہر حالت میں یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ وہ ایک سخت دل ظالم اور بے رحم انسان ہے۔ وہ لوگ، جو اپنی رحمدلی کے سبب ایک انسان کے قتل کو برداشت نہیں کر سکتے اور اس کے واقعات کو سن کر کانپ اٹھتے ہیں، وہی دوسرے موقعہ پر ہزار ہا انسانوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے یا اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر کبھی لرزہ نہیں کھاتے بلکہ بسا اوقات خوش ہوتے ہیں۔ جنگوں کا ہونا انسانی سوسائٹی کی ضرورت میں سے رہا ہے اور اب تک یہی حال ہے۔

جوں جوں انسانی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جاوے یہ معلوم ہوگا کہ لڑائیاں انسان کی ابتدائی ترقی میں اس کی موجودہ حالت سے بڑھ کر ضروری رہی ہیں اور انہیں جنگوں کے لوازمات میں سے ہی غلامی بھی ہے یا تھی۔ بلکہ درحقیقت غلامی کا رواج انسانی ترقی میں ایک عظیم مرحلہ تھا۔ کیونکہ اس رواج کے ساتھ وہ بے رحمی جاتی رہی، جس کی رو سے کل کے کل اسیر، جو کسی دوسری قوم کے جنگ میں ہاتھ لگے ہوں، قتل کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک عیسائی مصنف لکھتا ہے۔

" مگر اس بات کو ابھی تک لوگوں نے اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پچھلی تمدنی تدریجی ترقی میں جنگ ایک ضروری فرض کو ادا کرنے والی تھی۔ اول اس لحاظ سے کہ جنگ کا اصلی مقصد یہ تھا کہ متفرق قومیں ایک ہو جائیں اور اس لحاظ سے ضروری تھا کہ مخالفین میں سے جو لوگ پکڑے جائیں وہ ایک ماتحتی کی حالت میں رکھے جائیں تا دوبارہ اس قوم کو سر اٹھانے کی طاقت نہ ہو اور یوں جنگ کا اصل مقصد حاصل ہو۔ دویم۔ اس لحاظ سے کہ یہ مسلم امر ہے کہ ابتداء میں انسانی سوسائٹی میں محنت و مشقت کے کاموں سے گریز کیا جاتا ہے اور عموماً آرام طلبی زیادہ ہوتی ہے۔ پس جب ایک قوم کے لوگ اپنے مخالف لوگوں کے درمیان آ کر رہیں گے تو وہ سوائے مجبوری کے کبھی کام نہ کریں گے اس لئے ضروری ہوا کہ ان کو غلام بنا کر اس سے کام لیا جاوے۔ اس دوسرے امر کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا میں کسی قوم میں بھی خود بخود اور خوشی سے محنت کو اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ہر ایک ملک میں جس کا ہمیں علم ہے یہی نظر آتا ہے کہ زبردستوں نے مجبور کر کے زیردستوں کو کام پر لگایا ہے اور ان سے محنت شاقہ کے کام لئے ہیں اور آخر جب مدت تک یہ مجبوری چلی آئی تو پھر اس قوم کی عادت میں وہ امر داخل ہو گیا۔ امر اول کے لحاظ سے

آزاد آدمی لازماً جنگ پیشہ تھے اور غلام محنت کا کام کرنے والے لوگ تھے اور یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے لئے بطور معاون تھے۔ اور ایک کا وجود دوسرے کے سہارے اور آسائش کے لئے اور اس کے کام پر لگا رہنے کے لئے ضروری تھا۔ اور یوں بغیر مقابلے اور جھگڑے کے وہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہوکر انسانی سوسائٹی کی ترقی کے ذرائع تھے"۔

اسیران جنگ کے قتل کی بجائے انکے غلام بنا لینے کے رواج کی تدریجی ترقی اسرائیلی شریعت میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اسیران جنگ کو الگ چھوڑ کر اول تو یہی حکم ہے کہ "جو کوئی فقط خداوند کے سوا کسی معبود کیلئے قربانی کرے وہ عذاب سے مار ڈالا جائے"۔ (خروج ۲۲ /۲۰)۔ ایسا ہی استثناء ۱۳ آیت ۱۲۔۱۸ میں یہ حکم ہے کہ جس شہر کے لوگ غیر معبودوں کی پرستش کرنیوالے ہوں "تو تُو اس شہر کے باشندوں کو تلوار کی دھار سے ضرور قتل کرے گا اور اسے اور سب کچھ، جو اس شہر میں ہے، اور وہاں کے مواشی تلوار کی دھار ہی سے نیست و نابود کریگا۔ اور اسکی ساری لوٹ کو وہاں کے کوچے کے بیچوں بیچ اکٹھا کریگا اور اس شہر کو وہیں کی لوٹ کو خداوندا اپنے خدا کے لئے آگ سے جلا دیگا۔ اور وہ ہمیشہ کو ایک ٹیلا ہو گا، پھر بنایا نہ جائیگا "۔ پھر استثناء ۲۰/ ۱۶۔۱۷ میں یہ لکھا ہے۔" لیکن ان قوموں کے شہروں کو جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو بلکہ تو ان کو حرم کی جیو۔ حتی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی۔ جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے"۔ یہ احکام عمل میں بھی آتے رہے۔ چنانچہ گنتی ۲۱/ ۳ میں مذکور ہے۔" چنانچہ خداوند نے اسرائیل کی آواز سنی اور کنعانیوں کو گرفتار کر دیا اور انہوں نے انہیں اور انکی بستوں کو حرم کر دیا"۔ (حرم کر دینے سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک جاندار شے کو ہلاک کر کے تباہ کر دیا)۔ پھر قاضیون ۱/ ۱۷ میں لکھا ہے۔ "اور انہوں نے ان کنعانیوں کو، جو صفت میں رہتے تھے، جا مارا اور شہر کو حرم کر دیا"۔ ایسا ہی دیکھو قاضیون ۲۱/ ۱۰۔۱۲ جہاں لکھا ہے۔ "اور انہیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو جا کر عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرو"۔ یشوع ۶/ ۲۴۔ " پھر انہوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا"۔ اسموئیل ۱۵/ ۳ "سواب تو جا اور عمالیق کو مار اور سب جو کچھ کہ انکا ہے یک لخت حرم کر اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت ننھے بچے اور شیر خوار اور بیل بھیڑ اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر"۔ تواریخ ۴/ ۴۱ "اور معونیم کو جو وہاں ملے قتل کیا، ایسا کہ وے آج کے دن تک نابود ہیں"۔

معلوم نہیں کہ ان پادری صاحبان کو ایسے ایسے واقعات پڑھ کر کچھ شرم آتی ہے یا نہیں، جو اسلام پر اسلئے اعتراض کرتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے بھی تلوار کیوں اٹھائی گئی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے۔

اسرائیلی شریعت کوغور کی نگاہ سے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اسیران جنگ کو بجائے قتل کرنے کے غلامی میں لینے کا نرم قانون بھی مروج ہونا شروع ہو گیا تھا اور یوں ان کی زندگی بچ کر وہ اپنے آقا کی خدمت میں زندگی بسر کرتے (تھے)۔ اسی لئے غلامی کا قانون بھی حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں پایا جاتا ہے۔ مگر عام رسم اس زمانہ کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کو قتل کرتے (تھے) اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جاتا (تھا)۔ دیکھو استثناء باب ۲۰ آیت ۱۰۔۱۴۔ مگر اسرائیلیوں کے درمیان صرف جنگ ہی غلام بنانے کا ذریعہ نہ تھی، بلکہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ غلاموں کی خرید وفروخت بھی کرتے تھے اور بعض ایسی اقوام ان کے قریب قریب آباد تھیں، جو غلامی کی تجارت میں بہت مشہور تھی۔ اس ذریعہ سے غلامی کی کثرت ہوگئی۔

مگر اسرائیلی شریعت میں غلام کی حالت ایسی خراب نہ تھی، جیسی دوسری قدیم اقوام کے اندر۔ کل شامی قوموں کے درمیان غلام کو خاندان کا ایک ممبر سمجھا گیا ہے اور اسی لئے ان اقوام کے اندر آقا کا سلوک غلام کے ساتھ عموماً نرم رہا ہے۔ اگرچہ مالک کو مملوک پر ہر طرح سے اختیار حاصل تھا۔ مگر وہ اس کو جان سے نہیں مار سکتا تھا۔ صرف ایک استثناء تھی، جو خروج باب ۲۱ آیت ۲۰۔۲۱ میں مذکور ہے۔ "اور اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور وہ لاٹھیاں کھاتے ہوئے مر جائے تو اسے سزا دی جائے۔ لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جیوے تو اسے سزا نہ دی جائے۔ اس لئے کہ وہ اس کا مال ہے"۔ اگر آزاد آدمی کسی دوسرے کے غلام یا لونڈی کو مار دیتا تھا تو صرف خون بہا مالک کو دینا ہوتا تھا۔ (خروج باب ۲۱۔ آیت ۳۲) جو غلام قوم اسرائیل کے تھے ان سے غیر اسرائیلوں کی نسبت عمدہ سلوک ہوتا تھا۔ چھ سال غلام رہنے کے بعد وہ بغیر فدیہ دینے کے آزاد سمجھے جاتے تھے۔ (خروج باب ا۔ آیت ۲) مگر عبرانی لونڈی کے ساتھ غیر اسرائیلی غلام شادی نہ کرسکتا تھا اور مالک یا مالک کا بیٹا ہی اس پر تصرف کرسکتا تھا۔ اسرائیلی غلام جب چھ سال بعد آزاد ہوتا، تو مالک کو یہ بھی حکم تھا کہ اسے جاتے وقت کچھ ساتھ بھی دے (استثناء باب ۱۵۔ آیت ۱۳۔۱۴) مگر دوسرے غلاموں کو ان حقوق میں سے کوئی حق حاصل نہ تھا۔ ہاں اس کو عبادت میں شریک کرلیا جاتا (تھا)۔ سو اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کسی اور طرح پر پرستش کرنے کا مجاز ہی نہ تھا۔ بہر حال یوں خاندان میں شامل ہو جانے سے غلام کو فائدہ ضرور پہونچتا تھا۔

یونانیوں اور رومیوں میں غلامی کے متعلق چند لفظ بے موقعہ نہ ہوں گے۔ یونان میں اسیران جنگ کے علاوہ کئی طرح سے لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ آزاد ماں باپ اپنے بچے کو بیچ کر غلام بنا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور غلام بھی بازار میں بکنے کے لئے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ چُرا کر یا زبردستی

چھین کر بھی غلام بنا لئے جاتے تھے۔ یونانی تہذیب کے بڑے بڑے مرکزوں میں غلاموں کی تعداد بہت بڑی ہوتی تھی۔ ایتھنز میں ۱۰۲۱۰۰۰ اصل باشندوں کی آبادی میں چار لاکھ غلاموں کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ کارنتھ میں چار لاکھ ساٹھ ہزار۔ ایجانیا میں چار لاکھ ستر ہزار غلاموں کی تعداد بتائی جاتی ہے۔ بعض مؤرخوں نے ان اعداد میں کسی قدر مبالغہ بیان کیا ہے۔ مگر کم سے کم اندازہ، جو غلاموں کی آبادی کا کیا گیا ہے، اس کی رو سے بھی غلاموں کی آبادی آزاد آبادی سے تگنی بیان کی جاتی ہے۔

رومیوں کے درمیان غلامی کا اصل منبع جنگ ہی تھی۔ مگر جوں جوں دولت بڑھتی گئی غلاموں سے خدمت لینے کی ضرورت بھی زیادہ ہوتی گئی اور یہ ضرورت دو طرح سے پوری ہوتی رہی، یعنی ایک حد تک اسیران جنگ کی تعداد بھی یوماً فیوماً ترقی کرتی گئی اور دوسری طرف غلامی کی تجارت شروع ہو کر خرید کے ذریعہ غلام آنے لگے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے کہ "اپیرس میں ایمیلیس پالس کی فتوحات کے بعد ایک لاکھ پچاس ہزار قیدی بیچے گئے۔ دو اور مقاموں پر بھی جنگ کے قیدیوں کی تعداد اسی قدر بیان کی گئی ہے۔ سیزر نے ایک ہی موقعہ پر تریسٹھ ہزار قیدی فروخت کئے۔ اگسٹس نے سلاسی کے ملک میں ۴۴ ہزار قیدی گرفتار کئے۔ قحط اور تکلیفوں اور اکھاڑوں کی ہلاکت کے بعد بھی یہودی جنگ میں ستانوے ہزار غلام بنائے گئے"۔

۱۴۰ قبل مسیح اور ۲۳۵ء کے درمیان کے زمانے میں بحساب اوسط ہر ایک آزاد کے لئے تین غلام تھے۔ یعنی کل آزاد آبادی انہتر لاکھ چوالیس ہزار اور غلاموں کی آبادی دو کروڑ آٹھ لاکھ بتیس ہزار تھی۔ امراء کے پاس غلاموں کی ایک خاصی فوج جمع ہوتی تھی۔ اگسٹس کے زمانے میں ایک شخص چار ہزار ایک سو سولہ غلام چھوڑ مرا۔ معلوم ہوتا ہے یونان اور اٹلی میں اس زمانے میں وسیع پیمانے پر غلامی کی تجارت ہوتی تھی۔

رومی سلطنت کی نسبت یونان میں غلاموں کی حالت اچھی تھی۔ مگر یونان میں بھی ان غلاموں کے علاوہ، جن سے گھر کے کام لئے جاتے تھے، دوسرے غلاموں سے سخت محنت لی جاتی تھی۔ جو غلام زراعت کے کام میں لگائے جاتے تھے، ان کو زنجیریں ڈال کر کام پر لگایا جاتا تھا اور ان سے محض چار پایوں کا سا سلوک ہوتا تھا۔ غلاموں اور عورتوں کی شہادت ان کو سخت اذیت پہونچا کر لی جاتی تھی۔ اگر غلام کا کوئی عضو کاٹ دیا جاتا تھا یا اسے کوئی ضرب شدید پہونچائی جاتی، تو غلام کو کوئی حق نہ پہونچتا بلکہ اس کا معاوضہ مالک کو دلایا جاتا تھا۔ رومی قانون کے بموجب مالک کو مملوک پر پورا حق حاصل تھا، یعنی جو چاہے اسے کرے۔ یہاں تک کہ اسے جان سے مار ڈالنے کا بھی اسے حق حاصل تھا۔ جب

غلاموں کی تعداد ترقی کر گئی، تو چونکہ ان کے کام کی نگرانی کا انتظام عمدہ نہ ہوسکتا تھا، اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ کام کے وقت غلام کو زنجیریں ڈال دی جاویں۔ اور یہ قاعدہ یہاں تک وسیع ہوا کہ دروازہ پر جو غلام محافظ ہوتا اس کو بھی زنجیریں ڈال دی جاتیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات غلاموں سے نیک سلوک بھی کیا جاتا تھا۔ مگر غلاموں کی عام حالت نہایت ہی ذلیل اور بری تھی۔ ہلکی سزا، جو غلاموں کو دی جاتی تھی، وہ یہ تھی کہ قصبہ سے نکال کر ان کو دیہات میں مزدوری پر لگایا جاتا تھا۔ اور سخت سزا یہ تھی کہ ان کو کارخانوں یا گاؤں وغیرہ میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا، جہاں مرد اور عورتیں ملے جلے قریباً ننگے زنجیروں سے بندھے ہوئے سپاہیوں کی حفاظت اور کوڑوں کے نیچے کام کرتے تھے۔ اگسٹس کے زمانے میں ویڈیس پالیو کا ذکر ہے کہ وہ نہایت چھوٹے چھوٹے قصور پر، بلکہ اتفاقی غلطی کی وجہ سے بھی، اپنے غلاموں کو بحری اژدہاؤں کے آگے ڈالتا تھا۔

رومی سلطنت کے اندر ہی عیسائی مذہب بھی پیدا ہوا۔ اور اگر اس کا مشن غلاموں سے حسن سلوک کا ہوتا، تو سب سے اول یہی ملک تھا، جو اس کی ایسی تعلیم کا محتاج تھا۔ کیونکہ جس قدر غلاموں کی رومی سلطنت میں حالت ابتر ہو رہی تھی ایسی اور کہیں نہ تھی۔ ان کے ساتھ سخت سے سخت اور ظالمانہ سلوک ہوتا تھا۔ پس ایک مصلح کا پہلا فرض ایسی حالت میں یہ تھا کہ اگر ان کی آزادی پر نہیں تو کم سے کم ان کے ساتھ حسن سلوک پر ہی زور دیتا اور ان مظالم کو جو غلاموں پر ہو رہے تھے کھول کھول کر بیان کرتا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ حضرت مسیح کے اقوال میں، جو اسی زمانہ میں وعظ کر رہے تھے، ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس سے غلاموں پر ظلم کے متعلق ان کا اظہار ناپسندیدگی کا پایا جاتا ہو۔ کم سے کم جو اقوال آپ کے اناجیل میں درج ہیں ان میں ایک لفظ بھی غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں نہیں۔ اور نہ ہی مالکوں کو ان بیرحمیوں اور ظلموں سے روکا گیا، جو وہ غلاموں پر کرتے تھے۔

تعجب ہے کہ سرولیم میور جیسا مؤرخ اسلام پر یہ الزام دے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو دور نہیں کیا۔ درآنحالیکہ اسے علم ہے کہ بانی عیسائیت نے اپنے سارے وعظوں میں ایک دفعہ بھی ان مظالم سے لوگوں کو نہیں روکا، جو اس کی آنکھوں کے سامنے غلاموں پر ہوتے تھے۔ حضرت مسیح کی اس خاموشی کا عیسائی مذہب پر یہ اثر ہوا کہ بحیثیت مذہب غلاموں پر ظلم اور ان کی گری ہوئی اور ذلیل حالت سے اس نے کبھی نفرت ظاہر نہیں کی۔ عیسائی صاحبان کا یہ دعویٰ ہے کہ چونکہ عیسائی مذہب نے بڑی بھاری تبدیلی، جو دنیا میں کی، وہ یہ تھی کہ سب انسان آپس میں بھائی ہیں۔ اس لئے اسی تعلیم کا بالواسطہ اثر غلاموں کی حالت پر بھی پڑا۔ اور اس کے ثبوت میں یہ امر پیش کیا جاتا ہے کہ عیسائیت کے زور پکڑنے

کے ساتھ رومی سلطنت میں غلاموں کے ساتھ نرمی کو سلوک دن بدن بڑھتا گیا۔ مگر اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے۔ یہ بات کہ سب انسان بھائی ہیں تمام انبیاء کی تعلیم مشترک ہے اور مسیح سے پہلے سب نبیوں نے یہی تعلیم دی اور جب سے خدا نے شریعت دنیا میں نازل فرمائی ہے اس کے دو حصے قرار دیئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک تعلق اور اس کی مخلوق سے نیک سلوک۔ عیسائیت نے ہرگز اس بارے میں کوئی نئی تعلیم نہیں دی۔ باقی رہا رومی سلطنت میں غلاموں کی حالت کا تدریجاً بہتر ہوتے جانا۔ سو اس کا عیسائیت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ اصلاح تو عیسائی مذہب کے زور پکڑنے سے مدت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ دوسری صدی عیسائی میں، جب ابھی عیسائی مذہب کو اپنی زندگی کا فکر ہی پڑا ہوا تھا، قانون کا میلان آزادی کی طرف ہو گیا تھا۔ لڑکوں کو بیچنے وغیرہ کے رواج بند ہو چکے تھے۔ کسی انسان کو غلامی کے لئے چرانا سنگین جرم قرار دیا جا چکا تھا کہ جس کی سزا موت تھی۔ مالک سے غلام کو جان سے مار ڈالنے کا اختیار چھین لیا گیا تھا۔ اور یہ ہیڈرین کے زمانے کا ذکر ہے، جو ۱۱۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس سے بہت مدت پہلے شاہنشاہ نیرو نے، جو ۵۴ء میں تخت نشین ہوا، عدالتوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ غلاموں پر جو ظلم کئے جاتے ہیں ان کے متعلق استغاثوں کی سماعت کی جائے۔ اب یہ سب تبدیلیاں، جو قانون غلامی میں واقع ہو رہی تھیں، یہ زمانہ کی اپنی رفتار کا نتیجہ تھیں اور عیسائی مذہب کو ان سے کچھ بھی تعلق نہیں، کیونکہ عیسائی مذہب کی اپنی بنیاد ابھی متزلزل تھی اور اس کا اثر پڑنا شروع نہ ہوا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ عیسائی مذہب بجائے اپنے گرد و پیش کے خیالات پر اثر ڈالنے کے ہمیشہ دوسروں کے خیالات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کے بنیادی اصول ہی اکثر ان کفار قوم سے لئے گئے ہیں، جن کے درمیان یہ مذہب پیدا ہوا۔ پھر اس کا اثر دوسرے رواجوں پر کیا ہونا تھا۔ خصوصاً اس حالت میں جب اس کے بانی کے منہ سے ایک لفظ بھی غلامی کے دور کرنے یا غلاموں سے حسن سلوک کرنے کے متعلق نہ نکلا ہو۔ نیک اثر تو ایک طرف رہا یہاں تو تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تغیر خود رفتار زمانہ سے غلاموں کی بہتری کا پیدا ہو رہا تھا اس کو عیسائی مذہب نے ترقی دینے کی بجائے بہت کچھ روکا۔ چنانچہ رومی عیسائی بادشاہوں کے بعض قوانین سے یہ ترقی معکوس صاف معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً بچوں کی فروخت کو روکنے کا قانون پہلے پاس ہو چکا تھا، مگر قسطنطین نے اس قانون کو منسوخ کر کے پھر اس بات کو مروج کر دیا کہ آزاد والدین بچوں کو بیچ کر غلام بنا سکیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بہت سی غلامی کی سختیاں عیسائیت کی ترقی سے دور ہو گئیں اس کی اصل حقیقت میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اصلاح تو پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور اسی رفتار سے تدریجاً ہوتی چلی گئی۔ اور عیسائیت نے اس میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا نہ ہی کوئی خدمت قابل تعریف کی ہے۔ باقی

رہی عیسائیت کا وعظ کہ تمام انسان بھائی ہیں، جس سے بڑے لمبے چوڑے نتیجے نکالے جاتے ہیں، سو یہ محض خشک الفاظ ہی رہے ہیں۔ اس کے ثبوت کے لئے ایک عیسائی کی شہادت پیش کرتا ہوں۔

"مذہبی اخوت جیسی آج کل اسلام میں ایک واقعی قوت ہے، ایسی ہی یہودیوں میں بھی ایک طاقت تھی۔ اور عیسائیت کی مذہبی اخوت کے ادعا کی طرح خالی خولی دعویٰ ہی دعویٰ اور خشک لفظ ہی نہیں تھے"۔ (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا۔ کالم نمبر ۴۶۵۸)۔

اور پھر غلاموں کے بارے میں اس سنگدلی اور بیرحمی کو دیکھتے ہیں، جس کا اظہار اکھاڑوں میں ہوتا تھا اور جو پورے زور شور کے ساتھ جیٹسنین کے وقت تک جاری رہی، تو اور بھی اس دعویٰ کی حماقت کی شہادت ملتی ہے۔

ایک طرف قدیم زمانہ کی دو بڑی مہذب اقوام یعنی رومیوں اور یونانیوں میں اور دوسری طرف قدیم زمانے کے دو بڑے مذہبوں یعنی یہودیت اور عیسائیت میں غلاموں کی حالت پر غور کرنے کے بعد ہم اس قابل ہیں کہ ان مضرات کو سمجھ سکیں، جو رواج غلامی سے پیدا ہوتے تھے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف قدیم سوسائٹی میں غلامی کے رواج کے جاری رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جیسا کہ تمام اقوام کی متفقہ شہادت سے ثابت ہے۔ دوسری طرف اس کی بعض قباحتیں بھی صاف نظر آتی ہیں، جن کے دور کرنے کے بغیر غلامی انسانوں کے لئے واقعی لعنت کہی جا سکتی ہے۔ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کو اول تو جاہل اور تمام علوم سے محض نابلد رکھا جاتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ سخت ظلم کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایسی مخلوق ہے، جو صرف حقیر کام کرنے کے لئے اور ذلت میں زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور ان کو محض حیوانوں کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ دوسری طرف مالک کو مملوک پر کلی اختیارات حاصل ہونے کی وجہ سے مالک ایک چھوٹے سے ظالم بادشاہ کی طرح ہوتا تھا۔ پس اخلاقی لحاظ سے اور ایک حد تک تمدنی پہلو میں غلامی کے رواج کا اثر بہت ہی برا تھا اور سب سے بڑی اور ضروری اصلاح، جس کا یہ رواج محتاج تھا۔ وہ مالک اور مملوک کے متعلق تھی۔ اس میں شک نہیں کہ نسبتاً اسرائیلی شریعت میں بہت کچھ نرمی غلاموں کے ساتھ کی گئی تھی۔ مگر عام اثر غلامی کا یہ ہو گیا تھا کہ مالک کے ساتھ سخت دلی اور مملوک کے ساتھ ذلت لگی ہوئی تھی۔ عیسائی مذہب نے باوجود ان بڑے بڑے دعوؤں کے، جو آج پادری صاحبان منبروں پر چڑھ کر کر رہے ہیں، ان مضرات کے روکنے یا ان کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہ بتائی۔ اس لئے میں ان دوسری اصلاحوں کو بیان کرنے سے پہلے، جو غلامی میں اسلامی قانون اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں، یہ بیان کرونگا کہ غلاموں کے کے ساتھ کیسا حسن

سلوک اس پاک شریعت نے چاہا ہے۔ آقا اور غلام کے باہمی تعلقات میں عظیم الشان اصلاح اسلام نے کی ہے۔ اور اسی ایک اصلاح نے غلامی کی تمام بدیوں اور مضرات کو جڑھ سے کاٹ دیا۔ اور خاص اغراض کے لئے ایک نہایت ہی محدود دائرے میں غلامی کو برداشت کر کے حسن سلوک کے متعلق ایسی شرائط لگا دیں، جنہوں نے غلامی کی تمام اخلاقی اور تمدنی مضرات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا۔

اسلام میں غلاموں سے سلوک

یہ ایک امر واقع ہے، جسکی تصدیق روزمرہ کے واقعات سے ہو رہی ہے، کہ مسلمانوں میں مالک اور مملوک کا تعلق مغرب میں آقا اور نوکر کے تعلق سے بدرجہا بہتر ہے۔ جو لوگ صاحب مرتبہ یا صاحب ثروت ہیں، وہ غریب لوگوں کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ حقارت ان مغربی اقوام میں سب سے بڑھی ہوئی ہے، جن کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم غلامی کے رواج سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غلامی کے نام کو تو انہوں نے دور کر دیا ہے، مگر اس کی حقیقت اب بھی نوکر اور آقا کے تعلقات میں ویسے ہی پائی جاتی ہے اور نام کی تبدیلی سے حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ایک مہذب یوروپین جب ایک غیر قوم کے آدمی کو ملازم رکھتا ہے، تو وہ اسے ایک وحشی سے بھی بدتر سمجھ کر سلوک کرتا ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جب ملازم کا کام ادنیٰ درجہ کا ہو۔ اور جہاں تک سختی اور سلوک کا سوال ہے کوئی شخص امتیاز نہیں کر سکتا کہ صاحب کا سلوک اپنے نوکر سے اچھا ہے یا قدیم زمانے میں ایک رومی مالک کا تعلق اپنے غلام سے اچھا تھا۔ شاید ہی کوئی موسم گرما ایسا گذرتا ہے، جب یہ آواز ہمارے کانوں میں نہ پڑتی ہو کہ ایک غریب پنکھا قلی کو صاحب بہادر نے مار مار کر صرف اس لئے ہلاک کر دیا کہ اس بدقسمت کو تھک کر ذرا اونگھ آ گئی تھی۔ اس حالت میں مَیں نہیں سمجھتا کہ رومی مالک کو وہ کونسا اختیار اپنے غلام پر حاصل تھا، جو اب ایک مہذب عیسائی کو اپنے نوکر پر حاصل نہیں یا کونسی بدسلوکی وہ کرتا تھا، جو اب نہیں کی جاتی۔ اور گالیاں دینا یا معمولی طور پر مار لینا تو کوئی بات ہی نہیں۔ مہذب یوروپین اقوام کو غلامی کے موقوف کرنے پر اس وقت تک فخر نہیں کرنا چاہیئے، جب تک حقیقت غلامی یعنی نوکروں پر ظلم اور ان کے ساتھ بدسلوکی سے وہ نجات حاصل نہ کر لیں۔ اگر غلامی کے موقوف کرنے میں بڑی غرض یہ تھی کہ جو ظلم ایک مالک مملوک سے خدمت لینے میں کر سکتا ہے ان کو روکا جائے اور ان لوگوں کو جو غلام کہلاتے ہیں ان کی ذلیل حالت سے نکال کر دوسرے انسانوں کی طرح ان کو سمجھا جائے، تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یورپ میں سے ابھی تک غلامی کا رواج دور نہیں ہوا اور ابھی تک یورپ نے وہ مقصد حاصل نہیں کیا، جو اسلام اس سے تیرہ سو سال پہلے حاصل کر چکا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یوروپین لوگ دیسی ملازموں کو،

جن سے وہ خدمت لیتے ہیں، وحشیوں سے اچھا نہیں سمجھتے؟ پھر اتنی بات سے کیا فرق ہو جائے گا کہ وہ ان کا نام غلام نہیں بلکہ خادم رکھتے ہیں۔ آقا اور خادم کے سچے تعلقات کو سمجھنے میں یورپ ابھی اسلام سے باوجود تیرہ صدیاں گذر جانے کے بہت پیچھے ہے۔ جو ذلت قدیم اقوام میں غلام کے نام سے لگی ہوئی تھی اور پھر عیسائی نو آبادیوں کی غلامی میں لگی رہی اور جو ذلت آج بھی غریب اور کم حیثیت آدمیوں کی کی جاتی ہے اسلام نے اس کو غلامی کے نام سے قطعاً دور کر دیا اور نہ صرف لفظوں میں ہی بلکہ عملی طور پر اسے جڑھ سے کاٹ دیا۔ اسلام کے ظہور سے آقا اور غلام اور خادم اور مالک اور مملوک کے تعلقات سچے برادرانہ تعلقات سے بدل گئے۔ آقا اپنے غلام کی محنت کے کاموں میں شریک ہونے لگا۔ اور غلام اپنے آقا کی وجاہت اور عزت میں شریک ہو گیا۔ یہ صرف انہیں آقاؤں کی حالت نہ تھی، جو سوسائٹی کے درمیانی یا نچلے درجہ میں تھے، بلکہ معزز سے معزز اور دولتمند سے دولتمند آقاؤں کا بھی یہی حال تھا۔

سب سے پہلے ہمیں قرآن شریف کی تعلیم پر غور کرنا چاہئے کہ وہ غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک چاہتا ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آیت قرآن کریم میں وارد ہوئی ہے۔ وَاعْبُدُوْا اللّٰہَ وَ لَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئاً وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً وَ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسَاکِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ اِبْنَ السَّبِیْلِ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ (النساء ع ۶۔ آیت ۳۶) یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شرک مت ٹھہراؤ۔ اور احسان کرو ماں باپ کے ساتھ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والے پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ، جو تمہارے قبضے میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا، جو اترائیں (یعنی دوسروں کے حقوق کی پرواہ نہ کریں) اور بڑائی مارتے پھریں (یعنی دوسروں کو حقیر سمجھیں)۔ اس آیت شریف میں دو قسم کے احکام ایک ہی جگہ اکٹھے کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی مخلوق سے نیکی۔ اور اس دوسرے حصے میں بعض وہ لوگ، جن کے ساتھ انسان کو نیکی کرنی چاہئے، مخصوص کر کے بیان کئے گئے ہیں، تا ان کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ ان دونوں احکام کو ایک ہی جگہ بیان کرنے سے یہ مقصود ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرانا اسلام لانے کے لئے ضروری ہے، ویسا ہی مخلوق کے ساتھ بھی نیکی کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہی دو شریعت کے بھاری اجزاء ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کرنا اور اس کی مخلوق سے نیکی کرنا۔

پس جہاں انجیل غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہتی، قرآن

اسے ایسا ضروری قرار دیتا ہے جیسا والدین سے نیکی کرنا۔ کیونکہ ایک سے ہی الفاظ میں دونوں احکام بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اس قدر صاف حکم غلاموں سے نیکی کرنے کا ہے، جس سے کوئی دشمن اسلام بھی انکارنہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہیو نے اپنی ڈکشنری آف اسلام میں اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " یہ بالکل صاف امر ہے کہ قرآن شریف اور احادیث میں غلاموں کے ساتھ نیکی کرنے کی بڑے زور سے تاکید کی گئی ہے"۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ غلام کو قرآن کریم الفاظ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ سے ہی عموماً بیان فرماتا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوائے ان لوگوں کے، جو کفار کے ساتھ لڑائیوں میں مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے، اور کوئی غلام نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ مگر اس حصہ پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔ اس آیت کے آخری الفاظ میں اسی حسنِ سلوک کو پھر مؤکّد کیا ہے یہ فرما کر کہ تمہارے تمام افعال کی غرض تو یہ ہونی چاہئے کہ تم اپنے حقیقی آقا کے پیارے بن جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ تم خدا کے پیارے کبھی نہیں بن سکتے، جب تک تم دوسرے لوگوں کے حقوق کی پوری طرح نگہداشت نہ کرو گے اور دوسرے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا نہ چھوڑو گے۔

اس کے علاوہ دینی اخوت کا سلسلہ، جو اسلام نے قائم کیا، وہ بجائے خود ایک زبردست محرک نیک سلوک کا تھا۔ آزاد عورتوں اور غلاموں کے درمیان اور آزاد مردوں اور لونڈیوں کے درمیان نکاح جائز قرار دیئے گئے۔ ایک مشرکہ آزاد عورت اور مسلمان لونڈی میں نکاح کے وقت ترجیح لونڈی کو دی گئی اور ایک مشرک مرد اور مسلمان غلام میں ترجیح غلام کو دی گئی۔ بات بات پر غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا اور اسے بعض گناہوں کا کفارہ قرار دے کر یہ سمجھایا گیا کہ غلاموں کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کو آزاد کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی محبوب فعل ہے۔ لونڈی اگر نکاح کے بعد فحش کی مرتکب ہو، تو اس کی سزا آزاد عورت سے نصف رکھی گئی۔ غلاموں کے نکاح کرنے کا خاص طور پر حکم دیا گیا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَ الصَّالِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَائِکُمْ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۔(النور۔ ع۴۔ آیت۳۲)۔ اور تم میں سے، جن کے ازواج نہیں، ان کے نکاح کرو۔ اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔ قبل از اسلام، جو بدیاں عرب میں لونڈی غلاموں کے معاملے میں تھی، ان سب کو دور کیا گیا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بدرسم تھی کہ لونڈیوں سے بدکاری کرا کر اس مال سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ جس کی خاص طور پر ممانعت قرآن شریف میں کی گئی ہے۔

یہ ہیں قرآن شریف کے احکام۔ ان میں سب سے پہلے یہ امر دیکھنا چاہئے کہ ان احکام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین نے کیا سمجھا ہے اور ان پر کیونکر عمل کیا۔ اس غرض کے لئے احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور آپ کے عمل کو سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔ احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو زور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر دیا ہے اور جو خود اس حسن سلوک کا نمونہ دکھایا ہے اس سے اگر موازنہ کیا جائے تو یہی کہنا پڑیگا کہ کسی دوسرے مصلح نے آپ کے بالمقابل کچھ بھی نہیں کیا۔ سب سے پہلے میں صحیح بخاری کی احادیث کو بیان کرتا ہوں اور پھر دوسری متفرق احادیث کو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل و لیلبسه مما یلبس و لا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم**۔ یعنی تمہارے بھائی ہی تمہارے خدمتگار ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے نیچے رکھا ہے۔ پس جس شخص کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو، اسے چاہئے کہ جو چیز خود کھاتا ہے، اسی میں سے اسے بھی کھلاوئے اور جو پوشاک آپ پہنتا ہے، اسی میں سے اسے بھی پہناوے۔ اور ان پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالو، جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ کام ان کو دو، تو پھر ان کی مدد بھی کرو۔

بتاؤ کہ کونسا ایسا انسانوں کا ہمدرد پیدا ہوا ہے یا کونسا مصلح ہے جس نے ایسی کامل اخوت آقا اور غلام میں پیدا کی ہو، جو صرف الفاظ تک ہی محدود نہیں بلکہ عملی رنگ میں ہے کہ مالک اور مملوک کا ایک سا ہی لباس اور ایک سی خوراک ہو۔ یہی نہیں بلکہ غلاموں کی حالت بہت ہی قابل رشک معلوم ہوتی ہے جب ہم آپ کے یہ پیارے الفاظ پڑھتے ہیں۔ **وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ لَا الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْحَجِ وَ بِرَّ اُمِّی لَاَحْبَبْتُ اَنْ اَمُوْتُ وَ اَنَا مَمْلُوْکٌ** ۔ "قسم ہے اس ذات پاک کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد اور حج اور ماں کے ساتھ نیکی نہ ہوتی، تو میں پیار کرتا کہ غلامی کی حالت میں مروں"۔ پھر غلام محض حیوان کی طرح ایک گونگا کارکن نہیں بلکہ وہ اپنے آقا کا سچا مشیر قرار دیا گیا ہے۔ **قال اذا نصح العبد سیده و احسن عبادة ربه کان له اجره مرتین**. یعنی جو غلام اپنے آقا کو نیک صلاح دیتا ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت عمدہ کرتا ہے اس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔ غلاموں لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک کی صرف اسی حد تک محدود نہیں رکھا گیا کہ ان سے کام لیا جائے اور ان کے ساتھ نیکی کی جائے بلکہ ان کی عمدہ پرورش کے لئے بھی جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے خاص طور پر ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ لونڈیوں کے متعلق یہ ہدایت فرمائی۔ **قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل کانت له جارية ادبها فاحسن تعليمها و اعتقها و تزوجها فله اجران** ۔ "فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کے پاس لونڈی ہو پھر وہ اس کی تادیب کرے یعنی اسے اعلیٰ درجہ کے نیک اخلاق کی تربیت دے اور اس کو نہایت عمدہ تعلیم دے پھر اس کے بعد اس کو آزاد کرے اور اس سے نکاح کرے۔ اس کے لئے دوہرا اجر ہے"۔

اس حدیث کی طرف میں خصوصیت سے ان کوتاہ نظروں کو توجہ دلاتا ہوں، جو کہا کرتے ہیں کہ اسلام عورت کو جاہل رکھنا چاہتا ہے۔ وہ غور کریں کہ آزاد عورتیں تو ایک طرف رہیں، اسلام تو لونڈیوں کے متعلق بھی یہ حکم دیتا ہے کہ ان کو نہایت عمدہ تعلیم اور تربیت دی جاوے۔ اسی حدیث سے نہایت صفائی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا منشاء غلاموں اور لونڈیوں کو کس درجہ تک ترقی دینے کا ہے۔

بہت سی اور حدیثیں ہیں، جن میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے "مشکوٰۃ" کی بعض حدیثوں کا ترجمہ لین صاحب نے اپنے ترجمہ الف لیلہ کے نوٹوں میں دیا ہے اور انہی کو ہیو نے اپنی "ڈکشنری آف اسلام" میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ میں یہاں دیتا ہوں۔

" اپنے غلاموں کو اس کھانے میں سے کھلاؤ، تو تم خود کھاتے ہو اور وہ لباس پہناؤ، جو تم خود پہنتے ہو اور ان کو ایسا کام کرنے کو نہ دو، جو ان کی طاقت سے بڑھ کر ہو"۔ "جو شخص اپنے غلام کو بلا وجہ مارتا ہے یا اس کے منہ پر مارتا ہے، اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کرے۔ جو شخص اپنے غلام سے سختی کرتا ہے، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا"۔ "جو شخص ماں اور بیٹے میں جدائی پیدا کرتا ہے (یعنی لونڈی کو بیچ کر) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اپنے دوستوں سے جدا کرے گا"۔

ان تمام احادیث سے نہایت صاف اور یقینی شہادت اس بات کی ملتی ہے کہ مذہب اسلام میں غلام کو غلام سمجھا ہی نہیں گیا۔ بلکہ اسکے کام کو الگ چھوڑ کر، جو اسکے سپرد کیا گیا ہے، وہ ہر طرح سے اپنے مالک کے برابر سمجھا گیا ہے۔ تیرہ سو سال گذر چکے ہیں، جب پہلے ایک سچے ہمدرد بنی نوع انسان نے یہ ہدایتیں جاری کیں اور نہ صرف جاری کیں بلکہ ان پر عمل کیا اور کرایا۔ مگر آج باوجود تیرہ سو سال کے گذر جانے کے اور باوجود بڑے بڑے ہمدردی کے دعوؤں کے کسی شخص میں اس قدر اخلاقی جرات بھی نہیں، جو ان ہدایتوں پر عمل کرنا تو درکنار رہا نوکروں کے متعلق اسی قسم کی ہدایتیں دینے کی جرات کرے۔

اب میں چند اور حدیثیں نقل کرتا ہوں، تا کہ ناظرین کو معلوم ہو کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے کس قدر تاکید غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق کی ہے۔ایک روایت میں آیا ہے کہ مرض الموت میں آپ کے منہ میں یہ الفاظ تھے۔اِتَّقُوا اللہَ فِی الصَّلوٰۃِ وَ فِیْمَا مَلَکَتْ اِیْمَانُکُمْ ۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دو چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھو،یعنی قیام نماز اور غلاموں لونڈیوں کے ساتھ حسن سلوک۔اس حدیث سے کیسی صفائی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں انسانوں کے ساتھ اور خصوصاً اس جماعت کے ساتھ،جس کو دنیا کی سب قوموں نے ذلیل سمجھا اور اب تک ذلیل سمجھ رہی ہیں (یعنی غلام اور خادم) کے ساتھ کیسا سچی ہمدردی کا جوش تھا۔اور کس قدر ان کی بہتری کا فکر آپ کو تھا کہ اخیر وقت میں بھی یہی لفظ آپ کے منہ سے نکلے۔آپ کیا چاہتے تھے،ایک اثر (حدیث) سے پتہ لگتا ہے۔فرمایا۔لَقَدْ اَوْصَانِی حَبِیْبِی جِبْرَائِیْل بِالْرِفْق بِالْرَقِیْق حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنّ النَّاسَ لَا تَسْتَعْبِدُ وَ لَا تَسْتَخْدَمُ ۔میرے دوست جبرائیل نے غلاموں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کے لئے مجھے اس قدر وصیت کی کہ میں نے گمان کیا کہ آئندہ کوئی غلام نہیں بنایا جانا چاہئے۔جو لوگ ان صاف شہادتوں کے ہوتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اسلام پر یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ غلامی شریعت اسلامی کا ایسا ضروری جزو ہے کہ اس کو جدا کرنے سے شریعت درہم برہم ہو جاتی ہے،ان کو کم سے کم یہ حدیث پڑھ کر ضرور شرم کرنی چاہئے کیونکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلاموں کے ساتھ نرمی کا اصل مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے اور آئندہ غلام بنانے سے لوگوں کو روکا جاوے۔ایک شخص کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا کہ میں کتنی مرتبہ غلام کو معاف کیا کروں۔آپ نے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب ان کے سوال کا نہ دیا۔وہ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ سامنے آیا اور یہی سوال دھرایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بغیر جواب دینے کے منہ پھیر لیا۔چوتھی مرتبہ جب اس نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔ اعْفِ عَنْ عَبْدِکَ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً فِی کُلِّ یَوْمَ اِذَا اَرَدَتَّ نَوَال الْاَجْرِ وَ الثَّوابِ ۔"اگر تو اجر اور ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے،تو ہر روز ستر دفعہ اپنے غلام کو معاف کیا کر" ۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آج ان اقوام میں جو مہذب کہلاتی ہیں ایک آدمی بھی ایسا ہے جو اپنے خدمتگار کو باوجود اس کے قصور کے ستر دفعہ معاف کر سکے۔مگر اسلام میں غلاموں کے متعلق واقعی ایسا عملدرآمد ہوا۔آپ کا دل یہ بھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ غلام کو غلام پکارا جائے۔کیونکہ اس نام میں حقارت پائی جاتی تھی۔اور آپ پسند نہ کرتے تھے کہ کسی قسم کی بھی تحقیر ان کی کی جاوے۔چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے یہ حدیث روایت کی ہے۔لَا یَقُلْ اَحَدُکُمْ عَبْدِی اُمَّتِیْ وَ لْیَقُل فَتَایَّ وَ فَتَاتِیْ وَ

غُلَامِیْ۔ چاہئے کہ تم یہ نہ کہو کہ اے میرے غلام یا اے میری لونڈی، بلکہ یوں کہو کہ اے میرے فتایا اے میری فتاۃ یا اے میرے غلام (یہ لفظ ہر ایک جوان مرد اور جوان عورت پر بولے جاتے ہیں۔ غلام کا لفظ بھی اسی طرح بولا جاتا ہے۔ عربی میں غلام کا مفہوم عبد سے ادا ہوتا ہے) عبد اور امۃ کہنے سے اس لئے روکا کہ یہ الفاظ عموماً لونڈیوں اور غلاموں پر ہی بولے جاتے تھے۔ اور وہ الفاظ جن کے بولنے کی ہدایت کی وہ عام ہیں۔ آزاد مردوں اور عورتوں پر بھی بولے جاتے ہیں۔

اس کے بعد میں یہ بیان کروں گا کہ ان ہدایات پر عمل بھی کیا جاتا تھا یا نہیں اور اگر کیا جاتا تھا کس حد تک۔ مگر قبل اس کے کہ میں عمل کی نظیریں پیش کروں، ایک شبہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر غلاموں کو اس قدر حقوق دیئے گئے تھے اور ان کی اس کا قدر رعایت ضروری تھی جیسا کہ حدیثوں سے پتہ چلتا ہے تو پھر مالک اور مملوک میں فرق ہی کیا تھا۔ اس کا جواب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں موجود ہے اور یہ حدیث صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَتِهٖ فَالْاَمِيْرُ الَّذِىْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَ هُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالْمَرَاةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَ وَلَدِهٖ وَ هِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَ هُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ۔ یعنی "تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امیر لوگوں پر حاکم ہے اور اس سے ان لوگوں کے متعلق پوچھا جائیگا۔ اور عورت اپنے خاوند کے گھر پر اور اس کی اولاد پر حاکم ہے اور اس سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور غلام اپنے آقا کے مال پر حاکم ہے اور اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا"۔ اس حدیث کی رو سے ہر ایک شخص کے سپرد جدا جدا کام ہے اور ایک رنگ میں ایک شخص حاکم ہے اور دوسرے رنگ میں وہی محکوم ہے۔ اسلام ایسی مساوات کی تعلیم نہیں دیتا جس سے چھوٹوں بڑوں کا امتیاز ہی اٹھ جائے اور دنیا کے کاروبار بند ہو جائیں۔ بلکہ ایک ایسی اخوت قائم کرتا ہے کہ کام بھی سب کے الگ الگ رہیں اور سوسائٹی میں بڑے بھی ہوں اور چھوٹے بھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان میں انسان اور بھائی ہونے کی حیثیت میں ایک مساوات بھی ہو۔ نہ ہی کام مقرر کرنے سے اسلام کی پاک تعلیم کا یہ منشاء ہے کہ آقا غلام کے کام کو ذلیل سمجھ کر اسے ہاتھ نہ لگاوے۔ اور آقا کا کام غلام کی عزت سے بڑھ کر سمجھا جاوے۔ بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ ضرورت کے وقت آقا غلام کے کام میں اس کی مدد کرے۔ اور جو فوائد آقا اٹھاتا ہے غلام کو ان سے محروم نہ رکھا جاوے۔ ہاں آقا کو یہ چاہئے کہ وہ اپنے غلام سے نیکی کرے اور احسان برتے۔ اور غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کی سچے دل سے فرمانبرداری کرے۔ وہ اپنے اپنے

مفوضہ کاموں کو بجالاویں۔ باقی امور میں وہ مساوی ہیں۔

اب میں چند مثالیں بیان کرتا ہوں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف معلم ہی تھے، بلکہ ہر بات میں خود ایک پاک نمونہ بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی تعلیم کا وہ زبردست اثر آپ کے صحابہ اور مسلمانوں پر ہوا۔ یہ جو آپ نے فرمایا تھا کہ میرے دوست جبرائیل نے یہاں تک غلاموں کے ساتھ مجھے حسن سلوک کی تاکید کی ہے کہ میرا گمان ہوا کہ غلام بنانا ہی نہ چاہئے۔ یہ واقعی آپ کے دل کی سچی خواہش اور تڑپ تھی اور یہی آپ کی غلاموں کے ساتھ نیکی کی تعلیم کا اصل مقصد تھا۔ اور آپ تدریجاً دنیا کو اس طرف مائل کر رہے تھے۔ چنانچہ ان سب باتوں کا ثبوت آپ کے اپنے عمل سے ملتا ہے کہ آپ نے کبھی کوئی غلام نہیں رکھا۔ بلکہ جونہی کبھی کوئی غلام آپ کی مِلک میں آیا تو آپ نے اسے فوراً آزاد کر دیا۔ اس سے زیادہ واضح ثبوت آپ کی دلی خواہش کا اور کیا ہوسکتا ہے۔ مگر اس مضمون پر یہ بحث کا موقعہ نہیں۔ غلام تو آپ سب آزاد کرتے رہے۔ ہاں آپ کے خادم تھے اور چودہ پندرہ آدمیوں کے نام لئے گئے ہیں، جنہوں نے وقتاً فوقتاً آپ کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ علاوہ ان کے آپ کے صحابہ اور متبعین میں ہر ایک شخص اسے اپنے لئے باعث فخر و عزت سمجھتا کہ کوئی کام آپ اسے فرمائیں۔ پھر آپ کی پوزیشن دنیاوی لحاظ سے بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ مدینہ میں آپ گویا ایک چھوٹی سی جمہوری سلطنت کے اعلیٰ افسر تھے اور پھر بعد میں آپ کل عرب کے شہنشاہ ہو گئے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے آپ خود اپنے کپڑے درست کر لیتے، بکریوں کو دوہ لیتے اور اپنی بیویوں کے گھر کے کام کاج میں مدد دیتے تھے۔ جب کھانا کھانے بیٹھتے تو آپ ایک خادم کی طرح بیٹھتے۔ اور دوسروں کا کام کرنے کے لئے ہمیشہ اٹھنے کو تیار رہتے۔ سوار ہوتے تو کسی اور کو اپنے پیچھے بٹھا لیتے۔ حضرت انس نے آپ کے خادموں کے ساتھ نیکی کے کئی واقعات بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں دس سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا رہا۔ اس عرصہ میں کبھی آپ نے مجھ کو اُف تک نہ کہا۔ جب میں نے کوئی کام کیا تو مجھے یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا۔ اور اگر کوئی کام نہیں کیا تو یہ نہیں کہا کہ یہ کیوں نہیں کیا۔ اور آپ کا سلوک تمام دنیا سے بڑھ کر اچھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو یا کسی عورت کو نہیں مارا۔

آپ کے صادق محبّ اور مخلص بھی آپ کے نقش قدم پر ہی چلتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے اسیران جنگ میں سے ایک اسیر ایک صحابی ابوالہیثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور غلام کے دیا اور اسے نصیحت کی کہ اس سے نیک سلوک کرے۔ ابوالہیثم اس غلام کو لے کر گھر گیا اور اپنی بی بی کو کہا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ غلام دیا ہے اور ساتھ یہ وصیت کی ہے کہ اس سے حسن سلوک کرنا۔ بی بی نے کہا کہ اس نصیحت پر تم پورا عمل کیونکر کر سکتے ہو، سوائے اس کے کہ غلام کو آزاد کر دو۔ چنانچہ ابو الہیثم نے وہ غلام اسی وقت آزاد کر دیا۔

زنباع نے اپنے ایک غلام کو ایک لونڈی کے ساتھ پایا اور اس کا ناک کاٹ ڈالا۔ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔ آپ نے پوچھا کہ کس نے تیرا یہ حال کیا ہے۔ غلام نے کہا زنباع نے۔ چنانچہ اسی وقت زنباع کو طلب کیا گیا۔ اس نے جو دیکھا تھا بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو فرمایا کہ جا تو آزاد ہے۔ پھر غلام نے کہا یا رسول اللہ میں کس کا مولیٰ کہلاؤنگا (یعنی میرا معاون اور مددگار کون ہوگا) آپ نے فرمایا خدا اور اس کے رسول کا مولیٰ۔ چنانچہ اسی وعدے کی مطابق آپ جب تک جیتے رہے اس کی مدد کرتے رہے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور وہ واقعہ آپ کو یاد دلایا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اس کے اور اس کے عیال کے لئے گذارہ مقرر کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا تو کہاں جانا چاہتا ہے۔ عرض کیا مصر میں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حاکم مصر کے نام حکم لکھ دیا کہ اس کے گذارے کے لئے زمین دے دو۔ سبحان اللہ کیسا پاک وعدہ اور کیسا پاک ایفاء اس کا ہوا۔

ابومسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ ناگہاں میں نے اپنے پیچھے سے یہ آواز سنی۔ ابومسعود یاد رکھو کہ جس قدر طاقتور حاکم تم اس پر ہو، اس سے زیادہ طاقتور حاکم خدا تم پر ہے۔ ابومسعود فرماتے ہیں۔ جب میں نے پیچھے پھر کر دیکھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں نے اسی وقت اس کو خدا کے لئے آزاد کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم آزاد نہ کرتے تو تم آگ میں پڑتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ایک آدمی سوار ہے اور اس کا غلام اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اسے اپنے پیچھے بٹھا لو، کیونکہ یہ تمہارا بھائی ہے اور اس کی روح بھی تمہاری روح کی طرح ہے۔

معرور کہتے ہیں میں نے ابوذرؓ کو دیکھا کہ ایک نیا عمدہ لباس پہنا ہوا ہے اور آپ کے غلام نے بھی ویسا ہی نیا اور عمدہ لباس پہنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا تو فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایک آدمی (اس سے مراد آپ کا غلام ہے) کو گالیاں نکالیں۔ اس نے میری شکایت نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کے پاس کی۔ آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے اس کی ماں پر عیب لگایا۔ اور پھر فرمایا کہ تمہارے غلام اور

نوکر چاکر تمہارے بھائی ہیں۔ پس جس شخص کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو، اسے چاہئے کہ اپنے کھانے سے اسے کھلائے اور اپنے لباس سے کپڑا پہناوے۔ تم اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دو، جوان کی طاقت سے زیادہ ہو، اور اگر دو، تو پھر اس کے کرنے میں خود مدد دو۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک غلام کی نافرمانی کی وجہ سے اس کا کان مروڑا۔ اور پھر اپنے فعل سے توبہ کی اور اسی غلام کو کہا کہ تو بھی اسی طرح میرا کان مروڑ۔ مگر اس نے انکار کیا۔ آپ نے اصرار کیا تو اس نے آہستہ آہستہ کان مروڑنا شروع کیا۔ آپ نے کہا زور سے مروڑو، کیونکہ میں قیامت کے دن کی سزا برداشت نہیں کرسکتا۔ غلام نے جواب دیا۔ اے میرے آقا جس دن سے تو ڈرتا ہے، اسی دن سے میں بھی ڈرتا ہوں۔

حضرت زین العابدین کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک غلام نے بھیڑ کو پکڑتے ہوئے اس کی ٹانگ توڑ دی۔ انہوں نے کہا کہ تو نے کیوں ایسا کیا۔ کہا آپ کو غصہ دلانے کے لئے۔ آپ نے فرمایا جس نے تجھے یہ تعلیم دی میں اسے غصہ دلاؤں گا۔ جا اور تو خدا کے لئے آزاد ہے۔

غلاموں یا آزاد کردہ غلاموں کو بڑے بڑے عہدے دیئے جاتے تھے۔ اسامہ کو جو حضرت زید کے بیٹے تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کا افسر بنایا۔ قبل اس کے کہ یہ فوج روانہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے کہا کہ آپ کسی اور بڑے آدمی کو افسر بنائیں۔ مگر آپ بہت ناراض ہوئے کہ جو کام میرے پیارے محبوب اور آقا نے کیا میں اسے منسوخ کر دوں۔ جب فوج کی روانگی کا وقت آیا تو آپ اسامہ کے ساتھ ساتھ پیدل روانہ ہوئے اور وہ سوار تھے۔ انہوں نے عرض کی کہ اے خلیفہ رسول اللہ یا آپ بھی سوار ہو جاویں اور یا مجھے اجازت دیں کہ میں بھی پیدل چلوں۔ مگر آپ نے نہ مانا اور کچھ دیر تک نصیحت کرتے ہوئے اسی طرح ساتھ گئے۔ جب حضرت عمرؓ نے مصر کو فتح کا ارادہ کیا، تو اول صلح کا پیغام دے کر ایک جماعت حاکم مصر کے پاس بھیجی، جس کا سردار عبادہؓ کو قرار دیا، جو حبشی تھے اور حبشی اس زمانے میں بطور غلاموں کے فروخت ہوتے تھے۔ جب یہ جماعت حاکم مصر کے سامنے آئی، تو اس نے کہا کہ اس حبشی کو باہر نکال دو۔ انہوں نے کہا کہ یہی تو ہمارا سردار ہے اور جو کچھ یہ کہے گا یا کرے گا، اسی کے ہم پابند ہیں۔ مقوقس حیران ہوا اور پوچھا کہ تم نے ایک حبشی کو اپنا سردار کیونکر بنالیا۔ انہوں نے کہا کہ سرداری ہمارے درمیان قومیت یا رنگ پر نہیں بلکہ فضیلت پر ہے۔ سو یہ ہم سب سے افضل الرائے ہے۔

حضرت عمرؓ جیسے عظیم الشان بادشاہ کا جو سلوک اپنے غلاموں کے ساتھ تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ

غلاموں کی ابتدائی اسلامی سوسائٹی میں کیا حیثیت تھی۔ اور وہ لوگ کس طرح پر اپنے پیارے نبی کے لفظوں پر عمل کرتے تھے۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور شہر کے لوگ تنگ آ گئے، تو انہوں نے اس شرط پر شہر حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا کہ خود حضرت عمرؓ آ کر شرائط صلح طے کریں۔ ابو عبیدہؓ نے امیر المومنین کو لکھا تو آپ فی الفور روانہ ہو گئے۔ آپ کے ساتھ آپ کا غلام بھی تھا۔ مگر سواری کے لئے اونٹ صرف ایک ہی تھا۔ اس لئے خلیفہ اور غلام باری باری اس پر چڑھتے، اور جس کی باری نہ ہوتی، وہ پیدل ہمراہ دوڑتا۔ جب آپ ابوعبیدہ کے ڈیرے کے قریب پہنچے، تو اتفاقاً غلام کی باری سواری کی آ گئی۔ آپ اتر کھڑے ہوئے اور غلام کو سوار کیا۔ اور آپ پیدل ہمراہ بھاگتے تھے۔ اور تمام نظریں آپ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ابوعبیدہ نے اس بات سے ڈر کر کہ امیر المومنین کو اس طرح پیدل بھاگتا ہوا دیکھ کر یروشلم کے اہالی پر برا اثر نہ ہو اور مبادا جنگ رخ پلٹ دے عرض کیا تمام نظریں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس صورت میں یہ مناسب نہیں کہ آپ کا غلام تو سوار ہو اور آپ نوکروں کی طرح ساتھ ساتھ بھاگیں۔ حضرت عمرؓ اس بات کو سن کر غضب میں آئے اور فرمایا کہ تجھ سے پہلے مجھے ایسا کسی نے نہیں کہا اور یہ تیری بات مسلمانوں پر لعنت لانے والی ہے۔ ہم سب لوگوں سے ذلیل اور زیادہ حقیر اور سب سے تھوڑے تھے، خدا نے اسلام کے ذریعے ہمیں بڑائی اور عزت دی اور اگر ہم ان راہوں سے الگ چل کر عزت تلاش کریں گے جو راہیں اسلام نے ہمیں سکھائی ہیں تو پھر خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ جس سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ اسلام نے تو یہ تعلیم دی ہے کہ تم اپنی عزت اسی میں سمجھو کہ اپنے غلاموں کو اپنے برابر رکھو۔ اگر ہم مساوات میں اپنی ذلت سمجھنے لگیں گے، تو پھر خدا ہمیں ذلیل کرے گا، کیونکہ اس کی بتائی ہوئی راہ کو چھوڑ ینگے۔

میں پوچھتا ہوں کہ آیا آج بھی دنیا میں کوئی ایسا فاتح موجود ہے یا کوئی چھوٹی سے چھوٹی ریاست کا حکمران ایسا موجود ہے یا کوئی شخص جو کسی بڑے عہدے پر ممتاز ہوا ایسا ہے کہ وہ اخلاقی جرات دکھا سکے، جو حضرت عمرؓ نے دکھائی یا نیک سلوک کا وہ نمونہ دکھا سکے، جو ایک بڑے شہنشاہ نے دکھایا۔ کیا حضرت عمرؓ اس امر سے ناواقف تھے کہ ایک نئے فتح ہوئے ہوئے ملک پر رعب کا قائم رکھنا کس قدر ضروری تھا۔ مگر اسلام کے احکام کی سچی عظمت ان کے دل میں تھی۔ وہ صدق دل سے جانتے تھے کہ ہر ایک عزت اور شوکت انہیں راہوں پر چلنے سے ملے گی۔ اور اگر پچھلے زمانے میں مسلمانوں نے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ اس طریق برتاؤ کو چھوڑ دیا، تو یہ وہی بات ہے، جو حضرت عمرؓ نے کہی تھی۔ انہوں نے اسلامی راہوں کو چھوڑ کر اور راہوں سے عزت تلاش کی۔ پس وہ عزت کھو بیٹھے۔ اب بھی جو مسلمان

غیر مسلمان اقوام کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں معزز بننا چاہتے ہیں اور اسلام کی راہوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں یہی بات یاد رکھنی چاہیئے۔

مگر باوجود ان غلطیوں کے، جن میں مسلمان پڑ گئے ہیں، اور مرور زمانہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دور جا پڑے ہیں، یہ امر قابل غور ہے کہ آپ کی نیک تعلیم ایسی ان کے خونوں کے اندر رچ گئی یا یوں کہو کہ آپ کی قوت قدسی ایسی ان پر غالب آئی کہ اب بھی مسلمانوں کا سلوک اپنے نوکروں اور غلاموں سے غیر اقوام کے سلوک کی نسبت بدرجہا بہتر ہے اور یہ شکر کا مقام ہے کہ ہمیں اس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ خود عیسائیوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ لین الف لیلہ کے انگریزی ترجمہ کے نوٹوں میں لکھتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو مدتوں مصر میں رہا کہ مسلمانوں کے حالات کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں میں غلاموں کے ساتھ عموماً نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ جن سیاحوں نے دوسرے اسلامی ممالک کا سفر کیا ہے ان کی شہادت مسلمانوں کی اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق بہت ہی قابل اطمینان ہے۔ اور پھر لکھتا ہے کہ قرآن شریف اور احادیث میں جو ہدایتیں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق ہیں عموماً اب سب پر یا ان کے زیادہ حصے پر مسلمان لوگ عمل کرتے ہیں، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم غلاموں سے حسن سلوک کے متعلق عیسائیوں کے گال پر طمانچہ کی تعلیم کی طرح نہیں کہ سراہتے سراہتے ہزار ہا کاغذ سیاہ کریں اور جب عمل دیکھیں تو ایک بھی عامل دنیا میں نظر نہ آئے۔ یہ تو ایک غیر متعصب عیسائی ہے مگر پادری ہیو کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے، جیسا کہ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان ممالک میں غلاموں کے ساتھ سلوک بہت اچھا ہے بمقابلہ اس سلوک کے جو امریکہ میں کیا جاتا ہے جہاں غلامی کا رواج عیسائی اقوام کے نیچے رہا۔ مگر پادری صاحب پیرووں کو کیوں ملزم کرتے ہیں جب ان کے مرشد کی تعلیم میں ایک لفظ بھی غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق نہیں پایا جاتا۔

ایسا ہی انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں ایک عیسائی مضمون نویس مسلمانوں کے درمیان غلامی کے رواج پر لکھتا ہوا کہتا ہے۔" مشرقی اسلامی ممالک کی غلامی عموماً کھیت میں مزدوروں کی طرح کام کرنے کی غلامی نہیں بلکہ گھر کے کاروبار کے متعلق ہے۔ غلام کو خاندان کے ایک ممبر کی طرح سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور نرمی سے سلوک کیا جاتا ہے۔ قرآن شریف غلاموں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے سلوک کرنے کی روح پھونکتا ہے اور غلام آزاد کرنے کی ترغیب دیتا ہے"۔

اب اس اسلامی تعلیم اور ان واقعات یقینی کو پیش کرنیکے بعد میں اپنے منصف مزاج ناظرین

سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ غلامی جس کے رواج کو ایک حد تک اسلام نے یک لخت روک نہیں دیا کیا یہ ایسی غلامی ہے کہ اس لفظ کے معمولی مفہوم کے رو سے جو دنیا میں سمجھا جاتا ہے اس کو غلامی کہہ سکیں۔ نہیں بلکہ جہاں تک آج کل نوکروں کے ساتھ سلوک دیکھا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں جس قدر لوگ خادم کے نام سے موسوم ہیں وہ ایک اسلامی غلام پر رشک کریں گے اور اس خادمی کی حالت سے اس غلامی کی حالت کو بدرجہا بہتر سمجھیں گے۔ غلامی کے عام مفہوں کے رو سے تو یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ ایک حد تک اسلام نے غلامی کی اجازت دی۔ کیونکہ ہر ایک بدی جو اس سے پیدا ہوتی تھی اسلام کی تعلیم نے اس بدی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ جو آقا کے برابر ہے اسکو غلام کیوں کہا جائے گا۔ اور یہ مساوات اور خاندان کے ایک ممبر کی طرح ہونا صرف لفظ ہی لفظ نہ تھے بلکہ عمل سے یہ دونوں باتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ جو کھانا آقا کھائے وہی غلام کھائے اور جو لباس ملک پہنے وہی مملوک پہنے جہاں وہ رہے اسی جگہ غلام رہے۔ طاقت سے زیادہ کام نہ دینا۔ کبھی سختی سے اسے مخاطب نہ کرنا اور نہ ہی مارنا۔ اس سے بڑھ کر کونی اصلاح کی دنیا خواہشمند ہوسکتی تھی۔ یہ زمانہ لفظ پرست ہے اور بجائے مغز کے چھلکے پر خوش ہو جاتا ہے۔ نام کو تو غلامی موقوف کر دی گئی مگر افسوس ہے کہ غلامی کی حقیقت ابھی تک مہذب مما لک میں اسی طرح موجود ہے۔ عنقریب دنیا دیکھ لے گی کہ جب تک خادموں کے ساتھ وہ رفق اور نیکی کا طریق نہ برتا جائے گا، جسکی تعلیم تیرہ سو سال ہوئے ایک انسانوں کے سچے ہمدرد اور خدا کے برگزیدوں میں سے سب سے بڑے برگزیدہ نے دی تھی، تب تک غلاموں کی موقوفی لفظی موقوفی ہے اور حقیقتاً اس سے وہ اصلاح نہیں ہوئی، جو دنیا کی اخلاقی ترقی کیلئے ضروری ہے۔ اسلام کی تعلیم ہی وہ عملی تعلیم ہے، جس پر دنیا چل سکتی ہے اور جس پر انسان انسانوں کیلئے مفید اور خدا تعالیٰ کا سچا بندہ بن سکتا ہے۔

غلاموں کی تدریجی آزادی کے احکام

جیسا کہ بار بار ثابت کیا جا چکا ہے قرآن کریم نے عرب کے تمدنی اور اخلاقی قوانین میں ایک کامل اور بے نظیر تبدیلی پیدا کی۔ مدتوں کی بدیاں، جو گویا جزو خون ہو چکی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طاقتور الفاظ کے سامنے یوں نیست و نابود ہو گئیں، جیسے ایک زبردست آندھی کے سامنے چھوٹے چھوٹے تنکے اڑ جاتے ہیں۔ مگر غلامی ایک ایسی چیز تھی کہ جہاں بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اسے برا کہہ سکتے ہیں، بعض وجوہات سے ابتدائی سوسائٹی میں اس رواج کا موجود ہونا ضروریات میں سے تھا۔ اور یہ میں پہلے حصہ مضمون میں ثابت کر چکا ہوں۔ علاوہ ازیں یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ اسیران جنگ یا مغلوب دشمن کو غلام بنا لینا خود اس قدیم رواج پر ایک عظیم الشان ترقی تھی، جس کے رو سے ایسے لوگ

کل کے کل ہلاک کر دیئے جاتے تھے۔، جس کا ذکر توریت میں بھی ہے۔ان باتوں کو چھوڑ کر غلاموں کو یک دفعہ ہی آزاد کر دینے میں اور بڑے بڑے مضرات تھے اور ایسی کاروائی میں نہ صرف آقاؤں کا ہی بہت نقصان تھا، بلکہ اس کا اثر خود غلاموں کی حالت پر بھی بہت بُرا ہوتا۔اور سوسائٹی کے تمدن اور اخلاق کا تباہ کرنیوالا ہوتا۔وہ لوگ، جو پشتوں سے غلام چلے آتے تھے، ان میں سے نہ صرف آزادی کی روح ہی نکل چکی تھی، بلکہ کام اور محنت میں بھی وہ سست ہو گئے تھے۔ایسے لوگوں کو خالی ہاتھ کھلا چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ یا تو وہ آوارگی اور گدائی میں زندگیاں بسر کرتے اور یا چوری ڈاکہ اور بدمعاشی کے پیشے کو اختیار کرتے اور مالکوں کا لاکھوں روپیوں کا الگ نقصان تھا۔کوئی عقلمند انسان ان حالات کے ماتحت غلاموں کو یک مرتبہ آزاد کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

بلحاظ وجوہات بالا اور اور وجوہات کے لحاظ سے، جو اس وقت پیش آئیں، اسلام نے اپنے مد نظر پہلا مقصد یہ رکھا کہ غلاموں کی حالت بہتر کی جائے۔فطرت انسانی کی پستی کا خیال ان کے دلوں سے دور کیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو کام اور محنت کرنے کے قابل بنایا جائے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کو آہستہ آہستہ آزاد بھی کیا جاوے۔یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے اسلام نے آقا اور غلام کے درمیان ایک کامل اخوت قائم کی، تاکہ جو ذلت غلام کی طرف منسوب کی جاتی ہے، وہ دور ہو جائے اور اس ایک ہی دروازہ کے بند کرنے سے بہت سی بدیاں رک جائیں۔اس اخوت کا عملی طور پر ابتدائی مسلمانوں نے کیا ثبوت دیا۔صحابہ کی تاریخ کے حوالے سے سابقاً دکھایا جا چکا ہے۔اس بات کی تائید میں کہ واقعہ اسلام کا یہ منشاء تھا کہ پہلے غلاموں کی حالت سنوار کر پھر ان کو آزاد کیا جاوے۔قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں سے ثبوت ملتا ہے۔چنانچہ قرآن کریم فرمایا ہے۔وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً وَ اٰتُوْهُمْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىْٓ اٰتٰـكُمْ (النور۔ع۴۔آیۃ۳۳)۔اور ان لوگوں میں سے، جن تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہو چکے ہیں، یعنی تمہارے غلاموں لونڈیوں میں سے، جو اس بات کے خواہاں ہوں کہ تم ان کو آزادی کی لکھت دے دو، تو تم ان کے ساتھ مکاتبت کر لیا کرو، بشرطیکہ تم ان میں بھلائی کے آثار پاؤ۔اور آزاد کرتے وقت مال خدا میں سے، جو اس نے تم کو دے رکھا ہے، کچھ ان کو بھی دے دیا کرو۔

اس آیت شریف میں مکاتبت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں۔اول یہ کہ غلام میں کچھ بھلائی نظر آتی ہو، یعنی اس کی آزادی اس کی دینی اور سوسائٹی کی بہتری کا موجب ہو۔ان الفاظ کی تشریح میں تفسیر کبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْراً سے مراد یہ ہے اِنْ عَلِمْتُمْ لَھُمْ حَرْفَۃٌ فَلَا تَدْعُوْ ھُمْ کَلًّا عَلٰی النَّاس۔ یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ کوئی حرفہ جانتے ہیں، جس سے اپنا معاش پیدا کر سکتے ہیں۔ اور فرمایا کہ تم ان کو ایسی حالت میں مت چھوڑو کہ وہ لوگوں (یعنی سوسائٹی) پر بوجھ ہوں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ غلام لونڈی سے مکاتبت کرتے وقت یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اپنے لئے روزی کمانے کے قابل بھی ہے۔ اگر وہ اس لائق ہی نہیں، تو تمہارے اس کو آزاد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے سوسائٹی کا مفید ممبر ہونے کے وہ سوسائٹی پر ایک بوجھ ہوگا۔ اور اصل غرض آزادی کی مفقود ہو جائے گی۔ دوسری بات، جس کو مکاتبت کے ساتھ ضروری قرار دیا ہے، یہ ہے کہ اس کو مفلس کر کے دنیا میں مت چھوڑو، بلکہ کچھ مال بھی اس کو دے دو۔ تا وہ کسی کام کے شروع کرنے کے قابل ہو جاوے۔ ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھ کر بڑی صفائی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اصل غرض کیا تھی۔ ایسا ہی صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لونڈی یا غلام آزاد کیا جاوے، ایسا ہونا چاہیے، جو خوب کام کرتا ہے اور اپنے آقا کو خوش رکھتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ای الرقاب افضل یعنی آزاد کرنے کے لئے کونسا بردہ سب سے افضل ہے۔ فرمایا۔ اغلاھا ثمنا و انفسھا عند اھلھا۔ یعنی جو سب سے زیادہ گراں قیمت ہو اور مالک کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر ہو۔ ان الفاظ میں آپ نے غلاموں کو بھی سمجھا دیا کہ ان کے لئے آزادی حاصل کرنے کی راہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت مفید اور قیمتی آدمی بنانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ جس غلام کی مالک کو زیادہ قدر ہوگی، وہی سب سے پہلے آزادی کا مستحق بھی ہوگا۔ میں جب اسلام کی تعلیم کو دیکھتا ہوں، تو حیران ہو جاتا ہوں کہ اس کے کل کے کل احکام اس قدر باریک اصول حکمت پر مبنی ہیں۔ غلاموں کی آزادی کا فتویٰ الفاظ میں دے دینا مشکل نہیں، مگر اسلام صرف یہی نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس کی اصل غرض غلاموں کی حالت کو سنوارنا تھا، کیونکہ مدتوں کی غلامی سے ان کی حالت بہت گر چکی ہوئی تھی اور پھر جوں جوں ان کی حالت سنورتی جائے اور وہ اپنے آپ کو مفید بناتے جائیں، ساتھ ساتھ ان کی آزادی کا انتظام بھی فرما دیا۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ اسلام نے یک مرتبہ ہی غلاموں کی آزادی کا حکم نہیں دے دیا۔ بلکہ تدریجی آزادی کے قاعدہ کو جاری فرمایا۔ ورنہ وہ مذہب، جس نے شراب جیسی بدی کو جس کی بیخ کنی کا آج دنیا میں کوئی علاج نہیں ملتا، ایک ہی لفظ میں ایسا بیخ و بن سے کاٹ دیا کہ اس کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اس کے آگے غلاموں کو یک مرتبہ آزاد کر دینا کیا مشکل تھا۔ اور اب آخر کار انیسویں صدی میں آ کر جب عیسائیوں کو غلامی دور کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو تدریجی آزادی کے اصول کو ہی اختیار کیا گیا۔ پس یہ کس

قدر حماقت ہے کہ اسلام پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس نے غلامی کو کیوں یک قلم موقوف نہیں کر دیا۔

قبل اس کے، جو میں اسلام کے ان احکام کو بیان کروں، جن سے غلاموں کی تدریجی آزادی ثابت ہوتی ہے، میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ قائم کر کے اپنی اصل غرض اور اصل منشاء کو ظاہر کر دیا ہے۔ اور یہ فخر اور بزرگی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہے کہ آپ نے ہر ایک امر پر پہلے خود عمل کر کے دکھایا، تا کہ آپ کے عمل سے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کا منشاء کیا تھا۔ اور اسی لئے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فرما کر یہ سمجھا دیا کہ جو نمونہ تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم کرتے ہیں، اسی نمونہ پر تم سب کو چلنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کو حفاظت سے آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا۔ اب جب غلاموں کے بارے میں ہم آپ کے نمونہ کو تلاش کرتے ہیں، تو صحیح حدیثوں سے اور آپ کی سیرۃ کی معتبر تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ **مواہب لدنیہ** میں بہت سارے غلاموں اور لونڈیوں کے نام لکھ کر، جن کو آپ نے آزاد کیا تھا، ابن جوزی کی سند پر یہ لکھا ہے کہ آپ نے ۴۲ غلام اور گیارہ لونڈیوں کو آزاد کیا۔ بعض مؤرخوں نے آپ کے آزاد کردہ بردوں کی تعداد کو اس سے بہت زیادہ لکھا ہے۔ مگر ہماری غرض کے لئے صرف اس قدر بات کافی ہے کہ جو غلام آپ کے قبضے میں آتا تھا، آپ جلدی اس کو آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے اس نمونہ کو ہی دیکھ کر صحابہ رضوان اللہ علیھم نے بعد میں غلاموں کو آزاد کرنے میں بڑی بڑی ہمتیں دکھائیں اور جہاں تک اس وقت کی تمدنی حالت برداشت کر سکتی تھی، غلاموں کو آزاد کرتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گہری ہمدردی، جو غلاموں کے ساتھ تھی اور جو سچی تڑپ آپ کے دل میں ان کے آزاد کرنے کے لئے تھی، اس کا صحابہ پر اس قدر اثر تھا کہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بہت ہی خوش کرنے والی بات ہے کہ غلام کو آزاد کیا جائے۔ جب حضرت ابو ہریرہؓ نے اسلام قبول کیا اور بیعت میں داخل ہوئے، تو آپ کے ساتھ آپ کا ایک غلام بھی آیا تھا، جو اتفاقاً راستہ میں آپ سے جدا ہو گیا۔ آپ بیعت سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ غلام بھی آ موجود ہوا۔ آپ نے اسی وقت فرمایا کہ جا میں نے خدا کے لئے تجھے آزاد کیا۔ گویا اپنے اس فعل سے اس وقت آپ نے یہ ظاہر کیا کہ کس طرح آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک قول اور فعل کی پیروی کرنے کے لئے تیار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غلام اپنے آقاؤں کی شکایتوں کو اس طرح لے کر آتے تھے کہ گویا ان کا دل اس یقین سے بھرا ہوا تھا

کہ آپ ہر حال میں ہمارے حامی ہوں گے۔اور ایسی شکایتوں کا نتیجہ اکثر آقاؤں کے خلاف ہی ہوتا تھا کیونکہ آپ اکثر غلام آزاد کر دیتے۔ابو مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے جب اپنے غلام کو کسی قصور پر مارا تو اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا۔جب حضرت ابو مسعودؓ کو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے دیکھ لیا ہے تو پہلے لفظ، جو آپ کے منہ سے نکلے یہ تھے، کہ اے رسول خدا میں نے اس غلام کو خدا کے لئے آزاد کر دیا۔آپؐ نے فرمایا اور اگر تم آزاد نہ کرتے، تو آگ میں ڈالے جاتے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو کس قدر تیقّن تھا کہ آپ انسانوں کے سچے ہمدرد اور غلاموں کے سچے خیر خواہ ہیں۔آپ ہی کے نقش قدم پر قرون اولیٰ کے مسلمان چلتے رہے کیونکہ ان کے دلوں میں ایسی آپ کی محبت اور عشق کی آگ روشن تھی کہ وہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ جو فعل رسول خدا کو پیارا تھا، وہ اسے نہ کریں۔چنانچہ پہلے خلفاء کے زمانہ میں غلاموں کی تدریجی آزادی جاری رہی۔باقی رہا یک مرتبہ ان سب کا آزاد کر دینا۔سو ہر ایک دانشمند دیکھ سکتا ہے کہ اس میں نہ آقاؤں کی نہ غلاموں کی اور نہ ہی سوسائٹی کی بھلائی تھی، بلکہ سب کا نقصان تھا۔

اب میں ان احکام کو بیان کروں گا، جو قرآن کریم اور حدیث نبوی میں غلاموں کی تدریجی آزادی کے متعلق وارد ہوئے ہیں۔سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن شریف میں غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ احسان کرنے کا مذکور ہوا ہے، اس کی اصل غرض اور غایت بھی یہی تھی کہ رفتہ رفتہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے۔یہ بات نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل سے ہی ثابت ہے کہ آپ ہر ایک غلام کو، جو آپ کے قبضہ میں آتا تھا، آزاد کر دیتے تھے، بلکہ آپ کے اقوال سے بھی یہی بات واضح اور روشن ہے۔مثلاً آپ کا وہ قول، جو پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل نے غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی مجھے یہاں تک تاکید کی کہ میں نے خیال کیا کہ کسی کو غلام ہی نہ بنایا یا رکھا جائے۔ایک بیّن دلیل ہے اس بات پر کہ سب سے عمدہ سلوک غلاموں کے ساتھ ان کو آزاد کرنا ہی تھا۔ایسا ہی وہ حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے کہ جب ابو الہیثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ نے ایک غلام دیا اور ساتھ تاکید کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا، تو اس کی بیوی نے کہا کہ اس کے ساتھ حسن سلوک تو ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس کو آزاد کر دیں۔چنانچہ آزاد کر بھی دیا۔ان تمام باتوں سے وہ مدعا حاصل ہے، جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

جب ہم قرآن شریف کو پڑھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ غلام کو آزاد کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی پیارا فعل ہے۔چنانچہ سورۃ البلد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اَلَمْ نَجْعَل لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَ لِسَاناً وَ

شَفَتَیۡنِ وَ ھَدَیۡنَاہُ النَّجۡدَیۡنِ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ وَ مَا اَدۡرَاکَ مَا الۡعَقَبَۃُ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۔" کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور اس کو نیکی اور بدی کے دونوں رستے بھی دکھا دیئے، پھر بھی وہ گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا۔ اور کیا سمجھتے ہو کہ وہ دشوار گھاٹی کیا ہے۔ وہ ہے کسی کی گردن کا غلامی یا قرض کے پھندے سے چھڑا دینا"۔

اس آیت شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے غلاموں کے آزاد کرنے کو کس قدر ضروری قرار دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی مشکلات کو سمجھ کر یہ بھی فرما دیا کہ غلاموں کا آزاد کرنا کوئی آسان امر نہیں، بلکہ ایک نہایت مشکل امر ہے اور ایک دشوار گذار پہاڑی راہ پر چڑھنے کے برابر ہے۔ البقرۃ آیت ۱۷۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ ......وَ اٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی ......وَ فِی الرِّقَابِ کہ حقیقی پاکیزگی یہ ہے کہ انسان ایمان لائے اور پھر ساتھ اس کے اپنا مال خالص اللہ کی محبت کے لئے فلاں فلاں موقعہ پر خرچ کرے، جس میں غلاموں کا آزاد کرنا بھی شامل فرمایا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی آیتیں محض نصیحت کے پیرایہ میں نہیں، بلکہ ان میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا ایک سچا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ نے بہت بہت غلام آزاد کئے۔ نہ صرف اپنی ملکیت کے بلکہ خرید خرید کر بھی بہتوں کو آزاد کیا۔ چنانچہ ایک صحابی کا ذکر ہے کہ اس نے ایک سو غلام اسلام لانے کے بعد آزاد کئے۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے مکہ میں چالیس ہزار درہم غلاموں کے خرید کر آزاد کرنے میں خرچ کئے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں کا آزاد کرنا سلام نے مذہبی فرض قرار دیا ہے۔

نہ صرف افراد کو ہی یہ حکم تھا کہ وہ حسب طاقت اور بمقتضائے وقت غلام آزاد کریں، بلکہ صدقات کے روپئے کا، جو بیت المال میں جمع ہوتا تھا، ایک ضروری خرچ غلاموں کا آزاد کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلۡفُقَرَاءِ وَالۡمَسَاکِیۡنِ وَالۡعَامِلِیۡنَ عَلَیۡھَا وَالۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُھُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَالۡغَارِمِیۡنَ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ فَرِیۡضَۃٌ مِنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ۔ (التوبہ۔ ع ۸۔ آیت ۶۰) یعنی صدقات کا روپیہ فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا، جو اس کے وصول کرنے یا تقسیم پر مقرر ہیں اور مؤلفۃ القلوب کا۔ اور نیز یہ روپیہ غلاموں کے آزاد کرنے اور قرضداروں کے قرضے ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے خرچ کیا جائے۔ یہ اللہ کی ٹھہرائے ہوئے حقوق ہیں اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں صدقات یعنی زکوٰۃ کے روپئے کے مصارف میں سے ایک ضروری خرچ غلاموں

کے آزاد کرنے کا ٹھہرایا گیا ہے۔ گویا حکومت کو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ بھی ایک حصہ روپے کا غلاموں کے آزاد کرنے میں صرف کرے۔ یہ حکم انسانی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

علاوہ ازیں ان عام احکام کے بعض حالتوں میں صاحب مقدور مسلمانوں کے لئے غلام کا آزاد کرنا، جہاں غلام مل سکے، لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ تمام موقعے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہیں۔ پہلے موقعہ وہ ہے، جب ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو غلطی سے مارڈالے۔ اس وقت بردہ آزاد کرنے کا حکم ہے۔ (النساء۔۹۴)

دوسرا وہ موقعہ ہے جہاں کوئی اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے، یعنی اپنی بیوی کو ماں کہہ دے۔ اسے جھوٹ اور بے ہودہ قرار دیا ہے۔ اور ظہار کے بعد اگر پھر رجوع کرے، تو اس کا کفارہ غلام کا آزاد کرنا رکھا ہے۔ (المجادلہ۔۳،۴)

ان دونوں صورتوں میں غلام کا آزاد کرنا لازمی ہے۔ لیکن اگر غلام نہ ملے، تو پھر اور صورتیں کفارہ کی بتائی گئی ہیں۔ تیسرا موقعہ وہ ہے کہ جب کوئی قسم کھا بیٹھے اور پھر اس کو پورا نہ کرے، تو اس کا کفارہ یہ فرمایا کہ یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے۔ اور یا بردہ آزاد کرے۔ حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر اس کو توڑ دے، اس کا کفارہ بھی غلام کا آزاد کرنا ہے۔ یہ سب ایسے حکم ہیں، جن میں غلام کا آزاد کرنا ضروری ہے۔

احادیث میں بھی غلاموں کے آزاد کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ **اَیُّمَا رَجُلٌ اِعتَقَ امرأ مُسلِمًا اِستَنقَذَاللہ بِکُلِّ عُضوٍ مِنہُ مِنَ النَّار** یعنی جو شخص ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر ایک عضو کے بدلے آزاد کنندہ کے ہر ایک عضو کو آگ سے بچائے گا۔ اس سے بڑھ کر غلاموں کی آزادی کے لئے اور کیا ترغیب ہوسکتی ہے۔

ایک اور حدیث کا مضمون یہ ہے۔ **عن البراء ابن عازب قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال دلنی علی عمل یقرینی من الجنۃ و یبعدنی من النار ۔ فقال اعتق النسمۃ و فک الرقبۃ ۔** یعنی براء ابن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھے جنت سے نزدیک کرے اور دوزخ سے دور کرے۔ فرمایا غلام کو آزاد کر اور گردن کو چھڑا۔ ایسا ہی ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے پیارا عمل خدا کے نزدیک غلام کا آزاد کرنا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر بھی غلام کے آزاد کرنیکا حکم تھا۔ چنانچہ بخاری میں ہے۔ **عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما قالت امر**

النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعتاقۃ فی کسوف الشمس ۔اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کے موقعہ پر غلاموں کے آزاد کرنیکا حکم دیا۔

یہ تمام احکام، جو قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے دکھائے گئے ہیں، صرف ترغیب وتحریص کے رنگ میں ہیں اور اگرچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان احکام کی ایسی پیروی کرتے تھے، جیسے فرائض کی۔ مگر اسلام نے غلاموں کے آزاد کرنے کا صرف یہی طریق نہیں رکھا بلکہ ایک اور صورت بھی بتائی ہے، جو ان تمام صورتوں سے الگ ہے۔ کیونکہ ان تمام صورتوں میں غلام کا آزاد کرنا صرف آقا کی مرضی پر منحصر ہے۔ لیکن اسلام نے غلاموں کو آزادی حاصل کرنے کا حق بھی دیا ہے۔ اس پر سورۃ نور کی وہ آیت شاہد ہے، جو پہلے بھی ایک موقعہ پر نقل کی جا چکی ہے۔ وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡھُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡھِمۡ خَیۡراً وَ اٰتُوۡھُمۡ مِنۡ مَالِ اللّٰہِ الَّذِیۡ اٰتٰکُمۡ ۔ (النور۔۴۔۳۳) ترجمہ۔ اور تمہارے غلاموں میں سے، جو مکاتبت کے خواہاں ہوں، تم ان کے ساتھ مکاتبت کر لیا کرو، بشرطیکہ تم ان میں بہتری کے آثار پاؤ۔ اور مال خدا میں سے، جو اس نے تم کو دے رکھا ہے، کچھ ان کو بھی دے دیا کرو۔

مکاتبت یوں ہوتی تھی کہ آقا غلام کو کچھ روپئے کی ادائیگی کے وعدے پر یہ لکھ دیتا تھا کہ جب اس قدر روپیہ ادا ہو جائے گا، تو غلام آزاد سمجھا جائے گا۔ اور اس اثناء میں غلام بجائے خود کام کر کے روپیہ کماتا اور وہی روپیہ مالک کو آزادی حاصل کرنے کیلئے دیتا تھا۔ اس آیت شریف میں یہ حکم ہے کہ جب تمہارا غلام مکاتبت کو خواہاں ہو، تو ضروری ہے کہ تم اس سے مکاتبت کرو۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ کچھ مفید کام کرنیکے قابل ہو۔ اور اس شرط کا ہونا اسلئے ضروری تھا تا نکمے غلام آزاد ہو کر سوسائٹی کو بجائے فائدہ کے نقصان پہونچانے والے نہ بنیں۔ بلکہ صرف وہی آزاد ہوں، جو کچھ کمانے کے قابل ہیں۔

یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ جب غلام مکاتبہ چاہے، تو آیا آقا پر واجب ہے کہ وہ مکاتبت لکھ دے یا نہیں۔ اول تو قرآن کریم کے الفاظ سے ہی اس کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ حکم ہے کہ جب غلام مکاتبت کا خواہاں ہو، تو مکاتبت کر لیا کرو۔ احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں باب المکاتب کے نیچے آیت مذکورہ بالا کو لکھنے کے بعد لکھا ہے۔ **و قال روح عن ابن جریج قلت لعطاء واجب علی اذا علمت له مالا ان اکاتبه قال ما اراہ الا واجبا و قال عمرو بن دینار قلت لعطاء تاثرہ عن احد قال لاثم اخبرنی ان موسیٰ بن انس اخبرہ ان سیرین سال انسا المکاتبة و کان کثیر المال فابی فانطلق الی عمرؓ فقال کاتبه فابی**

فضربه بالدرة و يتلو عمر فكاتبوهم ان علمتم فيهم خيرا، فكاتبه ۔یعنی روح سے روایت ہے کہ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء کو پوچھا کہ اگر مجھے معلوم ہو کہ غلام مال دے سکتا ہے، تو مکاتبہ کرنا مجھ پر واجب ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو اسے واجب ہی سمجھتا ہوں۔ اور عمر بن دینار کہتے ہیں، میں نے عطاء کو کہا کہ آپ کسی دوسرے سے یہ روایت کرتے ہیں۔ کہا نہیں۔ پھر مجھے انہوں نے خبر دی کہ موسیٰ بن انس نے ان کو خبر دی کہ سیرین نے انس سے مکاتبہ کی خواہش کی اور وہ بہت مال والا تھا۔ انس نے انکار کیا، تو سیرین حضرت عمرؓ کے پاس چلے گئے۔ آپ نے انس کو بلا کر کہا کہ مکاتبہ کر لو۔ انہوں نے پھر انکار کیا، تو حضرت عمرؓ نے ان کو درہ کے ساتھ مارنا شروع کیا۔ اور آپ قرآن شریف کی یہ آیت پڑھتے تھے۔ **فکاتبوهم ان علمتم فيهم خيرا** ۔ پھر انس نے مکاتبہ لکھ دیا۔ مکاتبہ کا روپیہ عموماً با قساط ادا کیا جاتا تھا۔ اور بظاہر اس میں غلام کی ہی رعایت تھی۔ لیکن اگر اقساط مقرر کرنے کے بعد غلام کافی روپیہ ایک ہی وقت میں دے سکنے کے قابل ہو، تو آقا مجبور تھا کہ اسے اسی وقت روپیہ لے کر آزاد کر دے۔ چنانچہ حصرت عمرؓ کے سامنے ایسا ہی ایک فیصلہ ہوا تھا کہ ایک عورت نے یکمشت مکاتبہ کا روپیہ لینے سے انکار کیا، تو آپ نے روپیہ بیت المال میں داخل کر کے غلام کو آزاد کر دیا۔ اور عورت کو کہا کہ تو اب روپیہ خواہ با قساط لے لے اور خواہ یکمشت۔ ان مقدمات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں غلام آقا کو آزادی کے لئے مجبور کر سکتا تھا۔

مکاتبہ کی صورت میں سارا روپیہ غلام کو محنت سے ہی ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات دوسرے لوگ روپیہ دے کر اس کی مدد کرتے اور بعض اوقات قومی چندے بھی اس غرض کے لئے کئے جاتے اور صدقات کے روپئے میں سے بھی کچھ روپیہ دے دیا جاتا تھا۔ قرآن شریف کے اس حکم میں کہ وَاٰتُوْهُمْ مِنْ مَالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰكُمْ ۔صرف غلام کا آقا ہی مخاطب نہیں، بلکہ عام طور پر بھی مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ جب غلام روپیہ دے کر آزادی حاصل کرنی چاہتے ہو، تو تم بھی اسے کچھ دے دیا کرو۔ احادیث سے بھی یہ ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ غلاموں کے چھوڑنے میں مدد کیا کریں۔ تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر کے نیچے یہ روایت لکھی ہے۔ **ان رجلا قال النبی صلی الله علیه وسلم علمنی عملا یدخلنی الجنة قال لان كنت اقصرت الخطبه لقد اعظمت المسئلة اعتق النسمة و فک الرقبه فقال الیسا واحدا فقال لاعتق النمسة ان تنفرد بعتقها و فک الرقبة ان تعین فی ثمنها** ۔ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے وہ عمل سکھایئے، جس سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔ فرمایا اگرچہ تیری بات مختصر ہے، مگر تیرا سوال بہت

بڑا ہے۔غلام کو آزاد کرا اور گردن کو چھڑا۔اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اور کیا ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب نہیں۔فرمایا۔نہیں۔غلام کے آزاد کرنے سے یہ مراد ہے کہ تو اکیلا ہی اس کو آزاد کرے۔اور گردن کے چھڑانے سے یہ مراد ہے کہ تو اس کی قیمت کے ادا کرنے میں مدد کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں خود آپ نے اور آپ کے ازواج مطہرات اور صحابہ کرام نے غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مالی مدد دی۔ چنانچہ سلمان فارسی کے مکاتبہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے تین سو درخت کھجور کا لگایا اور روپیہ کی ادائیگی یوں ہوئی کہ آپ نے صحابہ کو اس کا چندہ کرنیکے لئے حکم دیا۔ چنانچہ چندہ کر کے وہ رقم ادا کی گئی۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریدہ کے مکاتبہ کا کل روپیہ ادا کیا۔اور یہ حدیث بخاری میں موجود ہے۔ فک رقبہ پر قرآن شریف نے خود بہت زور دیا ہے۔اور یوں ہر پیرائے میں مسلمانوں کو غلاموں کی آزادی حاصل کرنے میں مدد دینے کی ترغیب دی ہے کہ خود غلام آزاد کرو، چندہ کر کے انکی قیمت ادا کرو۔اور بالآخر یہ کہ صدقات کے روپئے کا ایک حصہ اسی نیک کام میں صرف کرو۔اگر پچھلے زمانے کے مسلمان ان ہدایتوں پر اسی طرح عمل کرتے، جیسے صحابہ کرام نے عمل کر کے دکھایا، تو اسلامی ممالک میں سے کبھی کا غلامی کا نام ونشان مٹ گیا ہوتا۔

بعض اور حالتیں بھی تھیں، جن میں غلاموں کا آزاد کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔اگر آقا غلام کو مارے، تو اس کا کفارہ اس کا آزاد کرنا قرار دیا گیا۔جب کبھی مار کی شکایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچی، تو آپ نے فی الفور غلام کو آزاد کر دیا۔خلفائے راشدین کا بھی اسی پر عمل رہا۔ چنانچہ امام مالک نے مؤطا میں یہ روایت لکھی ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک لونڈی کی شکایت آئی، جس کو اس کے آقا نے مارا تھا، تو آپ نے فی الفور اسے آزاد کر دیا۔ایسا ہی آزادی کا استحقاق اس صورت میں پیدا ہو جاتا تھا، جب لونڈی اور آقا کا تعلق خاوند بیوی کی طرح ہو کر اس سے اولاد پیدا ہو۔خاوند کی زندگی میں اس سے لونڈی کی طرح سلوک نہ ہوتا تھا۔اور اس کے مرنے کے بعد وہ آزاد سمجھی جاتی تھی۔اگر ایک غلام کئی مالکوں کی مشترکہ ملک ہو اور ان میں سے ایک بقدر اپنے حصہ کے اسے آزاد کر دے، تو حکم تھا کہ اگر اسے توفیق ہو، تو وہ باقی مالکوں کے حصہ کی پوری قیمت ادا کر کے غلام کو بکلی آزاد کر دے۔ایسا ہی اگر آقا وصیت لکھ دے کہ فلاں غلام آزاد ہے، تو ورثاء اس کو آزاد کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

علاوہ ان غلاموں کے جو اسلام سے پہلے مسلمانوں کے قبضے میں آ چکے تھے اور جنکی بہت بڑی تعداد ان احکام کے مطابق آزاد کر دی گئی تھی۔اسیران جنگ تھے، جو اس وقت کے قوانین جنگ کے لحاظ

سے فاتحین کی غلامی میں آ جاتے تھے۔مگرآ نحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر ان کو بھی آزاد کر دیا۔اسی (۸۰) آدمی،جنھوں نے فتح مکہ کے وقت مقابلہ کیا تھااور جو گرفتار کر لئے گئے تھے،سب کے سب آزاد کر دیئے گئے۔قوم ہوازن کے چھ ہزار قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھےاور وہ کل کے کل بغیر فدیہ لینے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیئے۔اور یہ تعلیم قرآن شریف کی ہے کہ حتی الوسع اسیران جنگ کواحسان رکھ کر یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔جیسا کہ سورہ محمدؐ کی آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً۔ سے ظاہر ہے۔یعنی جب تم دشمن کو قیدی بنا لو،تو پھر یا انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دواور یا فدیہ لے کے چھوڑ دو۔قرآن کریم کی بات بات میں خدا سے ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔یہاں بھی مقدّم اسی بات کو رکھا ہے کہ احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ہاں اگر احسان رکھ کر چھوڑ نا مصلحت وقت نہ ہواور اس سے دشمن کو ایسی تقویت پہونچتی ہو کہ اس سے پھر جنگ کا خطرہ ہو،تو سوسائٹی کے امن کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا،اور ہر ایک دانشمند اسے ضروری سمجھے گا کہ یا تو قیدیوں کا فدیہ لے کر ان کو چھوڑا جائے،تا دشمن کو مالی کمزوری پہونچ کر پھر وہ امن میں خلل نہ ڈال سکے۔اور اگر وہ فدیہ نہ دیں،تو ایسی صورت میں گویا وہ خود غلامی کو اختیار کرنے والے ٹھہریں گے۔چنانچہ جب ہوازن کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم،جیسا کہ بخاری شریف کی صحیح حدیث سے ثابت ہے،کئی دن تک ان کا انتظار کرتے رہے کہ وہ آ کر اپنے قیدی مانگیں،تو چھوڑ دیئے جائیں۔چنانچہ جب آخر وہ چند دن دیر کر کے آئے اور اس وقت غلام تقسیم ہو چکے تھے،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر مسلمانوں کو یوں خطاب کیا۔ **اما بعد فان اخوانکم جاؤنا تائبین و انی رایت ان ارد الیھم سبیھم فمن احب منکم ان یطیب ذالک فلیفعل و من احب ان یکون علی حظه حتی نعطیه ایاه من اول ما یفئی الله علینا فلیفعل. فقال الناس طیبنا ذلک** ۔تمہارے بھائی تائب ہوکر ہمارے پاس آئے ہیں کہ پھر جنگ نہ کریں گےاور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس کر دوں۔پس تم میں سے جو کوئی بخوشی ان کو احسان رکھ کر واپس کرنا چاہے،تو کر دےاور جو یہ چاہے کہ اس کے معاوضہ میں کچھ لے کر چھوڑے،تو وہ منتظر رہے،جب تک خدا ہم کو کچھ دے،جس میں سے ہم اسے دیدیں۔اس پر سب مسلمانوں نے عرض کیا کہ ہم بخوشی ان کو مفت چھوڑتے ہیں۔

اس تمام بحث سے ناظرین پر یہ عیاں ہو چکا ہے کہ دو قسم کے غلام تھے،جن کے ساتھ اسلام کو واسطہ پڑا۔اوران میں سے ہر ایک قسم کے لئے ان کے مناسب حال آزادی کی راہیں بھی الگ الگ تجویز کی گئیں۔قسم اول میں وہ غلام شامل تھے،جو اسلام لانے سے پہلے مسلمانوں کے قبضے میں آ چکے

تھے اور جو مدتوں سے، بلکہ پشت در پشت، غلامی میں چلے آتے تھے۔ دوسری قسم میں اسیران جنگ تھے، جو لڑائیوں میں مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے اور جو مروجہ قوانین جنگ کے رُو سے غلام تھے۔ ان کی غلامی صرف اسی وقت سے شروع ہوتی تھی، جب وہ قید کر لئے جاتے تھے۔ قسم ثانی کے غلام چونکہ تمدنی رنگ میں آزاد لوگوں کی طرح ہی تھے، اس لئے ان کے یکدفعہ ہی آزاد کر دینے سے سوسائٹی کے تمدن پر کوئی بد اثر نہ پڑ سکتا تھا۔ ان کی اپنی جائدادیں، اپنے گھر اور مکان، اپنی تجارتیں اور حرفے سب ایسے ہی موجود تھے، جیسے آزاد لوگوں کے۔ اور ان کو آزاد کرنا صرف ان کو اپنی اصلی حالت پر بحال کر دینا تھا۔ ان لوگوں سے اگر کوئی خطرہ تھا، تو صرف اس قدر کہ آزاد ہونے کے بعد وہ پھر ملک کے امن میں فساد نہ ڈالیں۔ پس ان کے لئے قرآن کریم نے یہ تجویز کی کہ ان سے کوئی خطرہ نہ ہو اور وہ اطاعت اختیار کریں، تو ان کے قیدی احسان رکھ کر چھوڑ دیئے جائیں، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں سے سلوک کیا کہ جب وہ تائب ہو کر آئے، تو آپ نے ان کے کل کے کل قیدی یکدفعہ ہی آزاد کر دیئے۔ لیکن اگر ان سے خطرہ ہو، تو پھر دو صورتیں تھیں، یا تو وہ فدیہ دے کر آزادی حاصل کریں، جیسا کہ دنیا کی کل اقوام میں اب بھی یہی دستور پایا جاتا ہے، اور اگر وہ فدیہ نہ دیں، تو پھر غلامی میں رہیں۔

مگر ان غلاموں کو، جو مدتوں سے غلامی میں چلے آتے تھے، قرآن کریم نے یک مرتبہ ہی آزادی دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ان لوگوں کے نہ کوئی گھر بار تھا، نہ جائدادیں تھیں، نہ کوئی تجارتیں تھیں۔ اور نہ ہی عموماً کوئی ہنر ان کو آتا تھا۔ پس ان سب کو یکدفعہ آزاد کر دینے میں نہ صرف مالکوں کو ہی ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑتا، بلکہ ان کی اپنی حالت بھی اور پستی کی طرف چلی جاتی اور ان کو ذلیل پیشے اختیار کرنے پڑتے۔ اور سوسائٹی کے تمدن پر اس کا بہت برا اثر پڑتا۔ نہ ان کے رہنے کے لئے مکان ہوتے اور نہ روزی کمانے کا کوئی عمدہ ذریعہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ ان کی اس گری ہوئی حالت کی اصلاح ان کو فوری آزادی دینے سے نہیں ہو سکتی تھی۔ پس ان کے لئے اسلام نے سچی دور اندیشی سے ایسا طریق سوچا، جس سے ان کی حالت بھی سنورنے لگی اور تدریجی طور پر ان کو آزادی ملنی بھی شروع ہو گئی۔ وہ ذلت، جو غلام کے نام سے لگی ہوئی تھی اور جو سب بدیوں کی جڑھ تھی، وہ اخوت کو قائم کر کے نابود کر دی گئی۔ اور پھر ان کو تعلیم دینے اور ہنر سکھانے کا اہتمام کیا گیا اور ساتھ ساتھ ان کی آزادی کا انتظام بھی کیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عجیب نمونہ، اپنے کل غلاموں کو آزاد کرنے کا دکھایا، اس کا اور بھی اثر نیک ہوا۔ غلاموں کی آزادی کی ضرورت مختلف طریقوں سے سمجھائی گئی۔ اور بہت سی صورتوں میں ان کا آزاد کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ ادھر صدقات کے روپے کا ایک حصہ اس مصرف میں لگنا

شروع ہوا۔ ادھر غلام کے آزاد کرنے کو گناہ کا کفارہ قرار دے کر ہر ایک مسلمان کو یہ سمجھایا گیا کہ غلام کے آزاد کرنے میں ہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مگر نہ صرف آزاد کرنے میں، بلکہ اس سے نیکی اور احسان کرنے میں اور ہر طرح سے اس کی مدد کرنے میں۔ اور ان سب حکموں کے بعد یہ فرمایا گیا کہ جب غلام ہوشیار اور محنتی ہو اور مفید کام کرنے کے قابل ہو اور وہ آزادی حاصل کرنا چاہے، تو مالک پر واجب ہوگا کہ وہ اسے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے دے اور اس طرح پر وہی لوگ غلامی میں رہ سکتے تھے جو بالکل نکمے اور بیکار تھے۔ غلاموں کی حالت میں یہ اصلاحیں نہ صرف اس زمانے میں، بلکہ اس کے بعد بھی کسی کو نہ سوجھیں۔ کوئی شخص انصاف اور خدا ترسی سے غور کرے اور دیکھے کہ ایک طرف تو وہ تاریکی، جس کے ساتھ دنیا ساتویں صدی کے شروع میں تاریک ہو رہی تھی، اور دوسری طرف یہ اعلیٰ درجہ کے اور روشن اصول۔ مقام غور ہے کہ یہ باریک اصول اس تاریکی سے تو پیدا نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی ایک شخص کے دل میں، جو اس جاہل قوم کے درمیان پیدا ہوا ہو، ایسے خیالات خود بخود آ سکتے تھے۔ پس ان پاک خیالات کا سر چشمہ کونسا تھا۔ اور وہ آفتاب کونسا تھا، جس سے یہ نور صداقت چمک اٹھا۔ صرف اتنی بات کہہ دینا کہ غلام آزاد کر دیئے جائیں، یہ تو ہر ایک کر سکتا ہے۔ مگر یہ باریک امتیاز اور یہ روشن اصول کہ کن حالتوں میں تدریجی آزادی دی جاوے۔ اور کن حالتوں میں یکدفعہ آزادی دیجائے۔ یہ بیشک اس پاک سر چشمہ کی تعلیم تھی، جو وحی کا سر چشمہ ہے، ورنہ ایسی جہالت اور تاریکی کے اندر ایسی عجیب اور پُر حکمت تعلیم دینا انسان کی طاقت میں نہ تھا۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس کامل انسان پر یہ جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے غلامی کو مذہب کا جزو بنا دیا۔ وہ راستہ، جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا اور جس میں مہاجرین اور انصار چلتے رہے، وہ ایک صاف اور واضح راستہ ہے۔ پس اس راہ پر نکتہ چینی نہ کرو اور دکھاؤ کہ کس مذہب نے اور کس مذہب کے بانی نے ایسے روشن اصول قائم کئے۔ اور انسانوں کے ساتھ ایسی پاکیزہ ہمدردی دکھائی۔

غلام بنانے کا رواج

اس بحث کے بعد، جو سابقاً ہو چکی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلام نے غلامی کے رواج کو ہمیشہ کیلئے اپنا جزو لازمی قرار دیدیا ہے یا کہ اس کا منشا غلامی کو موقوف کرنیکا پایا جاتا ہے۔ اسلام میں غلاموں کی تدریجی آزادی پر بحث کرتے ہوئے میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ تدریجی آزادی کے اصول کو قائم کرنا سوسائٹی کے امن اور اسکی بہتری کیلئے نہایت ضروری امر تھا۔ اسلئے اس حد تک اسلام کو غلامی کے جاری رہنے کی اجازت دینی پڑی۔ جب تک آہستہ آہستہ تمام غلاموں کے آزاد ہو جانے سے بغیر

سوسائٹی کے امن میں مخل ہونے کے غلامی خود ہی دنیا سے اٹھ جائے۔ یہ بھی میں نے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ غلامی کا رواج تو یکدفعہ ہی موقوف نہیں کیا گیا، مگر جس قدر مضرات اس رواج سے قدیم سوسائٹی میں پیدا ہوتے تھے، ان تمام کو اسلام نے یک قلم ہی موقوف کر دیا۔ یہ اس سوال کا مختصر سا جواب ہے، جو میں نے شروع میں کیا ہے۔ اور میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ قرآن شریف یا حدیث شریف میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں، جس سے یہ ثابت ہو کہ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لئے رواج دیا۔ صرف اس بات سے کہ غلاموں کا ذکر قرآن شریف میں ہے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غلامی اسلام کے لئے لازمی ہے۔ یہ کیسی بیہودہ دلیل ہے کہ چونکہ قرآن شریف غلاموں کے آزاد کرنے کا حکم دیتا ہے یا غلاموں سے حسن سلوک کے لئے تاکید فرماتا ہے یا بعض حالتوں میں آزاد مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ لونڈیوں کو بیبیاں بنا لیں، اس لئے اسلام کے اصول کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان احکام کے پورا کرنے کے لئے غلامی کے رواج کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا جاوے۔

درحقیقت یہ بڑی غلطی ہے یا یہ کہنا چاہئے کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے شرارت ہے، جو یہ کہا جاوے کہ اسلام نے غلامی کو اپنا ایسا جزو لازمی قرار دیدیا ہے کہ وہ اب اس سے الگ نہیں ہوسکتی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اسلام نے غلاموں کے آزاد کرنیکا حکم تو دیا، مگر آئندہ کے لئے غلام بنانے کے رواج کو بند نہیں کیا۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ جنگوں کو الگ چھوڑ کر، جس کا ذکر میں ابھی کروں گا، کوئی مثال ایسی نہیں پائی جاتی کہ جس طرح پرانی قوموں میں زبردستی پکڑ کر یا فروخت کے ذریعہ سے آزاد آدمیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، اسلام نے بھی ایسا کیا ہو۔ نہ ہی قرآن شریف یا حدیث سے اس طریق کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ نہ کوئی اس قسم کا حکم شریعت اسلامی میں ہے اور نہ ہی اجازت ہے کہ تم آزاد آدمیوں کو زبردستی پکڑ کر یا اور طرح سے فروخت کر کے ان کو غلام بنا لیا کرو۔ جس صورت میں غلاموں کے متعلق ان کی آزادی اور نیک سلوک اور ان کے نکاح اور ان کی سزاؤں وغیرہ کے سب احکام موجود ہیں، تو یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ اگر اسلام کے نزدیک فروخت وغیرہ کے ذریعہ غلام بنانا جائز ہوتا، تو اس کے احکام بھی قرآن شریف میں ہونے چاہئیں تھے۔ اور اس قسم کے احکام کے نہ ہونے سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ اسلام کے نزدیک آزاد لوگوں کو غلام بنانا جائز نہ تھا۔

پھر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اسلام نے غلام بنانے کی اجازت نہیں دی، تو پھر اس طریق سے روکا بھی نہیں۔ یہ عذر بھی غلط ہے۔ غلام کو آزاد کرنا یا آزاد کو غلام بنانا دو ایسے فعل ہیں، جو ایک دوسرے کے بالمقابل پڑے ہوئے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان میں سے ایک کو اچھا سمجھتا ہے تو ضرور

ہے کہ وہ دوسرے کو برا سمجھے۔اب ہر ایک طالب حق کو چاہئے کہ خود قرآن شریف کو پڑھ کر دیکھ لے کہ ان میں سے کس فعل کو محمود قرار دے کر قرآن شریف نے اس کی ترغیب دی ہے۔اگر قرآن کریم غلاموں کے آزاد کرنے کو اس قدر نیکی اور ثواب کا کام بیان نہ کرتا، بلکہ معمولی طور پر یہی کہہ دیتا کہ غلاموں کو آزاد کر دینا بھی جائز ہے،تو بیشک یہ نتیجہ صحیح نہ ہوتا کہ اس کی تعلیم کی رو سے آزاد کو غلام بنانا بُرا فعل ہے۔ مگر غلاموں کے آزاد کرنے کو اسلام نے ہر ایک مسلمان کا،جس کے پاس غلام ہوں، مذہبی فرض قرار دیا ہے اور اس فعل کو اعلیٰ درجہ کی نیکی اور ثواب کا کام قرار دیا ہے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آزاد کو غلام بنانا اسلام کے نزدیک ایک مذموم اور گناہ کا فعل ہے۔اس بات کو اور صاف کرنے کے لئے میں ان آیات کو حوالہ پھر دونگا،جن میں غلاموں کے آزاد کرنیکا حکم دیا گیا ہے۔

سب سے اول یہ حکم سورۃ البلد میں نازل ہوا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ انسان پر اپنی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کر کے فرماتا ہے۔ **فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَا اَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ . فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَتِيْماً ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْناً ذَا مَتْرَبَةٍ** ۔یعنی ہم نے اس قدر نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں،مگر پھر بھی وہ ایسا ناشکر گذار ہے کہ ایک دشوار گذار راہ کو طے نہیں کرتا۔اور اس دشوار گذار راہ کا طے کرنا کیا ہے؟ غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن یتیم رشتہ دار یا محتاج خاک نشین کو کھانا کھلانا۔اب اس بات کو چھوڑ کر کہ جو شخص باوجود مقدرت کے غلام کو آزاد نہیں کرتا یا اس حکم کے بموجب یتیم یا مسکین کو کھانا نہیں کھلاتا۔وہ خدا کے نزدیک کیسا سمجھا جاویگا۔اتنی بات بالکل صاف ہے کہ جو شخص اس حکم کی صریح خلاف ورزی اس طرح کرتا ہے کہ آزاد کو غلام بناتا ہے۔یا ایک محتاج اور یتیم کو بجائے کھانا کھلانے کے اس کا کھانا اس سے چھین کر اس کو بھوکا مارتا ہے، وہ خدا کے نزدیک یقیناً بڑا گنہگار ہے۔ایسا ہی سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حقیقی نیکی جو انسان کو خدا کی نظر میں برگزیدہ بناتی ہے، یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر یقین کامل رکھتا ہو اور اپنا مال اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے اپنے قریبیوں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے دے۔اور نمازوں کو قائم رکھے۔اور زکوٰۃ دے اور جب عہد کرے،تو اس عہد کو پورا کرے وغیرہ وغیرہ۔اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم یعنی غلاموں کے آزاد کرنے کے عین الٹ اس طرح پر چلنا جائز ہے کہ آزاد کو غلام بنایا جائے تو اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ باقی سب احکام کے الٹ چلنا بھی قرآن شریف کے نزدیک جائز ہے،جن کو اس جگہ حقیقی نیکی کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔مثلاً یہ کہ قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں کو مال دینے کی بجائے ان کا مال چھین لیا کرے۔یا نماز کو قائم

کرنے کی بجائے اوروں کو بھی اس سے روکے یا عہد کر کے عمداً عہد کو توڑا کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن شریف غلام کے آزاد کرنے کو گناہ کا کفارہ قرار دیتا ہے۔ پس یہ خود ظاہر ہے کہ آزاد کو غلام بنالینا اس کے نزدیک گناہ ہے۔ اور پھر یہ تو حکم دیا گیا ہے کہ صدقات کے روپے کا ایک حصہ غلاموں کے آزاد کرنے میں صرف ہونا چاہیئے۔ مگر یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ مسلمان گورنمنٹوں کو کچھ روپیہ باقاعدہ غلاموں کی خرید اور تجارت پر لگا رکھنا چاہیئے۔

یہ تو قرآن شریف کے احکام ہیں۔ جب ہم حدیث کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی ویسا ہی زور غلاموں کی آزادی پر دیا گیا ہے۔ کسی حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس طرح جاہلیت کے زمانے میں یا دوسری قوموں کے اندر زبردستی پکڑ کر یا فروخت کے ذریعے غلام بنالئے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح اسلام میں بھی کسی آدمی کو غلام بنالیا گیا ہو۔ بلکہ ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **قال اللہ تعالیٰ ثلاثۃ انا اخصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر و رجل باع حرافا کل ثمنہ (و فی حدیث عبد اللہ ابن عمرو و رجل اعتبد محررا) و رجل استاجرا جیرا فاستوفیٰ منہ و لم یعطہ اجرہ** ۔یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے، جن کے ساتھ قیامت کے دن میں جھگڑوں گا۔ ایک وہ شخص ہے جو میرے نام پر وعدہ کرتا ہے اور پھر اسے پورا نہیں کرتا۔ اور ایک وہ شخص ہے، جو آزاد کو بیچتا ہے اور اس کی قیمت کھا جاتا ہے (اور عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں ہے کہ وہ شخص، جو آزاد کو غلام بناتا ہے) اور ایک وہ شخص، جو ایک مزدور کو اجرت پر لگاتا ہے اور اس سے پوری محنت لے کر اس کی مزدوری اس کو نہیں دیتا۔ اس حدیث سے تائیدی شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ آزاد کو غلام بنانا قرآن شریف نے جائز نہیں رکھا۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنے مذہب کو اس عجیب رنگ میں بیان کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح بخاری میں غلاموں کے متعلق جو باب باندھا ہے، اس کا عنوان "باب العتق وفضلہ" رکھا ہے۔ یعنی غلاموں کے آزاد کرنے اور اس کی فضیلت کو بیان۔ اور کوئی باب ہی اس نے غلاموں کے متعلق نہیں باندھا۔ یہاں تک کہ غلاموں کی خرید وفروخت کا بھی کوئی باب نہیں باندھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، قرآن شریف اور حدیث کی تعلیم اور بخاری کا مذہب۔ ان سے بڑھ کر اور کونسی شہادت ہوسکتی ہے کہ اسلام کا اصلی مذہب اور اس کی سچی تعلیم کیا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غلاموں کی آزادی کا حکم مکہ میں ہی نازل ہوا۔ اور اصلاح کے مختلف پہلوؤں میں سے غلاموں کے آزاد کرنے کا پہلو ایسا تھا، جس کو اسلام نے ابتداء ہی میں اختیار

کیا۔ یہ تو امرواقع ہے۔ مگر اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ جو ناجائز خرید وفروخت انسانوں کی بعض اسلامی ممالک میں آج کل ہو رہی ہے، اس کے موقوف کرنے کے لئے اسلام کے اصول سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ گویا اسلام اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ غلاموں کو آزاد کیا جائے۔ ہر ایک شخص، جو تحقیق کی نظر سے اس مسئلہ کو دیکھے گا، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مروجہ خرید وفروخت غلاموں کی ایسے ہی اصول اسلام کے خلاف ہے، جیسا کہ آج کل مذہب کی آڑ کے نیچے غیر مذہب والوں کا قتل، جس کا نام جہاد رکھا جاتا ہے، جیسا کہ بعض مسلمانوں میں شراب خوری کا موجود ہونا۔ اسلام ان سب باتوں سے بیزار ہے۔

اس قدر بحث سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ جس قدر ذرائع انسانوں کو غلام بنانے کے اس وقت مروج ہیں، ان سب کو اسلام نے روک دیا۔ اب صرف قیدیان جنگ کے متعلق کچھ کہنا باقی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام کے جنگوں کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ لوگوں کو غلام بنایا جائے۔ نہیں۔ بلکہ اسلام کو جنگ ایک مجبوری کی حالت میں اختیار کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے جنگ صرف دفاعی تھے۔ یا ابتدائی خلفاء کے زمانے میں بعض جنگ مذہبی آزادی کو قائم کرنے کے لئے کئے گئے۔ مکہ میں تیرہ سال تک مسلمانوں کو پاؤں کے نیچے روندا گیا اور وہ جگہ جگہ پناہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر کار مدینہ منورہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ مگر ان کے خونخوار دشمنوں نے ان کو اس جگہ بھی امن سے بیٹھنے نہ دیا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تند ہو کر اب انہوں نے اسلام کو بالکل نیست و نابود کرنے کے لئے تلوار ہاتھ میں لی۔ ان حالات کے باعث مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ اپنی حفاظت کی خاطر بالمقابل جنگ کے لئے نکلیں۔ چنانچہ پہلی مڈ بھیڑ طرفین کی مقام بدر پر ہوئی، جو مدینہ سے تین دن کا سفر ہے۔ جمعیت کا یہ حال تھا کہ ایک مسلمان کے لئے تین کافر موجود تھے۔ اور اس سے بڑھ کے مسلمانوں میں بہت سے نوعمر ناتجربہ کار نوجوان تھے۔ اور قریش کا لشکر بڑے آزمودہ کار اور تجربہ کار جنگی جوانوں کا تھا، جو ہر طرح سے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس ظاہر فرق کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو ان دو باتوں سے چارہ نہ تھا۔ کہ یا تو وہ ان کے ساتھ جنگ کریں اور یا اپنی جانوں کو ان کے حوالے کر کے قتل ہونا پسند کریں۔ اس مجبوری کی حالت میں یہ پہلا جنگ ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق دشمن کی سب طاقتوں کو پامال کر کے مسلمانوں کو فتح دی۔ اس میں کوئی ستر کے قریب عمائد قریش مارے گئے اور قریباً ستر قید میں آئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب قیدیان جنگ مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ قیدی معمولی جنگ کے قیدیوں کی طرح نہ تھے، جن کا قصور سوائے اس کے کچھ نہ ہو کہ وہ شریک جنگ ہوئے ہوں۔ نہ ہی صرف اس قدر ان کا قصور تھا کہ وہ مسلمانوں پر چڑھ کر اس لئے آئے تھے کہ ان کو ہلاک کر ڈالیں اور ان

کا نام ونشان مٹا دیں۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے مسلمانوں پر شدید ظلم اور بے رحمیاں کی تھیں۔ اور بہتوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہونچا کر ہلاک کیا تھا۔ دنیا میں کوئی عدالت نہیں، جو یہ فتویٰ نہ دے کہ وہ سب کے سب قابل قتل تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کا یہی خیال تھا اور انہوں نے یہی رائے پیش کی تھی کہ یہ سب قابل قتل ہیں اور ان کو قتل کرنا چاہئے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رائے تھی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اسی کے مطابق اس موقعہ پر عمل بھی ہوا۔ یعنی سب فدیہ لے کر چھوڑ دیئے گئے۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی نظیر قائم ہوئی۔ اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر کی رائے پر عمل کیا جاتا، تو بہتر تھا کیونکہ آئندہ بہت سا فساد، جو انہی لوگوں نے دوبارہ اٹھائے، رک جاتے۔ مگر جو عملدرآمد ہوا، وہ یہی تھا کہ سب قیدیان جنگ رہا کر دیئے گئے۔ مگر ان کے غلام بنانے کے متعلق نہ کسی نے رائے دی اور نہ کوئی ایسی تجویز ہی ہوئی۔

ابھی تک قرآن کریم کا وہ حکم نازل نہ ہوا تھا، جس میں قیدیان جنگ کا بالخصوص ذکر ہے۔ اور جس کو میں پہلے کسی دوسرے موقعہ پر نقل کر چکا ہوں، جو ان الفاظ میں ہے۔ **اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً۔** یعنی جب جنگ ہو لے، تو جن کو تم نے اسیر کیا ہے، ان سے یہ سلوک ہونا چاہئے کہ یا تو ان کو احسان رکھ کر چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے قیدیان جنگ کے متعلق ایک عام حکم دیا ہے، جس پر اسلامی دنیا کو ہمیشہ کے لئے کاربند ہونا چاہئے۔ قرآن کریم یہ نہیں فرماتا جیسا کہ اس کے حق چھپانے والے دشمن کہا کرتے ہیں کہ تم سب قیدیان جنگ کو فی الفور غلام بنا لو۔ بلکہ اس کی پاک تعلیم یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دو یا احسان رکھ کر اور یا فدیہ لے کر۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس اعلیٰ درجہ کے قانون کو، جو اس وقت کے مروج قانون کے بالکل خلاف ہے، کوئی شخص برا کہہ سکے یا اس کے متعلق یہ کہہ سکے کہ یہ اب قابل عملدرآمد نہیں۔ وحی الٰہی نے جس قدر قوانین باندھے ہیں، وہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں قابل عملدرآمد ہیں۔ اور متعصب سے متعصب دشمن بھی ان پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اب معترضین پر لازم ہے کہ وہ اسکے خلاف کوئی اور قانون، جس میں بالخصوص قیدیان جنگ کا ذکر ہو، قرآن کریم سے نکال کر دکھائیں۔ یہی سچا قانون اسلام نے سکھایا ہے اور اس سے بہتر کوئی اور قانون تجویز نہیں ہو سکتا۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ کے بعض حالات کے رو سے اسلام کو کچھ اور قسم کی مشکلات درپیش تھیں، جو مقامی اور عارضی تھیں۔ اور اس لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا علاج بھی مقامی اور عارضی ہی کیا۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ تھی کہ قیدیان جنگ کو یا بطور احسان چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر۔ کیونکہ ہر صورت میں بطور احسان ہی ان کو چھوڑ دینا مصلحت ملکی کا تقاضا نہ تھا۔ مگر اس جگہ مشکل یہ تھی

کہ بعض اوقات مفتوح قوم یا مفتوح ملک اپنے قیدیوں کی پرواہ نہ کر کے فدیہ ادا نہ کرتے۔ یہ اسلام کے لئے ایک بڑی مجبوری تھی، کیونکہ اگر کل کے کل کو احسان رکھ کر چھوڑا جاتا، تو جو مشکلات اسلام کی راہ میں تھیں، ان کا کبھی خاتمہ نہ ہوتا۔ یہ ایک عارضی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اس کا عارضی علاج اسلام نے اسی ملک اور اسی زمانہ کے مطابق حال کیا۔ ایسے قیدیوں کو بجائے گورنمنٹ پر بوجھ ڈالنے کے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جاتا، جن کا یہ فرض تھا کہ ان کو ایسی حالت میں رکھیں جس حالت میں وہ آپ رہتے تھے۔ یہ تو کوئی مخالف بھی نہیں کہے گا کہ وہ اپنی آزادی کو کھو نہ چکے تھے۔ کیونکہ آج کل بھی اسیران جنگ کی آزادی تو چھین لی جاتی ہے، حالانکہ لڑائیاں بھی اسی قسم کی مجبوری کی نہیں، جیسی اسلام کو پیش آئی تھیں۔ مگر آزادی لینے کے سوا مسلمان اوران اسیران جنگ کو کوئی تکلیف نہ دیتے تھے۔ ان کو باہر کھیتوں میں مزدوروں کی طرح کام کرنے کے لئے نہ بھیجا جاتا تھا، جس صورت میں کہ ان کے آقا گھر میں آرام کر رہے ہوں، اور نہ ہی طاقت سے زیادہ ان سے کام لیا جاتا تھا، بلکہ ان رواجوں کو، جو قدیم سوسائٹی میں مروج چلے آتے تھے، اسلام نے بکلی موقوف کر دیا تھا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کو بیکار چھوڑ کر نکمے نہیں بنایا جاتا تھا، بلکہ کچھ کام بھی اس کو کرنا ہوتا تھا۔ پر وہ دوسرے گھر کے لوگوں کی طرح ہوتے تھے اور اپنوں کا سا ہی ان سے سلوک بھی ہوتا تھا۔ اور یہ اختیار ان کو ہر وقت حاصل تھا کہ فدیہ دے کر آزادی حاصل کر لیں۔

ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ اصلاح، جو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کی، وہ تدریجی طور پر ترقی کرنے والی اصلاح تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام بدیوں کو انسانی سوسائٹی سے دور کیا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیوی زندگی کے منقطع ہونے سے پہلے اس اصلاح کی ہر پہلو سے تکمیل ہو گئی۔ چونکہ آپ ہر ایک معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہی کام کرتے تھے، اس لئے آپ کسی رواج یا کسی بات کو بدلاتے نہ تھے، جب تک وحی الٰہی کے ذریعہ آپ کو حکم نہ پہونچے۔ چنانچہ قرآن شریف اور حدیث کے پڑھنے سے یہ بات صاف روشن ہے۔ اب جیسا کہ میں پہلے دکھا چکا ہوں، غلامی کے کل دیگر ذرائع کو تو اسلام نے ابتداء ہی میں روک دیا تھا، مگر اسیران جنگ کے متعلق، جو حکم خصوصیت سے نازل ہوا، وہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اخیری حصہ میں نازل ہوا۔ یہ حکم سورۃ محمد میں ہے اور یہ سورہ فتح مکہ کے قریب قریب نازل ہوئی۔ اب اس سے پہلے عام رواج کل قدیم اقوام کے اندر اسیران جنگ کے متعلق یہ تھا کہ وہ کل کے کل ہلاک کر دیئے جاتے تھے یا غلام بنا لئے جاتے تھے۔ پس اگر وحی الٰہی نازل ہونے سے پہلے ہمارے نبی کریمؐ اس مسلّم رواج پر عمل بھی کرتے تو وہ

عین حق پر ہوتے۔ مگر آپ نے اس وقت بھی عموماً بڑی ہی نرمی سے کام لیا۔ اساری بدر کے متعلق میں دکھا چکا ہوں کہ کس طرح سب کے سب فدیہ لے کر آزاد کر دیئے گئے۔ حالانکہ انہی لوگوں نے پھر جنگوں میں مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ دیئے۔ انیس جنگوں میں سے، جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنی پڑیں، صرف دو میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسیران جنگ کو غلام بنایا گیا۔ اور یہ دونوں موقعے وحی الٰہی کے نازل ہونے سے پہلے پیش آئے اور ان میں واسطہ بھی یہود سے پڑا۔ ایک موقعہ بنی قریظہ سے مدینہ میں اور دوسرے موقعہ پر خیبر کی جنگ میں۔ باقی تمام لڑائیوں پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اسیر بنائے بھی گئے، تو احسان دکھ کر یا فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ کئی مثالیں اس کی پائی جاتی ہیں۔ ایک موقعہ پر چھ ہزار قیدی کو بغیر کسی فدیہ کے لینے کے چھوڑ دیا گیا۔ عربوں نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم کئے تھے کہ مسلمانوں کو یہ حق پہونچتا تھا کہ جب ان پر غالب آئیں، تو ان کو قرار واقعی سزائیں دیں، چاہیں قتل کریں اور چاہیں غلام بنائیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو ہلاک کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ بلکہ جب داؤ لگتا یا بس چلتا تو نہایت بے رحمی سے غریب مسلمانوں کو مار ڈالتے۔ ایک موقعہ پر دھوکا دے کر ستر صحابیوں کو ان ظالموں نے قتل کر ڈالا۔ حالانکہ ان کو یہ کہہ کر ساتھ لے گئے تھے کہ ہم ان سے دین سیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب آخر کار خدا نے محض اپنی تائید اور نصرت سے، جو ہمیشہ وہ صادقوں کو عطا کرتا ہے، مسلمانوں کو ان ظالموں پر غالب کیا، تو ہمارے نبی کریں صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا، جس کے وہ مستحق تھے۔ نہ ہی رواج کے مطابق ان سب کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا۔ بلکہ ایک ایسی فراخ حوصلگی اور جوانمردی کے ساتھ، جس کی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی، جب یہ لوگ قید ہو کر آپ کے پاس آئے، تو آپ ان کو فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دیتے۔

لیکن دو جنگوں میں، جو یہودیوں سے ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اسیران جنگ سے اور رنگ کا تھا۔ ان میں سے ایک موقعہ تو یہود بنی قریظہ کے ساتھ پیش آیا، جنہوں نے دو دفعہ آپ کے ساتھ خطرناک طور پر دغا بازی کر کے کل کے کل مسلمانوں کو ہلاک کرنا چاہا۔ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ جو دغا بازی میں شامل تھے، ان کو قتل کیا گیا اور باقی کو، جن میں بچے اور عورتیں تھیں، غلام بنایا گیا۔ اگر چہ غلام کا مفہوم اسلام میں قطعاً وہ نہیں، جو دنیا کی دوسری قوموں میں تھا اور ہے۔ مگر قصور بھی یہود کا اپنا تھا۔ اور خود انہوں نے اپنے لئے یہ سزا تجویز کی، کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو اپنے متعلق منظور نہ کیا۔ بلکہ کہا کہ جو سعد بن معاذ ہمارے حق میں فیصلہ دیں، وہ ہم کو قبول ہوگا۔ چنانچہ انہی کے فیصلہ کے مطابق یہ سلوک بنی قریظہ سے ہوا۔

دوسرے موقعہ پر جب خیبر فتح ہوا، تو اس وقت جو سیران جنگ ہاتھ لگے، ان کو غلام بنایا گیا۔ اگر چہ یہ ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے فدیہ دینا چاہا ہو، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ کیا ہو۔ بلکہ بعض نظیروں سے یہ شہادت ملتی ہے کہ جن کے فدیہ کا کوئی انتظام ہوسکتا تھا، ان کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا۔ علاوہ فدیہ کے ان اسیروں کی اور بھی بہت سی راہیں کھلی تھیں، جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں موقعوں پر اسیروں کو ایسے طور پر غلام بنایا ہوتا کہ وہ کبھی آزادی حاصل نہ کر سکیں، تو ان میں سے کچھ غلام اخیر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا ابوبکرؓ کے پاس بھی رہنے چاہیئے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے پاس کوئی غلام نہ تھا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اسیران جنگ کو بھی، جو یہودیوں میں سے تھے، جلدی بعد میں آزاد کر دیا گیا تھا۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہودیوں کے ساتھ آنحضرتؐ نے سختی کی اور اپنی قوم کے ساتھ نرمی کی۔ عرب امّی لوگ تھے اور ان کے ہاتھ میں کوئی شریعت نہ تھی، جس کی بنا وحی الٰہی ہو۔ مگر یہودیوں کے پاس ایسی شریعت تھی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اپنی شریعت کے مطابق ان سے سلوک کیا۔ بلکہ اس جگہ بھی نرمی کا ہی پہلو اختیار کیا۔ یہودی شریعت کے مطابق دشمن کو معہ ان کے بچوں کے اور عورتوں کے ہلاک کر ڈالنا چاہیئے (دیکھو استثناء باب ۱۳۔۱۲ سے ۱۸۔ باب ۲۰۔ آیت ۱۶، ۱۷۔ گنتی باب ۲۱ آیت ۳۔ قاضیون باب ۱۔ آیت ۱۷۔ باب ۲۱۔ آیت ۱۰ سے ۱۲۔ یشوعا باب ۶۔ آیت ۲۴۔ اسموائیل باب ۱۵۔ آیت ۳) وغیرہ۔ اسی قانون کی ایک نرم صورت یہ تھی کہ مردوں کو مار ڈالا جائے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے۔ (دیکھو استثناء باب ۲۰۔ آیت ۱۰ سے ۱۴) اب سوچ لو کہ بنی قریظہ کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس میں الزام کس پر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں، کیونکہ آپ نے اس قوم کی شرائط کو منظور کر کے سعد بن معاذ کے فیصلے کے مطابق ان سے سلوک کیا، جسے وہ خود حکم مان چکے تھے۔ نہ ہی سعد بن معاذ پر کوئی الزام عائد ہوسکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے یہودی شریعت کے نہایت نرم پہلو کے مطابق فیصلہ دیا۔ بلکہ اگر کوئی الزام آسکتا ہے تو خود یہودی شریعت پر، جس میں اس سے بھی زیادہ سخت قانون موجود ہیں۔ ایسا ہی خیبر کے یہودیوں کے ساتھ بھی ان کی شریعت کے نہایت نرم پہلو کے مطابق عمل کیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا اعتراض ہے۔ آپ نے تو اسی شریعت کے مطابق ان سے سلوک کیا، جسے یہودی اس وقت تک منسوخ ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور آپ کی طبیعت کی نرمی اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے یہودی شریعت کے نرم سے نرم پہلو کو اختیار کیا۔ بلکہ اگر کچھ سختی اس سلوک میں سمجھی بھی جاوے، تو اس کا ازالہ خود اسلامی شریعت سے ہو گیا۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مثال اور تعلیم سے اپنے ساتھیوں پر یہی نیک اثر ڈالا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ تمام غلاموں کو آزاد کرتے جاویں۔ وہ متعصب عیسائی، جنہوں نے یہ شیوہ اختیار کر رکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک فعل پر اعتراض کریں اور دنیا کی نظر میں آپ کی باتوں کو قبیح کر کے دکھائیں، تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر دیکھیں کہ ان دونوں موقعوں پر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔ بلکہ اگر کوئی اعتراض ہے، تو اس کتاب پر جسکی اشاعت وہ خود دنیا میں کر رہے ہیں۔ یہودیوں پر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا وجہ چڑھائی نہیں کی، بلکہ خود اپنی دغا بازیوں سے انہوں نے اپنے آپکو مجرم بنایا۔ اور اس جرم کی سزا انکو انکی اپنی شریعت کے مطابق دی گئی۔

خدا کی شان ہے کہ ان مجرموں کے وکلاء آج وہ لوگ بن رہے ہیں، جنہوں نے خود لاکھوں یہودیوں کو بے گناہ قتل کیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم کئے اور اب تک بھی کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت اسلام کے اصول، جو قرآن کریم میں مندرج ہیں، عام اور وسیع اصول ہیں، جو ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق ہیں۔ لیکن اگر کسی حکم کے وحی الٰہی میں نازل ہونے سے پہلے کوئی کام کیا گیا ہو، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صریح غلطی ہے کہ یہی اسلام کا قانون ہے۔ ہر ایک امر کے متعلق دیکھنا یہ چاہئے کہ قرآن کریم اس بارے میں کیا حکم دیتا ہے۔ اور اس حکم کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کیا رہا ہے۔ مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں میں بعض مثالیں شریب پینے کی پائی جاتی ہیں۔ مگر ان سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اسلام شراب کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے اوپر بھی کہا ہے اسلام کی اصلاح تدریجی تھی۔ اور اصل حکم شراب کے متعلق وہ ہے جو قرآن کریم نے اس کی قطعی ممانعت کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔ ایسا ہی اسیران جنگ کے متعلق اسلامی شریعت کا حکم، جو وحی الٰہی میں بیان فرمایا گیا، وہ **فَاِمَّا مَنّاً بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً** ہے۔

اب اس بحث سے ناظرین یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے عملی طور پر غلامی کے تمام ذرائع کو روک دیا اور پرانے غلاموں کی تدریجی آزادی کے لئے مختلف احکام نازل فرمائے۔ اسیران جنگ کے متعلق حکم تو وہی تھا، جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے، مگر ایسی مجبوری کی حالتوں میں کہ نہ وہ فدیہ دیں اور نہ ہی ان کو احسان رکھ کر چھوڑنا مصلحت وقت ہو، اس وقت کے رواج کے مطابق ان سے سلوک کیا جاتا تھا۔ پھر بھی وہ فدیہ دے کر ہر وقت آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ اور علاوہ اس کے وہ مختلف راہیں، جو اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لئے بتائی تھیں، وہ سب بھی ان کے لئے کھلی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک بھی نہ ہوتا تھا۔ یعنی وہ اس قسم کے غلام نہ سمجھے جاتے تھے جیسے دوسری اقوام میں یا

زمانہ جہالت کے عربوں میں۔ پس جس صورت میں اسلام نے غلامی کی کل راہوں کو روک دیا اور ان کی تدریجی آزادی کے لئے کئی راہیں کھول دیں، تو کوئی اعتراض اسلام پر باقی نہیں رہتا۔ باقی رہے جنگ اور اسیران جنگ۔ سو یہ کام ابتداءً اسلام نے شروع نہیں کیا۔ بلکہ خود انہی لوگوں نے اول طرح طرح کے دکھ پہونچا کر آخر تلوار ہاتھ میں لے کر اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہا۔ اس مجبوری کی حالت میں مسلمانوں کو بھی اپنی حفاظت کے لئے تلوار اٹھانی پڑی۔ پس یہ لوگ تو خود آزادی کا حق کھو چکے تھے۔ مگر ان کے ساتھ بھی اسلام کا سلوک نہایت محسنانہ تھا۔ اور باوجود اس کے کہ ان لوگوں نے ہر طرح سے اپنے آپ کو قتل اور غلامی کا مستحق بنا دیا تھا، پھر بھی شریعت اسلام نے ان کی آزادی کا ہی حکم دیا۔ صرف استثنائی صورتوں میں بعض وقت جب ان لوگوں نے فدیہ دینے سے بھی انکار کیا، تو پھر مسلمانوں کے لئے مجبوری تھی کہ وہ ان کو غلام بناتے۔

یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس کثرت سے غلام تھے۔ اس کی تردید کے لئے تو یہی کافی ہے کہ ان کے پیشوا اور رہبر کے پاس ایک غلام بھی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قبل از اسلام امراء کے پاس غلاموں کی بڑی بڑی تعداد تھی۔ مگر اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنے پیارے نبی کے نقش قدم پر چل کر کثرت سے غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔ غزوہ احزاب کے متعلق ایک حدیث لکھتے ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اتفاقاً یہ ذکر کیا ہے کہ مہاجرین اور انصار کے پاس کوئی غلام نہ تھا جس سے وہ مزدوری کا کام لے سکتے۔ **خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الخندق فاذا المهاجرون و الانصار یحفرون فی غداۃ باردۃ فلم یکن لهم عبید یعملون ذالک لهم**۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خندق کی طرف نکلے، تو آپ کے صحابہ یعنی مہاجرین اور انصار ٹھنڈی صبح کے وقت خندق کھود رہے تھے اور ان کے پاس غلام نہ تھے، جو ان کے لیے یہ کام کرتے۔ میں نے **اصابہ** کو، جس میں صحابہ کے حالات لکھے ہیں، اس غرض کے لئے پڑھنا شروع کیا تھا کہ ان میں کس قدر غلام تھے۔ مگر افسوس ہے کہ کم فرصتی کی وجہ سے اس کام کو پورا نہ کرسکا۔ ۱۳۴ اصحابہ کے میں نے حالات پڑھے۔ ان میں ایک بھی غلام کا ذکر نہیں۔ ہاں تیرہ ایسے آدمیوں کا ذکر ہے، جو پہلے غلام تھے اور پھر آزاد کر دیئے گئے۔

لونڈیوں کے متعلق احکام

عیسائیوں نے تعدد ازدواج سے نیچے اتر کر اسلام پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا ہے کہ گویا اس مقدس مذہب کے رو سے لونڈیوں کے نام سے جتنی عورتیں کوئی چاہے گھر میں ڈال لے۔ چنانچہ سیل، جو میور

کے بعد اسلامی امور پر رائے دینے کے لئے تعلیم یافتہ عیسائیوں میں بڑا معتبر سمجھا جاتا ہے، اپنے اس مضمون میں، جو اسلام پر اس نے کرسچین کالج میگزین مدراس میں لکھا ہے، کہتا ہے کہ " تعدد ازدواج سے بھی سخت تر غلطی، جو اسلام نے کی، وہ یہ تھی کہ اس مذہب نے یہ اجازت دی کہ لونڈیوں کے نام سے جتنی عورتیں کوئی چاہے گھر میں ڈال لے۔ اس کے جواب میں بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی مما لک میں دوسرے مما لک سے زنا بہت کم پایا جاتا ہے۔ مگر لونڈیوں کے متعلق، جو کھلی اجازت دی گئی ہے کہ جس سے چاہے وطی کر لے، اس میں اور رنڈی بازی میں کچھ بھی فرق نہیں۔ اور جہاں یورپ کے عام مذہب نے رنڈی بازی کو سخت منع کیا ہے، مذہب اسلام نے لونڈیوں سے وطی کو جائز رکھا ہے"۔

قبل اس کے کہ میں اصل اصول اسلام پر بحث کروں، میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس عبارت میں پادری صاحب نے کس قدر جھوٹ سے کام لیا ہے۔ اس تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ جس طرح اسلام نے لونڈیوں کے ساتھ وطی کو جائز رکھا ہے، اس میں اور رنڈی بازی میں کچھ فرق نہیں، اور کہ عیسائی مما لک اس قسم کی برائیوں یعنی کسبیوں وغیرہ سے پاک ہیں۔ اور جس طریق پر یہودیوں کے درمیان لونڈیوں سے بیوی کا سا تعلق رکھنا جائز تھا، اس کو عیسائیت نے منع کر دیا۔ یہ اخیری نتیجہ اگرچہ بصراحت الفاظ میں موجود نہ ہو، مگر اسلام پر لونڈیوں کے احکام کے متعلق حملہ کرنے سے معترض اپنے مذہب کو لازماً اس سے خالی قرار دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اناجیل کے لفظ لفظ کو پڑھ ڈالے، تو وہ پادری صاحبان کی اس جرات سے حیران ہوگا۔ کہ جس صورت میں یہودی شریعت میں یہ رواج چلا آتا تھا اور انجیلوں میں اس کی ممانعت کا اشارہ تک بھی نہیں، تو پھر اس بناء پر اسلام پر اعتراض کرنا کس قدر حماقت کا کام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودی شریعت کے اندر لونڈی کو بطور بیوی کے رکھنا تعدد ازدواج کی ایک صورت تھی۔ اور ان دونوں امور میں عیسائی مذہب ہرگز مانع نہیں ہوا، بلکہ لوتھر کے زمانے میں یعنی عیسائی مذہب کی پیدائش کے تیرہ چودہ سو سال بعد جب اس کے سامنے تعدد ازدواج کے سوال کو پیش کیا گیا، تو اس نے یہی جواب دیا کہ انجیلوں سے تعدد ازدواج کی ممانعت معلوم نہیں ہوتی۔ ایسا ہی غلامی کو بھی حضرت مسیح نے کبھی نہیں روکا۔ بلکہ ایک لفظ بھی اس کے خلاف نہیں کہا۔ اور یہ رواج بھی اس کے پیروؤں میں ہمیشہ چلا آیا۔ بلکہ اس امر کی بھی کھلی کھلی شہادت ملتی ہے کہ لونڈوں کو بطور بیوی کے گھر میں ڈال لینا عیسائیوں میں بھی مروج رہا ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لونڈیوں پر مضمون لکھتے ہوئے عیسائی مضمون نویس لکھتا ہے کہ "پوپوں کے خطوط کے بعض فقرات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے تعلقات کی انہوں نے اجازت دی تھی "۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف عیسائیوں میں اس امر کا رواج ہی رہا، بلکہ ان کے مقدس پوپوں نے بھی اس کو جائز قرار دیا اور ایسا کرنے کی اجازت دی۔ اور پھر وہی مضمون نویس کہتا ہے کہ ٹولیڈو کی کونسل اول کا (جو ۴۰۰ء عیسوی میں ہوئی) قاعدہ ہفدہم یہ ہے کہ جو شخص ایک پاک دامن بیوی کی موجودگی میں لونڈی کو گھر میں ڈال لیتا ہے، اس کو خارج کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ لونڈی بیوی کی طرح اس کی خدمت کرے اور ایک ہی عورت، جس کو لونڈی کہا جاتا ہے، اس کے پاس ہو، تو پھر اس کو خارج نہیں کیا جائے گا۔ یہ طریق صرف عوام الناس کے لئے ہی جائز نہ تھا، بلکہ چھوٹے درجہ کے پادری، جن کو نکاح کرنے کی اجازت تھی، ان کو بھی اسی طرح لونڈی گھر میں ڈال لینے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد جو کونسلیں ہوئیں انہوں نے لونڈی کا نام ان بدکار عورتوں پر بھی بولا، جو گھر میں نہیں رکھی جاتی تھیں"۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت، جس کا ذکر اخیر میں اس عبارت میں کیا گیا ہے، بالکل کسبیوں کی سی ہے۔ اور شاید پادری سیل صاحب کو اپنے بزرگوں کی اس غلطی سے غلطی لگی ہو کہ انہوں نے اسلامی لونڈیوں کو کسبیاں قرار دیا۔ مگر پادری صاحب مطمئن رہیں کہ اسلام اس قسم کی تمام بدکاریوں پر لعنت بھیجتا ہے اور ان کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ ہاں اس بات کا جواب ان کو دینا چاہیئے کہ وہ تو عیسائیت میں لونڈیوں کے ہونے سے صاف انکار کرتے ہیں اور یہاں عیسائی کونسلیں (یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی کونسلیں ہیں، جنہوں نے تثلیث وغیرہ کے عقائد باطلہ گھڑ کر رائج کئے) نہ صرف لونڈیوں کے گھر میں ڈالنے کی ہی اجازت دیتی ہیں، بلکہ جیسا کہ انسائکلوپیڈیا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے، ان فاحشہ عورتوں سے بھی تعلقات رکھنے کی اجازت دیتی ہیں، جو گھر میں نہیں رکھی جاتی تھیں۔

دوسرا امر جس پر پادری صاحب نے بہت زور دیا ہے کہ کم از کم کسبیوں کی عیسائی مذہب میں سخت ممانعت ہے۔

جب ہم بائبل کو پڑھتے ہیں، تو اس میں اس ممانعت کا ذکر صریح الفاظ میں بجائے اناجیل کے، جو عیسائی مذہب کی خاص کتابیں ہیں، احبار ۱۹/۲۹ اور استثناء ۲۳/۱۷ میں پاتے ہیں۔ اناجیل میں اگر کچھ کسبیوں اور فاحشہ عورتوں کا ذکر ہے، تو صرف اتنا ہے کہ کسبیاں اور فاحشہ عورتیں یہودی علماء سے پہلے خدا کی سلطنت میں داخل ہوں گی۔ کیا پادری صاحب کے نزدیک یہی کسبیوں کے پیشہ کی ممانعت ہے؟ کہ ان کو فقیہوں اور فریسیوں پر ترجیح دے کر اور بھی دلیر کیا گیا ہے۔ مگر اس بات کو تسلیم کر کے کہ حضرت مسیح نے اس بدکاری کی ممانعت ضرور کی ہوگی، کیونکہ جس قدر انبیاء دنیا میں مبعوث ہوئے ہیں ان سب نے زنا کو سب سے بڑی بدکاری سمجھا ہے۔ اور اس سے لوگوں کو روکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کہ عیسائی مذہب نے کون کونسی کوشش اس بدکاری کو روکنے یا دنیا سے دور کرنے کے لئے کی ۔ اور اس سے بڑھ کر ضروری سوال یہ ہے کہ عیسائیوں کا اس بارے میں کیسا عملدرآمد رہا۔ ان دونوں سوالوں کا جواب میں وہی نقل کرتا ہوں، جو عیسائی صاحبان نے دیا ہے۔

امر اول کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے " مگر کلیسیا نے کسبیوں پر کبھی سختی نہیں کی اور توبہ کرنے پر ان کو داخل کر لیا جاتا تھا۔ اور بعض عیسائی بزرگوں نے کسبیوں کے پیشہ کو بدی سمجھ کر صریح الفاظ میں اس کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ (یہ الفاظ قابل غور ہیں) انہی میں سینٹ اگسٹین بھی تھا، جس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے روکنے سے بدکاری کی اس سے زیادہ تباہ کن راہیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس آزادیٔ خیال نے تدریجاً میانہ رنگ پکڑنا شروع کر دیا (یعنی اوّل اوّل تو کسبیوں سے صرف درگذر کی جاتی تھی، پھر اس سے ترقی کر کے وہی لوگ خود ان کسبیوں کے مربی بن گئے) درمیانی زمانوں سے پہلے ہی کلیسیا کے رواج اور قواعد اور اس کے عہدیدار اور پادری زنا کاری کے لئے ضرب المثل بن گئے۔ (افسوس ہے کہ پادری صاحبان کفارہ کے فوائد بیان کرتے وقت ان شہادتوں کو بھول جاتے ہیں) شارل مین نے اس ابتری کی حالت کو روکنا چاہا اور کوشش کی، مگر اس کی اپنی زندگی اوباش اور بدکاری کی تھی، اس لئے اس کے احکام، جن کے رو سے کسبیوں اور کٹنیوں کو کوڑے لگائے جانے کا حکم تھا، اخلاقی وجوہ پر مبنی نہ تھے"۔ میں اس امر سے بکلی انکار نہیں کرتا کہ عیسائی مذہب نے کوئی کوشش کسبیوں کی بدکاری کے دور کرنے کی کی ہو۔ مگر جو کوشش کی گئی اس میں یا تو شارل مین کی کوشش کی طرح خود کوشش کرنے والوں کی اپنی اخلاقی حالت ایسی گری ہوئی تھی کہ اس کا کوئی نیک اثر نہ ہو سکتا تھا، اور یا کوشش بہت کمزور اور کسی اصول حکمت پر مبنی نہ تھیں۔ اور اس لئے کبھی بھی ان کا نتیجہ نیک نہیں ہوا۔ چنانچہ وہی مصنف، جس کے اقوال اوپر نقل کئے گئے ہیں، لکھتا ہے۔ "باوجود ایسی کوششوں کے اور باوجود کبھی کبھی کسی کسی بادشاہ کی سختی کے کسبیوں کا پیشہ درمیانی زمانہ میں ہر جگہ غلبہ پکڑتا گیا۔ صرف یہی نہ تھا کہ اس کی برداشت کی جاتی ہو یا اس سے اغماض کیا جاتا ہو، بلکہ اس کے لئے لائسنس یعنی پروانے دیئے جاتے تھے۔ اور قانون میں اس کے قواعد منضبط کئے گئے تھے۔ لندن میں چکلوں کا ایک بازار تھا۔ جن کا لائسنس سب سے پہلے ونچسٹر کے لاٹ پادری نے دیا تھا اور بعد میں پارلیمنٹ اس کی منظوری دیتی رہی۔ یورپ کے دیگر ممالک میں اس زمانے میں یہی حالت تھی۔ کسبیوں کی حفاظت کی جاتی تھی اور اس پیشہ کے لئے قواعد قانوناً تجویز کئے جاتے تھے اور بہت سی حالتوں میں ملکی آمدنی کا یہ ایک ذریعہ تھا"۔

یہ تو عیسائی ممالک کی حالت گذشتہ زمانہ کی تھی۔ اس زمانہ میں یہ پیشہ رو بہ تنزل نہیں، بلکہ دن

بدن ترقی کر رہا ہے۔فرانس میں فوجداری قانون کسبیوں پر گرفت نہیں کرتا۔ جرمنی میں کسبی کا پیشہ کرنے کی ممانعت نہیں۔لیکن جو عورت بغیر اپنا نام رجسٹر کرنے کے ایسا پیشہ اختیار کرے، وہ گرفتار ہوسکتی ہے۔ آسٹریا کے قانون کے رُو سے اس پیشہ کی ممانعت ہے،مگر پولیس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بعض شرائط کے نیچے اس کی اجازت دے دیا کریں۔انگریزی قانون اس پیشہ کو مضر عام سمجھتا ہے۔مگر قانون کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔اور نہ ہی کوئی باز پرس ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی مضمون میں،جس کا حوالہ انسائیکلو پیڈیا سے اوپر دیا گیا ہے،لکھا ہے کہ "انگریزی قانون کے نیچے عام بازار صاف رکھے جا سکتے ہیں......اور بعض قصبات میں سرگرم پولیس اپنی ساری طاقت کو خرچ کر کے بھی ان کا مقابلہ کرنے کے بالکل نا قابل ہے۔ بڑے بڑے بازاروں اور عام مجمعوں میں عین دن کے وقت کسبیوں کی بڑی بڑی تعداد موجود رہتی ہے۔ اور رات کے وقت تو گویا راستے ان سے بند ہی ہوتے ہیں"۔ نہ ہی دوسرے بلاد یورپ میں قانون کی کچھ پرواہ کی جاتی ہے۔فرق اس قدر ہے کہ یہاں کھلم کھلا کسبیاں پھرتی ہیں۔ وہاں ظاہر کاری اتنی نظر نہیں آتی،مگر چکلوں کی تعداد بہت ہی زیادہ بڑھی ہوئی ہے"۔ ہر جگہ پولیس اس امر کی شاکی ہے کہ پوشیدہ طور پر کسبیوں کا پیشہ اس قدر ترقی پکڑ گیا ہے،جس کو وہ کسی طرح ضبط کے نیچے نہیں لا سکتے۔ اور دن بدن جیسے جیسے یہ خفیہ بدکاری بڑھتی جاتی ہے،اسی قدر ان کسبیوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے،جن کے نام سرکاری رجسٹروں میں موجود ہیں۔اس کثرت بدکاری کو دیکھ کر تمام مدبّر حیران بلکہ مایوس ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا میں اخیر پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ " کوئی ایسے واقعات موجود نہیں جن کی بناء پر مغربی ممالک کی بدکاری کا مقابلہ دوسرے ممالک سے یا پہلے زمانوں سے ہو سکے۔لیکن وہ نا قابل ذکر واقعات جو ہمیشہ پولیس کے علم میں آتے رہتے ہیں اس بات کو ایسا یقینی طور پر ثابت کرتے ہیں،جس میں شک کی کچھ بھی گنجائش نہیں کہ موجودہ تہذیب کے بڑے بڑے مرکز اپنی بدکاری میں ان مشہور بدکاری کے مرکزوں یعنی کارنتھ یا روما یا قدیم مصر یا موجودہ چین سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ پرانی بدکاری کے نقشے، جو کھنڈرات سے نکلتے ہیں اور عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں،ان سے کئی درجہ بڑھ کر بدکاری کی وہ تصویریں ہیں، جو آج پیرس یا امسٹرڈم میں کھینچی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بدکاری کی خطرناک ترقی صرف عارضی ہو،مگر یہ وہی صورت ہے، جس نے پہلے بھی بڑی بڑی قوموں کو تباہ کیا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ کسبیوں کا پیشہ دن بدن خطرناک ترقی کرتا جاتا ہے۔اس ترقی کا اثر ابھی سے اعلیٰ درجہ کی تہذیب یافتہ مغربی اقوام پر پڑنا شروع ہو گیا ہے، کیونکہ نکاحوں اور پیدائشوں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے"۔

یورپ میں سیاہ کاری کی یہ خطرناک تصویر صرف عیسائیت کی ناجائز تعریف کا جواب ہی نہیں بلکہ پادری سیل نے جو بہتان آمیز حملہ اسلام پر کیا ہے اس کا بھی جواب ہے۔ پادری صاحب یا تو عیسائیت کی تعلیم پر حصر کریں یا عیسائی صاحبان کے عمل پر۔ مگر یہ نہ کریں کہ جہاں مطلب کی بات ہوئی وہی پہلو اختیار کرلیا۔ تعدد ازدواج اور لونڈیوں کے متعلق تو آپ جھٹ سے عیسائی اقوام کا عمل دکھا دیتے ہیں۔ اور رنڈی بازی اور زنا کاری کی بابت عیسائیت کی تعلیم پیش کردیتے ہیں۔ یہ انصاف اور ایمانداری نہیں۔ ایک پہلو جو چاہیں اختیار کرلیں۔ اگر وہ کسبیوں اور زنا کاری کے ذکر کے وقت عیسائیوں کی عمل سے بیزاری ظاہر کر کے عیسائیت کی اصل تعلیم کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں، تو تعدد ازدواج اور لونڈیوں کے احکام کے ذکر کے وقت بھی اپنی بحث کا انحصار مذہب عیسوی کی تعلیم پر ہی رکھیں، جس کے رو سے انہیں ماننا پڑے گا کہ حضرت مسیح کے منہ سے، جو وہی عیسائی تعلیم ہے، ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا، جس میں تعدد ازدواج کی ممانعت ہو۔ یا یہودیوں کے اس رواج کا انکار ہو، جو لونڈیوں کے متعلق ان کے درمیان پشتوں سے چلا آتا تھا۔ پادری صاحب ایمان سے بتادیں کہ کیا یہ چالبازی نہیں کہ جدھر سے مطلب نکلتا دیکھا ادھر کا پہلو ہی بدل لیا۔ اب اصل بات یہ ہے کہ بدکاری اور رنڈی بازی کی ترقی تعدد ازدواج کی ممانعت سے ہی شروع ہوئی۔ کیونکہ اگر یہ سچی بات ہے کہ ابتدائی عیسائی سوسائٹی میں کسبیاں نہ ہوتی تھیں تو اس سے بھی بڑھ کر یہ امر حق ہے کہ اس ابتدائی سوسائٹی میں تعدد ازدواج کی بھی ممانعت نہ تھی، بلکہ اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ پھر جوں جوں تعدد ازدواج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، ویسے ہی بدکاری ترقی کرنے لگی۔ عیسائی صاحبان عموماً یہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ کسبیوں کے پیدا ہونے اور ترقی کی وجہ افلاس ہے۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیا سب سے بڑھ کر افلاس یورپین اقوام کے اندر ہی آ گیا، جو یہ بدی ترقی کر رہی ہے؟ یا یہ بات ہرگز نہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "بڑی بڑی اقوام کے اندر کسبیوں کا وجود انسانی سوسائٹی سے غیر منفک ہے۔ موجودہ مذہب کی تمدنی اور انتظامی ذرائع میں سے کوئی بھی ایسا ذریعہ ثابت نہیں ہوا، جو اس کو روک سکے۔ کیونکہ وہ اصلی قوانین، جن کی وجہ سے یہ بدکاری پھیل رہی ہے، ان انسانی تجویز کردہ قواعد سے، جو اخلاقی تعلیم یا فرضی معیار (یعنی پاکیزگی کے معیار) یا مجالس واضع قوانین تجویز کرتی ہیں، بہت زیادہ زبردست ہیں۔ اور جب کبھی اس بدکاری کے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور راہ سے پھوٹ نکلتی ہے۔ اصل بات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ صرف وہ واقعات ایک وقت کے لئے کوئی اور پہلو اختیار کرلیتے ہیں۔ غرضیکہ باوجود سب قسم کے علاجوں کے یہ بیماری دور نہیں ہوئی۔ اور اگرچہ اس کا وجود قوی قوت کے ساتھ بھی رہ

سکتا ہے مگر اس کا حد سے زیادہ بڑھ جانا اس بات کی علامت ہے کہ تہذیب کو اندر سے کیڑا لگا ہوا ہے اور وہ تنزل کی حالت میں ہے"۔

یہ بات کہ ہر ایک قوم کے درمیان کسبیوں کے وجود کا ہونا ضروری ہے بغیر استثناء کے صحیح نہیں۔ اور میں وہ واقعات دکھا سکتا ہوں، جن کی بنا پر میں یہ کہتا ہوں، بلکہ اگر عام نظر سے بھی اس دعویٰ کو دیکھا جائے، کہ یہ ایسی بیماری ہے، جسکا کوئی علاج ہی نہیں، تو اس کا باطل ہونا اظہر من الشّمس ہے۔ ایسا اعتقاد رکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بدکاری کا کوئی علاج ہی پیدا نہیں کیا، ہم اس کی طاقت اور قدرت اور احسانوں کا انکار کرنے والے ہوں گے۔ کیا ہی پاک لفظ ہیں، جو اس پاک انسان کے منہ سے نکلے، جس نے اللہ تعالیٰ کے حسن واحسان کو سب سے بڑھ کر دیکھ لیا تھا۔ مَا مِنْ دَاءٍ اِلَّا وَ لَہٗ دَوَاءٌ۔ یعنی کوئی ایسی بیماری نہیں، جس کی اللہ تعالیٰ نے دوا پیدا نہ کی ہو۔ بیماریوں میں نہ صرف جسمانی بیماریاں ہی شامل ہیں، بلکہ یہ الفظ اخلاقی اور روحانی امراض پر بھی حاوی ہے۔ اور یہ صرف لفظ ہی لفظ نہ تھے، بلکہ آپ نے اپنے اس دعویٰ کی سچائی کو ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس طرح پر کہ دو بدکاریاں اور روحانی اور اخلاقی بیماریاں، جو عربوں کا گویا جزو خون بن چکی تھیں، کیونکہ پشتوں سے وہ ان کے عادی چلے آتے تھے، ان تمام کو آپ نے جڑ سے اکھاڑ کر جزیرہ نما عرب کو بالکل ان سے پاک کر دیا۔ ایک قمار باز کا قمار بازی سے روکنا یا ایک شراب خور کو شراب خوری سے باز رکھنا یا ایک زانی کو زنا سے چھڑا دینا کس قدر مشکل کام ہے۔ مگر اس کامل انسان کی توجہ نے شراب خوری، زنا کاری اور قمار بازی جیسی بدیوں کو نیست و نابود کر کے دکھا دیا۔ اور نہ صرف اپنے صحابہ میں سے ہی ان کو دور کیا، بلکہ ایک دراز زمانہ تک مسلمان سوسائٹی کو ان سے پاک کر دیا۔ پس اسلامی سوسائٹی وہ سوسائٹی ہے جو ایک دراز عرصہ تک کسبیوں کی موجودگی سے بالکل پاک رہی، حالانکہ یہ ایک بڑی بھاری قوم اور اس زمانے میں اعلیٰ درجہ کی تہذیب یافتہ قوم تھی۔ اور اسلامی علاج ہی وہ علاج ہے، جو اس بدی کو دور کر سکتا ہے جس کے دور کرنے میں تمام انسانی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ کاش کہ عیسائی صاحبان میں سے کوئی ایسے وسیع خیال کے انسان بھی ہوں، جو تعصب مذہبی کے تنگ دائرہ سے نکل کر ان امور پر غور کریں کہ آیا یہ حق نہیں؟

لونڈیوں سے نکاح، جس کو عموماً لونڈیوں کو گھر میں ڈال لینے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، نکاح کی ایک خاص صورت تھی، جو اس وقت کی سوسائٹی میں بلحاظ غلامی کے رواج کے بعض اوقات ضروری ہوتا تھا جیسا کہ پہلے حصص مضمون غلامی میں دکھایا جا چکا ہے، اسلام کا منشاء تدریجی طور پر غلاموں کے آزاد کرنے کا تھا۔ اور اس کی تعلیم کا میلان آخر کار غلامی کو قطعاً دور کرنے کا تھا۔ مگر مسلمان سوسائٹی

کے بعد کے حالات نے اس میلان کو ترقی نہ کرنے دی، تو یہ اعتراض اسلام پر نہیں۔ یہ امر بیشک صاف ہے کہ چونکہ اس زمانے میں شریعت اسلام کے رو سے غلام لونڈیاں بنائے نہیں جا سکتے۔ اور خرید و فروخت کی ذریعہ یا زبردستی پکڑ کر غلام بنا لینے کے رواج کی شریعت اسلامی مانع ہے، اس لئے موجودہ رسم لونڈیوں کے گھر میں ڈال لینے کی بھی شریعت کے رو سے درست نہیں۔ کیونکہ شرعی معنوں میں وہ لونڈیاں لونڈیاں ہی نہیں۔ یہ امر کہ لونڈیوں کے متعلق شریعت اسلامی کا کیا حکم تھا اور وہ موجودہ رواج سے الگ تھا یا نہیں، میں ابھی دکھاؤں گا۔ مگر اس جگہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رواج لونڈیوں کے گھر میں ڈال لینے کا، جو آج کل بعض اسلامی ممالک میں درست سمجھا گیا ہے، اگرچہ واقعی نکاح کی رسم ادا نہ بھی ہو، تو بھی نکاح کی ہی ایک صورت ہے۔ یہ کسبیوں کی حالت یا زنا سے ایسا ہی الگ ہے، جیسا کہ خود رواج نکاح۔ پادری صاحب نے اس رواج کو کسبیوں کے پیشہ کے برابر ٹھہرایا ہے۔ اور اگر اس نے عمداً حق کو نہیں چھپایا، تو کم از کم اس میں سخت غلطی کھائی ہے۔ کسبیاں وہ عورتیں ہیں، جن کا پیشہ یہ ہے کہ جو شخص کچھ معاوضہ انہیں دیدے اسی سے ارتکاب زنا کریں۔ مگر لونڈی کو گھر میں ڈال لینے سے یہ منشاء ہے کہ آقا اس کو بطور بی بی کے رکھے، بلحاظ حیثیت کے نہیں، بلکہ بلحاظ زن وشوی کے۔ لونڈی اپنے آقا کی جورو کی طرح ہوتی ہے اور آقا اس لونڈی کا خاوند ہوتا ہے۔ یہ کس قدر بے حیائی ہے کہ ایسی لونڈیوں کو کسبیاں کہا جائے۔ کیا وہ بازار میں بیٹھتی ہے یا سوائے اپنے آقا کے، جو اس کا خاوند ہوتا ہے، کسی اور سے ہمبستری کرتی ہے یا کسی سے کچھ معاوضہ لیتی ہے۔ پھر یہ کس قدر جرات ہے کہ ایک ایسے رواج کو، جو بعینہٖ نکاح کے مطابق ہے، خواہ اس میں رسم نکاح نہ بھی ادا ہوئی ہو، کسبیوں کے پیشہ کے برابر بنایا جائے۔ نہ ہی اس طرح لونڈی کو گھر میں ڈال لینے کو زنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک شخص جو مثلاً ایک بیوی کے ہوتے ہوئے ایک لونڈی کو گھر میں ڈال لیتا ہے، وہ گویا دو بیویاں رکھتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زنا یا کسبیوں کی اولاد اپنے باپ کی کبھی وارث نہیں سمجھ گئی۔ مگر جو رواج لونڈیوں کے گھر میں ڈال لینے کا ہے، اس کے رو سے یعنی ان لونڈیوں کی اولاد، جو آقا سے پیدا ہوتی ہے، وہ آقا کی صحیح اور جائز اولاد سمجھی جاتی ہے اور اس کی جائز وارث ہوتی ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح نکاح کی اولاد وارث ہوتی ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لونڈی کو بطور بیوی کے گھر میں رکھا گیا ہے، ورنہ اس کی اولاد کو وہ حقوق کیونکر مل سکتے تھے، جو ایک بیوی کی اولاد کو ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایسی لونڈی کا سوائے اپنے آقا یعنی خاوند کے کسی دوسرے سے ہمبستر ہونا قانوناً زنا سمجھا جاتا ہے۔ پس اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بطور بیوی کے گھر میں رہتی ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف حیثیت کا ہے کہ وہ آزاد بیوی کے برابر

حیثیت نہیں رکھتی۔ پس اگر ایسے تعلقات پر کوئی اعتراض آ سکتا ہے، تو وہ یہ ہے کہ وہ نکاح کی ایک ادنیٰ صورت ہے، جس میں عورت کو برابری کے حقوق نہیں دیئے گئے۔ اور رسم نکاح اس طرز پر ادا نہیں ہوئی، جس طرز پر آزاد عورتوں کی رسم نکاح ادا ہوتی ہے۔ مگر زنا یا کسبیوں کے پیشہ کے یہ رواج ایسا ہی مخالف ہے جیسا کہ رواج نکاح۔ بلکہ یورپ کے مہذب ممالک میں، جو یہ رواج چلا آتا ہے کہ خاوند جب جی چاہے، تو علاوہ منکوحہ بیوی کے ایک یا دو یا جس قدر چاہے معشوقہ بھی رکھ لے۔ خصوصاً انگلستان میں تو یہ بہت ہی آسان امر ہے۔ کیونکہ صرف زنا قانون انگلستان کے رو سے نہ فوجداری جرم ہے اور نہ ہی خالی خاوند کے زنا کی وجہ سے بی بی طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ یہ مہذب رواج بھی، جس کی کوئی حد بندی نہیں، زنا کی تعریف میں آتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ اس کی روک کوئی نہیں، مگر ایسے تعلقات کی اولاد جائز اولاد نہیں سمجھی جاتی۔ لونڈیوں کے گھر میں ڈال لینے کو ان تمام باتوں سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کو صرف نکاح کی ایک رواجی صورت کہہ سکتے ہیں، جس میں باوجود بعض تفاوتوں کے نکاح کے اغراض حاصل ہیں۔ اس قسم کے رواج اب تک بعض عیسائی ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ خواہ سیل صاحب کو ان کا علم ہو یا نہ ہو۔ یا علم ہو تو وہ عمداً اخفا کرتے ہوں، خصوصاً جرمنی میں یہ رواج اب تک موجود ہے۔ ہاں فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اگر منکوحہ بیوی کی اولاد موجود ہو، تو لونڈی کی اولاد کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اور اگر منکوحہ بیوی سے اولاد کوئی نہ ہو، تو اس صورت میں لونڈی کی اولاد کو باپ کی جائداد کی ایک تہائی ملتی ہے۔ پس اصولاً لونڈی کو بطور بیوی کے رکھ لینے کا منشاء اس سے نکاح ہی ہوتا ہے۔ مگر شریعت اسلام نے کونسا طریق پسند کیا ہے۔ اس کو میں اب بیان کرتا ہوں۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ قرآن شریف اور صحیح احادیث اور سنت نے لونڈی کے ساتھ نکاح کے متعلق کیا ہدایات کی ہیں۔ اسلام سے پہلے منجملہ اور بدرسوم کے ایک یہ قبیح رسم بھی مروج تھی کہ لونڈیوں سے مجبور کر کے کسبیوں کا پیشہ کرایا جاتا تھا۔ اور اس سے جو مال حاصل ہوتا تھے، اس کا فائدہ آقا کو پہونچتا تھا۔ اس بدرسم کا اور پھر اسلام کے ذریعہ اس کے موقوف کئے جانے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ **وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**۔ (سورہ نور۔ ۳۳) یعنی تمہاری لونڈیاں، جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں، ان کو دنیا کے مال کے فائدہ کے لئے حرامکاری پر مجبور نہ کرو۔ اور صرف اس نے اصلاح پر بس نہیں کی۔ بلکہ ساتھ ہی اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا، جس کا منشاء یہ تھا کہ ہر قسم کی بدکاری کو جڑ سے کاٹا جاوے کہ **وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ** اور جن کے

تم میں سے بیاہ نہیں ہوئے ،ان کے نکاح کر دو، اور ایسا ہی اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی، جو نیک بخت ہوں، نکاح کر دو۔

یہاں صاف الفاظ میں غلاموں اور لونڈیوں کے آقاؤں کو حکم ہے کہ ان کے نکاح کر دیا کریں۔ اگر چہ غلاموں لونڈیوں کا آزاد لوگوں سے الگ اختیار رکھا گیا تھا، مگر ضرورت کے وقت قرآن شریف نے آزاد مرد کو لونڈی سے اور آزاد عورت کو غلام سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امتیاز کو قرآن شریف نے ایک عارضی امتیاز ٹھہرایا تھا۔ جو صورتیں اس کی قرآن شریف میں بیان ہوئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

اول۔سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۲۔ **وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكَاتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّن مُّشۡرِكَةٍ وَ لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ .وَ لَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا. وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِن مُّشۡرِكٍ وَ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ** ۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مردوں کو نہیں چاہئے کہ وہ مشرک عورتوں سے ،جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ،نکاح کریں ، بلکہ شرک کرنے والی آزاد عورت،خواہ کیسی ہی بھلی کیوں نہ لگے، اس سے مسلمان لونڈی بہتر ہے۔ اور نہ ہی اپنی آزاد عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں دینا چاہئے ،جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۔اور مشرک تم کو کیسا ہی بھلا کیوں نہ لگے، اس سے مسلمان غلام بہتر ہے ۔یعنی مشرک عورت سے نکاح کرنے کی نسبت مسلمان لونڈی سے نکاح کر لینا بہتر ہے۔ پس اس آیت کے رو سے آزاد مردوں اور لونڈیوں اور آزاد عورتوں اور غلاموں میں نکاح جائز قرار دیئے گئے۔

دوسرا موقعہ سورۃ النساء آیت ۲۹، ۳۰ ہے، جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَ مَن لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِن مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيَاتِكُمُ الۡمُؤۡمِنَاتِ. وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ ، بَعۡضُكُمۡ مِنۡ بَعۡضٍ ، فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَ آتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنَاتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَ لَا مُتَّخِذَاتِ اَخۡدَان ، فَاِذَا اُحۡصِنَّ فَاِنۡ آتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنَاتِ مِنَ الۡعَذَاب. ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِيَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ وَ اَنۡ تَبۡصِرُوۡا خَيۡرٌ لَكُمۡ، وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ** ۔اور تم میں سے جس کو مسلمان آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کا مقدور نہ ہو، تو مسلمان لونڈی سے، جو تمہارے قبضے میں آ چکی ہیں، نکاح کر لے۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے (آزاد اور غلام) تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہی ہو۔ پس لونڈی کے اہل کے اذن سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ان کے حوالے

کردو۔ بشرطیکہ وہ نکاح کی قید میں ہو کر رہیں، نہ کھلی بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ چھپی آشنائی رکھنے والی۔ پھر اگر وہ قید نکاح میں رہنے کے بعد ارتکاب زنا کریں، تو ان کی سزا آزاد بیاہی عورت کی سزا سے نصف ہے۔ یہ اجازت (لونڈیوں سے نکاح کرنے کی) تم میں سے ان کے لئے ہے، جس کو اندیشہ ہو کہ (اگر وہ نکاح نہ کرے گا تو) کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے گا۔ اور اگر تم صبر کرو، تو تمہارے حق میں زیادہ اچھا ہے۔ اور اللہ بڑا حفاظت کرنے والا اور مہربان ہے"۔

ان آیات سے کئی باتیں صاف ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے پادری سیل صاحب کا یہ جھوٹا اعتراض ہی دور ہوتا ہے کہ اسلام نے لونڈیوں کو کسبیوں کی طرح رکھنے کی اجازت دی۔ یہاں صاف فرما دیا ہے کہ لونڈی قید نکاح میں رہ کر رہے اور نہ کھلی بدکاری بازاری عورتوں کی طرح کرے اور نہ چھپے آشنا رکھے، یعنی جیسے بعض عورتیں گھروں میں رہ کر زنا کرتی ہیں۔ دوسرا ان آیات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کس وقت اور کن شرائط کے ماتحت ایک آزاد مرد ایک لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ لونڈی اگر خاوند کے سوا کسی دوسرے سے تعلق رکھے گی، تو اس کو مرتکب زنا سمجھ کر سزا دی جائے گی۔

جہاں تک میں نے اس سوال پر غور کیا ہے قرآن کریم سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آقا کو اختیار تھا کہ جس وقت لونڈی سے چاہئے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی مملوکہ ہے، وطی کرے۔ یہ ایک غلط نتیجہ ہے، جو اس آیت سے نکالا گیا ہے۔ **والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم**۔ اس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ازواج کو **ما ملکت ایمانهم** سے الگ بیان کرنے کا منشاء صرف اس امتیاز کو ظاہر کرنا تھا، جو آزاد عورتوں اور لونڈیوں میں رکھا گیا تھا۔ اس امتیاز کی شہادت قرآن کریم سے بھی ملتی ہے، کیونکہ عام طور پر یہ اجازت نہیں دی گئی کہ آزاد مرد لونڈیوں سے نکاح کریں، بلکہ سخت مجبوری کی حالت میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ایک شخص ضرورت نکاح کی بھی رکھتا ہو، پھر اسے کوئی آزاد عورت خواہ وہ غریب ہی ہو نہ مل سکتی ہو، پھر اسے ڈر بھی ہو کہ اگر نکاح نہ کیا تو بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا۔ تب وہ لونڈی سے ہی نکاح کر لے، مگر پھر بھی ساتھ فرما دیا ہے کہ صبر کرو، تو بہتر ہی ہے۔ پس جب خود قرآن شریف نے آزاد عورتوں اور لونڈیوں کی حیثیت میں اس قدر فرق رکھا ہے اور لونڈی کے ساتھ نکاح کی صرف مجبوری کی حالت میں اجازت دی ہے، تو پھر کیا ضروری نہ تھا کہ لونڈیوں کا ذکر ازواج، یعنی آزاد عورتوں، سے الگ کیا جاتا۔ لفظ زوج میں جہاں ایک طرف خاوند یا بیوی ہونے کا مفہوم موجود ہے، ساتھ ہی ایک برابری کا مفہوم بھی موجود ہے۔ کیونکہ زوج جوڑے کو کہتے ہیں، یعنی وہ دونوں چیزیں ایک سی اور ایک دوسرے کی ہم پلہ ہوں۔ مگر چونکہ لونڈی میں حیثیت کی

مساوات خاوند کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی، اس واسطے اس کو زواج سے الگ کر کے بیان کیا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ الفاظ **ما ملکت ایمانھم** کا مفہوم صرف لونڈیاں نہیں، بلکہ اس میں لونڈیاں اور غلام دونوں داخل ہیں۔ پس یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ ہم ان الفاظ کے مفہوم کی تحدید نہیں کر سکتے، کیونکہ ان معنوں میں اس قدر عمومیت ہے کہ تحدید کرنی لازمی ہے۔ پس جب کسی وجہ سے ایک طرح کی تحدید ہوسکتی ہے، تو کسی دوسری کافی وجہ پر کوئی اور قید بھی انہی معنوں پر لگ سکتی ہے۔ اور یہ قید کہ وہ مملوکہ عورتیں، جن کا یہاں ذکر ہے، نکاح میں بھی داخل ہونی چاہئیں، نہ صرف اسی جگہ سے، جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے، ظاہر ہے، بلکہ قرآن شریف کی صریح نص، جو دوسری جگہ پر موجود ہے، اس تحدید کو ضروری ٹھہراتی ہے۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ جہاں قرآن شریف نے آزاد مردوں کے لئے ازواج کے علاوہ لونڈیوں کو بھی جائز ٹھہرایا، تو اس کا منشاء یہ نہ تھا کہ لونڈیاں بلا نکاح ہی گھروں میں ڈال لی جائیں یا جس کی مِلک میں ہوں، وہ بلا نکاح ان سے وطی کرے۔ بلکہ منشاء اس حکم کا یہ تھا کہ آزاد مردوں کو یہ اجازت ہے کہ ضرورت کے وقت لونڈیوں میں سے بھی بیویاں بنالیں، یعنی ان کو اپنے نکاحوں میں لے آویں۔ اب اس دعوے کے دلائل میں بیان کرتا ہوں۔

سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف نے خود ہی تمام مومنوں کو صاف اور صریح الفاظ میں یہ حکم دیا کہ وہ اپنے عباد یعنی غلاموں اور اِماء یعنی لونڈیوں کے نکاح کر دیویں۔ اب یہ دعویٰ کہ قرآن شریف لونڈیوں کے آقاؤں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ مملوکہ ہونے کی وجہ سے وطی کرلیا کریں، پہلے حکم کے خلاف ہے۔ اگر یہ اجازت تھی، تو پھر ان کے نکاحوں کا حکم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ دونوں باتیں خود ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں کہ ایک طرف آقا کو کہا جائے کہ تم اپنی لونڈی کا نکاح کسی دوسرے سے کر دو۔ اور دوسری طرف اسے کہا جائے کہ تم بلا نکاح خود اس سے وطی کرلیا کرو۔ اگر لونڈی کے محض مملوکہ ہونے کی وجہ سے آقا کو اس کے ساتھ وطی کا حق پیدا ہوجاتا تھا اور مِلک ہی قائم مقام نکاح تھی، تو پھر نکاح کا حکم کیوں دیا۔ کیونکہ جب ایک ایسی صورت موجود ہے کہ ایک مرد اور عورت میں میاں بیوی کا تعلق موجود ہے، تو پھر اس تعلق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ تم لونڈی کا نکاح کہیں اور کردو خلاف عقل ہے۔ مگر چونکہ سورہ نور نے قطعی طور پر آقا کو اپنی لونڈیوں کے نکاح کر دینے کا حکم صاف الفاظ میں دیا ہے، پس اس حکم کے ہوتے ہوئے وہی کتاب یہ اجازت نہ دے سکتی تھی کہ آقا خود بھی بلا نکاح اسے بطور منکوحہ کے استعمال کرے۔

پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک آقا اپنی لونڈی کا نکاح کسی دوسرے مرد یا غلام سے کر دیوے، تو کیا پھر بھی مِلک یمین کے حق سے اس لونڈی کے ساتھ وہ وطی کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی ہے۔ یعنی ایسا حق اس کو ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کا جواب نفی میں دیا جائے، تو ساتھ ہی اس دعویٰ کی بھی نفی ہو جائے گی کہ مِلک یمین سے وطی کا حق آقا کو حاصل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ مِلک یمین تو باوجود نکاح کے ویسی کی ویسی موجود ہے۔ اور اگر مِلک سے بدوں کسی اور شرط کے وطی جائز تھی، تو پھر مذکورہ بالا سوال کا جواب بھی ہاں ہوگا۔ مگر قرآن شریف اس جواب کی تردید کرتا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ قرآن شریف محض مِلک یمین سے وطی کی بھی تردید کرتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ الفاظ **ما ملکت ایمانهم** کو محض مملوک کے عام اور وسیع معنوں میں نہیں لے سکتے، بلکہ اول تو اس سے مراد مملوکہ عورتیں ہیں اور پھر ان میں سے وہ عورتیں، جن کو بطور بیویوں کے نکاح میں لایا گیا ہے۔ اس طریق پر جو سورہء نساء آیت ۲۹، ۳۰ میں بیان کیا گیا ہے یہ امر قابل ذکر ہے کہ وہاں بھی وہی الفاظ **ما ملکت ایمانکم** ہی استعمال کئے ہیں۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ لونڈیاں، جن سے نکاح کیا گیا ہے، وہ بھی **ما ملکت ایمانکم** میں ہی داخل ہیں۔ پس ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس آیت **والذین هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** میں منکوحہ لونڈیاں، جن کے ساتھ حسب ارشاد سورہء نساء نکاح کئے گئے ہیں اور ایسا ہی دوسری منکوحہ لونڈیاں زیر الفاظ **ما ملکت ایمانهم** داخل ہیں۔ کیونکہ نکاح سے وہ مملوک ہونے سے نہیں نکالی گئیں۔ پس جس صورت میں کم از کم **ما ملکت ایمانهم** میں منکوحہ لونڈیاں بھی داخل ہیں، تو یہ مفہوم ان الفاظ سے نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ صرف وہی لونڈیاں ہیں، جن سے مِلک یمین سے وطی کی جائے اور مِلک یمین کی شرط مفقود ہو گئی۔

علاوہ ازیں جب قرآن کریم نے اس بات کی تصریح کر دی کہ کن صورتوں میں آزاد مرد لونڈیوں سے نکاح کر سکتا ہے، تو یہ خیال کرنا کہ اس کے علاوہ کوئی اور قانون بھی ہے، جس کا قرآن شریف میں ذکر نہیں، غلطی ہے۔ ان آیات میں **وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا** میں کل آزاد مرد داخل ہیں۔ اور کوئی استثناء نہیں کہ جس کے ہاں لونڈی اپنی ملک کی موجود ہو وہ نکاح نہ کرے۔

اسی کی شہادت قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ملتی ہے۔ سورہء احزاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے متعلق فرماتا ہے۔ **قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج

اور مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کے معاملہ میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مقرر فرمایا ہے اس کا ذکر قرآن شریف میں کسی جگہ کیا بھی گیا ہے۔ سو یہ ذکر سورہ نساء کی اِن آیات کے، جو اوپر لکھی گئی ہیں، اور کسی جگہ موجود نہیں۔ یہی ایک مقام ہے، جہاں مفصل یہ بیان فرمایا ہے کہ کن حالات میں لونڈیوں سے نکاح کرنا چاہیئے اور کس طرح ان کا مہر ادا کرنا چاہیئے۔ پس سورہ احزاب میں جو اشارہ ہے وہ انہی آیات کی طرف ہے۔ اس کے سوائے دوسری آیات میں سوائے اس کے ذکر نہیں کہ مومنوں کو ازواج اور ماملکت اَیمان کے سوائے اپنے فروج کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ سو ایسے مقامات پر ازواج یا ماملکت اَیمان کے بارے میں کچھ بیان نہیں کیا۔ یہ بیان ازواج کے متعلق قرآن شریف کے مختلف مقامات میں ہے، مگر مملوکوں کے بارے میں سوائے سورہ نساء کی ۲۹ اور ۳۰ آیت کے اور کسی جگہ نہیں۔ پس قرآن شریف نے خود یہ تصریح فرما دی ہے کہ ماملکت ایمانہم کے بارے میں جو کچھ قرآن شریف میں دوسری جگہ فرض کر دیا گیا ہے اس کے سوا اور اس کا کوئی منشاء نہیں۔

ایک موقعہ اور بھی قابل ذکر ہے۔ سورہ نساء کی ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ فرمایا ہے۔ **وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی ا لْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ** ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں (جن کو تم اپنے نکاح میں لاؤ) انصاف قائم نہ رکھ سکے گے، تو (دوسری) عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں، دو دو تین تین اور چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کئی بیویوں میں عدل نہ کر سکو گے، تو پھر (نکاح کرو) ایک ہی بی بی سے یا ان سے جن کے تمہارے دہنے ہاتھ مالک ہو چکے۔

اب اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ **واحدۃ** اور **ما ملکت ایمانکم** دونوں فعل جس قدر **انکحوا** کے نیچے ہیں دوسرا کوئی فعل اس آیت میں یا اس سے پہلی آیتوں میں ایسا نہیں جس کے متعلق ان کو کر سکیں۔ کم از کم اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ **واحدۃ** اور **ما ملکت ایمانکم** ایک ہی حالت میں ہیں۔ اگر ایک ہی بی بی بغیر نکاح کے آدمی کے لئے درست نہیں ہوسکتی، تو **ما ملکت ایمانکم** بھی بغیر نکاح کے درست نہیں ہوسکتی۔ پس یہ آیت بھی لونڈیوں سے نکاح پر قطعی دلالت کرتی ہے۔ مگر اس جگہ بھی وہ احکام بیان نہیں فرمائے، جن کا اشارہ سورہ احزاب میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ تفصیل احکام کے لئے ہمیں انہی آیتوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو **من لم یستطیع** سے شروع ہوتی ہیں۔

اس طرح پر کم از کم چار موقعہ قرآن کریم میں ایسے موجود ہیں، جن میں بڑی صفائی اور وضاحت

سے لونڈیوں کے نکاح کا حکم یا بیان ہے۔یعنی سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۲،جس میں یہ ارشاد ہے کہ نکاح کرنے کے وقت آزاد مشرکہ پر مسلمان لونڈی کو ترجیح دی جائے۔سورۃ نور کی ۳۲ویں آیت، جس میں صاف حکم ہے کہ اپنے غلام اور لونڈیوں کے نکاح کر دیا کرو۔سورۃ نساء کی تیسری آیت، جس میں لونڈیوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔اور اسی سورۃ کی انتیسویں اور تیسویں آیتیں جن، میں وہ حالات بیان کئے گئے ہیں، جن کے ماتحت ایک آزاد مسلم مسلمہ لونڈی سے نکاح کر سکتا ہے۔اور صرف دو موقعہ ایسے ہیں، جن میں قرآن شریف نے سوائے ازواج اور ماملکت اَیمان کے دوسری عورتوں سے منع کیا ہے، جس سے ملک یمین نکالی جاتی ہے۔مگر میں یہ دکھا چکا ہوں کہ اس جگہ مقصود صرف آزاد عورتوں اور لونڈیوں کا مقابلہ ہے۔اور الفاظ **مالکت ایمانھم** کے وسیع معنے نہیں لئے جاسکتے، بلکہ ان پر بعض قیود لگانی پڑتی ہیں۔مثلاً ایک طرف جب قرآن شریف ہی حکم دیتا ہے کہ اپنی لونڈوں کے نکاح کر دیا کرو، تو کم از کم ایسی منکوحہ لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین سے وطی جائز نہ ہوسکتی تھی۔بلکہ پھر یہ فعل زنا کی تعریف میں آئے گا۔ایسے ہی یہ قید بھی ضروری ہے کہ وہ لونڈیاں بغیر نکاح کے تصرف میں نہ لائی جاویں۔کیونکہ اس کا ذکر سورۃ نساء کی آیت ۲۹،۳۰ میں بالصراحت موجود ہے۔اور علاوہ ازیں ازواج کا مقابلہ مملوک سے خود انہیں معنوں کو چاہتا ہے۔گویا مقصود ان مقامات پر صرف اس قدر بیان کرنے کا ہے کہ لونڈیوں کے ساتھ بھی نکاح جائز ہے۔کن صورتوں میں جائز ہے، اس کا پتہ دوسرے مقام سے ملتا ہے۔علاوہ ازیں یہ بات خود ظاہر ہے کہ جہاں مرد وعورت کے تعلق کا ذکر ہے، وہاں نکاح کا مفہوم خود ضروری ہے۔اس کی میں دو مثالیں دیتا ہوں۔سورۃ نساء میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی**۔ اس جگہ لفظ تو صرف یتامیٰ بولا، مگر مراد اس سے ہر قسم کے یتیم نہیں، بلکہ یتیم لڑکیاں اور ان میں سے بھی، جو باوجود ولی ہونے کے نکاح میں لائی جاویں۔دراصل یہ موقعہ **ماملکت ایمانھم** سے خوب مطابقت کھاتا ہے۔یہاں صرف یتامیٰ کا ذکر کر کے مراد لیا ہے یتیم لڑکیاں، جو نکاح میں لائی جاویں۔وہاں صرف مملوک کا ذکر کر کے مراد لیا ہے، مملوکہ عورتیں، جو نکاح میں لائی جاویں۔اگر کسی کو ایک جگہ ایسے معنے لینے میں اعتراض ہے، تو دوسری جگہ کیوں نہیں۔دوسرا موقعہ سورۃ احزاب کی آیت ہے۔**یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ وَ مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ مِمَّا اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیْکَ وَ بَنٰتِ عَمِّکَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَ بَنٰتِ خَالِکَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِکَ الّٰتِیْ ھَاجَرْنَ مَعَکَ** ۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حلال کی گئی ہیں، اول آپ کی ازواج، جن کے آپ مہر دے چکے ہیں۔دوم مملوکہ یمین، جو خدا نے آپ

کودی ہیں۔سوئم چچااور پھوپھیوں اور ماموں اور خالاؤں کی بیٹیاں۔اب اگرمملوکہ یمین بغیر ازواج کے داخل ہونے کے حلال ہوتیں،تو پھر چاہئے کہ قسم سوم کی عورتیں یعنی چچا وغیرہ کی بیٹیاں بھی بغیر ازواج میں داخل ہونے کے حلال ہوتیں۔پس ایک تو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ ملک یمین والی عورتیں بھی آپ کے لئے اسی صورت میں حلال تھیں کہ آپ ان سے نکاح کرتے۔جیسا کہ چچا وغیرہ کی بیٹیاں بھی نکاح کرنے کے بعد ہی حلال تھیں۔اور دوسرا یہ ثابت ہوا کہ اسی قسم کی آیت جو **اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ** ہے۔وہاں بھی ملک یمین والی عورتیں ازواج کی طرح ہی نکاح میں آنی چاہئیں۔میں نہیں سمجھتا اس سے بڑھ کر صریح شہادت اس امر کی اور کیا ہوسکتی ہے کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح ضروری تھا،خواہ وہ اپنی لونڈی ہو یا دوسرے کی۔

یہ تو قرآن شریف کی شہادت ہے۔اور اس سے بڑھ کر معتبر شہادت اور کوئی پیش نہیں ہوسکتی۔مگر دو ذرائع شہادت کے اور بھی ہیں،جو قرآن کریم کے مؤید ہیں۔یعنی حدیث اور سنت یا عمل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کبار رضی اللہ عنہم۔ان میں سے حدیث میں سب سے معتبر کتاب بخاری کو لیتا ہوں کہ اس میں اس امر کے متعلق کونسی حدیثیں آئی ہیں۔کوئی حدیث اصح الکتب اور کتاب اللہ میں ایسی نہیں ملتی،جس میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ صرف ملک یمین سے اور بغیر نکاح کے لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے۔بلکہ ایک ہی حدیث،جو اس امر کے متعلق ملتی ہے،اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دو جگہ دو مختلف روایتوں سے بیان کی ہے۔ایک غلاموں کی آزادی کے بیان میں اور دوسری جگہ نکاح کے باب میں۔پہلے موقعہ پر جس طرح یہ حدیث آئی ہے اس کو میں اپنے موقعہ پر گذشتہ مضامین میں بیان کر چکا ہوں۔دوسرے موقعہ پر یہ حدیث اس طرح آئی ہے۔ **قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اَیُّمَا رَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَہٗ وَلِیْدَۃٌ فَعَلَّمَھَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَھَا وَاَدَّبَھَا فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَھَا ثُمَّ اعْتَقَھَا وَ تَزَوَّجَھَا فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اَیَّمَا رَجُلٌ مِنْ اَھْلَ الْکِتَابِ آمَنَ بِیْ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اَیُّمَا مَمْلُوْکٌ اَدّٰی حَقَّ مَوَالِیْہِ وَ حَقَّ رَبِّہٖ فَلَہٗ اَجْرَانِ** ۔ترجمہ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس لونڈی ہو،پھر وہ اسے تعلیم دے اور نہایت عمدہ تعلیم دے اور اس کو اخلاق سکھائے اور نہایت عمدہ اخلاق سکھائے،پھر اس کو آزاد کرے اور پھر اس سے نکاح کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

اب ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص ان باتوں کی خلاف ورزی کرے،اس کو بھی ایک اجر ضرور ملے گا۔مثلاً اہل کتاب میں سے جو شخص اپنے نبی پر ایمان لاتا ہے،مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایمان نہیں لاتا، وہ نافرمان ہے۔ اور غلام، جو اپنے آقا کے احکام کی فرمانبرداری کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کرتا، وہ بھی بے فرمان ہے۔ اسی طرح جو شخص لونڈی کو بغیر تعلیم دینے اور آزاد کرنے کے اور بغیر نکاح کرنے کے وطی کرتا ہے، وہ بھی نافرمان ہے۔ تینوں صورتیں ایک سی ہی ہیں۔ گویا ان میں صرف ترغیب ہی نہیں، بلکہ حکم ہے کہ ہر ایک آدمی کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ دوہرا اجر اس واسطے کہا کہ دو کام نیکی کے ایسے شخص نے کئے۔ لونڈی کو تعلیم دی اور اسے آزاد کر کے اس سے نکاح بھی کیا۔ اہل کتاب اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی ایمان لایا۔ غلام نے اپنے آقا کا حکم بھی مانا اور خداوند تعالیٰ کے احکام بھی بجا لایا۔ اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر تاکید کرتے ہیں کہ ایک شخص کی اپنی لونڈی ہو، تو اسے چاہئے کہ اسے تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی دے، آزاد بھی کرے اور پھر اس سے نکاح بھی کرے۔

ایک اور حدیث جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب نکاح میں ہی بیان کیا ہے اس مضمون پر روشنی ڈالتی ہے۔ عَنْ اَنس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ اَقَامَ النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلمْ بَیْنَ خَیْبَرَ وَ الْمَدِیْنَۃَ ثَلٰثاً یَبْنٰی عَلَیْہِ بِصَفِیَّۃَ بِنْت حَیّی فَدَعَوْتُ الْمُسْلِمِیْنِ اِلٰی وَلِیْمَتِہٖ فَمَا کَانَ فِیْھَا مِنْ خُبْزٍ وَ لَا لَحم اَمَرَ بِالْاَنطَاعِ فَاُلْقِیَ فِیْھَا مِنَ التَّمر وَالْاُقْطِ وَ السِّمنِ فَکَانَتْ وَلِیْمَتُہ‘ فَقَالَ الْمُسْلِمُوْنَ اِحْدیٰ اُمَّھَاتَ الْمُؤْمِنِین اَوْ مَا مَلَکَتْ یَمِیْنَہ‘ فَقَالُوْا اِنْ حَجَبَھَا فَھِیَ مِنْ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْن وَ اِنْ لَمْ یَحْجُبَھَا فَھِیَ مِمَّا مَلَکَتْ یَمِیْنَہ‘ فَلَمَّا اِرْتَحَلَ وَطِیَ لَہ‘ خَلْفَہ‘ وَ مَدَّ الْحَجَابَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ النَّاسِ۔ یعنی انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر اور مدینہ کے درمیان تین دن ٹھہرے، جہاں صفیہ بنت حیی بطور عروس کے آپ کے پاس لائی گئی۔ پھر میں نے مسلمانوں کو آپ کے ولیمہ کے لئے دعوت کی اور اس میں روٹی اور گوشت نہیں تھا، پھر دسترخوان بچھائے گئے اور ان میں کھجوریں اور پنیر اور گھی ڈالا گیا۔ سو یہ آپ کا ولیمہ تھا۔ پھر مسلمانوں نے آپس میں کہا کہ آیا امہات المؤمنین میں سے ایک ہوں گی۔ یاما ملکت یمینہ میں سے یعنی لونڈیوں میں سے۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر آپ ان کو پردہ میں رکھیں، تو انہیں امہات المؤمنین میں سے کہنا چاہئے۔ اور اگر پردہ میں نہ رکھیں، تو ماملکت یمینہ میں سے ہوں گی۔ پس جب آپ نے کوچ کیا، تو اپنے پیچھے صفیہ رضی اللہ عنہا کو بٹھایا اور ان کے اور لوگوں کے درمیان پردہ ڈال دیا۔

اس حدیث سے بہت سے ضروری نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا نتیجہ، جس کو مضمون زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں، یہ ہے کہ یہودیوں کو فتح کرنے کے بعد بھی آپ اپنے صحابہ کی دعوت میں گوشت اور

روٹی نہیں دے سکتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر جھوٹ ہے جو کہا جاتا ہے کہ آپ کی لڑائیاں لُوٹ کی خاطر تھیں۔ یہودیوں کی قوم، جو دنیا میں ہر جگہ اپنی دولتمندی کے لئے مشہور ہے اور جو مدت تک عیسائی بادشاہوں کے ہاتھوں سے سخت ظلم اٹھاتے رہے محض روپے کی خاطر، ان کو فتح کرنے کے بعد بھی آپ کی اور آپ کے صحابہ کی یہ حالت ہو۔ پس یہ کس قدر ظلم ہے، جو کہا جاتا ہے کہ لُوٹ کی خاطر سب کچھ کرتے تھے۔ مگر اس بحث سے اس جگہ ہمیں کوئی تعلق نہیں۔ مضمون زیر بحث کے متعلق، جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ازواج اور ما ملکت ایمان یعنی بیویوں اور لونڈیوں میں سوائے حجاب کے اور کوئی فرق نہ تھا۔ کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ نکاح بھی ہو چکا اور ولیمہ بھی ہو چکا تھا اور ابھی مسلمان متذبذب تھے کہ آیا انہیں آپ کی بیوی قرار دیں یا لونڈی۔ اور آخر حجاب پر فیصلہ کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بیوی اور لونڈی میں سوائے حجاب کے اور کوئی فرق نہ تھا۔ نکاح وغیرہ کے مراسم اور باقی سب امور میں دونوں یکساں تھیں۔ حضرت صفیہ جنگ میں بطور قیدی کے آئی تھیں اور آپ نے ان سے نکاح بھی کیا اور ولیمہ بھی ہو گیا۔ مگر ان میں سے کوئی بات ایسی ممیّز نہ تھی، جس سے فیصلہ ہو جاتا کہ وہ ام المؤمنین ہیں یا مملوکہ۔ فیصلہ کن امر صرف یہ تھا کہ حجاب میں رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس سے ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اصل تمیز حُرہ اور مملوکہ میں نکاح کی نہ تھی، بلکہ حجاب کی تھی اور یہ قرآن شریف کے بھی مطابق ہے۔ کیونکہ قرآن شریف نے بھی اور کوئی فرق حُرہ اور مملوکہ میں قرار نہیں دیا، سوائے اس کے کہ مملوکہ کا مرتبہ حُرہ کے برابر نہ تھا۔ اور اسی لئے وہ پردہ میں نہ رکھی جاتی تھی۔ ورنہ نکاح ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ حُرہ کی صورت میں۔

ایک اور حدیث سے، جو وہ بھی بخاری میں مذکور ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ نکاح سے پہلے صفیہ آزاد کر دی گئی تھیں۔ اس کے بعد بھی صحابہ کے متذبذب ہونے سے یہ معلوم ہوتا کہ باوجود آزاد کر کے نکاح کرنے کے بھی ایک عورت مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُ میں داخل ہو سکتی تھی۔ اور صحیح اور ممیّز فرق حُرہ اور مملوکہ میں سوائے حجاب کے کچھ نہ تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس سے پہلی حدیث کا منشاء ہے، کہ مالک کو حکم تھا کہ اگر وہ خود لونڈی سے نکاح کرنا چاہے، تو اس کو آزاد کرنے کے بغیر نہ کرے۔ یہی وہ طریق تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صفیہؓ کے نکاح میں ملحوظ رکھا۔ ان صحیح اور یقینی احادیث کے خلاف، جن کی قرآن شریف سے بھی تائید ہوتی ہے، اگر کوئی کم پایہ کی ایسی حدیث بھی ہو، جس میں کوئی ایسا واقعہ مروی ہو کہ کسی شخص نے مِلک یمین سے وطی کی، تو ایسے بلا تائید بیان کی ہم تصدیق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں۔

تیسرا ذریعہ شہادت کا امر زیر بحث کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریق عمل ہے۔ کیونکہ ملک یمین جیسی مومنوں کے لئے جائز تھی، ویسے ہی آپ کے لئے بھی جائز تھی۔ اس امر کو بالاتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ ملک یمین والی عورتوں میں سے جویریہ اور صفیہ آپ کے پاس تھیں اور ساتھ ہی بالاتفاق یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونو کو آپ نے آزاد کر کے ان کے ساتھ نکاح کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونو آپ کے ملک یمین میں آ چکی تھیں، کیونکہ سراری میں تھیں۔ پھر آپ کو کیا ضرورت تھی کہ ان کو آزاد کرتے اور پھر ان سے نکاح کرتے۔ آپ کے اس عمل سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا منشاء وہی تھا، جو آپ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ جس کے پاس لونڈی ہو، اسے چاہئے کہ اسے تعلیم دے اور آزاد کرے اور پھر اس سے نکاح کرے۔ ایک طرف آپ کے لفظ اور دوسری طرف آپ کا امہات المؤمنین جویریہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما سے یہ طریق عمل کہ محض ملک یمین سے ان کو اپنے تصرف میں نہیں لائے، بلکہ ہر دو کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا۔ یہ قول اور یہ فعل بھی اگر کسی کو اس بات کے حق میں ہونے کے قائل نہیں کر سکتے، تو اس کا تو میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ لیکن جو شخص آپ کے قول اور فعل کی پیروی کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے یہ شہادت کافی ہے۔ ماریا قبطیہ اور ریحانہ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ ہر دو ملک یمین سے آپ کی تصرف میں تھیں، بالکل غلط ہے۔ ماریہ کے متعلق اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں کہ وہ حجاب میں رکھی گئی تھیں۔ اور جیسا کہ ام المؤمنین صفیہ کے نکاح والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، حجاب ہی اصل امتیاز حُرہ اور مملوکہ کے درمیان تھا۔ پس جب ماریہ حُرہ تھیں، تو نکاح بطریق اولیٰ ثابت ہو گیا۔ ریحانہ کے متعلق بھی متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے آزاد کر کے اس سے نکاح کیا۔ علاوہ ازیں اس امر کو تمام مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ آپ نے نہ کبھی کوئی غلام رکھا اور نہ لونڈی، بلکہ جبھی آپ کے مِلک میں کوئی غلام یا لونڈی آتی، آپ اسے آزاد کر دیتے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ آپ خدمتگاروں تک کو تو غلامی میں رکھنا پسند نہ کرتے اور بیویوں کو غلامی میں رکھتے۔ آپ کے بعد ہمارے لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عمل دیکھنا کافی ہے۔ سو ان کے متعلق بھی یہ بالاتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ کوئی لونڈی ان کے پاس نہ تھی، جس کے ساتھ وہ مِلک یمین سے وطی کرتے ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر نکاح اور مِلک یمین دو الگ الگ باتیں ہوتیں اور جیسا کہ نکاح سے مرد اور عورت کا تعلق جائز سمجھا جاتا تھا ایسا ہی صرف مِلک یمین سے بغیر نکاح کے ایسا تعلق جائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا عمل کیوں اس کے خلاف ہوتا۔ بلکہ چاہئے تھا کہ جس طرح ان کے پاس منکوحہ بیویاں تھیں کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتیں، جنہیں وہ مِلک یمین سے بغیر نکاح کے

اپنے تصرف میں لاتے۔

یہ بات پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ کوئی حدیث، جس سے مِلک یمین کے ساتھ لونڈی کا تصرف میں لانا معلوم ہوتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچتی۔ بلکہ آپ کے الفاظ صاف نکاح ہی کی تائید کرتے ہیں۔ پس جو اس قسم کی روایتیں ہیں، اول تو ان سے نکاح کی نفی نہیں ہوتی۔ اگر ہو بھی تو وہ قرآن شریف وصحیح احادیث اور سنت کے خلاف ہیں۔ اس لئے ان کو مان کر ان تینوں کو نہیں چھوڑ سکتے، جن پر مذہب اسلام کی بنا ہے۔ علاوہ ازیں لونڈیوں سے متعلق اس قسم کی ممانعتیں منکوحہ عورتوں کے متعلق، مثلاً یہ کہ دو بہنوں کا اکٹھا رکھنا یا بیٹے کا باپ کی موطؤہ لونڈی کو تصرف میں لانا وغیرہ وغیرہ۔ جو صاف طور پر قرآن شریف کے اس حکم سے لی گئی ہیں، جو اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ (الخ) یعنی ان ان عورتوں سے تمہارے لئے نکاح کرنا حرام ہے۔ ورنہ لونڈیوں کے لئے کوئی الگ حکم قرآن شریف میں موجود نہیں کہ فلاں فلاں قسم کی لونڈیاں حرام ہیں۔ اس سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ لونڈیوں کے ساتھ اسی طرح نکاح کیا جاتا تھا، خواہ آزاد کر کے یا آزاد کرنے کے بعد، جس طرح حرّہ عورتوں سے نکاح کیا جاتا تھا۔

("حقیقت غلامی" کا مضمون مؤلفہ علامہ مولوی محمد علی صاحب، رسالہ ریویو آف ریلیجنز (اردو)۔ جلد ۴ (۱۹۰۵ء) نمبر ۸ (اگست) صفحات ۲۹۰۔۳۰۹۔ نمبر ۹ (ستمبر) صفحات ۳۳۱۔۳۴۲۔ نمبر ۱۰ (اکتوبر) صفحات ۳۶۵۔۳۷۴۔ نمبر ۱۲ (دسمبر) صفحات ۴۴۵۔۴۶۲ سے ماخوذ ہے)

کتاب البیوع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

وجہ حِلّتِ بیع سَلّم

اَمَّـا بَـعْدُ۔ بعض اشخاص کا اعتراض ہے کہ بیع سَلّم خلاف قیاس ہے، کیونکہ وہ معدوم اشیاء پر ہوتی ہے اور معدوم اشیاء کی بیع خلاف قیاس وعقل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **لَا تُبِعَ مَا لَیُسَ عِنُدَکَ**۔ یعنی اس چیز کی خرید وفروخت نہ کرو، جو موجود نہ ہو۔

امّـا الُـجَوَاب۔ واضح ہو کہ بیع سَلّم موافق قیاس وعقل ہے۔ کیونکہ بیع سلم میں وصف ومعرفت قدر وجنس اور بائع کی طرف سے چیز کے ادا کرنے کا ذمہ شرط ہے اور یہ بیع اس معاوضہ کی طرح ہے، جو اجارہ میں منافع پر ہو۔ پس بیع سلم کا قیاس از روئے صورت ومعنی معدوم اشیاء پر کرنا کہ جن کے حاصل ہونے کا احوال معلوم نہ ہو درست نہیں ہے۔

خدا تعالیٰ نے عاقلوں کی فطرت میں اس امر کی تمیز رکھی ہے کہ وہ ان چیزوں میں فرق کریں کہ جن کا انسان نہ مالک ہوسکتا ہے اور نہ اس کے مقدور میں ہوں۔ اور درمیان ان اشیاء کے کہ جن کو بائع ادا کرنے کا ذمہ لیتا ہے اور وہ عادۃً ان کے ادا کرنے پر قادر ہو۔

پس ان امور کو یکساں سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ مردار ومذبوح وربا اور بیع کو برابر سمجھا جائے۔ اور یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم بن حزم کو فرمایا کہ **لَا تَبِـعُ مَـا لَیُسَ عِـنُدَکَ** یعنی جو چیز موجود نہ ہو، اس کی خرید وفروخت نہ کرو۔ اس سے مراد دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایسی چیز کو فروخت نہ کر، جس کا تو مالک نہیں، بلکہ وہ چیز کسی دوسرے شخص کی ہو۔ دوسرے اس سے وہ بیع مراد ہے، جس کے ادا کرنے پر انسان قادر نہ ہوسکے۔

قرآن کریم وسنت نبویہ اور آثار صحابہ کرام سے کہیں بھی ثابت نہیں ہے کہ معدوم کا بیع جائز نہیں ہے۔ ہاں سنت میں بعض معدوم اشیاء کی بیع منع ہے، جیسا کہ بعض موجودہ اشیاء کی بیع بھی منع ہے۔ پس

ممانعت بیع کی وجہ عدم اور وجود اشیاء نہیں ہے، بلکہ وہ امور ہیں، جن میں سنت وارد ہے اور وہ بیع غرا ہے، جس کے ادا کرنے پر انسان قادر نہ ہو سکے، خواہ وہ موجود ہو یا معدوم۔ مثلاً بھاگ جانے والے اونٹ کی بیع منع ہے، خواہ وہ موجود ہی ہو۔ کیونکہ بیع کا موجب بیع کا ادا کرنا ہے۔ پس جب کہ بائع اس کے ادا کرنے پر ہی قادر نہ سکے، بلکہ عاجز ہو، تو وہ غرا اور مخاطرہ اور قمار بازی ہے۔

بیع معدوم بعض مواضع میں درست ہے۔ مثلاً شریعت اسلامیہ میں پھل کی اصلاح و پختگی کے آثار ظاہر ہونے اور غلّہ پکنے پر بیع جائز رکھی ہے۔ اور بیع سَلَم، جو موجل ہو، جب انسان کو اس کے ادا کرنے کا یقین نہ ہو، تو ناجائز، اور اگر اس کے ادا کا یقین ہو، تو جائز ہے۔ اور وہ مثل قرض کے ہے اور محض مصلحت الٰہی کے موافق ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ ۔ ترجمہ۔ یعنی اے ایماندارو جب تم آپس میں لین دین کا معاملہ ایک وقت مقرر پر کرو، تو اس معاہدہ کو لکھ لکھا لو۔

یہ آیت ثمن یعنی نقد اور مثمن، یعنی وہ چیز جو نقد کے عوض خریدی جائے، سب کو شامل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بیع سَلَم کا مباح ہونا موافق قیاس و مصلحت الٰہی کے ہے۔

جواز اجارہ کی حکمت

جو لوگ اجارہ کی خلاف قیاس کہتے ہیں ان کا گمان ہے کہ اجارہ ایک معدوم چیز کی خرید ہے، کیونکہ منافع عقد اجارہ کے وقت معدوم ہوتے ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ محض معدوم ہونے یا کسی چیز کے اسی وقت بالکمل الوجہ ظاہر نہ ہونے سے جیسے بیع ناجائز نہیں ہے، ایسے ہی اجارہ بھی منع نہیں ہے۔ قرآن کریم نے بچے کو دودھ پلانے والی دائی کے اجارہ کو درست فرمایا۔ حالانکہ بچہ کی تکمیل بتدریج بڑی مدت کے بعد ہوتی ہے۔ مگر رضاعت کا حق پہلے ہی دینا چاہئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔ ترجمہ۔ یعنی اگر وہ عورتیں تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو۔

اور یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقد کو اشیاء کے موجود ہونے پر مؤخر رکھا جائے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع حمل و بیع پھل قبل ظہور اصلاح اور غلہ پکنے سے پہلے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی اشیاء ہیں کہ اگر ان میں خرید و فروخت جائز ہو، تو مظنہ فساد ہیں۔ لہٰذا ان عقود سے منع ہوا۔

خمر ومردار وخنزیر وبُت کی خرید وفروخت واجرت زنا واجرت کاہن حرام ہونیکی وجہ

اشیاء کی حرمت کا مدار چند امور پر ہوتا ہے۔ ازاں جملہ ایک یہ ہے کہ بعض اشیاء عادت کے اعتبار سے معصیت پر مشتمل ہوں یا لوگوں کو ان اشیاء سے، جس قسم کا فائدہ وتمتع حاصل کرنا مقصود ہو، وہ ایک قسم کی معصیت و گناہ ہو۔ مثلاً خمر و بُت وتنبورے وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کی بیع کا طریق جاری کرنے اور ان کے بنانے میں ان معاصی کا ظاہر کرنا اور لوگوں کو ان معاصی پر آمادہ کرنا ورغبت دلانا اور نزدیک کرنا پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مصلحت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ان چیزوں کا بیع وشرا کرنا اور ان کا گھروں میں رکھنا حرام کیا جائے۔ کیونکہ ان معاصی کو دور کرنا اور لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے پرہیز واجتناب کریں۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **ان الله و رسوله حرم بيع الخمر و الميتة والخنزير و الاصنام**۔ ترجمہ۔ یعنی خداتعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے شراب اور مردار اور خوک اور بتوں کی خرید وفروخت حرام کو کیا ہے۔ تو اس کے ثمن یعنی اس کی قیمت کو بھی حرام کیا۔ یعنی جب ایک چیز سے نفع اٹھانے کا طریق مقرر ہے، مثلاً شراب صرف پینے کے لئے اور بت صرف پرستش کے لئے بنائے جاتے ہیں، پس خداتعالیٰ نے اس چیز کو حرام کیا ہے۔ اس لئے حکمت الٰہیہ کا مقتضےٰ ہوا کہ ان کی بیع بھی حرام کی جائے۔ اور نیز فرمایا ہے **مهر البغي خبيث** ۔ یعنی اجرت زنا کی خبیث ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کو اجرت دینے سے منع فرمایا اور مغنّیہ کے کسب سے نہی فرمائی۔ وجہ یہ ہے کہ جس مال کے حاصل کرنے میں گناہ کی آمیزش ہوتی ہے، اس مال سے بدو وجہ نفع حاصل کرنا حرام ہے۔ ایک تو یہ کہ اس مال کے حرام کرنے اور اس سے انتفاع نہ حاصل کرنے میں معصیت سے باز رکھنا ہے۔ اور اس قسم کے معاملات کے دستور جاری کرنے میں فساد کا جاری کرنا اور لوگوں کو اس گناہ پر آمادہ کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ وخیال میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ ثمن مبیع سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ملاءِ اعلیٰ میں اس ثمن کے لئے ایک وجود تشبیہی ہوتا ہے گویا کہ وہ خود مبیع ہے اور اسی طرح اجرت کے لئے ایک وجود تشبیہی ہوتا ہے۔ پس اس مبیع اور اس عمل کی خباثت ان کے علوم میں اس ثمن اور اس اجرت کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور لوگوں کے نفوس میں بھی اس صورت عملیہ کا اثر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اس کے نچوڑنے والے، نچڑوانے والے اور پینے والے اور لے جانے والے اور، جس کے پاس لے جاتا ہے، سب پر لعنت کی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معصیت کی مدد کرنا اور اس کا پھیلانا اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا بھی معصیت اور زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔

اور ایک یہ وجہ ہے کہ نجاست کے ساتھ اختلاط کرنے میں مثل مردار وخون وگوبر اور پاخانہ وغیرہ کے ساتھ نہایت قباحت اور خدا تعالیٰ کی ناخوشی ہے۔ اور اس کے سبب سے شیاطین کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ گندگی اور خباثتوں سے اجتناب کرنا ان اصولوں میں داخل ہے، جن کے قائم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ہے۔ اور جس کے سبب سے ملائکہ کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اور پاکیزہ لوگوں کو خدا تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ اور چونکہ کسی قدر مخالطت مباح کے بغیر بھی چارہ نہیں ہے، اس لئے کہ بالکل اس بات کے مسدود کرنے میں لوگوں پر نہایت دقت ودشواری ہوتی ہے، لہٰذا اسی قدر ضروری ہوا کہ ان ناپاک چیزوں کے اختلاط کے ساتھ پیشہ اختیار کرنے اور ان کی تجارت کرنے سے نہی فرمائی جائے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ **ان اهل الذمة لا يلزمون احكامنا فى الديانات و فى ما يعتقدون خلافه من المعاملات و لهذا لا يمنعهم عن شرب الخمر واكل الخنزير و بيعهما و فانا امرنا ان نتركهم و ما يدينون** ۔ترجمہ۔ ذمیوں کے لئے ضروری نہیں ہے کہ ہمارے احکام دین کی اور معاملات میں ہم سے مختلف اپنے عقائد کی پیروی کریں۔ اس لئے ان کے لئے شراب پینا منع نہیں، نہ ہی (لحم) خنزیر کا کھانا یا اس کی خرید وفروخت کرنا۔ کیونکہ ہمیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ انہیں ان کے معاملات دین میں پابند نہ کریں۔ (ترجمہ از مرتب)
اس جگہ آریہ وعیسائی غور کریں کہ اگر اسلام میں اکراہ جائز ہوتا، تو ہمارے ائمہ عظام کا یہ فتویٰ اس کے برعکس ہوتا۔

دائن کو مدیون سے ہدیہ لینا منع اور مرتہن کو راہن کے مال سے نفع حاصل کرنا جائز ہونیکی وجہ

۱۔ قرض کی بنا تبرّع واحسان وہمدردی پر ہوتی ہے۔ لہٰذا مدیون سے ہدیہ وتحفہ لینا منع ہوا کہ اس سے دائن کے عمل احسان کا ابطال لازم آتا ہے۔

۲۔ قرض دے کر کسی شخص سے توقع نفع رکھنا ایک قسم کا سود شمار ہوتا ہے۔ پس اگر اس امر کو جائز کیا جاتا، تو اس مرض کے عالمگیر ہونے کا اندیشہ تھا۔

۳۔ اگر دائن اپنے مدیوں سے ہدایا وتحائف کا لینا قبول کرلیا کرے، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جو دروازہء ربا کو مفتوح کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس باب کو مسدود رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حیلہ کو ہی منع فرمادیا، تاکہ باب رباخوری مفتوح نہ ہوجائے۔

رہن بھی قرض ہے اور اس میں بھی تبرّع واحسان کی صفت موجود ہے۔ مگر رہن کی بنا مضبوطی پر ہے اور مضبوطی شے مرہون کے قبضہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پس جب مرتہن راہن کی کسی چیز کو اپنے قبضہ میں رکھ کر اس کے خرچ ونقصان کا ذمہ دار ہو، تو اس کے لئے نفع حاصل کرنا ازروئے تقاضائے عقل سلیم اسی طرح جائز ہونے کا حق حاصل ہے، جس طرح اس کے مالک کو ہے۔

اور شریعت اسلامیہ نے بھی مرتہن کے لئے مرہون سے نفع حاصل کرنے کی یہی صورت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **الظهر يُركب بنفقتهٖ اذا كان مرهونا ولبن الدر يشرب بنفقته اذا كان مرهونا و على الذى يركب و يشرب النفقة** ۔ترجمہ۔ یعنی سواری کا خرچ اٹھانے سے اس کی سواری کی جائیگی، جبکہ وہ مرہون ہو اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ اس کا خرچ اٹھانے سے پیا جائے گا، جبکہ وہ مرہون ہو۔ اور سوار ہونے والے اور دودھ پینے والے کو اس کا خرچ اٹھانا پڑے گا۔ اسی بنا پر زمین کا گرو رکھ کر مرتہن کو اس کے منافع کا حاصل کرنا جائز شمار کیا جاتا ہے، جب کہ مرتہن اس کی مالگذاری وکشت وکاشت کا ذمہ دار ہو۔ اس صورت میں تجاویز رہن جائز ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر فصل ہوگئی، تو حکام زمینداروں سے معاملہ وصول کرلیا کرتے تھے۔ اگر نہ ہوئی، تو معاف ہوجاتا تھا۔ اور اب خواہ فصل ہو یا نہ ہو، حکام اپنا مطالبہ وصول کر ہی لیتے ہیں۔ پس چونکہ حکام وقت اپنا مطالبہ کسی صورت میں نہیں چھوڑتے، تو اس طرح یہ رہن بھی جائز رہا۔ کیونکہ کبھی فصل ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ تو دونوں صورتوں میں مرتہن نفع ونقصان کا ذمہ دار ہے۔ پس رہن عدل کی صورت میں جائز ہے، جب دودھ والا جانور اور سواری کا گھوڑا یا قبضہ ہوسکتا ہے اور اس کے دودھ اور سواری سے مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو زمین کا رہن تو آپ ہی حاصل ہوگیا۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں رہن کے متعلق فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ کہہ کر مرہون کا قبضہ شرط قرار دیا ہے۔ پس جس کے لئے قبضہ کا حق حاصل ہے، اس کے لئے انتفاع بھی جائز ہے۔

رہن زیور وزکوٰۃ زیور

زیور ہو یا کچھ ہو حسب ارشاد نبوی انتفاع جائز ہے، تو خواہ نخواہ تکلفات کیوں بناتے جائیں۔ اگر کوئی شخص زیور کو استعمال کرنے سے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، تو اس کی زکوٰۃ بھی اس کے ذمہ ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب الاکل والشرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ لَنَا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً وو َضَعَ عَلَی الْاَشْیَاءِ عَلَامَاتٍ بَیَاناًلِحِلَّتِھَا وَحُرْمَتِھَا صَرِیْحاً وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفیٰ وَ اَحْمَدِنِ الْمُجْتَبیٰ الَّذِیْ بَیَّنَ لَنَا حَلَالاً وَ حَرَامًا فَصِیْحاً وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ الَّذِیْنَ اَوْصَلُوْا اِلَیْنَا کَلَامَہٗ جَلِیًّا وَّ خَفِیًّا ط

وجوہاتِ حرمتِ خنزیر

۱۔اما بعد واضح ہو کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے، تو خدا تعالیٰ نے اس کے حرام ہونے کی وجہ اس کے نام میں ہی بیان فرمادی ہے۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خنزیو عربی زبان کا لفظ ہے، جو خنز اور ار سے مرکب ہے، جس کے معنے ہیں کہ میں اس کو فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے معنے بہت فاسد۔ ار کے معنے میں دیکھتا ہوں۔چنانچہ لفظ خنز کے متعلق نھایہ جلد دوم صفحہ۳ میں حضرت ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔یقال خَنزَیَخْنَزُ وَخَزَنَ یَخْزَنُ ، اِذَا تَغَیَّرَ رِیْحُہٗ ۔یعنی جب کوئی چیز فاسد ہو اور اس کی اصلی بُو متغیر ہو جائے، تو اس کے لئے عربی زبان میں لفظ خنز اور خزن استعمال کرتے ہیں۔ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔و لو لا بنو اسرائیل ما خنز اللحم ،یعنی اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے،تو گوشت فاسد و گندہ نہ ہوتا۔پس اس جانور کا نام، جو ابتداء سے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے، وہی اس کی پلیدی پر دلالت کرتا ہے۔

اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس جانور کو سؤر کہتے ہیں۔یہ لفظ بھی سؤ اور ار سے مرکب ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بہت برا دیکھتا ہوں۔اور اس سے تعجب نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ سؤ عربی لفظ ہے۔اس لئے ہندی زبان میں سؤ کا ترجمہ بد ہے۔پس اس جانور کو بدبھی کہتے ہیں۔ اور ان الفاظ کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرنے میں ہم منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ جملہ اہل علم کا بیان ہے کہ **الالفاظ لم یقصد لنفسھا و انما ھی مقصودۃ للمعانی المتوصل بھا الی معرفۃ مراد المتکلم و مرادہ یظھر من عموم لفظہ تارۃ و من عموم المعنیٰ الذی قصد تارۃ و قد**

یکون فہمہ من المعنیٰ اقوی و قد یکون اللفظ اقویٰ ۔ترجمہ۔یعنی الفاظ بذاتہا مقصود نہیں ہوتے ، بلکہ وہ متکلم کی مراد معلوم کرنے کے لئے مقصود ہوتے ہیں۔اور متکلم کی مراد کبھی تو اس کے عام لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کی مراد اس کے معنے مقصود سے معلوم ہوتی ہے۔اور گاہے اس کی مراد معنے سے قوی تر اور کبھی لفظ سے زیادہ تر قوی مفہوم ہوتی ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصل لفظ غلطی عوام سے بدل جاتے ہیں،تو اس وقت یوں کہا جاتا ہے کہ **الحقائق لا یتغیر بتغیر الالفاظ** ۔یعنی لفظوں کے بدلنے سے حقائق نہیں بدلتے ۔معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں تمام اہل دنیا کی زبان عربی تھی اس ملک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا، جو خنزیر کے ہمنام ہے۔ پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا ہے۔ہاں یہ ممکن ہے کہ شاستری میں اس کے قریب قریب یہی لفظ متغیر ہو کر اور کچھ بن گیا ہو۔مگر صحیح لفظ یہی ہے، کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے،جس پر لفظ خنزیر گواہ ناطق ہے۔

پھر علاوہ ازیں لفظ سؤر بھی اسی امر پر شاہد ہے۔اس لفظ میں بھی اس جانور کے اوصاف مذمومہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ مفردات راغب میں لکھا ہے۔سؤ روسور بمعنی حدّت یعنی تیزی اور السورۃ بمعنے الثورۃ یعنی غصہ وغضب۔اس جانور میں غصہ وغضب بیحد ہوتا ہے اور رحم نہیں۔اس لئے اس نام سے بھی مسمّٰی ہوا۔گویا غصہ ہی غصہ ہے۔ایسا ہی جو انسان اس جانور کی صفات سے موصوف ہو جائے اس کو بھی یہی لقب ملتا ہے، کیونکہ انہی صفات کے مطابق انسان کا حشر قیامت کو ہوگا،جن سے وہ دنیا میں موصوف تھا۔

حشر پُر حرص خسے مردار خوار   صورتے خوکے بود روز شمار
سیرتے کاں در دجودت غالب است   ہم براں تصویر حشرت واجب است

۲۔اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اول درجہ کا نجاست خور، بے غیرت و دیوث ہے۔اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہو، کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے۔پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی ہوگا۔جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے۔پس جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ تغیر بدن و اخلاق کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے۔لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھانے سے شریعت اسلامیہ نے منع فرما دیا۔جس کے صفات دنیہّ شیاطین کے ساتھ بالکل مشابہت رکھتے اور ملائکہ سے بعید ہونے کا سبب ہوں اور اخلاق

صالحہ کی خلاف صفات کو پیدا کرتے ہوں۔

۳۔ سب غذاؤں سے زیادہ قوی الاثر گوشت ایسے جانور کا ہے، جس کی صورت میں کوئی قوم مسخ کی گئی ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب کسی انسان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو اس کے سبب سے انسان کے اندر ایک ایسا مزاج پیدا ہو جاتا ہے، جو صحت انسانی سے اس قدر دور ہوتا ہے کہ وہ شخص انسان کی صورت نوعیہ سے بالکل خارج ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مسخ سے مراد مسخ معنوی ہے حقیقی نہیں۔

۴۔ لعنت الٰہی بدن انسانی کے عذاب دینے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے اور ایسے وقت میں اس کا مزاج روحانی انسانی اخلاق سے نکل کر کسی خبیث جانور کے اخلاق و عادات اختیار کر لیتا ہے۔ جن سے طبائع سلیمہ کو نفرت ہوتی ہے۔ ایسے وقت کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس شخص کو مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دیا۔ پس خطیرہ القدس میں اس کے متعلق یہ علم متمثل ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے جانور اور انسان مغضوب علیہ اور رحمت الٰہی سے بعید ہو۔

۵۔ ایک مناسبت خفیہ سے اس جانور میں اور طبیعت سلیمہ میں، جو اپنی فطرت پر باقی ہو، نہایت درجہ کا بُعد واقع ہے۔ پس لامحالہ ایسے جانور کا گوشت کھانا اور اس کو اپنے بدن کا جزو بنانا نجاست کے ساتھ ملاپ اور ان افعال کے عمل میں لانے سے، جو غضب کو جوش میں لاتے ہیں، زیادہ تر برا ٹھہرے گا۔ لہٰذا ہمیشہ سے خطیرۃ القدس کے ترجمان یعنی حضرت نوحؑ کے وقت سے تمام انبیاء علیہم السلام خنزیر کو حرام کرتے اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کا حکم کرتے چلے آئے ہیں۔

۶۔ خنزیر یعنی خوک نجاست کی طرف بہت مائل ہے۔ خصوصاً انسان کا فضلہ یعنی براز اس کی خوراک ہے۔ اس کا گوشت اسی نجاست سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کا گوشت کھانا گویا اپنی نجاست کھانا ہے۔

۷۔ یہ جانور حرص، بے حیائی، بے غیرتی کی طرف اس قدر مائل ہے کہ دوسرے جانوروں میں اس قدر یہ خصلت نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی اس کا گوشت بطور مداومت کھاتے ہیں، ان اخلاق میں اس جانور سے کمال مشابہت رکھتے ہیں، جیسے نصاریٰ اور بعض اقوام ہنود وغیرہ۔

سؤر سراپا نجس ہے اور بے حیا ہے اور اس کے مادہ پر جس کا جی چاہے جست کرے، اس کو کچھ پرواہ نہیں۔ اسی لئے وہ قابل حرمت ہے تا کہ اس کے کھانے سے بےحیائی نہ چھا جائے۔ اور دل و جان ناپاک نہ ہو جائیں، جن سے خیالات ناپاک پیدا ہوں۔ وجہ یہ کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ گرم غذا سے گرمی اور

سرد سے سردی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی اخلاق و کیفیات و خواص انواع حیوانات کو خیال فرما لیجئے۔

۸۔ صاحب "مخزن الادویہ" فساد گوشت خوک اور اس کی حرمت کے تیرہ وجوہات ذیل تحریر کرتے ہوئے ظاہر فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرت انسانی کے برخلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

" گوشت خوک (۱) مولد خلط غلیظ است و (۲) مورث حرص شدید و (۳) صدع مزمن و (۴) داء الفیل و (۵) اوجاع المفاصل و (۶) وفساد عقل است و (۷) معدہ و (۸) زوال مروت و (۹) وغیرت و (۱۰) حمیت و (۱۱) باعث فحش است و اکثرے از فرق غیر اسلامی آنرا می خورند و قبل از ظہور نور اسلام گوشت آنرا در بازار میفر وختند و بعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع و موقوف گردید۔ (۱۲) بسیار کثیف و (۱۳) بدہیئت است۔

۹۔ منجملہ اور وجوہات کے اس جانور کے حرام ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا گوشت کھانے سے انسان پر فوراً سوداوی امراض حملہ آور ہوتے ہیں۔ چنانچہ "مخزن الادویہ" میں لکھا ہے۔ "چوں خوردن لحم مورث خلط سودا و امراض سوداوی است باید کہ شخصے کہ ناچار باشد بخوردن آں تعہد نماند بدن خود را باخراج سودا و ترطیب آں باستعمال اوہان ولعابات و چوں تناول نماید در بدن خود تعلّے وتمدّ دے وریا بدوز و داز معدہ ء او نگذرد و باید کہ مبادرت نماید باخراج آں"۔

کیا خوک نجس العین ہے

اکثر کا اتفاق ہے کہ خوک نجس العین ہے۔ اس کی کسی چیز سے انتفاع جائز نہیں ہے۔ مگر حضرت امام اعظم اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے تجویز فرمایا ہے کہ اس کے بالوں سے جھول اور خورجیاں اور دوسری چیزیں اس کے چمڑے کی بنائی جائیں (تفسیر عزیزی) حضرت امام اعظم و امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اسناد قرآن کریم کی دو آیات ذیل سے ہے۔ اول۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعاً. یعنی خدا تعالیٰ وہ قادر و محسن ہے، جس نے زمین کی تمام اشیاء تمہارے انتفاع و فوائد کے لئے پیدا کی ہیں۔ کیونکہ زمین کے اگر بعض جانوروں کا کھانا حرام ہے، تو ان سے دیگر انتفاع جائز ہیں، مثلاً گدھا وغیرہ۔ ایسے بہت سے جانور ہیں، جن کا گوشت تو حرام ہے، مگر ان سے بار برداری وغیرہ فوائد حاصل کرنا جائز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ زمین کی تمام اشیاء تمہارے منافع کے لئے خدا نے پیدا کی ہیں۔ دوسری آیت یہ ہے۔ حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْر ۔ یعنی حرام کیا گیا تم پر گوشت مردار کا کھانا اور خون اور گوشت خوک کا کھانا۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے حرمت گوشت خوک کی خصوصیت فرما دی ہے اور اگر اس کے وجود کی دوسری اشیاء سے انتفاع بھی حرام ہوتا، تو خدا تعالیٰ

یوں فرما دیتا کہ خوک تم پر حرام کیا گیا۔

گوشت خوک کے کھانے سے نہی شدید کی وجہ

غالباً گوشت خوک کو کوئی فرقہ کھایا کرتا تھا، لہٰذا شرائع الٰہی میں اسکے کھانے سے نہایت شدت کے ساتھ نہی کی گئی اوراس کو چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔اور دیگر حرام جانوران بندرو چوہاوغیرہ ایسے ہیں کہ ان کو کوئی قوم نہیں کھاتی۔اس لئے ان سے نہی کرنے میں تاکید شدید کے نزول کی ضرورت نہیں ہوئی۔

وجہ حرمت بندر

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔**جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوۡتَ** ۔ترجمہ۔یعنی خدا تعالیٰ نے کر دیا ان میں سے بعض کو بندر و خوک اور پرستش کرنے والے شیطان کے۔اوراسی کی مثل یہ ہے کہ جس زمان میں خسف یا عذاب نازل ہوا ہے،اس زمین میں ٹھہرنا مکروہ ہے۔اور **مغضوب علیھم** کی ہیئت بنانا بھی قبیح ہے، کیونکہ ان اشیاء کے ساتھ ملتبس ہونے کا اثران ہیئیات کے ساتھ ملتبس ہونے کے اثر سے کم نہیں ہے، جو مزاج شیطانی کا اقتضاء ہے۔اوران کے بعد اس جانور کا کھانا حرام ہے، جس کی سرشت میں ایسے افعال داخل ہیں، جو ان اخلاق کے برخلاف ہیں، جو نوع انسان سے مطلوب ہیں۔

جملہ درندہ جانوروں وشکاری پرندوں کے حرام ہونے کی وجہ

سارے درندہ جانور، جن کی سرشت وفطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور دبدبہ سے زخم پہنچانا ہے اور جن میں سخت دلی ہے، سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا۔**اَوۡ یَاۡکُلُه' اَحَدٌ** ۔یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے، یعنی اس کو کوئی نہیں کھاتا۔وجہ حرمت ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام درندوں کے کھانے سے منع فرمایا۔اس لئے کہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج اوران کی عادات بد ہیں اوران کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا۔ہر شکاری پرند کے کھانے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔اور بعض جانوروں کو آپ نے فاسق تعبیر فرمایا۔لہٰذا ایسے جانوروں و پرندوں کا کھانا حرام ہے، کیونکہ ان کے کھانے سے ان جیسی خصلت کھانے والے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ **عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنۡهُ اَنَّ رَسُوۡلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّم حَرَّمَ یَوۡمَ خَیۡبَرَ کُلَّ ذِیۡ نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ. وَ عَنۡ جَابِرٍ رَضِیَ اللهُ عَنۡهُ حَرَّمَ رَسُوۡلُ اللهِ**

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ خَیْبَرَ الْحُمُرَ الْاِنْسِیَةَ وَ حَرَّمَ الْبِغَال وَ کُلَّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ وَ ذِیْ مَخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ ۔ترجمہ۔یعنی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ خیبر کے دن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر ایک ذی ناب درندے کو حرام فرمایا۔اور جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن اہلی گدھے اور خچروں کے گوشت اور ہر ایک ذی ناب کو یعنی درندے جانوروں و پنجوں والے پرندوں کو حرام فرمایا۔شیر۔بھیڑیا۔ریچھ۔گیدڑ۔لومڑ۔نیولا۔باز شاہین۔چیل۔باشا وغیرہ سب حرام ہیں۔کیونکہ یہ سب ذی ناب اور درندے جانور ہیں۔اگر مذکورہ جانوروں میں سے کسی کو خواب میں دیکھا جائے،تو اس سے مراد ظالم و دھوکہ باز غاصب انسان ہوتے ہیں۔پس جو شخص ایسے جانوروں کا گوشت کھائے،اس میں بالضرور ایسے جانوروں کا اوصاف پیدا ہوں گے،جو مزاج انسانیت کے برخلاف ہیں۔

وجہ حرمت مردار وخون

۱۔مردار کا حرام ٹھہرانا عین حکمت الٰہی ہے۔کیونکہ جانور کے بدن کو پاک کرنے والی روح ہے۔جب روح اس سے جدا ہو جائے،تو اس کی عفونت کو دور کرنے والا نہیں رہتا۔لہٰذا وہ عفونت اس کے سارے بدن کو فاسد کر دیتی ہے اور وہ بہت بدمزہ اور بدبودار اور بدتاثیر ہو جاتا ہے۔

جو لوگ طفلی سے مردار خوار ہوں،ان کی صورت وشکل و اخلاق ایسے قبیح ہوتے ہیں گویا ان کا مزاج انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے۔رزالتِ طبع وقساوتِ قلبی ان کی فطرت وجبلت ہو جاتی ہے۔

۲۔مردار کے اندر ایک خطرناک زہر ہوتا ہے،جس کا نتیجہ انسان کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔چنانچہ جتنی مردار خوار قومیں ہیں،ان کی زبان،جلد،عقل موٹی اور بھدی ہوتی ہے۔اوروں کو نہیں تو چوہڑوں کو دیکھ لو۔شریف گھروں سے کھاتے ہیں۔انہی کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتے ہیں،مگر پھر بھی مردار خواری کا اثر ان کی شکلوں اور عقلوں سے ظاہر ہے۔

۳۔خون کے اندر اس قسم کی زہریں ہوتی ہیں،جن سے اعصاب کو تشنج،فالج،استرخا ہو جاتا ہے۔

۴۔خون کا کھانا اخلاق درندوں کی طرف مائل کرتا ہے۔اور مزاج میں غصہ وسبکی پیدا کرتا ہے،جیسے کہ حبشیوں اور چماروں و مردار خواروں میں،جو خون کھانے کے معتاد ہیں،یہ اخلاق ظاہر ہیں۔لہٰذا تقاضائے حکمت الٰہی سے یہ چیزیں حرام کی گئیں۔کیونکہ جو مردار خواروں میں نقصانات ہوتے ہیں،وہ خون کھانے سے لاحق ہوتے ہیں۔اور اگر خون زندہ جانوروں کا نکال کر کھاتے،تو یہ صورت خونخواروں

کی ہو جاتی، جو دائرہ انسانیت سے باہر ہے۔ اور جانور بھی بہ سبب نکل جانے خون کے کمزور ہو جاتے ہیں، کیونکہ حیوان کی قوت کا مادہ اور روح کا مرکب خون ہی ہوتا ہے۔ اور بوقت ضرورت ان سے فائدہ حاصل نہ کر سکتے، اور ان کا گوشت بدمزہ ہو جاتا اور سواری اور باربرداری کے کام بھی نہ آ سکتے۔ پس حلال جانوروں کا خون حلال نہ ٹھہرانا ایسا ہے، جیسے کوئی حاکم و رئیس زمیندار سبز اور کچی کھیتی کھانے سے منع فرمادے، تاکہ انجام کار نقصان نہ ہو۔

۵۔ خنزیر و مردار و خون کی حرمت کی وجہ خدا تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ گندی چیزیں ہیں، ان کے کھانے سے انسان کا ظاہر و باطن گندہ ہو جاتا اور انسان فاسق بن جاتا ہے۔ اور ایسا ہی غیر اللہ کے نام پر کسی چیز کے ذبح کرنے اور اس کے کھانے والے کا حال ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَّآ اَنْ یَکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَسْفُوْحاً اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقاً وَ مَا اَھَلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہ۔ ترجمہ۔ یعنی حلال نہیں ہے مردار اور خون رواں اور گوشت خوک کا کھانا، کیونکہ یہ چیزیں گندی ہیں۔ ان کے کھانے سے گندے اخلاق و گندے اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہی غیر اللہ کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز کا کھانا بھی حلال نہیں ہے، کیونکہ ایسے جانور کے کھانے سے انسان فاسق و بدکار بن جاتا ہے۔

الغرض مردار کا کھانا اس لئے شریعت میں منع ہے کہ مردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے۔ اور نیز ظاہری صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ اور جن جانوروں کا خون اندر ہی اندر رہتا ہے، جیسے گلا گھونٹا ہوا یا لاٹھی سے مارا ہوا، یہ تمام جانور درحقیقت مردار کے حکم میں ہی ہیں۔ کیا مردہ کا خون اندر رہنے سے اپنی حالت پر رہ سکتا ہے؟ نہیں۔ بلکہ بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ ہوگا۔ اور اپنی عفونت سے تمام گوشت کو خراب کرے گا۔ اور نیز خون کے کیڑے، جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوئے ہیں، مر کر ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دیں گے۔ تمام مِلل حقّہ و باطلہ میں مردار جانور حرام ہیں۔ مِلل حقّہ کا اس بات پر اس واسطے اتفاق ہے کہ خطیرۃ القدس سے ان ملت والوں کو اس بات پر تفہیم و تلقی ہوئی کہ یہ چیزیں خبیث ہیں۔ اور مذاہب باطلہ کا اس واسطے اتفاق ہے کہ ان کے علم میں اکثر مردار چیزوں میں زہریلا اثر ہوتا ہے۔ مردار جانور کے بدن میں مرتے وقت اخلاط سمّیہ پھیل جاتے ہیں، جن کو انسانی مزاج سے منافات ہوتی ہے۔ پھر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ مردار جانور کو غیر مردار سے جدا کیا جائے۔ اس کا انضباط اس طرح کیا گیا کہ مردار وہ جانور ہے، جس کی جان کھانے کی غرض سے نہ نکالی جائے۔ اس واسطے اس جانور کا کھانا حرام ہوگیا، جو سینگ لگ کر یا کہیں سے گر کر مر جائے یا کوئی درندہ اس کو کھالے۔ کیونکہ یہ سب خباثت اور موذی چیزیں ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ۔ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ

اَلْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَا اَکَلَ السَّبُعُ وَ مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذَالِکُمْ فِسْقٌ ۔ترجمہ۔یعنی حرام ہوا تم پر مردار اور لہو اور گوشت سؤر کا اور جس جانور پر نام پکارا گیا اللہ تعالیٰ کے سوا۔اور جو مر گیا گھُٹ کر یا چوٹ سے یا گر کر یا سنگ مارے سے اور جس کو کھالیا پھاڑنے والے درندے نے ۔مگر جو تم نے ذبح کرلیا وہ حلال ہے۔اور جو ذبح کیا ہو جانور کسی تھان پر کسی ولی وغیرہ کی تقریب سمجھ کر۔اور یہ کہ بانٹا پانسے ڈال کر۔یہ سب فسق کے کام اور حرام ہیں۔

٦۔خدا تعالیٰ نے مذکورہ بالا مردار جانوروں و دیگر اشیاء کی حرمت بیان کر کے ان کی وجہ حرمت بھی آخر ظاہر فرمائی،یعنی وہ یہ کہ ان اشیاء کے کھانے سے اور ایسے کام کرنے سے انسان فاسق بن جاتا ہے،اس لئے حرام کیا گیا۔میتہ۔دم۔لحم الخنزیر۔ما اھل بہ لغیر اللہ۔ان کی وجہ حرمت یہ ہے کہ مردار کا اثر بد جسم پر اور خون کا اثر بد روح پر اور گوشت خوک کا اثر بد اخلاق و عادات پر اور مذبوح باسم غیر اللہ کا اثر بد اعتقادات پر پڑتا ہے۔

وجہ حرمت کوّا۔چیل۔چھپکلی۔مکھی۔سانپ۔بچھو۔چوہا

وہ حیوانات جن کی طبیعت میں آدمیوں کو ایذا دینا و تکلیف پہنچانا اور ان سے کسی چیز کا اچک لینا اور ان پر لوٹ کرنے کی غرض سے فرصت کے منتظر رہتے ہیں۔اور ان میں شیطانی الہام کے قبول کرنے کا مادہ ہے،وہ سب حرام ہیں۔اور یہی وجہ ان کی حرمت کی ہے۔اور احادیث نبویہؐ میں ان کی تفصیل آئی ہے۔عَنْ عَائِشَةَؓ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ قَالَ اَلْحَیَّةُ فَاسِقَةٌ وَ الْفَارَةُ فَاسِقَةٌ وَالْغُرَابُ فَاسِقَةٌ ۔ترجمہ۔یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں کہ سانپ فاسق ہے ۔بچھو فاسق ہے۔چوہا فاسق ہے۔کوّا فاسق ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جانوروں کو فاسق قرار دے کر ان کی حرمت کی وجہ بیان فرمادی۔یعنی جو کوئی ان جانوروں کو کھائیگا،اس میں فسق کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے۔دوسرے ان جانوروں کو فاسق کہنے میں اس امر کی طرف ایما فرمایا کہ ان جانوروں کو جس قدر کوئی پالتو بنائے اور ان کی پرورش کرے،اس کو بالآخر ضرر دیں گے اور حق تربیت و عہد ربوبیت کو توڑ دیں گے۔

اور اس امر کی وجہ کہ آپ نے کیوں ان جانوروں کو حرام نہ کہا اور فاسق فرمایا،یہ ہے کہ اگر آپ ان جانوروں کو گن کر فرما دیتے کہ یہ جانور حرام ہیں،تو پھر ان کی وجہ حرمت،جو آپ کو بیان کرنی مطلوب تھی،اس کے بیان کے لئے دوبارہ کلام دوہرانی پڑتی۔لہٰذا ایک ہی بار میں حرمت اور وجہ حرمت بیان فرما

دی۔ اُوْتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ (ترجمہ از مرتب۔ مجھے فصحت کلام کی صفت عطا ہوئی ہے)۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔ اور ہر جانور کے لئے علاحدہ علاحدہ فاسق کا لفظ فرمانے سے ان جانوروں کی شدّت حرمت اوران کے کھانے سے نہی ومنع کی تاکید نکلتی ہے۔

دوسری حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالفاظ ذیل روایت فرمائی ہے۔قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم خَمْسَ فَوَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ اَلْفَارَةُ وَ الْعَقْرَبُ وَالْغُرَابُ وَ الْحَدَبَاء وَالْكَلْبُ الْعَقُوْر ۔رواہ الترمذی۔ترجمہ۔یعنی پانچ جانور فاسق ہیں۔ان کو حرم میں بھی قتل کیا جائے۔ چوہا۔بچھو۔کوّا۔چیل۔دیوانہ کتا۔

چونکہ حرم کے جانوروں کے مارنے وشکار کرنے میں نہی تھی، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جانوروں کو ان کی شدت سرکشی وعصیان کے باعث حرم میں بھی مار ڈالنے کا حکم فرمایا، کیونکہ باغی وسرکش کو حرم میں بھی امن نہیں مل سکتا۔

ان جانوروں کی حرمت ظاہر ہے کہ جو کوئی ان کا گوشت کھائے، وہ انہی کا متصف ہو جائے۔ کوّے کے اکثر خصائل بد ہیں۔لوٹ مار دہی میں اول درجہ کا ہے۔مگر اس میں تین ایسے خصائل ہیں، جن سے انسان کو سبق سیکھنا وعبرت حاصل کرنا چاہئے۔

(۱) کوّے کو کسی نے جماع کرتے کم دیکھا ہے۔(۲) ایک ٹکڑا بھی کھانے کو مل جائے، تو اڑ کر اوروں کو اطلاع ضرور کر دے گا کہ یہاں کچھ ملتا ہے۔(۳) کسی کوے کو صدمہ پہنچے، تو سب وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔اسی واسطے شور وغل کو ہماری زبان پنجابی میں " کاواں رولی" کہتے ہیں۔

ایک بڑے شکاری سے پوچھا گیا کہ کبھی کسی کوے کی لاش تم نے جنگل میں دیکھی ہے، تو اس نے کہا کہ نہیں۔اس سے تین باتیں نکلیں۔شرم وحیا بھی کوئی چیز ہے۔ نیک برتاؤ کرنا چاہئے۔اور ہمدردی میں مردے کی لاش کو دفن کرنے کی فکر بھی شامل ہے۔

وجہ حرمت حشرات الارض ہزار پا وغیرہ

وہ حیوانات، جن کی سرشت وفطرت میں ذلت اور گڑھوں میں چھپا رہنا پایا جاتا ہے، مثلاً چوہا اور دیگر حشرات الارض وغیرہ، وہ سب حرام ہیں۔اور ان کی وجہ حرمت یہ ہے کہ ان کے کھانے والا انہیں جانوروں کے اوصاف اور خصلتیں قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم تعبیرات سے ثابت ہے کہ رؤیا میں ان جانوروں کو دیکھنے سے مراد دنی (کم) ہمت انسان ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ حرمت ان جانوروں کی یہ ہے کہ تمام حشرات الارض میں سمی (زہریلا) مادہ پایا جاتا ہے، جس کے سبب ان کو کھانے سے انسان

ہلاک ہوسکتا ہے۔

وجہ حرمت کتا و بلی

کتا و بلی دونوں درندے جانور ہیں اور حرام چیزوں کو کھاتے ہیں۔ کتا شیطان ہوتا ہے۔ پس جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان فرمایا ہے اس کے کھانے والے کو بھی شیطان اور درندہ بننا پڑتا، اس لئے اس کی حرمت فرمائی۔ عَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَھیٰ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عَنْ اَکْلِ الْھِرَّۃِوَ ثَمْنِھَا ۔ترجمہ۔یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے کھانے اور اس کی قیمت سے منع فرمایا۔

کتا خبیث ترین وذلیل ترین وخسیس ترین وحریص ترین حیوانات میں سے ہے۔اس کی ہمت اس کے پیٹ سے آگے نہیں گذرتی۔اس کی شدت حرص میں سے ایک یہ بات ہے کہ جب وہ چلتا ہے تو شدت حرص کی وجہ سے ناک زمین پر رکھ کر زمین کو سونگھتا جاتا ہے اور اپنے جسم کے سارے اعضا کو چھوڑ کر ہمیشہ اپنے دبر کو سونگھتا ہے۔اور جب اس کی طرف پتھر پھینکو، تو وہ فرط حرص وغصہ کی وجہ سے اس کو کاٹتا ہے۔الغرض یہ جانور بڑا حریص وذلیل ودنی (کم) ہمت ہوتا ہے۔گندے مردار کو بہ نسبت تازہ گوشت کے زیادہ پسند کرتا ہے اور نجاست کو بہ نسبت حلوا کے بڑی چاہت سے کھاتا ہے۔اور جب کسی مردار پر پہنچے، جو صدہا کتوں کے لئے کافی ہو، تو شدت حرص وبخل کی وجہ سے اس مردار سے دوسرے کتے کو ذرہ بھر بھی کھانے نہیں دیتا۔اور اس کی حرص میں سے ایک یہ امر بھی عجیب ہے کہ جب وہ کسی خستہ حال وگُہنے وپھٹے پرانے کپڑوں والے شخص کو دیکھتا ہے، تو اس پر بھونکتا اور حملہ آور ہوتا ہے۔گویا وہ تصور کرتا ہے کہ وہ شخص اس کی روزی میں شرکت چاہتا ہے۔اور جب کسی وجیہہ واچھے لباس والے رعب ناک آدمی کو دیکھتا ہے، تو اس کا مطیع ہو جاتا ہے۔پس جب کتے کے ایسے اوصاف مذمومہ ہیں، تو جو شخص اس کو کھاتا ہے، وہ بھی انہیں اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے۔لہٰذا یہ جانور حرام ٹھہرایا گیا۔

وجہ حرمت گرگٹ اوراس کے مارنے کی تاکید شدید کا راز

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گرگٹ کے مار ڈالنے کا حکم صادر فرمایا اور اس کا نام فاسق رکھا اور فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آگ پر یہ پھونک مارتا تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض حیوانات کی سرشت وخلقت میں یہ بات داخل ہے کہ ان سے مدام افعال قبیحہ وہیئات شیطانیہ صادر ہوتے رہتے ہیں اور وہ حیوانات شیطان کے قریب تر ہوتے ہیں اور وسوسہ کے اعتبار سے اسی کے تابع

ہوتے ہیں۔اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کرلیا تھا کہ گرگٹ بھی انہی حیوانات میں سے ہے اور اس بات پر آپ نے آگاہ فرمایا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آگ کو پھونکتا تھا۔ شیطان کے وسوسہ کے سبب سے اس کا یہ کام مقتضائے طبع سے تھا۔ اگرچہ اس کے پھونکنے سے آگ میں کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔

گرگٹ کے قتل کرنے پر آپ نے دو وجوہات کے سبب رغبت دلائی۔ایک تو یہ کہ اس میں نوع انسانی کی ایذا کا دفیعہ ہے۔اس کا حال ایسا ہے کہ اس میں لشکر شیطانی کا توڑنا اور اس کے وسوسہ کو دور کرنا ہے۔اور یہ بات خداوند کریم اور اس کے ملائکہ مقربین کے نزدیک پسندیدہ امر ہے۔

"مخزن الادویہ" میں گرگٹ کے متعلق لکھا ہے کہ "کسے را نمی گزد و چوں بگزد کشندہ است و معالجہ ندارد و گوشت آں سم قتال است و عارض مے گردد۔از خوردن آں قے و وجع فواد۔ ہمیشہ نظر بآفتاب دارد۔ ودرایام گرما چہرہء آں سرخ مے گردد۔دونبالہء آں بلندو چشمائے آں بجمیع جہات حرکت مے کند برائے آنکہ صید خودرا بہر طرف کہ باشد بہ بیند و چوں صیداو کہ مگس و امثال آن است نزدیک او آید بسرعت زبان خودرا بر مے آورد و آنرا مے ربائد و از دور کہ مے بیند رفتہ آنرا صید مے کند و حشرات سمی مانند ہزار پا و عقرب را صید مے کند و مے خورد"۔

ترجمہ۔"یہ جانور کسی کو نہیں کاٹتا اور اگر کاٹ جائے تو آدمی مر جاتا ہے اور اسکے زہر کا کوئی علاج نہیں ہے۔اس کا گوشت زہر مہلک ہے اور اس کے کھانے سے قے اور درد دل شروع ہو جاتا ہے۔اور ہمیشہ آفتاب کی طرف نظر رکھتا ہے اور گرم موسم میں اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔اس کی دم بلند و آنکھیں سب طرف حرکت کرتی رہتی ہیں تا کہ اپنے شکار کو ہر طرف دیکھے۔اور جب اس کا شکار مکھی وغیرہ اسکے نزدیک پہنچے،تو فوراً اپنی زبان کو باہر نکال لیتا ہے اور اس کو نگل جاتا ہے اور دور سے دیکھ کر بھی ان اشیاء کا شکار کرتا ہے اور زہریلے حشرات الارض ہزار پا اور بچھو وغیرہ اس کی خوراک ہوتے ہیں۔"

اس جانور کی وجہ حرمت صاف ظاہر ہے کہ اس کا گوشت قاتل و مہلک ہوتا ہے۔اور کیونکر نہ ہو جیسا بیج ویسے پھل۔ جب کہ اس کی خوراک ہی زہریلے جانور ہوئے،تو اس کے زہر کا اثر بالضرور ظاہر ہونا ٹھہرا۔ ہمارے ملک پوٹھوہار میں اس جانور کا نام سپ گڈی یعنی سانپ کی گودی مشہور ہے۔ گودی مغز ولب کو کہتے ہیں۔ گویا اس ملک کے کسی حاذق نے اس کے نام میں ہی اس کی خواص ظاہر کر کے اس نام سے اس کو مسمیٰ کر دیا۔یعنی یہ جانور سانپ کے زہر کا مغز اور اصل ہے۔

وجہ حرمت گوشت اُلّو و چمگادڑ

ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ غذا کا اثر بدن کے علاوہ روحانی اخلاق واطوار پر بھی ہوتا ہے۔اس پرندے یعنی اُلّو کی حماقت اور بیوقوفی و ذلّت ثابت شدہ امر بلکہ ضرب المثل ہے۔ چنانچہ جب کوئی حماقت و بیوقوفی کا کام کرتا ہے،تو اس کو کہتے ہیں۔ او اُلّو ،تم نے ایسا کام کیوں کیا ہے۔صاحب مخزن لکھتا ہے کہ "خوردن گوشت آں مورث ابلہی و بیوقوفی در جمیع امور است"۔یعنی اس جانور کا گوشت کھانے سے انسان میں کند ذہنی وحماقت و بیوقوفی ہر قسم کے امور میں پیدا ہوتی ہے۔لہٰذا اس جانور کی حرمت کی وجہ اظہر ہے کہ جو کوئی اس کو کھاتا ہے،اس کو اُلّو یا اس کا پٹھا بننا پڑتا ہے۔

یہی حال چمگادڑ کی حرمت کا ہے۔اس جانور کی فطرتی کور بینی وحماقت و ذلت ایسی مشہور و معروف ہے کہ ضرب المثل ہوگئی ہے۔چنانچہ جب کوئی ظاہر و باہر صداقت کو نہیں مانتا،تو اس کو کہا کرتے ہیں۔"شپرکے است کہ روز روشن را شب قرار مے دہد"۔یعنی چمگادڑ ہے کہ روز روشن کو رات قرار دیتی ہے۔پس جو کوئی اس جانور کو کھاتا ہے،اس کی صداقت اور حقائق بینی کی آنکھ میں کوری پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس جانور کا کھانا بھی حرام ہوا۔

وجہ کراہیت خوردن گوہ یعنی سوسمار

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سوسمار یعنی گوہ کی نسبت فرمایا کہ خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کے کسی قبیلہ پر جب غضبناک ہوا،تو ان کو جانوروں کی صورت میں، جو زمین پر چلتے ہیں، مسخ کر دیا۔معلوم نہیں کہ شاید گوہ بھی انہی میں سے ہو۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبل از بعثت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اہل عرب سوسمار کو کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہ کسریٰ کو دعوت کا خط لکھا،تو اس نے حقارت کے طور پر کہا کہ سوسمار کھانے والے میرا تخت لینا چاہتے ہیں۔اس ماجرا کو فردوسی حکایۃً شاہ فارس کی طرف سے لکھتا ہے۔

ز شتر خوردنِ سو سمار   عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیان را کنند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

الغرض ایک دفعہ آپ کے دسترخوان پر لوگوں نے موافق سابق رسم کے سوسمار کا گوشت کھایا۔ اس لئے کہ اہل عرب اس کو طیب چیزوں میں شمار کرتے تھے۔اور ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوسمار کے نہ کھانے کی نسبت یہ عذر کیا کہ میری قوم کے ملک میں یہ جانور نہ تھا۔اس لئے مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔اور ایک بار احتمال مسخ کے ساتھ معذرت فرمائی۔اور ایک بار اس سے نہی فرمائی۔ان اقوال و روایات میں تناقض نہیں ہے، کیونکہ اس میں دونوں وجوہ پائی جاتی ہیں کہ غذا کے لئے ہر چیز کافی ہے،مگر

مشتبہ چیز کا ترک کرنا بہتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **اَلْحَرَامُ بَیِّنٌ وَالْحَلَالُ بَیِّنٌ وَ مِنْهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ** ۔یعنی حرام وحلال ظاہر وباہر ہیں اوران دونوں کے درمیان بہت سے مشتبہ امور ہی۔لہٰذا شبہ والی اشیاء کوترک کرنا ہی انسب وافضل ہے۔

حکماء نے لکھا ہے کہ سوسمار کی عمر سات سوسال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔اوراس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ پانی نہیں پیتا۔اور ہر چالیس یوم میں ایک قطرہ بول کرتا ہے۔اوراس کی چربی برقرار رہتی ہے۔ایام سرما میں زمین کی تہہ میں چلا جاتا ہےاوراپنے رہنے والے بل کا راستہ باہر سے بند کر دیتا ہے اورموسم گرما میں باہر آ جاتا ہے۔حضرت حاتم اصم کہتے ہیں۔

وَ كَيْفَ اَخَافُ الْفَقْرَ وَ اللّٰهُ رَازِقِیْ   وَ رَازِقُ هٰذَا الْخَلْقِ فِی الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ
يَكْفَلَ بِالْاَرْزَاقِ لِلْخَلْقِ كُلِّهِمْ   وَ الضَّبُ فِی الْبَيْدَاءِ وَ الْحُوْتُ فِی الْبَحْرِ

ترجمہ۔میں بھوک سے کیوں ڈروں، جب کہ خدا میرا رزاق ہے۔اوروہ رزاق ہےمخلوق کا تنگی اورآسانی میں۔ مخلوق کے رزق کا وہ ضامن ہے۔اوروہ رازق ہےسوسمار کا چٹیل میدانوں میں اورمچھلیوں کا سمندر کے اندر۔

عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ الاَسْوَدُ عَنْ عَائِشَةَ اُهْدٰى لَهَا ضَبٌّ فَسَالَتِ النَّبِىَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمُ هَلْ يَحِلَّ اَكْلَه‘ فَنَهٰى هَا عَنْ اَكْلِهٖ فَجَاءَ سَائِلٌ فَاَمَرَتْ لِلْسَائِلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمُ اَنَظْعَمِيْنَ مَا لَا تَاْكُلِيْنَ (مسند امام اعظم ص۵۱) ترجمہ۔یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بطور ہدیہ ایک سوسمار لایا گیا،تو آپ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ کیا اس کا کھانا حلال ہے۔تو آپ نے اس کے کھانے سے منع فرمایا۔پھرایک سوالی آیا،تو حضرت عائشہؓ نے اس سوالی کو وہ سوسمار دینے کے لئے امر فرمایا۔اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو دوسروں کو وہ چیز کیوں کھلاتی ہو،جس کوتو خودنہیں کھاتی۔

وجہ حرمت گدھا وخچر اور جو حیوانات ان کی مانند ہیں

وہ حیوانات جونجاستوں اور ناپاکیوں میں اپنی زندگی بسر کرتے ،ان میں رہتے اور وہی کچھ کھاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بدن ان گندگیوں سے بھرے رہتے ہیں، مثلاً گدھا۔ یہ جانور حماقت و بیوقوفی وذلت میں ضرب المثل ہے۔ جوشخص بیوقوفی وحماقت کا کام کرتا ہے،اس کو گدھے کا خطاب ملتا ہے۔پس جوکوئی ایسے جانور کھائے، وہ بالضرور ذلت اور حماقت و بے وقوفی و بےتمیزی میں گدھے کی مانند ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ اکثر اہل عرب ،جن کی طبائع سلیمہ تھیں، اس کوحرام سمجھتے اورشیاطین کے ساتھ مشابہت دیتے تھے۔جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اذا سمعتم نهيق الحمار**

فتعوذوا باللہ من الشیطان فانہ رایٰ شیطانا ۔ترجمہ۔یعنی جب تم گدھے کی آواز سنو،تو خداتعالیٰ کے پاس شیطان سے پناہ لو۔اس لئے کہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے۔ بلاشبہ یہ جانور مزاج نوع انسان کے مخالف ہے۔لہٰذا طب کے اعتبار سے بھی اس کا گوشت نہ کھانا چاہیئے۔رسول خداصلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک ایسے جانور کے کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے، جونجاست کھاتا ہے۔اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جب کہ اس کے اعضاء نے نجاست کو جذب کر لیا اور وہ اس کے اجزاء میں پھیل گئی،تو اس کا حکم مثل نجاست یا اس جانور کے ہو گیا، جونجاست میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔گدھا شیطان کو دیکھ کر رینگتا ہے۔عرب کے پاکیزہ اور زکی الفطرت لوگ اس کو حرام جانتے تھے۔زیادہ تر اس کی حرمت کی وجہ اس کے خصائل مذمومہ ہیں، ورنہ نجاست تو استحالہ سے پاک ہو جاتی ہے۔

وجہ پیدائش جانوران واشیائے حرام

سوال۔ جب کہ بعض جانوروں اور بعض اشیاء کے کھانے سے انسان کو منع کیا گیا ہے اور ان کو اس پر حرام ٹھہرایا گیا ہے،تو پھر خداتعالیٰ نے ان کو پیدا ہی کیوں کیا ہے۔وہ کس کام آتے ہیں؟

جواب۔(۱) خداتعالیٰ فرماتا ہے۔**هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً** ۔یعنی تمہارا پروردگار وہ ہے، جس نے پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمام وہ چیزیں اور جانور جو زمین پر ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ خداتعالیٰ نے تمام حلال وحرام چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا کی ہیں۔اس لئے کہ اگر کسی چیز کا استعمال ایک وجہ سے حرام ہے،تو دوسری وجہ سے حلال ہے۔دیکھو گدھے کا کھانا حرام ہے، مگر اس پر سواری کرنا اور اس پر بوجھ لادنا حلال ہے۔ایسا ہی تمام درندہ جانوروں کا کھانا حرام ہے، مگر ان کے چمڑے کی پوستین بنا کر پہننا اور ان کی چربی زخموں اور اعضائے ماؤفہ کو لگانا حلال ہے۔ایسا ہی اور حرام جانوروں اور اشیائے محرمہ کے متعلق سمجھ لو کہ من وجہ ان کا استعمال حرام ہے اور من وجہ حلال ہے۔

(۲) محرمات خداتعالیٰ کی باڑ ہیں۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **اَلَا لِكُلِّ مَلِكٍ حِمیً وَ اِنَّ حِمَی اللهِ تَعَالیٰ مُحَارِمَه'** ۔ترجمہ،سنو ہر ایک بادشاہ کی باڑ ہوتی ہے اور خداتعالیٰ کی باڑ اس کے محرمات ہیں۔

وجہ حرمت حیوانات واشیاء محرمہ

تمام جانور، جو حرام کئے گئے ہیں، ان کی وجوہ حرمت درج ذیل ہیں۔

(۱) خباثت وگندگی کی وجہ۔ چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ مَارَزَقْنَاكُمْ وَ**

لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِىْ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِىْ فَقَدْ هَوٰى ۔ترجمہ۔یعنی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تم کو دی ہیں اوران میں زیادتی نہ کرو۔ ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوگیا، وہ گر گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ خبائث کو کھانے سے انسان مغضوب الٰہی بن جاتا ہے۔ طغیانی کے معنے اس جگہ یہ ہیں کہ طیبات سے آگے نہ بڑھو اور خبائث کو نہ کھاؤ۔

(۲) درندگی کی وجہ۔ یعنی ایسے جانوروں کے کھانے سے انسان درندہ طبع بن جاتا ہے۔

(۳) زیادہ تر شیطانی امور سے مشابہت کی وجہ۔

(۴) سمّیت کی وجہ۔ یعنی بعض جانور اور چیزیں زہردار ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔

(۵) بداخلاقی کی وجہ۔ یعنی بعض جانوروں کے کھانے سے انسان بداخلاق بن جاتا ہے۔

(۶) بد اعتقادی کی وجہ۔ یعنی بعض ایسے جانوروں و اشیاء کے کھانے سے انسان میں بد اعتقادی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

وجہ حرمت چھپکلی

اس جانور کو عربی میں خناز بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ مفردات راغب میں لکھا ہے۔ وَ فِىْ حَدِيْثِ عَلِىٍّ اَنَّهٗ قَضٰى قَضَاءً فَاعْتَرَضَ عَلَيْهِ بَعْضُ الْحَرَوْرِيَّةُ فَقَالَ لَهٗ اُسْكُتْ يَا خَنَازُ ۔ترجمہ۔ یعنی حضرت علیؓ نے ایک فیصلہ کیا، تو اس پر قبیلہ حروریہ کے ایک شخص نے اعتراض کیا، تو آپ نے فرمایا چپ رہ اے چھپکلی۔

خنّاز کا اشتقاق خنز سے ہے۔ خنز کے معنے فاسد و گندہ کے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ نے اس جانور کے نام میں ہی اس کی حرمت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے۔ اَلْخَنَازُ اَلْوَذْغَةُ وَ هِىَ الَّتِى يُقَالُ لَهَا سَامَ اَبْرَصَ ۔ترجمہ۔ یعنی عربی میں خناز کا دوسرا نام وزغ ہے۔ اور یہ وہی جانور ہے، جس کو عربی زبان میں سام ابرص بھی کہتے ہیں۔ سام ابرص اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ مجذوم کی طرح اس کے جسم پر داغ ہوتے ہیں۔ مخزن الادویہ میں لکھا ہے "اسم آں وزغ است ولیکن مصطلع آن است کہ بری آنرا سام ابرص و بلدی را وزغ مے نامند کہ بفارسی چلپاسہ مے نامند خوردن آں مورث سل و امراض ردیہ است"۔ اس کی حرمت کی وجہ ظاہر ہے کہ اس کے کھانے سے انسان مسلول و گرفتار امراض ردّیہ ہو جاتا ہے، جن کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ ہمارے ملک پوٹھوار میں اس جنگلی جانور کو رتّ مُنڈ یا اور گھروں میں رہنے والے کو کوہڑہ کرکلہ کہتے ہیں۔

مردار۔ مذبوحہ اہل کتاب۔ مذبوحہ بنام غیر اللہ۔ مردارِ شکار وغیرہ کا حرمت میں برابر ہونے کی وجہ

مذکورہ بالا امور پر حضرت ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ سوال و جواب لکھے ہیں۔ ہم ان کا ترجمہ یہاں پر درج کر دیتے ہیں۔

سوال ۔مردار مذبوحہ غیر اہل کتاب یعنی کافر، مردار شکار وغیرہ کی حرمت میں برابری کی کیا وجہ ہے۔ گویا سائل کا یہ خیال ہے کہ جب کہ مردار میں یہ خون جذب ہو جاتا ہے، تو وہ اس کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے۔ مگر غیر اہل کتاب اور **ما اھل بہ لغیر اللہ** (ترجمہ از مرتب۔ جو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ذبح کیا گیا ہو) کی ذبح سے خون جذب نہیں ہوتا، تو پھر اس سے کس طرح جانور حرام ٹھہرایا جاتا ہے؟

جواب ۔(۱) یہ بات غلط ہے اور جُہل ہے کہ مردار کی حرمت کا ایک ہی سبب خون کے جذب ہونے کو قرار دیا جائے۔ بلکہ حرمت مردار کی بہت سی وجوہات و اسباب ہیں۔ اگر صرف جذب خون کی وجہ سے حرمت مردار ہوتی، تو اس سوال کو وقعت ہوتی۔ مگر جبکہ حرمت مردہ جانور کے بہت سے اسباب ہوں، تو کسی ایک سبب کے نہ ہونے سے دوسرے اسبابِ حرمت کی نفی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس سبب معدوم کا کوئی اور سبب خلیفہ اور جا بجا ہو جاتا ہے، جس سے مردہ جانور کو حرام کہا جاتا ہے۔ اور یہ امر اسباب اور وجوہات عقلیہ میں بھی شمار نہیں ہے۔ پس حکم شریعت سے کیونکر انکار ہوسکتا ہے۔

سوال ۔کیا شریعت اسلامیہ نے دونوں قسم کے مردہ جانوروں میں برابری نہیں کی ہے، حالانکہ ان کی موت کے مختلف اسباب ہیں۔ گویا شریعت نے دو مختلف و متضاد باتوں کو جمع کیا اور دو متماثل اور مشابہ امور کو الگ کر دیا۔ کیونکہ ذبح کرنا درحقیقت ظاہری و حسی طور پر ایک قسم کا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ذبح کی بعض صورتوں سے حیوان کو مردار ہونے سے خارج کیا اور بعض صورتوں سے حیوان کو بغیر فرق کے مردار قرار دیا؟

جواب (۲) شریعت نے از روئے لغت دونوں مرداروں کے نام میں برابری نہیں رکھی، بلکہ ان کے اسمِ شرعی میں برابری رکھی ہے۔ پس مرُ دار کا نام شرع میں بہ نسبت لغت کے عام ہو گیا ہے اور شارع علیہ السلام کبھی لغوی ناموں میں نقل سے اور کبھی عمومیت سے اور کبھی خصوصیت سے تصرف کرتے ہیں اور اہل عرف بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس یہ بات شرع و عرف میں بُری نہیں ہے اور حرمت میں ان کو اس لئے یکساں ٹھہرایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم پر پلیدیاں حرام لکھیں۔ اور پلیدی، جو موجب حرمت

ہوتی ہے، اس کو کبھی شارع ظاہر فرماتا ہے اور کبھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ پس جو پلیدی ظاہر ہو، اس پر شارع نے بغیر وصف کے کوئی علامت نہیں رکھی اور جو پوشیدہ ہو، اس پر علامت رکھ دی، جو اس کی خباثت پر دلالت کرے۔ پس مردار میں جذب خون کا ظاہر سبب موجود ہے اور مجوس اور مرتد اور تارک تسمیہ کی مذبوحہ اور جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، ایسے مذبوحہ جانوروں میں خباثت اور پلیدی سرایت کر جاتی ہے، جو کہ موجب حرمت مذبوحہ ہے، اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مذبوحہ پر بتوں، جنوں۔ ستاروں وغیرہ کے نام لینے سے مذبوحہ پلید نہ ہو۔ ایک خدا تعالیٰ ہی کا پاک نام ہے، جو مذبوحہ کو پاک کرتا ہے۔ مگر جسکو حقائق علم و ایمان و ذوق شریعت سے بہرہ نہ ملا ہو وہ انکار کرے تو کچھ تعجب نہیں ہے۔

(۳) جن جانوروں پر خدا تعالیٰ کا نام بوقت ذبح نہیں لیا جاتا، ان کو خدا تعالیٰ فسق فرماتا ہے اور فسق پلید ہے۔ پس جہاں پلیدی ہو وہاں حرمت ضرور لاحق ہو جاتی ہے۔ **وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّه' لَفِسْقٌ** (انعام۔۸) اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کا پاک نام مذبوحہ کو پاک کرتا ہے اور ذبح کرنے والے اور مذبوح جانور سے شیطان کو دور کر دیتا اور ہٹا دیتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کا نام مذبوح پر نہ لیا جائے، تو ذبح کرنے والے اور مذبوح جانور میں شیطان سرایت کر جاتا ہے۔ اور شیطان کی خباثت جانور میں تاثیر کرتی ہے۔ کیونکہ شیطان جانور کے خون کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور خون ہی کے مقامات میں اس کا مقام ہے۔ خون ہی شیطان کی سواری ہے اور وہی اس کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِیْ مِنْ بَنِی آدَمَ كَمَجْرَی الدَّمِ** یعنی شیطان بنی آدم میں اس کے رگ و ریشہ اور خون کے جاری ہونے کے مقامات میں رہتا ہے اور وہ سب پلیدیوں سے بڑھ کر ہے۔ پس جب ذبح کرنے والا خدا تعالیٰ کا نام لیتا ہے، تو شیطان خون کے ساتھ ہی خارج ہو جاتا ہے اور مذبوحہ پاک ہو جاتی ہے۔ اور اگر اللہ پاک کا نام نہ لیا جائے، تو وہ پلیدی خارج نہیں ہوتی اور جب خدا تعالیٰ کے دشمن شیطان و بتوں کا نام مذبوحہ پر لیا جائے، تو مذبوح میں پلیدی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

(۴) ذبح کرنا قائم مقام عبادت الٰہی ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے دونوں کو جمع کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ. قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن. وَالْبُدْنَ جَعَلْنَا هَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوْا اِسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافّ فَاِذَا وَاجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ. كَذَالِكَ سَخَّرْنَا هَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْن. لَنْ يَّنَالُ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَادِمَاءُ هَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰیْ مِنْكُمْ** ۔

خدا تعالیٰ نے بتا دیا کہ ہم نے ان جانوروں کو ان لوگوں کے لئے مسخر کیا اور حلال ٹھہرایا، جو ان پر خدا تعالیٰ کا نام لیکر ان کو ذبح کریں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو تو انسان سے تقویٰ منظور ہے۔ جس سے مراد خدا تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کر کے اس کا قرب چاہنا اور وقت ذبح جانوروں پر خدا کا نام لینا ہے۔ اور جب وقت ذبح حیوانات پر خدا تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے، تو ان کا کھانا منع اور ناپسند ہے۔ کیونکہ اس مکروہ فعل سے ان مذبوح جانوروں میں پلیدی کا اثر ہو جاتا ہے۔ اور اگر مذبوح پر خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے،، تو وہ مذبوح مردار کی طرح ہو جاتا ہے۔ پس جبکہ تسمیہ ترک کرنے اور خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لینے سے مذبوح حرام ہو جاتا ہے، تو جس کو خدا تعالیٰ کا دشمن ذبح کرے، جو ناپاک مخلوقات ہے، اس کی مذبوح بالاولیٰ حرام ہوگی۔ کیونکہ ذبح کرنے والے کا فعل وارادہ اور اس کی خباثت بالضرور مذبوح میں مؤثر ہوتی ہے۔ جیسا کہ ناکح یعنی نکاح کرنے والے کی پلیدی اور اس کا وصف وفعل اور اس کا ارادہ عورت منکوحہ کو مؤثر ہوتا ہے۔ یہ وہ حقائق شریعت ہیں کہ جن کے سینے نور شریعت سے روشن ہیں، وہ ان کی بخوبی تصدیق کرتے ہیں۔

جبکہ غیر مذبوح جانور کا خون گوشت میں جذب ہو کر گوشت ہی بن جاتا ہے، تو پھر اس کی حرمت کی کیا وجہ ہے؟

یہ بات کہ بعد مرگ خون گوشت میں جذب ہو جاتا ہے یا بعد استحالہ گوشت بن جاتا ہے، اس لئے یہ گذارش ہے کہ مستحیل ہونے کے لئے تو قوت ہاضمہ اور قوت محیلہ یعنی اس قوت کی ضرورت ہوتی ہے، جس کا یہ کام ہے کہ ایک شے کو دوسری کی طرف مستحیل کر دے۔ اور ظاہر ہے کہ بدن کی سب قوتیں مثل قوت باصرہ وغیرہ قوائے حیوانی حیات کے ساتھ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اعضائے حیوانی مثل چشم وگوش وغیرہ ان قوا کے لئے ایسے ہیں جیسے آئینہ نور کے لئے، یعنی قابل اور منفذ ہیں، جیسے اصل نور آئینہ میں نہیں ہوتا، بلکہ آفتاب میں ہوتا ہے۔ ایسے ہی اصل قوائے حیوانی نفوس حیوانی میں ہوتے ہیں اعضاء میں نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے آئینہ بے امداد آفتاب نور کے حساب سے بیکار ہے، ایسے ہی ابدان حیوانی بے عنایت روحانی قویٰ حیوانی کے حساب سے بیکار ہیں۔ اس صورت میں بعد مرگ استحالہ ممکن نہیں۔ ہونہ ہو جذب ہی ہوگا، جو بعد مرگ کاٹو تو خون نہیں نکلتا اور جذب ہوا، تو پھر ناپاکی یقینی ہے۔

حلّت بیضہء مرغی کی وجہ

آج مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۹ء بتقریب نماز جمعہ میرے ایک بھائی نے مجھ سے بیضہ ماکیان کی حلّت

اوراس کی وجہ حلّت کا سوال کیا۔ لہٰذا تقریر جانبین بطور سوال و جواب درج کی جاتی ہے، جس سے حلّت بیضہ اوراس کی وجہ حلّت واضح ہوگی۔

سوال۔ بیضہء مرغی کی حلت کی دلیل آپ کے پاس کوئی ہے۔

جواب راقم۔ کیا حلت مرغی کی دلیل آپ کے پاس کوئی ہے۔

جواب۔ ہاں حدیث سے ثابت ہے کہ مرغی حلال ہے۔ چنانچہ ترمذی میں یہ حدیث لکھی ہے۔

عَنْ زهدم عَنْ اَبِی مُوسٰی قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْکُلُ لَحْمَ دَجَاجٌ.

یعنی ابی موسیٰ راوی ہے کہ میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ آپ مرغی کا گوشت کھا رہے تھے۔ علاوہ ازیں صحیح مسلم میں حلت انڈا کے متعلق صریح حدیث آچکی ہے۔ دیکھو صحیح مسلم میں نماز جمعہ کے لئے سب سے آخر میں آنے کے ثواب کو ایک انڈے کی قربانی دینے والے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی ہے۔

ا۔ جواب راقم۔ یہی دلیل حلت بیضہ ہے یعنی بیضہ اس لئے حلال ہے کہ مرغی حلال ہے، کیونکہ وہ مرغی جیسی حلال چیز کا ہوتا ہے۔

سوال۔ مرغی کے کئی ناپاک و مکروہ اجزا ہوتے ہیں، جن کو کھایا نہیں جاتا۔ مثلاً مرغی کی بیٹ، مرغی کی انتڑیاں، مرغی کی ٹانگیں۔ کیا یہ چیزیں کھانے کے لائق ہیں؟ جیسا مرغی کی یہ چیزیں مکروہ ہیں، ایسا ہی مجھے انڈا بھی مکروہ نظر آتا ہے۔

جواب راقم۔ خدا نے انسان کو جیسا کہ بعض حواس اشیائے تلخ و شیرین، کھٹی میٹھی، سیاہ، سفید وغیرہ وغیرہ اشیاء کی دریافت کے لئے زبان وآنکھیں دی ہیں، ایسا ہی اس نے انسان کو خبائث و طیبات کی شناخت کے لئے دل میں ایک قوّت وحِسّ عطا کی ہے۔ اس سے وہ خبائث و طیبات میں تمیز کرلیتا ہے۔ **اِنَّ اللہَ حَرَّمَ الْخَبَائِثُ وَ اَحَلَّ الطَّیِبَاتُ** ۔ (ترجمہ از مرتب) اللہ تعالیٰ نے خبائث کو حرام اور طیبات کو حلال کیا ہے۔

۲۔ بیضہ طیبات سے ہے، اس لئے حلال ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیضہ کی مثال طیبات کے ساتھ دی ہے۔ اگر بیضہ خبائث و مکروہ اشیاء میں سے ہوتا، تو اس کی مثال طیبات سے قرآن کریم میں نہ آتی۔ **کَاَنَّھُنَّ بَیْضٌ مَکْنُوْنٌ** ۔ اطباء کے نزدیک بیضہ ماکیاں بہترین غذا ہے۔ چنانچہ مخزن الادویہ میں لکھا ہے۔ بیضہء مقوی دل و دماغ و بدن و ملبہی است و سریع الہضم جید الغذا است۔

سوال۔ بیضہ کے کھانا سے بظاہر طبیعت کو کراہت آتی ہے، کیونکہ یہ پختہ گوشت کی طرح نہیں

ہوتا، بلکہ اپنی خام حالت میں گویا نطفہ کی حالت میں ہوتا ہے۔اس لئے اس کی حلّت میں مجھے تر دد ہے۔ کیونکہ کسی جانور حلال کا بھی نطفہ کھانا جائز نہ ہوگا۔

۳۔جواب۔ہم کہاں کہتے ہیں کہ بیضہ نطفہ کی حالت میں ہوتا ہے، بلکہ بیضہ جب ہی بیضہ کہلاتا ہے کہ وہ نطفہ کی حالت سے نکل کر بیضہ بن جاتا ہے اور جنین کی حلّت پر گویا آ جاتا ہے۔اور بیضہ کی پہلی حالت جنین ماکیان کی شکم میں سے شروع ہوتی ہے اور باقی باہر آ کر کامل ہوتی ہے۔اور خدا تعالیٰ نے سورہء انعام پارہ ہشتم میں حلال مادہ مواشی کے شکم میں جو جنین ہوتے ہیں، وہ حلال فرمائے ہیں۔لہٰذا بیضہ کو بھی اسی پر قیاس کرلو۔

۴۔وجہ اس قیاس کی صحت کی یہ ہے کہ قرآن کریم استدلال بالاولیٰ سے کام لیتا ہے۔وہ ایک قسم یا ایک جنس یا ایک حالت کی اشیاء کی حلت کا حکم و وجہ بیان کر دیتا ہے،تو پھر باقی اس رنگ و حالت کی اشیاء کی حلّت اس سے ثابت ہو جاتی ہے۔

۵۔مرغی طیر ماکول اللحم سے ہے اور طیر سباع سے نہیں ہے۔چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایسے طیر کا ذکر قرآن کریم میں بہشتیوں کے کھانوں میں کیا ہے۔وَلَحْمِ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُوْن ۔(ترجمہ از مرتب۔ اور طیر کا گوشت،جسکی انکو اشتہاء ہوگی)لہٰذا ماکول اللحم طیر کے انڈے کو کون حرام یا مکروہ کہہ سکتا ہے۔

سوال۔اشیاء کی حلّت وحرمت اپنی رائے سے بیان کرنا منع بلکہ حرام ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَ هٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللهِ الْكَذِبَ ۔(ترجمہ از مرتب۔نہ کہو ایسی باتیں جو تمہارے زبانیں جھوٹ بولتی ہوں کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے،اس طریق سے تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوتے ہو)۔

جواب۔ہم نے کہاں اپنی رائے کا اظہار بغیر استدلال قرآن وحدیث کیا ہے۔ بلکہ ہم نے قرآن وحدیث کے استدلال پر اس کی حِلت بیان کی ہے۔اگر مرغی کی حِلت نصِ صریح نہ ہوتی،تو ہم اپنے رائے کا اظہار نہ کر سکتے۔اور ہر رائے و قیاس کی حرمت نہیں آئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ اس قیاس ورائے کو حرام کہا جاتا ہے، جس کی موافقت قرآن وحدیث سے نہ ہو سکے۔اور وہ ان دونوں سے مخالف ہو۔قرآن میں بھی خدا تعالیٰ نے ایسے ہی قیاسوں وتاویلات سے منع فرمایا ہے، جو قرآن اور اس کے رسول کی سنت واحادیث کے برخلاف ہوں یا وہ تاویلات علم الٰہی کے موافق نہ ہوں۔اگر مطلق قیاس واستنباط کو حرام کہو گے،تو پھر دین کے بہت سے امور کو تمہیں چھوڑنا پڑے گا،یعنی بہت سی ایسی اشیاء و احکام ہیں،جن کا استدلال واستنباط قرآن وحدیث سے ہوتا ہے،مگر بظاہر ان کا نام مذکور نہیں ہے۔

جانور کو حلق سے ذبح کرنے کی حکمت

۱۔ جانور کو حلق سے اس لئے ذبح کیا جاتا ہے کہ مجمع خون کا دل وجگر ہے اور خون کو اس جگہ سے نکالنے کی نزدیک تر یہی راہ ہے۔ اس واسطے طبیبوں کے یہاں مقرر ہے کہ اس جگہ کے مواد کو قے کرا کر نکالتے ہیں۔

۲۔ اگر جانور کے بدن کا لہو کسی اور طرف سے نکالا جائے، تو جانور دیر سے مرتا ہے اور اس کو تکلیف بہت ہوتی ہے۔ اور حلق سے ذبح کرنے سے جلدی مرجاتا ہے۔

۳۔ سانس کی آمدورفت کی یہی راہ ہے۔ اور سانس ممدّ روح ہے۔ لہٰذا روح اور مرکب روح خون کو اسی راہ سے نکالنا مناسب ہے۔

۴۔ روح اور خون غذا سے پیدا ہوتے ہیں اور غذا اسی راہ سے جاتی ہے۔ لہٰذا روح وخون کو جدا کرنے کی مناسب راہ یہی ہے۔

۵۔ جو خون اوپر کو جاتا ہے روح بھی اس کے ساتھ جنبش کرتی ہے۔ اور حرکات زکاتی سے کدورت سے صفائی حاصل ہوتی ہے اور خباثت کم ہو جاتی ہے اور قابل اس امر کے ہوتا ہے کہ خاک بہشت ہو۔

۶۔ چونکہ حلق میں تمام رگیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور اعضائے باقیہ میں یہ بات نہیں ہے، تو تا مقدور جانور کو حلق سے ذبح کرنا ہی مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلق کاٹنے سے جانور جلدی مرجاتا ہے اور دوسرے اعضاء کاٹنے سے بدیر مرتا ہے۔ پس جب کہ دوسرے اعضاء کاٹنے سے حیوان دیر سے مرتا ہے اور اس کو زیادہ ایذا پہنچتی ہے، اس لئے حلق کا کاٹنا ہی افضل ٹھہرا۔

وجہ حلت مچھلی وٹڈی بغیر ذبح

۱۔ مچھلی اس وجہ سے ذبح نہیں کی جاتی کہ اس کے بدن کا اصل مادہ پانی ہے اور پانی بالطبع پاک اور پاک کرنے والا ہے۔ پس جیسے کہ نجاست پانی میں اثر نہیں کرتی، ایسا ہی آبی جانور کی روح جدا ہونے سے اس میں نجاست اثر نہ کرے گی اور حاجت ذبح کی نہ رہی۔ اور ٹڈی اس سبب سے ذبح نہیں کی جاتی کہ وہ خود بخود دبے تو الد وتناسل پیدا ہوتی ہے اور خون جاری نہیں رکھتی۔ اور تعلق اس کی روح کا بدن سے مثل تعلق روح پہاڑ و درخت و دیگر جمادات کے ہے، اور اس طرح کے تعلق کا جدا ہونا موجب نجاست نہیں ہوتا۔ اگر چہ تمام دریائی جانور اور تمام حشرات الارض اس علّت میں مشترک ہیں۔ لیکن وہ

بہ سبب ذاتی خباثت اور غذائے نجس کے مضر وحرام ہیں۔ بخلاف مچھلی وٹڈی کے کہ وہ ذاتی وعارضی خباثت سے پاک وسالم ہیں۔اسی واسطےان دونوں کے لئے خاص استثناء ہوا۔

۲۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ **اُحِلَّتْ لَنَا مَیْتَتَانِ وَ دَمَّانِ. اَمَّا الْمَیْتَتَانِ اَلْحُوْت وَالْجَرَاءُ وَالدَّمَانِ اَلْکَبَدُ وَ الطَحَالُ** ۔ترجمہ۔یعنی ہمارے لئے دومیتیں اوردوخون حلال کئے گئے ہیں۔ دومیتوں سے مراد مچھلی اورٹڈی ہیں اور دوخونوں سے مراد جگراورتلی ہیں۔ جگروتلی دوعضو ہیں اعضائے بہیمیہ سے، مگر یہ دونوں خون کے مشابہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شبہ کورفع کردیا، جوان سے پیدا ہوتا تھا۔

۳۔ مچھلی وٹڈی کے مذبوح نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ان میں دم مسفوح یعنی خوان رواں نہیں ہوتا۔ لہٰذاان کے لئے ذبح کرنا مشروع نہیں ہوا۔

وجہ حلت شتر۔گائے۔بیل۔گاؤمیش۔بھیڑ۔بکری۔دنبہ

ا۔ یہ سارے جانور دراصل مزاج انسانی کے موافق اورستھرے ومعتدل المزاج ہوتے ہیں۔ اسلئے حلال ٹھہرائے گئے ہیں۔ان جانوروں کوخداتعالیٰ نے **بھیمۃالانعام** فرمایاہے۔انکے نام میں لفظ انعام نعمت الٰہی کی طرف اشارہ ہے، جوخداتعالیٰ کی طرف سے بندوں کیلئے سراسرنعمت ہیں۔نعمت میں ہرپہلو سے نظافت ولطافت وصفائی ہوتی ہے۔اسکا کوئی جزو بے کارنہیں ہوتا۔ دنیا میں زیادہ ترانہیں جانوروں کا گوشت بنی آدم استعمال کرتے ہیں۔فطرت انسانی اس امرکی مقتضی ہے کہ جیسا کہ بنی آدم کی خورک کا کچھ حصہ بناتات سے ہوتا ہے،ایسا ہی کچھ حصہ اسکا حیوانات سے ہواوراسکی خوراک کیلئے حیوانات بھی وہ مقرر ہونے مناست تھے، جواسکے مزاج کے موافق ہوں۔لہٰذا خداتعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔

۲۔ جبکہ انسان جامع جلال وجمال ہے،تو اسکی خوراک میں جمال وجلال دونوں کا ہونا مناسب تھا۔لہٰذاانسان کی خوراک کیلئے وہ جانور مقرر ہوئے،جن میں جمال وجلال ہردوصفات موجود ہیں۔

وجہ حلت ہرن۔گورخر۔خرگوش۔شترمرغ

وہ جانور جوجنگل میں رہتے ہیں اور بہیمۃ الانعام کے مشابہ ہیں، وہ سب حلال ہیں، کیونکہ ان میں بہیمۃ الانعام کے پاک وستھرے اوصاف موجود ہیں۔اوروہ مزاج انسان کے موافق ومطابق ہیں۔ مثلاً ہرن۔گورخر۔شترمرغ وغیرہ۔ایک دفعہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کوکسی شخص نے بطور ہدیہ کے گورخرکا گوشت بھیجا،تو آنحضرتؐ نے اس کوقبول فرماکرتناول کیا۔

وجہ حلت مرغ و مرغابی۔ بط۔ چڑیا۔ کبوتر۔ بٹیر و مانند آں

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مرغی کا گوشت تناول فرمایا ہے اور باقی تمام مؤخر الذکر جانور مرغی کی مثل ہیں۔ ان میں مرغی کے اوصاف موجود ہیں۔ لہٰذا یہ اس کی طرح پاک چیزیں ہیں۔ مرغ کی خاصیت ہے کہ فرشتہ کو دیکھ کر بانگ کہتا ہے۔ ان پرندوں کا گوشت مزاج انسانی کے موافق و مفید ہے، لہٰذا حلال ٹھہرے۔ یہی وجہ ہے کہ مرغ وغیرہ اس قسم کا کوئی پرند خواب میں دیکھا جائے، تو اس سے مراد عالی ہمت، پاکیزی نفس، اور جہیر الصوت شخص ہوتا ہے۔

بہشت میں حلت شراب کی وجہ

سوال۔ شراب جو دنیا میں بھی ممنوعات اور محرمات میں سے ہے، وہ کیونکر بہشت میں روا ہو جائیگی؟

جواب۔(۱) خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بہشتی شراب کو اس دنیا کی فساد انگیز شرابوں سے کچھ مناسبت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بہشتی شراب کی صفت یوں لکھی ہے۔ **وَ سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَاباً طَهُوراً. اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْراً. عَيْناً يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْراً** ۔ترجمہ۔یعنی جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، ان کا خدا ان کو پاک شراب پلائیگا، جو ان کو کامل طور پر پاک کر دے گی۔ نیک لوگ وہ جام پئیں گے، جس میں کافور کی آمیزش ہے۔ یعنی ان کے دل وہ شراب پی کر غیر کی محبت سے بکلی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ وہ کافوری شراب ایک چشمہ ہے، جس کو اسی دنیا میں خدا کے بندے پینا شروع کرتے ہیں۔ وہ اس چشمہ کو ایسا رواں کر دیتے ہیں کہ نہایت آسانی سے بہنے لگتا ہے اور وسیع اور فراخ نہریں ہو جاتی ہیں۔ یعنی ریاضات عشقیہ سے سب روکیں ان کی دور ہو جاتی ہیں۔ اور نشیب و فراز بشریت کا صاف اور ہموار ہو جاتا ہے۔ اور جناب الٰہی کی طرف انقطاع کلی میسر آ کر معارف الٰہیہ میں وسعت تامہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ کافوری آمیزیش والی شراب ہوگی، اس کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو لوگ حقیقی نیکی کرنے والے ہیں ان کو وہ جام پلائے جائیں گے، جن کی ملونی کافور کی ہوگی، یعنی دنیا کی سوزشیں اور حسرتیں اور ناپاک خواہشیں ان کے دل سے دور کر دی جائیں گی۔

کافور کَفر سے مشتق ہے اور کفر لغت عرب میں دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے جذباتِ ناجائز دبائے جائیں گے اور وہ پاک باطن ہو جائیں گے اور معرفت کی خنکی ان کو پہنچے

گی۔ اور پھر فرماتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کو اس چشمہ کا پانی پیئں گے، جس کو وہ آج اپنے ہاتھ سے چیرتے یعنی کھودرہے ہیں۔ اس جگہ بہشت کی فلاسفی کا ایک گہرا راز بتلایا ہے، جس کو سمجھنا ہو سمجھ لے۔

پھر بہشتی شراب کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ. لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يَنزِفُوْنَ. لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْواً وَ لَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلاً سَلَامًا سَلَامًا. وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ . مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلَّ سَبِيْلاً۔ ترجمہ۔ یعنی وہ شراب صافی کے پیالے جو آبِ زلال کی طرح مصفیٰ ہوں گے بہشتیوں کو دیئے جائیں گے۔ وہ شراب ان سب عیبوں سے پاک ہوگی کہ دردسر پیدا کرے یا بیہوشی اور بدمستی اس سے طاری ہو۔ بہشت میں کوئی لغو اور بیہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی اور نہ کوئی گناہ کی بات سنی جائیگی۔ بلکہ ہر طرف سلام سلام جو رحمت اور محبت کی نشانی ہے سننے میں آئیگا۔ اس دن مومنوں کے منہ تر و تازہ اور خوبصورت ہوں گے اور وہ اپنے آپ کو دیکھیں گے۔ جو شخص اس جہاں میں اندھا ہے، وہ اس جہان میں بھی اندھا ہوگا، بلکہ اندھوں سے بھی گیا گذرا۔

اب ان تمام ایات مذکورہ بالا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ بہشتی شراب دنیا کی شرابوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ وہ اپنی تمام صفات میں ان شرابوں سے مبائن اور مخالف ہے اور کسی جگہ قرآن شریف میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ وہ دنیوی شرابوں کی طرح انگور سے یا قندسیاہ سے اور کیکر کے چھلکوں سے یا ایسا ہی کسی اور دنیوی مادہ سے بنائی جائے گی۔ بلکہ بارہا کلام الٰہی میں یہی بیان ہوا ہے کہ اصل تخم اس شرب کا محبت اور معرفت الٰہی ہے، جس کو دنیا ہی سے بندہ مومن ساتھ لے جاتا ہے۔

چونکہ محبت الٰہی کو شراب سے تشبیہ دینا اور استعارۃً شراب کہنا عارفوں کے نزدیک متعارف و مروج تھا۔ اس لئے خدا نے محبت الٰہی کے ثمرہ و نتیجہ کو بھی پاکیزہ شراب کے پیرایہ میں ذکر فرمایا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ محبت الٰہی کو شراب کی تشبیہ میں بیان فرماتے ہیں۔

سَقَانِی الْحُبُّ كَاسَاتِ الْوَصَالِ　　　فَقُلْتُ لِخَمْرَتِیْ نَحْوِیْ تَعَال

یعنی شراب محبت الٰہی نے مجھے وصال الٰہی کے پیالے پلائے۔ پس میں نے شرب محبت کو کہا کہ میری طرف آجا۔

اور یہ بات کہ وہ روحانی امر کیونکر شراب کے طور پر نظر آجائیگا، یہ خدا تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے، جو عارفوں پر مکاشفات کے ذریعہ کھلتا ہے اور عقلمند لوگ دوسری علامات و آثار سے اسکی حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ روحانی امور کا جسمانی طور پر متمثل ہو جانا کئی مقامات پر قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ یہ بھی لکھا ہے کہ تسبیح و تقدیس الٰہی کی باتیں پھلدار درختوں کی طرح متمثل ہوں گی۔

اور نیک اعمال پاک وصاف نہروں کی طرح دکھلائی دیں گے۔

مثنوی

آب صبرت آب جُویٔ خلد شد	جُویٔ شیر خلد مہر تست وود
ذوق طاعت گشت جُویٔ انگبیں	مستی و شوق تو جویٔ خمر بیں
چوں سجودی بار کوعی مرد کشت	شد دراں عالم سجودِ او بہشت
چونکہ پرید از دہانش حمدِ حق	مرغ جنت ساختش رب الفلق
آں صفت در امرتو بود ایں جہاں	ہم در امرِ تست آں جوہا رواں
آں درختاں مرترا فرماں برند	کاں درختاں از صفات پا برند
چوں بامرِ تست اینجا ایں صفات	پس در امرِ تست آنجا آں جزات

۲۔ بہشتی شراب وشہد ودودھ وغیرہ کی حقیقت خدا تعالیٰ قرآن کریم کے ایک دوسرے مقام میں بالفاظ ذیل بیان فرماتا ہے۔ **مَثَلُ الْجَنَّۃُ الَّتِیْ وُعِدَا الْمُتَّقُوْن ، فِیْھَا اَنْھَارٌ مِنْ مَاءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ وَ اَنْھَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ یَتَغَیَّرُ طَعْمُہ‘ وَ اَنْھَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّۃٍ لِلشَّارِبِیْن، وَ اَنْھَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّیٰ.** ترجمہ۔ یعنی وہ بہشت، جو پرہیزگاروں کو دی جائیگی، اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے، اس میں اس پانی کی نہریں ہیں، جو کبھی متعفن نہیں ہوتا۔ اور نیز اس میں دودھ کی نہریں ہیں، جس کا مزہ کبھی نہیں بدلتا۔ اور نیز اس میں اس شراب کی نہریں ہیں، جو سراسر سرور بخش ہے، جس کے ساتھ خمار نہیں ہے۔ اور نیز اُس میں اُس شہد کی نہریں ہیں، جو نہایت صاف ہے، جس کے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔

اس جگہ صاف طور پر فرمایا کہ اس بہشت کو مثالی پیرایوں میں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی اس میں ناپیدا کنار نہریں ہیں۔ وہ زندگانی کا پانی، جو عارف دنیا میں روحانی طور پر پیتا ہے، اس میں ظاہری طور پر بھی موجود ہے۔ اور وہ روحانی دودھ، جس سے وہ شیر خوار بچہ کی طرح روحانی طور پر دنیا میں پرورش پاتا ہے، ظاہر ظاہر دکھائی دیگا۔ اور وہ خدا کی محبت کی شراب، جس سے وہ دنیا میں روحانی طور پر ہمیشہ مست رہتا تھا، اب بہشت میں ظاہر ظاہر اس کی نہریں نظر آئیں گی۔ اور وہ حلاوت ایمانی کا شہد، جو دنیا میں روحانی طور پر عارف کے منہ میں جاتا تھا، وہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دکھائی دیگا۔ اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی روحانی حالت کا اندازہ برہنہ دیکھے گا۔ اور خدا تعالیٰ بھی اس دن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آجائیگا۔ غرض روحانی حالتیں مخفی نہیں رہیں گی، بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔

۳۔شراب میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ایک نشہ، دوسرا سرور۔اوران دونوں میں باہم تضاد ہے۔ نشہ بیہوشی کا نام ہے۔کم نشہ ہوتو بیہوشی ہوتی ہے اور زیادہ ہوتا ہے تو سرور۔اور سرور کو ہوش لازم ہے۔ کیونکہ بیہوشی میں نہ رنج ہوتا ہے نہ راحت نہ غم نہ خوشی۔اس صورت میں ان دونوں کا اجتماع ایسا ہوگا، جیسا کہ تمام مرکبات عنصریات میں گرمی وسردی کا اجتماع ہوتا ہے۔مگر جیسے بایں وجہ کہ گرمی سردی باہم متضاد ہیں۔ایک شے کی تاثیر یہ دونوں نہیں ہو سکتے اوراس وجہ سے پانی اورآگ کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی بوجہ مذکور نشہ اور سرور شے واحد کا اثر تو ہو ہی نہیں سکتے۔خواہ یہی کہنا پڑیگا کہ نشہ کسی اور چیز کی خاصیت ہے اور سرور کسی اور چیز کی خاصیت۔اگر شراب میں وہ چیز نہ رہے، جس کی خاصیت نشہ ہے، بلکہ قدرت الٰہی کی چھلنی سے چھان کراس کو جدا کر دیں، تو پھراس صورت میں شراب فقط لذت اور سرور ہی رہ جائے گی۔اور بے شک ہر عاقل کے نزدیک وہ شراب حلال ہوگی۔

۴۔باعث حرمت شراب تمام عقلا اور قائلین حرمت کے نزدیک یہی نشہ ہے اوراہل اسلام اس کی حرمت کے جبھی قائل ہیں، جب تک اس میں نشہ ہو۔اگر شراب سرکہ بن جائے اور نشہ نہ رہے، تو وہ پھراس کے پینے میں تامل نہیں کرتے۔اِدھر قرآن وحدیث وفقہ میں بھی یہی وجہ مرقوم ہے۔بالجملہ وجہ حرمت وہ نشہ ہے اور چونکہ وہ ایک جدی چیز کے ساتھ قائم ہے اوراس وجہ سے اس کا جدا ہونا ناممکن ہے، تو درصورت جدائی فقط مادہ سرور ہی شراب میں باقی رہ جائیگا۔اور ظاہر ہے کہ شراب کو جو کوئی پیتا ہے، وہ بوجہ سرور پیتا ہے، بوجہ بیہوشی نہیں پیتا۔سوکلام اللہ میں لذت کا تو ثبوت ہے، جو مایہ سرور ہے اور نشہ کی نفی ہے، جو وجہ مخالفت تھی۔چنانچہ لفظ **لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَاثِيمٌ** اس پر شاہد ہے۔

۵۔دنیا میں نشہ کی چیزوں کی اسی وجہ سے ممانعت تھی کہ نشہ کے وقت احکام خداوندی ادا نہیں ہو سکتے۔سو یہ اندیشہ زندگانی دنیا تک ہی ہے۔بعد مرگ تمام احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔بہشت میں ہر کوئی فرائض واجبات وغیرہ سے فارغ البال ہوگا۔وہاں اگر شراب حلال ہو جائے، تو کیا حرج ہے۔

بائیں ہاتھ سے کھانا وپینا منع ہونے کی وجہ

ا۔جیسا کہ ادویہ میں تاثیرات ہیں، ایسا ہی ہر عضو کے افعال میں خدا تعالیٰ نے جدا جدا اثر مودّع فرمائے ہیں۔دائیں ہاتھ کے افعال کو یمن وبرکت وشرافت وفضیلت وتقدم و پاکیزگی وفرحت و سرور وآسانی وسہولت سے مشابہت عطا ہوئی ہے۔لہٰذا جواُمور دائیں ہاتھ سے ہوں گے، ان کے آثار و نتیجے بھی ایسے ہی ظاہر ہوں گے، جیسا دائیں ہاتھ کے اوصاف ہیں۔اور بائیں ہاتھ کونحوست، دناءت۔ کمینگی، کمزوری، غموم وہموم ودکھوں سے مناسبت ہے، لہٰذا دائیں ہاتھ کے امور بائیں کو سپرد کرنے میں

ان کے نتیجے وآ ثار بھی ایسے ہی ظاہر ہوں گے، جو بائیں ہاتھ کے اوصاف میں خدا نے رکھے ہیں۔اسی لئے امر ہے کہ ہر فعل اپنے اپنے مناسب اعضاء سے لیا جائے۔ ورنہ نتیجہ اچھا ظاہر نہ ہوگا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاَمَّا مَن اُوْتِیَ کِتَابَہ' بِیَمِیْنِہٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَاباً یَسِیْراً وَ یَنْقَلِبُ اِلٰی اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا. وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَہ' وَرَاءَ ظَھْرِہٖ فَسَوْفَ یَدْعُوْ بِثُوْرًا وَ یَّصْلٰے سَعِیْراً. اِنَّہ' کَانَ فِیْ اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا ۔ترجمہ۔پس جس کواپنا عمالنامہ اپنے دائیں ہاتھ میں ملا، تواس کا حساب آسان لیا جائیگا اور وہ اپنے لوگوں میں خوش وخورم لوٹے گا۔اور جسکواپنا اعمالنامہ پیٹھ کے پیچھے سے ملا، وہ ہلاکت کو بلائے گا اور وہ آگ میں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ اپنے لوگوں میں خوش وخورم رہتا تھا۔

قیامت میں اعمالناموں کا دائیں و بائیں ہاتھوں یا پیچھے سے ملنا اپنے اپنے اوصاف مناسبہ کی وجہ سے ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا پینا منع ہے۔ کیونکہ بائیں ہاتھ سے کھانے و پینے سے عموم وہموم ودناءت کے اوصاف نفس میں پیدا ہوتے ہیں۔دائیں و بائیں طرف کے اوصاف خدا تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔وَ اَصْحَابُ الْیَمِیْنِ مَا اَصْحَابُ الْیَمِیْنِ فِیْ سِدْرٍ مَخْضُوْدٍ وَ طَلْحٍ مَنْضُوْدٍ وَ ظِلٍّ مَمْدُوْدٍ وَ مَاءٍ مَسْکُوْبٍ وَ فَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ لَا مَقْطُوْعَۃٍ وَ لَا مَمْنُوْعَۃٍ وَ فُرُشٍ مَرْفُوْعَۃٍ اِنَّا اَنْشَاْنَاھُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنَا ھُنَّ اَبْکَارًا عُرُباً اَتْرَ اً بِالْاَصْحَابِ الْیَمِیْنِ . وَ اَصْحَابُ الْشِّمَالِ مَا اَصْحَابُ الشِّمَالِ فِیْ سَمُوْمٍ وَ حَمِیْمٍ وَ ظِلٍّ مِنْ یَّحْمُوْمٍ لَا بَارِدٍ وَ لَا کَرِیْمٍ اِنَّھُمَّ کَانُوا قَبْلَ ذَالِکَ مُتْرَفِیْنَ وَ کَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلٰی الْحِنْثِ الْعَظِیْم . یَاکِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِؤُنَ مِنْھَا الْبُطُوْن فَشَارِبُوْنَ عَلَیْہِ مِنَ الْحَمِیْمِ فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْھِیْمِ ھٰذَا نُزُلُھُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۔ترجمہ۔اوردائیں طرف والوں کے اوصاف تو کیا جانتا ہے کہ کیسے ہیں وہ۔ رہتے ہیں درخت بیری کے نیچے، جس کے کانٹے جھاڑے ہوئے ہیں،اور درخت کیلے کے نیچے، جو تہ بر تہ ہےاور لمبی چھاؤں کے نیچےاور پانی بہائے ہوئے کے پاس، جہاں میوے کثیر اور دائمی اور غیر ممنوع ہیں۔اور ان کو عالی ذات عورتیں دی گئی ہیں۔ ہم نے وہ عورتیں ایک اٹھان پر بنائی ہیں۔ اور ان کو کنواریاں پیار دلاتیاں اور یکساں عمر کیا ہے۔ یہ سب کچھ دائیں طرف والوں کے واسطے ہے۔اور بائیں طرف والوں کے اوصاف تو کیا جانتا ہے کیا ہیں۔وہ آنچ کی بھاپ اور جلتے پانی اور دھوئیں دار گرم چھاؤں میں ہوں گے، جو نہ ٹھنڈی ہوگی اور عزت کی۔ یہ لوگ اس سے پہلے آسودہ تھےاور ضد کرتے تھے اس بڑے گناہ پر۔ اے بہکے ہوئے جھٹلانیوالو، تمہارا کھانا درخت سینڈھ سے ہوگا۔ اور اسی سے پیٹ بھروگے۔ پھر پیؤ گے اس پر جلتا پانی۔ پھر پیو جیسے اونٹ تونسے۔ یہ مہمانی ہوگی ان کے لئے انصاف کے

دن۔

واضح ہو کہ اصحاب الیمین واصحاب الشمال کو یہ مدارج ان کے اپنے ذاتی اعمال کی مناسبتوں سے ملے ہیں۔کیونکہ۔

مثنوی

چوں ز دستت زخم بر مظلوم رست — آں درختے گشت ازاں زقوم رست
چوں ز چشم آتش تو در دلہا زدی — مایہء نار جہنم آمدی
آتشت اینجا چو آدم سوز بود — آنچہ ازوے زاد مرد افروز بود
آتش تو قصدِ مردم میکند — نار کزدے زاد بر مردم زند
آں سخنہائے چو مارو گژدمت — مارو گژدم گشت و سیگر دوست
خشم تو تخم سعیر دوزخ است — ہیں بکشایں دوزخت را کاں فخ است
کشتن ایں نار نبود جز ز نور — نورک اطفا نارنا سخن الشکور
گر تو بے نوری کنی خامی بدست — آتشت زندست و در خاکستر است
آں تکلف باشد و روپوش ہیں — نار را نکشد بغیر نور دیں
تاز بنی نور دیں ایمن مباش — کانش پنہاں بود یک روز فاش

ســـوال ۔ جب کہ غذا، شربت، میوہ جات وغیرہ، جو دائیں ہاتھ سے کھائی جائیں، وہی بائیں سے کھائی جائیں، تو پھر ان کی تاثیرات جدا جدا کس طرح ظاہر ہو سکتی ہیں۔ جدا جدا تاثیرات تو جب ظاہر ہوں کہ جو خوراک وغذا دائیں سے کھائی جائیں، وہ بائیں سے نہ کھائی جائیں، بلکہ بائیں سے کچھ اور دائیں سے کچھ دیگر اشیاء کھائی جائیں۔ پس جبکہ ایک ہی چیز دونوں ہاتھوں سے کھائی جائے، تو ایک ہی چیز کے کھانے سے جدا جدا تاثیرات کیونکہ ظاہر ہوں گی۔

جـــواب ۔ (ا) گدھے، بیل، اونٹ، بکریاں، آدمی سب خدا تعالیٰ کی پیدائش ہیں۔ ایک ہی خوراک ان سب کو مثلاً چاول یا کنک وغیرہ کھلا کر تجربہ کرلو کہ ان سب کے گوبر اس ایک ہی خوراک کے کھانے سے جدا جدا اشکال وصورتیں اور جدا جدا تاثیرات لیکر باہر آئینگے۔ اگر سب انداموں واجسام کی تاثیرات یکساں ہوتیں، تو سب کی ایک ہی آخری صورت ہوتی اور سب میں سے ایک ہی قوت وطاقت کا ظہور ہوتا۔ اور سب اندا موں کا ایک ہی نام ہوتا۔ حالانکہ جو کام آنکھ دیتی ہے، وہ زبان نہیں دے سکتی، جو کام کان دیتے ہیں، وہ ہاتھ نہیں دے سکتے۔ اسی طرح جو کام دائیں ہاتھ سے نکلتا ہے اس کا ظہور بائیں ہاتھ سے کما حقہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے مقررہ قانون قدرت سے تجاوز کرنے سے برے

آ ثار ظاہر ہو جائیں، تو جائے تعجب نہیں۔

(۲) شریعت نے ظاہر کے لئے ایک باطن رکھا ہے۔ مثلاً ہر چیز کو دائیں ہاتھ سے لینے دینے کا حکم ہے۔ دائیں کو فارسی میں راست اور بائیں کو چپ، یعنی الٹا، عربی میں شمال کہتے ہیں۔ اس میں ایک نصیحت ہے کہ لین دین میں ہمیشہ راستی کو مدنظر رکھو۔ سید ہا دو۔ الٹے ہاتھ سے نہ دو اور نہ لو۔

(۳) ہر امر خیر کو دائیں جانب و دائیں ہاتھ سے ابتداء کرنے کا حکم اسلئے دیا گیا ہے کہ اس وجہ سے نفس میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اطاعت کا خیال اس میں پیدا ہوتا ہے۔ نفس جب اطاعت کی اس طرح بجا آوری کرتا ہے، جیسے مہتم بالشان امور کی کرتا ہے، تو اس سے اسکی توجہ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

(۴) جس کو اعتدال اور مرتبہ عدالت کی ورزش مقصود ہوتی ہے، وہ ہر چیز کو اس کا حق ادا کرتا ہے۔ کھانے اور پینے اور پاکیزہ چیزوں کے لئے دائیں ہاتھ کو اور نجاست دور کرنے کے لئے بائیں کو خاص کرتا ہے۔ یہی راز ہے کہ انخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب میں مینے دیکھا کہ مسواک کر رہا ہوں۔ اتنے میں دو شخص آئے۔ ان میں سے ایک بڑا تھا۔ میں نے مسواک چھوٹے کو دی۔ اس وقت مجھے کہا گیا کبّر کبّر یعنی بڑے کو دو۔ اس طرح خویصہ اور مخیصہ (مسعود کے دو بیٹوں کا نام ہے) کے قصہ میں آپ نے فرمایا بڑے کو پہلے گفتگو کرنے دو۔

(۵) حدیث شریف میں آیا ہے۔ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَاْکُلُ بِشَمَالِہٖ۔ یعنی شیطان بائیں ہاتھ سے کھایا کرتا ہے۔ اور ایسے ہی اور جگہ پر بھی شیاطین کی طرف بعض افعال کی نسبت کی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیاطین کو خدا تعالیٰ نے قدرت دی ہے کہ خواب میں یا بیداری کی حالت میں لوگوں کے سامنے ایسی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں، جو ان کے مزاجوں کے موافق ہوتی ہیں۔ وہ شکلیں ان حالات کا مقتضا ہوا کرتی ہیں، جو سنتے وقت شیاطین پر طاری ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کا وجدان سلیم ہوتا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ شیاطین کی مزاجی حالت کی وجہ سے بدکاریاں اور ایسے ایسے کام سرزد ہوتے ہیں، جن میں سبکی اور تنگدلی پائی جایا کرتی ہے۔ ناپاکیوں سے وہ حالت قریب کر دیتی ہے۔ ذکر الٰہی میں ان کی وجہ سے سنگدلی ہوا کرتی ہے۔ جتنے انتظام پذیرا اور برگزیدہ ہیں، ان میں اس حالت کی وجہ سے ابتری ہوا کرتی ہے۔ بدکاریوں سے ہماری مراد ایسے افعال ہیں، جن سے لوگوں کے دل نہایت بیزار ہوں۔ سننے سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ وہ زبان سے ان افعال پر لعن طعن کریں۔ یہ لوگوں کا قدرتی طریقہ ہے جو صورت نوعیہ کے فیضان سے ان میں پیدا ہوا ہے۔ تمام فرقے اس میں برابر ہیں۔ ایسے آثار کسی قومی رسم و رواج کی پابندی یا کسی خاص مذہبی اثر سے نہیں ہوا کرتے۔ مثلاً اپنی شرمگاہ کو

ہاتھ سے گرفت کرنا، کودنا، ناچنا، اپنی دبر میں انگلی داخل کرنا۔ یا کسی چوپایہ پر سوار ہو کر اس کے دم کی طرف منہ کرنا۔ یا ایک پاؤں میں موزہ پہن کر دوسرا برہنہ چھوڑ دینا۔ ایسے ہی اور افعال ہیں، جن کو دیکھتے ہی ہر شخص لعنت و ملامت کرتا ہے۔ کنکریوں کو بیہودہ طور پر لوٹ پوٹ کرنا۔ بدنما طور پر ہاتھ پاؤں کو ہلانا۔ بہر حال خداوند کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان افعال کو منکشف کیا کہ یہ شیطانی مزاجوں کے میلان اور اقتضا سے ہوا کرتے ہیں۔ جب کسی کو خواب یا بیداری میں شیطان کی صورت نظر آتی ہے، تو ایسی حرکات اس میں ہوا کرتی ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو شیاطین اور شیطانی حالتوں سے گریز کرنا چاہئے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال اور صورتوں اور ان کی برائی کو بیان فرمایا اور ان سے محترز رہنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ قضائے حاجت کے وقت شیاطین آموجود ہوتے ہیں۔

(٦) عدالت کی صفت کا جب نشست و برخاست اور خواب و بیداری اور چلنے و پھرنے اور بولنے چالنے اور کھانے و پینے و بناس وشعار کی اوضاع کے ساتھ اعتبار کیا جاتا ہے، تو اس کا نام ادب ہوتا ہے۔ ایسے افعال اختیار کرنے سے انسان کے اندر ملائکہ کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ان کے برخلاف جو ہئیتیں و افعال اختیار کئے جاتے ہیں ان سے انسان کے اندر شیاطین کا مزاج پید ہو جاتا ہے۔ اسی باب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے اِنَّ الشَّیْطَانَ یَاْکُلُ بِشَمَالِہٖ۔ یعنی شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

برتن میں مکھی پڑنے سے اسکو اس میں ڈوبا دے کر نکالنے کی وجہ

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِیْ اَنَاءِ اَحَدَکُمْ فَلْیَغْمِسَنَّهُ کُلَّه‘ ثُمَّ لَیَطْرَحُهُ فَاِنَّ فِیْ اِحْدَ جَنَاحَیْهِ شِفَاءٌ وَ فِی الْاٰخِرِ دَاءٌ۔ ترجمہ، اگر تمہارے کسی برتن میں مکھی گر پڑے، تو مکھی کو اس میں ڈوبا دے کر پھر اس کو پھینک دو، کیونکہ اس کے ایک پَر میں شفاء اور دوسرے میں بیماری ہے۔

اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ مکھی اس پَر سے بچتی ہے، جس میں بیماری ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حیوان کے اندر اس کی طبیعت کو تدبیر بدن کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ طبیعت اکثر اوقات مواد موذیہ کو جو جزو بدن ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے، اعماق بدن سے اطراف بدن کی طرف دور کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اطباء جانوروں کی دم کھانے سے منع کرتے ہیں۔ اور مکھی اکثر اوقات خراب غذا، جو جزو بدن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کھاتی رہتی ہے۔ اور اس کی طبیعت اس مادہ

فاسد کو اس کے عضو خسیس یعنی پَر کی طرف پھینکتی رہتی ہے۔ پھر وہ عضو، جس میں یہ مادہ سمیہ ہوتا ہے، تالو کی طرف دفع ہوتا ہے اور یہی عضو وقت ہجوم تنگیوں کے مقدم ترین اعضاء کا ہوتا ہے۔ اور خدا کی حکمت ہے کہ جس چیز میں زہر رکھا ہے، تو اس میں تریاقیہ مادہ بھی رکھا ہے۔ الغرض ہر جانور کے زہر کا تریاق اسی جانور کے بدن میں خدا تعالیٰ نے رکھا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ سانپ کے زہر کا تریاق سانپ کے سر میں ہوتا ہے۔ ایسا ہی اور جانوروں کا ہوتا ہے۔ ورنہ اگر جانوروں میں زہر تو ہو، مگر ان میں تریاقی مادہ نہ ہو، تو کوئی جانور زندہ نہ رہ سکے۔ مکھی کے کاٹنے کا زہر بعض اوقات اور بعض غذاؤں کے کھاتے وقت محسوس اور معلوم ہوتا ہے۔ اور جس عضو کی طرف یہ مادہ لذاعہ دفع ہوتا ہے، اس کا حرکت کرنا معلوم ہوتا ہے۔

پانی و برتن میں سانس لینا و پھونکنا منع ہونے کی وجہ

عن ابی هریره قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا شرب احدکم فلا یتنفس فی الاناء فاذا اراد ان یعود فلینح الاناء ثم لیعد ان کان یرید ۔یعنی حضرت ابی هریرہؓ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے راوی ہیں کہ جب تم میں سے کوئی شخص پانی پینے لگے، تو برتن میں سانس نہ لے۔ اور پھر جب سانس لینا چاہے، تو برتن کو منہ سے ہٹالے۔ اور پھر جب پینے کا ارادہ کرے، تو برتن منہ سے لگائے۔ دوسری حدیث میں ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں **لم یکن رسول الله صلی الله علیه وسلم ینفخ فی الشراب** ۔یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں نہ پھونکتے تھے۔ اور ایسا ہی ایک اور حدیث میں حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں۔ **نفی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان ینفخ فی الاناء** ۔یعنی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے برتن میں پھونکنے سے منع فرمایا ہے (ابن ماجہ)

سانس کا پانی میں لینا یا پانی میں پھونکنا اس لئے منع ہوا کہ سانس تمام گندے بخارات لے کر باہر آتا ہے۔ اور پانی میں سانس لیا جائے یا پانی میں پھونکا جائے، تو ان متعفنہ بخارات سے پانی متاثر ہو جاتا ہے، جو اندر سے باہر آتے ہیں اور اس طرح سے وہی بخارات اندر چلے جاتے ہیں، جن سے حدوث امراض کا خطرہ ہے۔

انسان کے اندر آمد و رفت سانس گویا الٰہی مشین ہے، جس کے ذریعہ گندے اور متعفنہ مادے ہر دم باہر نکلتے اور تازہ ہوا اس کے اندر آتی رہتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ انسان کی صحت قائم رہتی ہے۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ "ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است و چوں بر مے آید مفرح ذات است"۔ یعنی ہر ایک سانس جو اندر جاتا ہے، وہ انسان کی زندگی کا مددگار ہے اور جب سانس باہر آتا

ہے،تو وہ روح کوخوش کرنے والا ہوتا ہے۔ الغرض اندر کے گندے ومتعفنہ بخارات و مادے جو سانس کے ذریعہ باہر آتے ہیں،ان کو کھانے پینے والی چیزوں میں سانس کے ذریعہ ڈالنا ممنوع ہوا کہ اس سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کے لئے گوشت کھانا کیوں جائز ہوا؟

انسان کو مثل شیر و چیتا، بھیڑیا وغیرہ کچلیوں کا عطا ہونا اس جانب مشیر ہے کہ اس کی اصلی غذا گوشت ہے۔ اوراہل عقل کے نزدیک یہ بات کم از اجازت نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کو جتنی چیزیں دی گئی ہیں، کسی نہ کسی کام کے لئے دی گئی ہیں۔ آنکھ، کان جیسے دیکھنے سننے کے لئے ہیں، اس لئے ان سے صاف عیاں ہے کہ یہ دیکھنے سننے کی اجازت ہے۔ ایسے ہی کچلیوں کو بھی خیال فرمالیجئے۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سارے حیوانات یکساں نہیں۔ ہر کسی کے گوشت میں جدا تاثیر ہے۔ لہٰذا جس جانور کا گوشت مفید ہوگا وہی جائز ہوگا۔ جس جانور کا گوشت مضر ہوگا بقدر مضرت ناجائز ہوگا۔ کیونکہ خداوند کریم کے امر ونہی و اجازت وممانعت آدمی کے نفع ونقصان کے لحاظ سے ہے، اپنے نفع ونقصان کے لحاظ سے نہیں۔ اسی لئے سؤر وشیر وغیرہ درندے بوجہ بداخلاقی کے قابل ممانعت ہوگئے اوران کا کھانا انسان پر حرام ہوگیا۔ تاکہ ان کے کھانے سے مزاج میں بدخلقی نہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ جیسے گرم غذا سے گرمی اور سرد سے سردی پیدا ہوتی ہے، ایسے ہی حیوانات کے کھانے سے ان کے مزاج کے موافق انسان میں اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

گوشت وترکاریاں کھانے سے انسان کے روحانی اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں

ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں اوراس بات کو دوبارہ یاددلاتے ہیں کہ غذا کا اثر جسم پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا غذا کا مزاج ہو۔ گرم غذا سے گرمی اور سرد سے سردی کا پیدا ہونا مسلم ہے۔ اسی طرح حیوانات کے کھانے سے انسانی اوصاف کا تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ مدام بقول وغلہ جات کے کھانے سے انسان میں نرمی وحلم ورحم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور گوشت کھانے سے اس میں شجاعت و جسارت وقوت غضبیہ کو تحریک ہوتی ہے۔ چونکہ انسان جامع جلال و جمال ہے، لہٰذا اس کے لئے بقول اور گوشت دونوں قسم کی غذائیں حلال ہوئیں۔ اگر انسان سے قوت غضبیہ بالکل مفقود ہو جائے، تو انسانی صفت سے محروم رہ جائے اوراس کے کئی امور خلل پذیر ہو جائیں۔ کہیں گرمی کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں سردی کی حاجت۔ کبھی تلخ ادویہ مفید ہوتی ہیں اور گاہے شیریں سے حاجت براری ہوتی ہے۔ جہاں تلخ ادویہ کے

ساتھ معالجہ کرنا ہو، وہاں شیریں اشیاء کا استعمال کرنا سراسر نقصان دہ وغیر مفید ہوگا۔ کبھی غصے وغضب سے ہی کام نکلتا ہے اور نرمی سے بگڑتا ہے اور گاہے نرمی ورفق وحلم سے معاملہ سنورتا اور غصہ وغضب سے خراب ہوتا ہے۔ اسی طرح اغذیہ کو سمجھ لو۔ مرچ جیسی تیز ونیم جیسی تلخ اشیاء اور قند جیسی شیریں چیزوں کا انسان کے لئے پیدا ہونا اس جانب مشیر ہے کہ انسان کو مدام ایک ہی چیز کا استعمال کرنا مضر ہے۔ گاہے تلخ اور گاہے شیریں۔ گاہے غلہ ومیوہ جات وسبزہ۔ اور گاہے رحم اور گاہے غضب کا برتاؤ کرے اور اسی طریق سے عدالت قائم رہ سکتی ہے۔

انسان میں قوت غضبیہ وحلم وغیرہ کی حکمت

انسان کی فطرت پر نظر کر کے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مختلف قویٰ اس غرض سے دیئے گئے ہیں کہ تا وہ مختلف وقتوں میں حسب تقاضا محل اور موقعہ ان قویٰ کو استعمال کرے۔ مثلاً انسان میں منجملہ اور خلقوں کے ایک خلق بکری کی فطرت سے مشابہ ہے اور دوسرا خلق شیر کی صفت سے مشابہت رکھتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ بکری بننے کے محل میں بکری بن جائے اور شیر بننے کے محل میں وہ شیر بن جائے۔ اور خدا تعالیٰ ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ ہر وقت ہر محل میں بکری ہی بنا رہے اور نہ یہ کہ ہر جگہ وہ شیر ہی بنا رہے۔ اور جیسا کہ وہ نہیں چاہتا کہ ہر وقت انسان سوتا ہی رہے یا ہر وقت جاگتا ہی رہے یا ہر دم کھاتا ہی رہے یا ہمیشہ کھانے سے منہ بند رکھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان اپنی اندرونی قوتوں میں سے صرف ایک قوت پر زور ڈال دے اور دوسری قوتیں، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملی ہیں، ان کو لغو سمجھے۔ اگر خدا نے انسان میں ایک قوت حلم اور نرمی اور درگذر اور صبر کی رکھی ہے، تو اسی خدا نے اس میں ایک قوت غضب اور خواہش انتقام کی بھی رکھی ہے۔ پس کیا مناسب ہے کہ ایک خدا داد قوت کو تو حد سے زیادہ استعمال کیا جائے اور دوسری قوت کو اپنی طرف میں سے بکلی کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ اس سے تو خدا پر اعتراض آتا ہے گویا اس نے بعض قوتیں انسان کو ایسی دی ہیں، جو استعمال کے لائق نہیں کیونکہ یہ مختلف قوتیں اسی نے تو انسان میں پیدا کی ہیں۔ پس یاد رکھو کہ انسان میں کوئی بھی قوت بری نہیں ہے، بلکہ ان کا بد استعمال برا ہے۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٍ فَمَنْ عَفٰى وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَى اللّٰهِ ۔ یعنی اگر کوئی تمہیں دکھ پہنچائے، مثلاً دانت توڑ دے یا آنکھ پھوڑ دے، تو اس کی سزا اسی قدر بدی ہے، جو اس نے کی۔ لیکن اگر تم ایسی صورت میں گناہ معاف کر دو کہ اس معافی کا کوئی نیک نتیجہ پیدا ہو اور اس سے کوئی اصلاح ہو سکے، یعنی مثلاً مجرم آئندہ اس عادت سے باز آ جائے، تو اس صورت میں معاف کرنا ہی بہتر ہے۔ اور اس معاف کرنے کا خدا سے اجر ملے گا۔

اس آیت میں دونوں پہلوؤں کی رعایت رکھی گئی ہے اور عفو اور انتقام کو مصلحت وقت سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ سو یہی حکیمانہ مسلک ہے، جس پر نظام عالم کا چل رہا ہے۔ رعایت محل اور وقت سے گرم اور سرد دونوں کا استعمال کرنا یہی عقلمندی ہے، جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ہم ایک ہی قسم کی غذا پر ہمیشہ زور نہیں ڈال سکتے، بلکہ حسب موقعہ گرم اور سرد غذائیں بدلتے رہتے ہیں اور جاڑے اور گرمی کے وقتوں میں کپڑے بھی مناسب حال بدلتے رہتے ہیں۔ پس اسی طرح ہماری اخلاقی حالت بھی حسب موقعہ تبدیلی کو چاہتی ہے۔ ایک وقت غصہ دکھلانے کا مقام ہوتا ہے، وہاں نرمی و درگذر سے کام بگڑتا ہے اور دوسرے وقت نرمی اور تواضع کا موقعہ ہوتا ہے اور وہاں رعب دکھلانا سفلہ پن سمجھا جاتا ہے۔ غرض ہر ایک وقت اور ہر ایک مقام ایک بات کو چاہتا ہے۔ پس جو شخص رعایت مصالح اوقات نہیں کرتا، وہ حیوان ہے نہ کہ انسان اور وہ وحشی ہے نہ کہ مہذب۔

قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ مخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ وہ محل اور موقعہ گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا۔ پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اندھوں کی طرح صرف گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو، بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے بخشنے میں یا سزا دینے میں۔ پس جو امر محل اور موقع کے مناست ہو وہی کرو۔

مذبوحہ کے شکم کا بچہ بغیر ذبح حلال ہونے کی وجہ

سوال۔ یہ جو حدیث میں مذکور ہے کہ جانور کا ذبح اس کے شکم والے بچہ کے لئے بھی کافی ہے خلاف اصول ہے، کیونکہ جو بچہ کسی مادہ جانور کا ذبح کے وقت اس کے شکم میں ہی مر جائے تو وہ مردار ہے کیونکہ اس کو ذبح نہیں کیا گیا۔ اور حلال جانور کا ذبح اسلام نے ضروری ٹھہرایا ہے۔

جواب (ا)۔ یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار کو حرام ٹھہرایا ہے یہی بات مذبوحہ کے شکم میں مرنے والے بچے کو مباح ٹھہراتی ہے، کیونکہ مذبوحہ کا شکم والا بچہ، جو بغیر ذبح شکم میں مر جائے، وہ مردار ہوتا تو آنحضرتؐ مچھلی اور ٹڈی مردہ کی طرح اس کے لئے ایک استثنائیہ کلمہ بیان فرماتے۔ یعنی جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مرداروں کو حرام فرما کر کہا کہ ان میں سے دو جانور خود بخود حلال ہیں، مچھلی اور ٹڈی۔ ایسا ہی آنحضرتؐ اس کے متعلق یوں فرماتے کہ مذبوحہ تو حلال ہے، مگر اس کے شکم کا بچہ مردار ہے۔ لیکن اس کے متعلق آنحضرتؐ نے کوئی استثناء نہیں فرمایا۔

(۲) شکم والا بچہ اس لئے حلال ہے کہ وہ اپنی ماں کے اجزا میں سے ہوتا ہے۔ اور ذبح اس کی ماں کے تمام اجزا پر واقع ہوتی ہے۔ پس ضروری نہیں کہ اس کے ہر ایک جز و کو ذبح کیلئے علیحدہ کیا جائے۔ جنین تو اپنی ماں کا ایک جز و ہے، جو کل کے تابع ہوتا ہے۔

سوال۔ یہ حدیث بدیں قیاس تم پر حجت ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **زکاۃ الجنین زکاۃ امہ۔** یعنی جنین کا ذبح اس کی ماں کو ذبح کرنا ہے اور اس سے مراد تشبیہ ہے، یعنی جنین کی ذبح بھی اس کی ماں کی ذبح کی طرح کرنی چاہئے۔ اور یہ بات اس امر پر دال ہے کہ جنین مباح نہیں ہوتا بغیر ذبح کی تشبیہ کے کہ جو اس کی ماں کی ذبح پر واقع ہوئی۔

جواب۔ یہ سوال پہلے ہی سوال کی طرح ہے۔ اس میں ایک ہی بات عاقل کے لئے کافی ہے کہ اگر تم حدیث پر غور کرو، تو ایسا سوال ہی نہ کرو گے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ ذیل ہیں۔ **عن ابی سعید قال قلنا یا رسول اللہ ننحر الناقۃ و نذبح البقرۃ وا لشاۃ وفی بطنھا الجنین. انلقیہ ام ناکلہ قال کلوہ ان شئتم فان ان ذکاتہ زکاہ امہ۔** ترجمہ۔ ابی سعید رضی اللہ عنہ راوی ہے کہ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم اونٹنی یا گائے یا بکری ذبح کرتے ہیں، تو اس کے شکم سے بچہ نکلتا ہے۔ کیا ہم اس کو پھینک دیں یا کھا لیا کریں۔ فرمایا کہ چاہو تو کھا لو، کیونکہ اس کی ماں کا ذبح کرنا ہی اس کا ذبح ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنین کا کھانا مباح فرمایا اور سبب یہ بیان کیا کہ مذبوحہ کی ذبح ہی جنین کی ذبح کے لئے کافی ہے۔ یہاں نص و قیاس آپس میں متفق ہیں۔

بوقت ذبح جانور پر تکبیر پڑھنے کا راز

ا۔ ہر تاثیر کے لئے ایک مؤثر چاہئے اور ایک قابل آفتاب کی تاثیر سے جو آئینہ منور ہو جاتا ہے اور آتشین شیشہ میں آتشین شعاعیں آجاتی ہیں، تو ان دونوں صورتوں میں آفتاب مؤثر ہوتا ہے اور آئینہ اور آتشین شیشہ متاثر اور قابل۔ اگر ادھر آفتاب نہ ہو، تب یہ نورانیت، جو آئینہ میں آجاتی ہے اور یہ سوزش، جو آتشین شیشہ میں پیدا ہو جاتی ہے، ظہور نہ کرے۔ اور اگر ادھر آئینہ آتشین نہ ہو، تب بھی یہ نورانیت اور یہ سوزش ظاہر نہ ہو۔ اسی طرح تکبیر وغیرہ ذکر اللہ مؤثر ہیں۔ اور حیوانات معینہ قابل و متاثر۔ اگر مؤثر کی جانب بالکل خالی ہو یا بجائے ذکر اللہ کچھ اور ہو، جو موجب حلت مقصود نہیں اور اگر قابل کی جانب بالکل خالی ہو یا سوائے حیوانات معینہ اور کوئی حیوان ہو، تب بھی حلت متصور نہیں۔

۲۔ جب حکمت الٰہی نے انسان کے لئے ان حیوانات کو، جو زندگی میں بھی اسی کی مثل ہیں، مباح کر دیا اور ان حیوانات پر اس کو قدرت عطا فرمائی، تو واجب ہوا کہ ان حیوانات کی جان نکالنے کے

وقت اس نعمت سے غافل نہ ہو۔ اور غافل نہ ہونے کی یہی صورت ہے کہ خدا تعالیٰ کا نام اس پر ذکر کریں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ ترجمہ۔یعنی تا کہ خدا تعالیٰ کا نام لیں اس چیز پر، جو خدا تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی، چار پایوں میں سے۔

اہل عرب اور یہود تو ذبح اور نحر کیا کرتے تھے اور مجوس گلا مروڑ یا پیٹ پھاڑ کر کھا جایا کرتے تھے۔ ذبح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہمیشہ سے طریق چلا آتا ہے۔ اس کے اندر بہت سی مصلحتیں ہیں، جن میں سے ہم کچھ بیان کر چکے ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ ذبیحہ کو اس میں زیادہ تر تکلیف اور ایذا نہیں ہوتی۔ کیونکہ جان نکالنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے۔

۳۔ چونکہ غلہ، پھل وغیرہ نباتات کا بنی آدم کے لئے ہونا تو ظاہر تھا۔ کون نہیں جانتا کہ یہ چیزیں نہ ہوتیں، تو بنی آدم کیلئے زندگی محال تھی۔ البتہ حیوانات کا بنی آدم کیلئے ہونا اس وجہ سے مخفی تھا کہ بنی آدم کی طرح انکے بھی دست و پا و چشم و گوش وغیرہ اعضاء قویٰ انکے حق میں آلات انتفاع ہیں۔ پھر جیسے غلہ ، پھل وغیرہ نباتات بنی آدم کے کام آتے ہیں، ایسے ہی حیوانات بھی اس معاملے میں ہم سنگ بنی آدم نظر آتے ہیں۔ البتہ نباتات میں یہ بات نہ تھی۔ اس لئے ان کا تو پیدا کر دینا ہی کم از اجازت نہیں۔ اور حیوانات میں پیدا کرنے کے سوا اور اجازت کی ضرورت ہے، ورنہ ایذائے ذبح، جو اعلیٰ درجہ کی ایذا ہے، کیونکہ قتل ہی لاریب اعلیٰ درجہ کا ظلم ہوگا۔ اور کیوں نہ ہو ہماری تمہاری مِلک برائے نام مِلک ہے۔ جب ہماری مملوکات میں تصرف بے اجازت ظلم سمجھا جائے، تو خدا تعالیٰ کی مملوکات ومخلوقات میں تصرف بے اجازت ظلم کیوں نہ ہوگا۔ اسلئے اس کی اجازت کی ضرورت پڑی۔ مگر ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ مالک کی اجازت اس وقت متصور ہوگی، جب تصور کرنے والا مالک کو مالک سمجھتا ہو۔ اور اگر کسی اور کو سوائے مالک کے مالک سمجھ بیٹھے، تو بجائے اجازت بحکم غیرت مالک ممانعت ضرور ہے، علی ہذا القیاس انعام کی توقع اسی وقت ہوسکتی ہے، جبکہ حقوق مالکیت اسی کو ادا کئے جائیں۔ اور اگر بالفرض مالک کے حقوق کسی اور کو ادا کئے جائیں، تو اس وقت انعام کی جگہ الٹا مستحق سزا ہوگا۔ اس لئے بغرض رفع اشتباہ ذبح کے وقت مالکیت اور اجازت کا اعلان ضرور ہوگا۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسلام اور اہل کتاب کے مذہب میں وقت ذبح بسم اللہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بالجملہ وقتِ ذبح خدا کا نام لینا موافق عقل ضروری ہے۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کی حرمت کی وجہ

ذبیحہ کا کھانا خدا کی اجازت پر مبنی ہوگا۔ اگر یہ بات طے شدہ ہے تو پھر اعلان اجازت خداوندی ضروری ہے۔ تا کہ یہ وہم صورت حال ذبح سے نہ پیدا ہو کہ وہ خدا کی ذات کا محتاج نہیں یا قبل اجازت

خدا کے عمدہ عمدہ مملوکات میں خاطر خواہ تصرف کرسکتا ہے، جس سے اس کا ظالم ہونا اور خدا کی تحقیر نکلتی ہے۔ پھر اس پر اس اعلان میں یہ فائدہ ہوگا کہ خدا کا نام سن کر حیوانات کو بوجہ اس اعتقاد کے، جس سے خدا کی مالکیت اور اپنی مملوکیت کی نسبت ان کے دل میں ہونا ثابت ہو جائے، جان دینی سہل ہو جائے۔

القصہ خداوند عالم مالک الملک اور حیوانات متاع غیر نہ رہے۔ اس لئے اگر ان کا حلال ہونا وقت ذبح خدا کے نام لینے پر موقوف رکھا جائے اور غیر خدا کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو اگر حرام کھا جائے تو بجا ہے، کیونکہ مالک کو یہ گراں نہیں ہوتا کہ اس کی اجازت سے اسکی مملوکات میں تصرف کیا جائے۔ پھر بے اجازت تصرف کبھی گوارا نہیں ہوتا۔ اور اگر اجازت کے سوا یہ بھی پیش آ جائے کہ تصرف کرنے والا اس شئے کو کسی اور کے نام کہتا پھرے اور اس کے نام سے اس میں تصرف کرے، تو گوارا ہونا کجا الٹی سزائے بغاوت اس کے لئے تجویز کی جائے گی اور وہ چیز اس سے چھین لی جائے گی۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسلام ایسی ذبیحہ کو، جس پر غیر خدا کا نام بوقت ذبح لیا جائے یا غیر خدا کا سمجھ کر برائے نام خدا کے نام پر ذبح کیا جائے، حرام کہتے ہیں۔ اس تقریر سے تو وقت ذبح خدا کے نام لینے کی ضرورت اور غیر خدا کے نام لینے کی خرابی موجہ ہوگی۔ مگر ذکر نام خدا کی محبوبیت خداوندی پر مبنی ہونے کی ہنوز کیفیت معلوم نہیں ہوئی، لہٰذا واضح ہو کہ ذبح میں جان نثاری جاندار کی طرف سے اگر ہوتی ہے، تو محبوب اصلی کے لئے ہوتی ہے اور اس کا کوئی واسطہ دار اگر اس کی جان نثاری کرے، مثلاً باپ بیٹے کی جان نثاری کرے یا مالک کسی اپنے پلے ہوئے جانور کی جان نثاری کرے، تب اپنے محبوب اصلی کے لئے ہوتی ہے۔ نہ بے وجہ کوئی اپنی جان نثاری کرے، نہ اپنے واسطہ داروں کی جان نثاری کرے۔ اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ غیر محبوب کے لئے جان نثاری کی جائے۔ کیونکہ خداوند عالم تمام بنی آدم کا بھی محبوب اور حیوانات کا بھی محبوب۔ پھر محبت بھی کیسی، جیسے خدا کی محبوبیت۔ تمام وجوہ محبوبیت خدا میں خانہ زاد اور اصلی ہیں۔ اور غیر خدا میں اس سے مستعار۔ ایسے ہی خدا کی محبت بھی انسان اور حیوان کے حق میں ذاتی اور اصلی ہے خارجی اور عارضی نہیں، کیونکہ اپنی محبت خدا کی محبت پر موقوف ہے۔ اور اپنی محبت اوروں کی محبت کی طرح کسی طرح قابل زوال نہیں، اس لئے مستحق جان نثاری سوا اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اور یہ ہے تو پھر حیوانات کی وہ کیفیت، جس سے اکثر امور میں حیوانات کا ہم سنگ بنی آدم ہونا ثابت ہو چکا ہے، اس بات کا مقتضی ہے کہ براہ محبت ان کی جان نثاری کی جائے تو خدا ہی کے لئے۔ مگر یہ ہے تو پھر وہی اعلان ضرور ہوگا تا کہ شبہ تحقیر خداوندی لازم نہ آئے اور جانوروں کو بتقاضائے محبت خداوند عالم جان دینا سہل ہو جائے، ورنہ بے وجہ جان نثاری ہونے لگے، تو پھر بسہولت تو کیا ہوتی جان مفت ضائع

ہوتی۔ کیونکہ اس جان نثاری میں محبوبیت ہی کو کیا فروغ ہوگا، بلکہ جان نثاری منجملہ انداز محبت ہی نہ ہوگی، جومحبوب کے ساتھ یہ معاملہ دیکھ کر کہ اس کو محبّ باوفا خیال کریں۔اور غیر خدا کے نام پر جان نثاری ہوئی، تو یوں کہو اسی کو محبوب اصلی سمجھا، جس کا انجام یہ ہوگا کہ اس کو اپنی حقیقت کا بانی مبانی تصور کیا۔ کیونکہ خدا کی محبت اس کی محبت پر تھی جو فیما بین مخلوقات و وجود محض ثابت ہوئی اور ظاہر ہے کہ وہی توقف سرمایہء خالقیت ہے۔اس لئے اگر غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے یا غیر خدا کی محبوبیت کی خاطر سے اس کو ذبح کیا، گو برائے نام خدا ہی کا نام لیا جائے تو پھر ذبح کرنا تو خدا سے انحراف پر دلالت کریگا۔اس وجہ سے سزائے بغاوت کا مستحق ٹھہرے گا۔ کیونکہ اس صورت میں بھی غیر خدا کو ہمتائے خدا بنا دیا۔ اتنا فرق ہے کہ خدا کی مالکیت کے لحاظ میں تو درصورت بغاوت مالکیت میں غیر ہمتائے خدا بنتا تھا۔اور اس صورت میں محبوبیت میں ہمسری ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ ہمسری بہ نسبت اس ہمسری کے استحقاق اطاعت میں کہیں زیادہ ہے۔کون نہیں جانتا کہ محبّ جس قدر مطیع ہوتا ہے، اس قدر غلام مملوک مطیع نہیں ہوتا۔اور یہ صورت ہے تو پھر ایسا ذبیحہ، جس پر براہ محبت غیر خدا کا نام لیا جائے یعنی غیر خدا کے لئے قربان کیا جائے، ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو حلال کہیں، کیونکہ جیسے وہ ذبیحہ جو بلحاظ مالکیت خدا باجازت خداوندی اپنے لئے ذبح کیا جاتا ہے درد محبت اپنے لئے ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ ذبیحہ جو برائے خدا ذبح کیا جائے اصل میں خدا کے لئے ہوتا ہے۔

حرمت شراب وقمار بازی کی وجہ

چونکہ لوگوں کی معاش، خانگی تدابیر اور سیاست مدن بغیر عقل وتمیز کے مکمل نہیں ہوسکتی اور شراب خوری کی عادت سے تمام انسانی انتظامات میں گڑ بڑ پیدا ہو جاتی ہے۔اس سے جنگ وجدال اور ذاتی رنجشیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب طبائع انسانی میں بے ہودہ خواہشیں عقلوں کو مغلوب کر لیتی ہیں، تو ان میں ایسے ایسے رذائل کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے، جو تمام تدابیر کو تلف کر دیتا ہے۔ اگر ایسی حرکات کی روک ٹوک نہ کی جائے، تو لوگ ہلاک ہو جائیں۔

شراب میں بہت سی خرابیوں کا اندیشہ ہے، جن سے خدا تعالیٰ کی ناخوشی ہوتی ہے۔شراب کی وجہ سے خدا کی جانب خالص توجہ نہیں ہوسکتی۔تمدن اور خانہ داری کے انتظامات سب درہم برہم ہو جاتے ہیں۔شارع نے شراب کو نجاسات میں داخل کیا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔شراب ناپاک ہے اور شیطان کا فعل ہے۔رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۔اس لئے خدا نے اس کو بہت تاکید کے ساتھ حرام کیا ہے۔حکمت الٰہیہ کا اقتضا ہوا کہ اس کو پیشاب اور پاخانہ کے برابر کر دیا جائے۔ تا کہ لوگوں کے

سامنے اس کی برائی متمثل ہو جائے اور اس سے خود بخود ان کے دلوں کو اس کی طرف سے کشیدگی ہو جائے۔ اس کی حرمت کی اور بھی وجوہات ہیں، جو سب فسادوں کی جامع ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَاءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُنْتَھُوْن ۔ترجمہ۔شیطان چاہتا ہے کہ تم میں دشمنی اور بَیر ڈالے شراب اور جوئے کے ذریعہ اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے۔ کیا تم باز آؤ گے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ مَا اَسْکَرَ کَثِیْرَہ' فَقَلِیْلَہ' حَرَامٌ ۔یعنی جو چیز بڑی مقدار میں نشہ آور ہو، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

قمار بازی یعنی جوا اس لئے حرام ہے کہ اس سے مال ناحق ضائع ہوتا ہے اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور تدابیر مطلوبہ متروک ہو جاتی ہیں اور معاونت (باہمی امداد)، جس پر تمدنی زندگی کا مدار ہے، سے لوگ اعراض کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اس بیان پر اعتبار نہ ہو، تو پھر غور کرو کہ کبھی تم نے جواریوں کو ان باتوں سے خالی اور آسودہ حال دیکھا ہے۔ ایسا ہی شراب خانہ خراب پینے والوں کا حال ہے۔ اس کے نقصانات اور فساد بھی بے شمار ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَفْعِھِمَا ۔ترجمہ۔ یعنی وہ تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کو کہہ دے کہ ان میں گناہ بڑا ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے، مگر اس کا گناہ فائدے سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا نقصان ہی ہوا اور فائدہ کوئی نہ ہوا۔ دراصل شراب خانہ خراب ہے، جس گھر یا قوم و ملک میں اس کی کثرت نوشی ہو گی، وہاں مصائب کی کثرت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے ممالک میں کثرت شرب نوشی کے باعث مصائب جرم میں بھی دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

اسلام میں مسکرات کی ممانعت صاف طور پر بتاتی ہے کہ اس پاک مذہب کو شہوانیت سے کس قدر نفرت ہے۔ ہم اس جگہ یہ سوال نہیں کرتے کہ اگر موجودہ عیسائی مذہب نفسانیت کی راہ نہیں بتاتا، تو کیوں اس میں شراب جیسی بُری چیز کی کوئی ممانعت نہیں، کیونکہ یہ مضمون اس وقت زیر بحث نہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر شراب شہوانی خیالات کو ابھارنے والی ہے، جیسا کہ دنیا تسلیم کر رہی ہے، تو کیا کسی مذہب کا شراب سے منع کرنا اور شراب خوری کو قطعاً روک دینا اس امر کی یقینی اور قطعی شہادت نہیں کہ وہ شہوانی خیالات سے چھڑانے والا اور راست بازی اور روح و دل کی پاکیزگی کی طرف بلانے والا ہے۔ اگر اسلام ایک نفسانی مذہب تھا اور اس کی غرض یہی تھی کہ شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے ذریعے

بتائے اوران کی راہ کھول دے،تو پھراس نے شراب کو کیوں منع کیا اور شراب خوری کو کیوں جڑ سے کاٹا۔ ہمیں اور بھی تعجب ہوتا ہے جب ہم بعض نام کے مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ اسلام کے اصول ایک ابتدائی سوسائٹی کے لئے تجویز کئے گئے تھے، جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ گویا یہ اصول ایک وحشی قوم کے لئے تجویز کئے گئے تھے اور آج کل کی مہذب اقوام کے لئے وہ موزوں نہیں۔ بہر حال ان مہذبوں سے، جو آج کل شراب خوری سے تباہ ہو رہے ہیں، وحشی قوم ہی اچھی رہی۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ واقعات کی بنا پر نتائج پر غور نہیں کرتے، بلکہ جو ایک خیال دل میں بیٹھ گیا اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ کوئی پاکیزگی اس پاکیزگی کے برابر نہیں جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ مگر اس حقیقی پاکیزگی کو نفسانیت کہا جاتا ہے اور اس شہوانیت کو، جس کی طرف شراب خوری انسانوں کو لے جا رہی ہے، پاکیزگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شراب ہی وہ چیز ہے، جو انسان کے نفسانی جذبات کو جوش میں لاتی ہے۔ اور شراب خوری کی علت کو جڑ سے کاٹ کر اسلام نے انسانوں کو حیوانی جذبات سے آزاد کر دیا ہے۔ ابھی تک دنیا اس حقیقی نور سے بے خبر ہے، مگر وہ زمانہ بہت قریب آتا جاتا ہے، جب دنیا کی آنکھیں اس نور کے دیکھنے کے لئے کھولی جائیں گی۔ اور جب اسلام کے اصول دنیا کو معلوم ہوں گے۔ تب اسے سمجھ آئے گا کہ وہ پاکیزگی ان لوگوں کے وہم و گمان سے بھی برتر ہے، جو اسلام سکھاتا ہے۔

حرمت سود کی وجہ

سود سے مراد یہ ہے کہ مقروض نے جتنا قرض لیا ہے، اس سے زیادہ یا بہتر ادا کرے۔ یہ حرام اور باطل ہے، کیونکہ تمام مقروضوں کا یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کا قرض اپنی حاجت اور پریشانی کی وجہ سے لے تو لیتے ہیں، لیکن حسب وعدہ اس کا ایفا نہ کرنے سے وہ دو چند سہ چند ہوتا چلا جاتا ہے اور اس سے خلاصی کبھی ممکن ہی نہیں، بلکہ اس میں جھگڑوں اور عام خصومتوں کا گمان غالب ہے۔ اور جب مال کی بڑھائی کا یہ طریقہ و رسم ہو جائے گا، تو اس کی وجہ سے کھیتیاں اور تمام صنعتیں متروک ہو جائیں گی، جو تمام پیشوں کی جڑ ہیں۔ اس لئے سود کو حرام ٹھہرایا گیا۔ **عن ابن مسعودؓ قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربا و موکله و شاهد یه و کاتبه** (مسلم۔ ترمذی) یعنی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیاج لینے والے کو اور دینے والے کو اور سود کا معاہدہ لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔

اور خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ **يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْاللهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوااِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَ رَسُوْلِهٖ** ۔ ترجمہ۔ اے ایمان

والو، ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو، جو سود رہ گیا ہے اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہیں کرتے اور سود لینے اور دینے سے باز نہیں آتے، تو تمہارے خلاف خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

حرمت سود پر دلائل قویہ

قرآن شریف کی وہ آیات، جن میں سود کی ممانعت کا ذکر ہے، مال میں ظاہر اور پوشیدہ صدقات دینے کے حکم کے بعد ہی یہ آیت ہے۔ **اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰو لَایَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ** ۔ترجمہ۔یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ نہیں کھڑے ہوتے، مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے، جو مس شیطان سے مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔قرآن مجید میں اس جگہ لفظ ربوٰ (ربا) کا آیا ہے اور اس پر بہت بحث مباحثہ ہوا ہے کہ اس آیت میں اس سے کیا مراد ہے۔اس کے لفظی معنے بڑھوتی یا زیادتی ہے۔لیکن رواجاً اس سے وہی مراد ہے، جو ابتداءً سود خوری سے مراد ہوتی تھی۔یعنی اس کے معنے ہیں قرضہ پر سود۔جیسا کہ اسی آیت کے بعد کی تیسری و چوتھی آیت سے ظاہر ہوتا ہے، جہاں صاف صاف الفاظ ربوٰ اور راس المال کے آئے ہیں، جن سے سود و اصل مال مراد ہے۔علاوہ ازیں آیت متذکرہ بالا میں ربوٰ اور تجارت کے منافع کا فرق خود ربوٰ کے معنوں کو ظاہر کر رہا ہے، کیونکہ دوسرے حصہ آیت مذکورہ میں یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوٰ یعنی سود خوری کو حرام۔اس سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں سود کی حرمت بیان کرنے سے قرآن شریف کا مدعا اس رسم کے استیصال کا ہے، جو مقررہ شرح سود پر قرضہ دینے کے بارہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں بھی ایسی ہی پھیلی ہوئی تھی، جیسی کہ دیگر تمام ممالک میں۔اس آیت میں ایک اور امر بہت ہی توجہ کے قابل ہے۔وہ یہ ہے کہ جو شخص سود پر قرضہ دے، اس کی مثال ایسے شخص سے دی گئی ہے، جو مس شیطان سے گر گیا ہو یا دیوانہ ہو گیا ہو۔اصل الفاظ سے دونوں معنے نکل سکتے ہیں۔قرآن شریف نے اس ایک ہی لفظ میں سود خواری کے تمام بدنتائج بتلا دیئے ہیں اور یہ اس پاک کتاب کا خاصہ ہے کہ اکثر مواقع پر ایک ہی لفظ میں ایک لمبے مضمون کا فلسفہ بیان کر دیتی ہے۔یہاں کہا گیا ہے کہ سود خور کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا، بلکہ جب وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے تو پھر گر پڑتا ہے۔

سود خوری کے ذریعہ دولت کے بڑھانے کی خواہش کو مس شیطان سے مشابہت دی گئی ہے، جس کے باعث انسان زمین پر جھکا رہتا ہے، یعنی بالکل زمینی ہو جاتا ہے اور آسمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔سود خور ہر وقت اور ہر آن اس غم اور فکر میں غرق رہتا ہے کہ کس طرح اس کی دولت بڑھے۔اس لئے وہ حد سے زیادہ زمین کی طرف جھکا ہوا ہے اور انسانی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی خواہش اس کے

دل میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ وہ خود چونکہ گرا ہوا ہوتا ہے، اس لئے اپنے ابنائے جنس کی بھی کوئی امداد نہیں کرسکتا۔ وہ اسی دنیا کی خواہشات کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے مس شیطان سے مراد دنیا کی محبت ہے۔ ہمدردی، محبت اور شفقت نہ ہونا، جو سودخوری کا لازمی نتیجہ ہے، اخلاقی تنزل کا باعث بن جاتا ہے، جس کو زمین پر گرا ہوا ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت، جس میں سودخوری کی حرمت اس سے بھی زیادہ پرزور الفاظ میں بیان کی گئی ہے، یہ ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْااللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبوٰا اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْن. فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ. وَ اِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ. وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. یعنی اے مسلمانو، اگر تم ایمان رکھتے ہو، تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور جو سود لوگوں کے ذمہ باقی ہے، اس کو چھوڑ دو۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے، تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے ہوشیار رہو۔ اور اگر توبہ کرتے ہو، تو اپنی اصل رقم تم کو نہیں پہنچتی ہے۔ نہ تم کسی کا نقصان کرو اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے۔ اور اگر کوئی تنگدست تمہارا مقروض ہو، تو فراخی تک کی مہلت دو۔ اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو قرضہ بھی بخش دو۔

ان آیات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ بقایا سود کے چھوڑ دینے کے حکم سے پہلے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ کیونکہ بنی نوع انسان کی فائدہ رسانی کا کام درحقیقت ایک تقویٰ کی راہ ہے۔ علاوہ ازیں اس حکم سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ تمام احکام میں قرآن شریف کو، جو مدعا مدنظر ہوتا ہے، وہ حصول تقویٰ ہی ہے۔ اسی سے اس امر کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر فکر رہتا تھا کہ آپ کے اتباع تقویٰ کے اعلیٰ مدارج حاصل کریں۔ اور جیسا کہ آپ کو اس بات کا فکر رہتا تھا ایسا ہی جو نتائج حاصل ہوئے وہ بھی بہت عظیم الشان ہیں۔ کیونکہ آپ کے انفاس طیبہ نے تقویٰ کی وہ روح آپ کے پیروؤں میں بھی پھونک دی، جس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ کسی نہ کسی شکل میں قرضہ پر سود لینا جائز ٹھہرانا چاہتے ہیں، وہ اور نہیں تو یہی غور کریں کہ پہلے زمانہ کے مسلمانوں نے جب سچے تقویٰ کے حصول کے لئے اپنا تمام مال خدا کی راہ میں دے دیا، تو ہم ان مدارج کو کیونکر پا سکتے ہیں اگر ہم حرمت سود کے حکم کے پابند بھی نہ رہیں۔

وہ رباء، جس کی حرمت قرآن کریم نے کی ہے، عرب کے لوگوں میں زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف امر تھا۔ امام رازی اپنی تفسیر میں اس جاہلیت کے رباء کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، جن کا

ترجمہ یہ ہے کہ رباءالنسیہ وہ ہے جو عرب کے لوگوں میں ایام جاہلیت میں مشہور اور متعارف امر تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے کو کچھ مال بطور قرضہ دیتا تھا اس شرط پر کہ قرضہ لینے والا مہینے کے مہینے ایک رقم معین، جس کو شرح سود کہنا چاہیئے، قرضخواہ کو دے اور راس المال بدستور مدیون کے ذمہ باقی رہتا تھا۔ جب معیاد قرضہ ختم ہو جاتی، تب قرضخواہ مدیون سے اپنا قرضہ یعنی راس المال طلب کرتا۔ پھر اگر وہ ادا نہ کرسکتا تھا تو ادھر قرضہ کی رقم بڑھادی جاتی اور ادھر مہلت بڑھادی جاتی۔ یہ وہ ربا تھا جو جاہلیت کے ایام میں جاری تھا۔ ربا کے معنوں کے اس قدر واضع اور کھلے کھلے ہونے کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی رباء کے معنے معلوم نہ تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رباء کے معنے کچھ نہیں بتائے، اس لئے کہ آپ کو مہلت ہی نہیں ملی۔

یہ بات بالکل غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جلدی اس حکم کے نزول کے بعد فوت ہو گئے تھے کہ آپ کو اس کی تفسیر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ ان آیات کے نزول کے بعد آپ کا حجۃ الوداع کرنا ثابت ہے، جہاں آپ نے کل مسلمانوں کو جمع کر کے ایک بہت لمبا وعظ کیا، جیسا کہ کل معتبر کتب احادیث میں درج ہے۔ اور اسی کے اثناء میں رباء کے ممنوع ہونے پر بھی زور دیا۔

عن سلیمان ابن عمرو عن ابیه قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی حجة الوداع یقول الا ان کل رباء من رباء الجاهلیة موضوع لکم رؤس اموالکم لا تظلمون و لا تظلمون. الا و ان کل دم من دم الجاهلیة موضوع و اول دم اضع منها دم الحارث بن المطلب. قال اللهم هل بلغت قالوا نعم ثلاث مرات قال الهم اشهد ثلاث مرات ۔ترجمہ۔یعنی سلیمان اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ اس نے کہا میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ دیکھو ہر ایک رباء ربائے جاہلیت کا موقوف کیا جاتا ہے۔ ہاں راس المال لینے کا حق تمہیں ہے۔ نہ تم دوسروں پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ دیکھو ہر ایک خون جاہلیت کے خون سے موقوف کیا جاتا ہے۔ اور پہلا خون، جس کو میں موقوف کرتا ہوں، وہ حارث بن عبد المطلب کا خون ہے۔ اس کے بعد آپ نے پکار کر فرمایا۔ کیا میں نے تم لوگوں کو پیغام پہنچا دیا ہے۔ سب نے کہا ہاں۔ اور تین دفعہ آپ نے یونہی پکارا اور یہی جواب کل حاضرین نے آپ کو دیا۔ اس کے بعد تین دفعہ آپ نے فرمایا۔ اے خدا تو گواہ رہ، یعنی اس بات پر کہ میں نے ان لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دئے ہیں اور اس کا یہ سب اقرار کرتے ہیں۔ حدیث کے یہ الفاظ ابوداؤد سے لئے گئے ہیں۔ مگر بہت تھوڑی کم وبیشی سے یہی الفاظ ہر ایک معتبر کتاب حدیث میں ملیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ آپکا فرمانا ان آیات کے نزول کے بعد تھا۔ جو سورہ بقرہ میں وارد ہوئی ہیں۔ وہاں بھی بعینہ یہی ذکر ہے کہ راس المال تم کو واپس مل سکیں گے، مگر رباء تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اب یہاں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو کھول کر سمجھاتے ہیں کہ جاہلیت میں جس قدر تم رباء لیتے تھے، وہ سب کُل کے کُل موقوف کیا جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ کے مجتہد لکھتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقت ہی نہیں ملا کہ بتائیں کہ کونسا رباء حرام کیا گیا ہے اور کونسا باقی رکھ لیا گیا ہے۔ رباء تو آپ نے کوئی باقی نہیں رکھا۔ البتہ قرآن شریف میں حکم تھا، جہاں فرمایا کہ اصل روپیہ، جسے راس المال کہتے ہیں اور جو بطور قرضہ دیا گیا تھا، وہ تمہیں واپس مل سکتا ہے۔ کیا اب بھی رباء کے معنوں میں کوئی شک باقی ہے۔ پھر آپ نے بآواز بلند ہزارہا حاضرین کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ کیا میں نے یہ پیغام تم کو پہنچا دیا ہے۔ اور سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ بیشک آپ نے پہنچا دیا ہے۔ اگر رباء کے معنوں میں ان کو کوئی شک تھا، تو اس وقت کس نے انکے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، جو یہ کہہ دیتے کہ اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ابھی تک رباء کے معنوں کا کچھ پتہ نہیں لگا۔ ذرا اسکی تشریح فرما دیجئے۔ پھر ایک دفعہ نہیں تین دفعہ انہوں نے یہی شہادت دی کہ ہاں ہم نے ان باتوں کو سمجھ لیا ہے۔ اور آپنے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ یقیناً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہاں موجود تھے اور اگر انہوں نے اس موقعہ پر کچھ نہیں کہا، تو بعد میں وہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ ہمیں رباء کے معنے سمجھ میں نہیں آئے۔ کیونکہ آنخضرتؐ کو سمجھانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

کثرت سے اور احادیث موجود ہیں، جن میں رباء کے متعلق بڑے بڑے وعید آئے ہیں۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ ضد ہے یا کم فہمی، جو یہ کہا جاتا ہے کہ رباء کے معنوں کا ہی صحابہ کو پتہ نہ تھا۔ اور پھر ان احادیث پر کُل اسلامی دنیا کا ابتداء سے عمل بھی رہا ہے، جس سے ان کا معتبر اور صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں، جس کو تمام معتبر کتب احادیث نے بیان کیا ہے، یہ وارد ہوا ہے کہ **لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الرباء و موکلہ و شاہدہ و کاتبہ** ۔یعنی آپؐ نے سود لینے والے اور سود دینے والے اور سودی معاہدہ کے گواہ اور کاتب پر لعنت کی، کیونکہ وہ سب اس بدی میں معاون ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ سورہ بقرہ کی وہ آیات، جن میں رباء کی ممانعت کا حکم نازل ہوا ہے، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخیر زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ آپ کو ان آیات کے نزول کے بعد اس قدر مہلت ہی نہ ملی تھی کہ آپ رباء کے معنوں کی تشریح کر سکتے۔ اور یہ کہ اس لئے یہ مسئلہ بلا وضاحت ہی رہ گیا، ایک بے ہودہ خیال ہے۔ کیا رباء کی تشریح کے لئے کئی سالوں یا

مہینوں یا دنوں کی ضرورت تھی۔ اگر کسی تشریح کی ضرورت تھی، تو یہ تو ایک منٹ کا بھی کام نہ تھا۔ یہ لفظ عام طور پر عرب میں مستعمل تھا اور رباء کا رواج عام تھا، آخر اس کی تشریح کے لئے کوئی مجلد تو نہیں بنائے جانے تھے۔ کچھ نہ کچھ تو اس کا مفہوم عرب کے لوگوں کے دل میں بھی تھا۔ اگر قرآن شریف نے ان عام معنوں کو چھوڑ کر رباء کو کسی اور معنوں میں مستعمل کیا تھا، تو یہ ممکن نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معنے مسلمانوں کو نہ بتاتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن شریف اس قدر سختی سے مسلمانوں کو سود خوری چھوڑنے کا حکم دیتا اور ان کو صاف الفاظ میں یہ اعلان جنگ دیتا ہے کہ اگر تم رباء کو نہ چھوڑو گے، تو خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ تمہاری جنگ ہے، حالانکہ یہ خبر ان کو دی ہی نہیں گئی کہ رباء سے کیا مراد ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ نہ بتایا اور نہ ہی قرآن شریف نے اس کی تشریح کی۔ یہ کیسا بیہودہ خیال ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن شریف نے ایسے احکام دیئے ہیں اور مسلمانوں کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور عمل نہ کرنے کی صورت میں عذاب کی دھمکیاں دی ہیں، حالانکہ اس کا مفہوم نہیں بتایا گیا، وہ قرآن شریف سے محض جاہل ہے۔

پس جس طرح دیگر احکام دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا قرآن شریف نے سمجھا دیا کہ صلوٰۃ کس طرح ادا کرنی چاہئے، صوم کے متعلق کیا کیا پابندیاں ہیں وغیرہ وغیرہ، تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب رباء کی حرمت کا حکم دیا تو اگر یہ لفظ تشریح طلب تھا، تو اس کی تشریح کیوں نہ کی۔ اس صورت میں تو یہ حکم ہی لغو اور بے معنے ٹھہرا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہی بات حضرت عمرؓ بھی کہتے ہیں کہ یہ لفظ ایسا مشہور اور متعارف ہے کہ اس کی تشریح کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

سود و ایمان

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سود کے بغیر دنیا کے کاروبار نہیں چل سکتے۔ مگر ایسے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ نے سود کی حرمت مومنوں کے واسطے مقرر کی ہے۔ اور مومن وہ ہوتا ہے، جو ایمان پر قائم ہو۔ خدا تعالیٰ خود اس کا متولی اور متکفل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں کروڑ ہا ایسے آدمی گذرے ہیں، جنہوں نے نہ سود لیا نہ دیا۔ آخر ان کے حوائج بھی پورے ہوتے ہی رہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ سود نہ لو نہ سود دو۔ جو ایسا کرتا ہے، گویا خدا کے ساتھ لڑائی کی تیاری کرتا ہے۔ ایمان ہو تو اس کا صلہ خدا بخشتا ہے۔ ایمان بڑی بابرکت شے ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ اگر کسی کو خیال ہو کہ پھر کیا کرے، تو کیا خدا تعالیٰ کا حکم بھی بیکار ہے۔ اس کی قدرت بہت بڑی ہے، سود تو کوئی شے ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا کہ زمین کا پانی نہ پیا کرو، تو وہ ہمیشہ بارش کا پانی آسمان سے دیا کرتا۔ اسی طرح

ضرورت پر وہ خود ایسی راہ نکال ہی دیتا ہے کہ جس سے اس کی نافرمانی بھی نہ ہو۔ جب تک ایمان میں میل کچیل ہوتی ہے، تب تک یہ ضعف اور کمزوری ہے۔ کوئی گناہ چھوٹ نہیں سکتا، جب تک خدا تعالیٰ نہ چھڑا دے۔ ورنہ انسان تو ہر ایک گناہ پر یہ عذر پیش کر سکتے ہے کہ ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ اگر چھوڑیں تو گذارہ نہیں چلتا۔ دوکانداروں، عطاروں کو دیکھا جائے کہ پرانا مال سالہا سال تک بیچتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ ملازمت پیشہ لوگ رشوت خوری کرتے ہیں اور سب یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ گذارہ نہیں چلتا۔ ان سب کا اگر اکٹھا کر کے نتیجہ نکال جائے، تو پھر یہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی کتاب پر عمل ہی نہ کرو، کیونکہ گذارہ نہیں چلتا۔ حالانکہ مومن کے لئے خدا خود سہولت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تمام راسبازوں کا مجرب علاج ہے کہ مصیبت اور صعوبت میں خدا خود راہ نکال دیتا ہے۔ لوگ خدا کی قدر نہیں کرتے، جیسے ان کو حرام کے دروازے پر بھروسہ ہے، ویسا خدا پر نہیں ہے۔ خدا پر ایمان ایک ایسا نسخہ ہے کہ اگر قدر ہو اور جی چاہے تو جیسے دوسرے عجیب نسخے مخفی رکھنا چاہتے ہیں، ویسے ہی اسے بھی مخفی رکھا جائے۔

سود بینک جائز و ناجائز ہونے کی وجوہات

یہ بات بالکل سچ ہے کہ سود حرام ہے، لیکن اپنے نفس کے واسطے۔ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں جو چیز جاتی ہے وہ حرام نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ حرمت اشیاء کی انسان کے لئے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے۔ پس سود اپنے نفس کے لئے، بیوی بچوں، احباب رشتہ داروں اور ہمسایوں کے لئے بالکل حرام ہے۔ لیکن اگر یہ روپیہ خالصۃً اشاعت دین کے لئے خرچ کیا جائے، تو حرج نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اور پھر دوسری مصیبت یہ ہے کہ لوگ زکوٰۃ بھی نہیں دیتے ہیں۔ دیکھا جا رہا ہے کہ اس وقت دو مصیبتیں واقع ہو رہی ہیں اور دو حرمتیں روا رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ زکوٰۃ، جس کے دینے کا حکم تھا، وہ دیتے نہیں اور سود، جس کے لینے سے منع کیا تھا، وہ لیتے ہیں۔ یعنی جو خدا تعالیٰ کا حق تھا، وہ تو دیتے نہیں اور جو اپنا حق نہ تھا، وہ لے لیتے ہیں۔ جب ایسی حالت ہو رہی ہے اور اسلام خطرناک ضعف میں مبتلا ہے، تو ایسے سودوں کی رقمیں، جو بینک سے ملتی ہیں، یکمشت اشاعت دین میں خرچ کرنی چاہئیں۔ مگر یہ فتویٰ عام نہیں ہے۔ ورنہ سود کا لینا دینا دونوں حرام ہیں۔ مگر اس ضعف اسلام کے زمانہ میں جبکہ مالی ترقی کے ذرائع پیدا نہیں ہوئے اور مسلمان توجہ نہیں کرتے، ایسا روپیہ اسلام کے کام میں لگنا حرام نہیں ہے۔ قرآن شریف کے مفہوم کے موافق جو حرمت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے لئے اگر خرچ ہو تو حرام ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جیسے سود اپنے لئے درست نہیں، کسی اور کو اس کا دینا بھی درست نہیں۔ ہاں خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ایسے مال کا دینا درست ہے اور اس کا یہی طریق ہے کہ وہ

صرف اشاعت اسلام میں خرچ ہو۔ اس کی ایسی مثال ہے، جیسے جہاد ہو رہا ہو اور گولی بارود کسی فاسق فاجر کے ہاں ہو، اس وقت محض اس خیال سے رک جانا کہ یہ گولی بارود حرام ہیں ٹھیک نہیں۔ بلکہ مناسب یہی ہوگا کہ اس کو خرچ کیا جائے۔ اس وقت تلوار کا جہاد تو باقی نہیں رہا اور اب قلم کا جہاد باقی ہے، اس لئے اشاعت دین میں ہم اس کو خرچ کر سکتے ہیں اور وہ یوں ہے کہ اسلامی امداد کے لئے دینی کتب بکثرت شائع کی جائیں۔

اس وقت اشاعت اسلام کیلئے روپیہ کی اشد ضرورت ہے اور اس پر وہ روپیہ، جو بینکوں کے سود سے آتا ہے، خرچ کیا جائے، تو جائز ہے۔ کیونکہ وہ خالص خدا کے لئے ہے۔ خدا تعالیٰ کے لئے وہ حرام نہیں ہے، جیسا کہ ابھی اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خواہ کسی جگہ کا سکہ و بارود ہو، وہ جہاد میں خرچ کرنا جائز ہے۔

یہ ایسی باتیں ہیں کہ بلا تکلف سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ کیونکہ بالکل صاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ فرماتا ہے کہ **فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَ لَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ**۔ پس جبکہ اضطراری حالت میں اپنی جان بچانے کی خاطر سؤر کھانا جائز ہے، تو کیا ایسی حالت میں کہ اسلام کی حالت بہت ضعیف ہوگئی ہے اور اس کی جان پر آ بنی ہے، اس کی جان بچانے کے لئے محض اعلائے کلمہء اسلام کے لئے سود کا روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا۔

ہمارا مذہب یہ ہے کہ سود کا روپیہ بالکل حرام ہے کہ کوئی شخص اسے اپنے نفس پر خرچ کرے اور کسی قسم کے بھی ذاتی مصارف میں خرچ کرے یا اپنے بال بچے کو دے یا کسی فقیر مسکین کو دے یا کسی ہمسایہ یا مسافر کو دے سب حرام ہے۔ سود کا روپیہ لینا اور خرچ کرنا سب گناہ ہے لیکن حسب تقریر سابق امداد اسلام کے لئے خرچ کیا جائے تو درست ہے، کیونکہ یہ ایام اسلام کے واسطے بڑے مالی مشکلات کے ہیں۔ اول تو مسلمان اکثر غریب ہیں اور پھر جو امیر ہیں وہ اپنے ذاتی مصارف میں اور مال اور عیال فکر میں حد سے بڑھ گئے ہیں، سود کا روپیہ لے لیتے ہیں اور زکوٰۃ نہیں دیتے۔ دونوں طرف سے گناہگاری میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ غریب ہو یا امیر ہو کسی کو بھی دین اسلام کی اشاعت کی فکر نہیں۔ جو زکوٰۃ دیتے ہیں وہ بھی رسمی طور پر دنیوی عزت کے موقعہ پر اپنا روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں۔ اپنا جو حق نہ تھا وہ لیتے ہیں اور خدا کا جو حق تھا وہ نہیں دیتے اور اس طرح اپنے اندر دو گناہ ایک ہی وقت میں جمع کر لیتے ہیں۔ غرض اس قدر اسلامی مصیبت کے وقت میں اگر اس قسم کا روپیہ اشاعت اسلام کے واسطے تالیف کتب میں صرف کیا جائے، تو یہ جائز ہے۔ سود کا روپیہ تصرف ذاتی کے واسطے ناجائز ہے۔ لیکن خدا کے واسطے کوئی شے حرام نہیں۔ خدا کے کام میں جو مال خرچ کیا جائے وہ حرام نہیں ہے۔ اس کی

مثال اس طرح ہے کہ گولی بارود کا چلانا کیا ہی ناجائز اور گناہ ہو لیکن جو شخص اسے ایک جانی دشمن کے مقابلہ پر نہیں چلاتا، وہ قریب ہے کہ خود ہلاک ہو جائے۔ کیا خدا تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ تین دن کے بھوکے کے واسطے سؤر بھی حرام نہیں، بلکہ حلال ہے۔ پس سود کا مال اگر ہم تم خدا کے لئے لگائیں، تو پھر وہ کیونکر گناہ ہو سکتا ہے۔ اس میں مخلوق کا حصہ نہیں، بلکہ اعلائے کلمہ اسلام میں اور اسلام کی جان بچانے کے لئے اس کا خرچ کرنے ہم اطمینان اور ثلج قلب کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ بھی فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ میں داخل ہے۔ اب تلوار کا جہاد باقی نہیں رہا، لیکن قلم کا جہاد باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس طرح کی تیاری کفار تمہارے مقابلہ میں کرتے ہیں، اس طرح کی تیاری تم بھی ان کے مقابلہ میں کرو۔ اب قوموں کے درمیان تلوار کی مذہبی جنگ باقی نہیں رہی، کیونکہ زمانے کا رخ بدل گیا ہے۔ مذہب کے لئے کوئی کسی پر جبر و اکراہ نہیں کر سکتا۔ اور اسلام کا بھی یہی حکم ہے کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ ہاں اب قلم کی جنگ و جہاد ہے۔ آج کل پادری و آریہ لوگ طرح طرح کے مکر و فریب کے ساتھ اسلام کے برخلاف کتابیں شائع کرتے ہیں اور غلط باتیں افترا پردازی سے کہتے ہیں، جب تک ان خبیث باتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ہونا ثابت نہ کیا جائے، اسلام کی اشاعت کس طرح ہو سکتی ہے۔ پس ہم بلا خوف لومۃ لائم علیٰ رؤس الاشہاد کہتے ہیں کہ قرآن شریف کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے نفس، عیال، اطفال، دوست عزیز کے واسطے سود مباح نہیں، بلکہ پلید و حرام ہے۔ لیکن اس ضعف اسلام کے زمانہ میں جبکہ مالی امداد کا سخت احتیاج ہے اسلام کی امداد ضرور کرنی چاہئے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارا منشاء صرف یہ ہے کہ اضطراری حالت میں جبکہ خنزیر کھانے کی اجازت نفسانی ضرورتوں کے واسطے جائز ہے، تو اسلام کی ہمدردی کے واسطے اگر انسان دین اسلام کو ہلاکت سے بچانے کے واسطے سود کے روپے کو خرچ کرے، تو کیا قباحت ہے۔

اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ اجازت مختص المقام اور مختص الزمان ہے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ کے واسطے اس پر عمل کیا جائے۔ جب اسلام کی نازک حالت نہ رہے، تو پھر اس ضرورت کے واسطے بھی سود لینا ویسا ہی حرام ہے۔ کیونکہ دراصل سود کا عام حکم حرمت ہی ہے۔

ریلوے بونس کا روپیہ جائز و ناجائز ہونے کی وجہ

ریلوے میں جو لوگ ملازم ہوتے ہیں ان کی تنخواہ میں سے ایک آنہ فی روپیہ کاٹ کر رکھا جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ روپیہ ان کو دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ زائد روپیہ بھی دیتے ہیں۔ اس پر یہ سوال ہوا کہ آیا ایسا روپیہ جائز ہے یا نہیں۔ سو واضح ہو کہ شرع میں سود کی یہ تعریف ہے کہ ایک شخص

اپنے فائدہ کے واسطے دوسرے کو روپیہ قرض دیتا ہے اور فائدہ مقرر کرتا ہے۔ یہ تعریف جہاں صادق آئیگی وہ سود کہلائے گا۔لیکن جس نے روپیہ لیا ہے اگر وہ وعدہ وعید تو کچھ نہیں کرتا اور اپنی طرف سے زائد دیتا ہے تو وہ سود سے باہر ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ شرائط کی رعایت رکھتے آئے ہیں۔ اگر بادشاہ کچھ روپیہ لیتا ہے اور وہ اپنی طرف سے زیادہ دیتا ہے اور دینے والا اس نیت سے نہیں دیتا کہ یہ سود ہے، تو وہ سود میں داخل نہیں ہے۔ وہ بادشاہ کی طرف سے احسان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے ایسا قرضہ نہیں لیا کہ ادائیگی کے وقت اسے کچھ زائد نہ دیا ہو۔ یہ خیال رہنا چاہئے کہ اپنی خواہش نہ ہو، تو خواہش کے برخلاف جو زیادہ ملتا ہے وہ سود نہیں۔

نوٹ از مرتب۔ یہاں پر مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل بونس کی سکیم کے پیچھے جو سسٹم ہے، وہ سودی نظام کا ہی حصہ ہے، کیونکہ تنخواہوں سے کٹوتی کی رقم کو سودی کاروبار میں لگایا جاتا ہے، جس سے منافع کمانا مقصود ہوتا ہے۔ اور وہ زائد رقم جو ملازمین کو ملازمت کے خاتمے پر ملتی ہے، وہ اسی طریق سے کمائی جاتی ہے۔ البتہ ملازمین اس سودی کاروبار میں براہ راست شریک نہیں ہوتے۔

چھری کانٹے سے کھانا جائز و ناجائز ہونے کی وجہ

چُھری کانٹے سے کھانا اسلامی شریعت نے منع تو نہیں کیا، مگر تکلف سے ایک بات یا ایک فعل پر زور دینے سے منع کیا ہے۔ اس خیال سے کہ اس میں اس قوم سے مشابہت نہ ہو جائے، جو اس کام میں تکلف کی پابند ہے۔ ورنہ یوں تو ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری کانٹے سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے اور یہ فعل اس لئے کیا کہ امت کو تکلیف نہ ہو۔ جائز صورتوں پر کھانا جائز ہے، مگر بالکل اس کا پابند ہونا اور تکلف کرنا اور کھانے کے دوسرے طریقوں کو ناجائز سمجھنا منع ہے۔ کیونکہ انسان آہستہ آہستہ یہاں تک تتبع متکلفین کی کرتا ہے کہ ان کی طرح طہارت بھی چھوڑ دیتا ہے۔ **من تشبہ بقوم فھو منھم** (ترجمہ۔ جو کوئی کسی قوم کی نقل کرتا ہے، وہ انہیں میں سے ہے) سے یہی مراد ہے کہ التزاماً ان باتوں کو نہ کرے، ورنہ بعض وقت جائز ضرورت کے لحاظ سے کر لینا منع نہیں ہے۔

کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی وجہ

کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا اس لئے مشروع ہوا کہ اس فعل سے انسان جملہ امراض متعدیہ سے محفوظ و مصئون رہتا ہے۔ کیونکہ اجرام موذیہ، جو مورث امراض متعدیہ ہوتے ہیں، وہ ہاتھ دھونے سے اتر جاتے ہیں۔ اور انسان کے اندر داخل نہیں ہوتے۔

رشوت وہدیہ میں فرق

رشوت کی یہ تعریف ہے کہ جس سے گورنمنٹ یا دوسرے لوگوں کے حقوق تلف کئے جائیں۔ لیکن جو چیز بطور نذرانہ یا ہدیہ یا ڈالی کسی کو دی جائے، جس سے کسی کے حقوق کا اتلاف مدنظر نہ ہو، بلکہ اپنی حق تلفی اور شر سے بچنا مقصود ہو، تو یہ منع نہیں ہے۔ کسی کے ظلم سے بچنے کو شریعت اسلامیہ منع نہیں کرتی۔ بلکہ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلٰی التَّهْلَكَةِ فرمایا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

الغرض رشوت وہ مال ہے کہ جو کسی کی حق تلفی کے واسطے دیا یا لیا جائے۔ ورنہ اگر کسی نے کسی شخص کا ایک کام محنت سے کیا ہے اور حق تلفی بھی کسی کی نہیں ہوتی، تو اس کو جو دیا جائے گا، وہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب الجنایات والحدود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

زانی مُحصن وغیر مُحصن کی سزا میں فرق کی وجہ

اما بعد۔ واضح ہو کہ خدتعالیٰ نے محض بنی آدم کی خاطر با آرام وامن زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ ایسے قوانین واحکام مقرر فرمائے، جو بنی آدم کے پیش نظر رہنے سے وہ ایک دوسرے پر ظلم وتعدی نہ کر سکے۔ اور جو کوئی ان قوانین کا نقص کرے اس کی سزا ہی کے مشاہدہ سے باقیوں کیلئے عبرت ہو۔

مُحصن (بالغ) کی حد سنگسار کرنا اور غیر محصن (غیر بالغ) کو درّے لگانا اس لئے مقرر کئے گئے کہ جس طرح پندرہ برس کی عمر وغیرہ سے آدمی بالغ ہو کر پورا پورا مکلّف ہوتا ہے اور اس سے قبل پورا پورا مکلّف نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس کی عقل اور جسم اور رجولیت کا کمال اس سے پہلے نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس عقوبت میں بھی تفاوت ہونا چاہئے، جو کمال عقل اور مرد کامل اور استقلالِ سمجھ اور خودمختاری کے سبب سے پورا پورا مکلّف ہوتا ہے۔ اور اس لئے محصن کامل اور غیر محصن ناقص ہے۔ پس غیر محصن حُر کامل اور غلام کے مابین واسطہ ہوا۔ اور صرف سنگسار ہونے میں اس واسطہ کا اعتبار کیا گیا۔ اس لئے کہ وہ حق الٰہی کے اندر جو سزا مقرر کی گئی ہے ان سب میں سے سخت ہے۔

چوری کی سزا میں چور کا ہاتھ کاٹنا

مگر زنا کی سزا میں درے لگانا اور شرمگاہ نہ کاٹنے کی وجہ

چوری کی سزا میں چور کا ہاتھ کاٹنا اور زنا کی سزا میں زانی کی شرمگاہ نہ کاٹنا خدا تعالیٰ کی نہایت حکمت ومصلحت پر مبنی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کی حکمت اور اس کی رحمت اور اس کی مخلوق کی مصلحت میں جائز نہیں ہے کہ ہر مجرم کا وہی عضو کاٹا جائے، جس سے اس نے گناہ کیا ہو۔ کیونکہ اس طرح ہر ایک بدنظر کی آنکھ نکالی جاتی اور بری بات سننے والے کے کان کاٹے جاتے اور ہر بدزبانی کرنے والے کی زبان کاٹنی

پڑتی اور ہر ایک ظلم سے طمانچہ مارنے والے کے ہاتھ کاٹے جاتے۔ اور اس طرح سے سزا کے اس امر میں جو زیادتی و تجاوز کرنا پڑتا ہے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں عدم لحاظ مراتب ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عالیہ اور اس کے افعال حمیدہ اس امر کو نہیں چاہتے کیونکہ حد مقرر کرنا محض امن کے لئے ہی نہیں ہے۔ اگر اس امر کا ارادہ ہوتا تو مجرم کو قتل کرنا ہی لازم ہوتا۔ حد مقرر کرنے سے مقصود تو گناہ پر توبیخ و زجر کرنی اور سزا دینی و عبرت منظور ہے اور نیز یہ کہ حدود سے لوگ ظلم و زیادتی کرنے سے رک جائیں اور دوسرے آدمی ایک کی سزا سے عبرت پکڑیں۔ اور نیز یہ کہ مجرم عذاب و سزا سے خالص توبہ کی طرف رجوع کرے۔ اور یہ کہ حد کی سزا سے انسان کو عذاب آخرت یاد آ جائے اور مصالح بنی آدم کو سمجھ کر آئندہ بدیوں سے باز آ جائے۔

پھر چور کی حد میں ایک اور بات بھی ہے، وہ یہ ہے کہ چور چوری پوشیدہ طور پر کرتا ہے، جیسا کہ سرقہ کا لفظ خود اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کی طرف چوری سے دیکھتا ہے، جب کہ وہ اس کو خفیہ نظر سے دیکھتا ہو اور نہ چاہتا ہو کہ اس کو کوئی معلوم کرے۔ چوری کا ارادہ کرنے والا پوشیدہ اور خائف رہتا ہے کہ مبادا اس کے مکان سے کوئی واقف ہو، تو ماخوذ ہو جائے اور جب وہ کوئی چیز اٹھاتا ہے، تو اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بھاگنا اختیار کرتا ہے۔ اور دونوں ہاتھ انسان کے لئے ایسے ہیں کہ جیسا پرندے کے لئے اڑنے کے دو بازو ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ میں فلاں شخص کا بازو بن گیا، جب کہ تم نے اس کو دیکھا ہو کہ وہ اکیلا جاتا ہو، تو اس کے ساتھ شامل ہو کر اس کے مصاحب بن جاؤ۔ پس چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا اس کے بازوئے قوت کو کوتاہ کرنے اور دوبارہ چوری کرے، تو اس کو بآسانی پکڑنے کے لئے ہے۔ جب پہلی دفعہ چوری کرے، تو اس کا بازو کاٹا جائے تا کہ اس کے دوڑ دھوپ میں کمزوری واقع ہو جائے۔ پھر دوسری دفعہ چوری کرے، تو اس کا ایک پاؤں قطع کیا جائے، تا کہ اس کے بھاگنے میں زیادہ کمزوری ہو جائے اور کوئی بھی اس کو بھاگنے نہ دے۔ اور تیسری دفعہ چوری کرے، تو اس کا دوسرا ہاتھ قطع کیا جائے۔ اور چوتھی بار چوری کرے، تو اس کا دوسرا پاؤں بھی قطع کیا جائے۔ پس وہ اس طرح سے گوشت کا ایک ٹکڑا بن جائے گا۔ اور لوگ اس کے دکھ سے آرام پائیں گے۔

اور زانی کی شرمگاہ سزا میں اس لئے قطع نہیں کی جاتی کہ زانی تو سارے بدن کے ساتھ زنا کرتا ہے اور تمام بدن سے لذت لیتا اور قضائے شہوت کرتا ہے۔ اور زنا کا فعل اکثر زانیہ کی مرضی و رضا پر بھی ہوتا ہے۔ پس وہ اس امر سے نہیں ڈرتا، جس سے چور یعنی طلب کرنے اور ڈھونڈنے سے ڈرتا ہے۔ پس

زنا میں غیر مُحصن کے سارے بدن کو درّے لگانے اور مُحصن کو سنگسار کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔

چونکہ زنا بڑے اور کبائر گناہوں میں سے ہے، کیونکہ زنا سے نسب مل جاتے ہیں اور نسب مل جانے سے تعارف وشناخت اور دین کے زندہ کرنے کی امداد باطل ہو جاتی ہے اور اس میں ہلاکت کشت وتباہی نسل انسانی لازم آتی ہے۔ پس زنا اکثر امور میں قتل سے مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس میں قصاص سے توبیخ وتنبیہہ کی گئی ہے، تاکہ ایسا فعل کرنے سے لوگ رک جائیں اور دنیا میں امن واصلاح ہو۔ کیونکہ اصلاح سے انسان عبادات الٰہی کی طرف رغبت کرتے ہیں اور عبادات الٰہی نعمائے اُخروی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

زانی کی شرمگاہ کو قطع کرنے میں اس کو آیندہ نسل سے محروم کرنا لازم آتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ کی مصلحت وحکمت کے برخلاف ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگوں کی اولاد وذریت ان کی عورتوں سے بکثرت پیدا ہو اور قطع شرمگاہ سے قطع نسل لازم آتا تھا۔ لہٰذا یہ امر مشروع نہ ہوا۔ الغرض زانی کی شرمگاہ قطع کرنے میں اور بھی مفاسد ہیں ۔ بے ستری، اتلاف نسل وغیرہ وغیرہ۔ ازاں جملہ زانی تو سارے بدن سے جرم زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو پھر سارے جسم کو چھوڑ کر ایک عضو کو سزا دینا خلاف عدل تھا۔ لہٰذا عدل اس مار کا مقتضی ہوا کہ زانی کے سارے جسم کو سزا دی جائے۔

مثنوی

او زنا کردہ جزا صد چوب بود	گو یدا و من کے زدہ کس را بعود
نے جزائے آں زنا بود ایں بلا	چوب کے ماند زنا را در جلا
مار کے ماند عصا را اے کلیم	درد نے ماند و دارا اے حکیم
تو بجائے آں عصا آب منی	چوں فیفگندی شد آں شخص سنی
یار شد یا مار شد آں آب تو	زاں عصا چو نسبت ایں اعجاب تو
ہیچ ماند آب آں فرزند را	ہیچ ماند نے شکر مر قندرا

شراب خوری۔ زناؔ۔ لواطت ۔ چوری میں کفارہ مقرر نہ ہونیکی وجہ

حضرت ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ **ما کان من المعاصی محرم الجنس کالظلم والفواحش فان الشارع لم یشرع له کفارة و لهذا لا کفارة فی الزنا و شراب الخمر و قذوا المحصنات وا لسرقة و لیس ذالک تخفیفا عن مرتکبیها بل**

لان الکفارۃ لا تعمل فی ھذا الجنس من المعاصی و انما عملھا فیما کان مباحا فی الاصل و حرم لعارض کا لوطی فی الصیام و الاحرام۔ترجمہ۔جو گناہ حرام کی جنس سے ہوں مثلاً ظلم اور امور فاحشہ ان کے لئے شارع نے کوئی کفارہ مقرر و مشروع نہیں فرمایا۔اس لئے زنا،شراب خوری،محصنہ عورتوں پر تہمت لگانے اور چوری کرنے میں کوئی کفارہ مشروع نہیں ہوا۔اوران گناہوں کا کفارہ نہ مشروع ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے ارتکاب کرنے والوں سے تخفیف نہیں کی گئی، بلکہ ان میں کفارہ اس لئے مشروع نہیں ہوا کہ اس جنس کے گناہوں میں کفارے کا عمل مناسبت نہیں رکھتا۔ کفارے کی تعمیل وہاں مشروع ہے کہ جو امر دراصل مباح ہو اور کسی عارضی سبب سے حرام ہو جائے۔مثلاً ماہ رمضان و حالت احرام میں جماع کرنے سے کفارہ دینا لازم آتا ہے،مگر عنوان الصدر گناہ کبائر اور بڑے گناہ ہیں ان میں سزا ہے۔

حالت حیض میں عورت سے جماع کرنے میں تعیین کفارہ کی وجہ اور عورت کے دُبر میں جماع سے عدم کفارہ کا راز

عن ابن عباس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الذی یاتی امراتہ و ھی حائضٌ قال یتصدق بدینارٍ او بنصف دینارٍ ۔ترجمہ۔اس شخص کے بارے میں،جو اپنی عورت سے حالت حیض میں جماع کرے،نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ایک دینار یا آدھا دینار بطور کفارہ وصدقہ دے دے۔(ابن ماجہ)

ہم قبل ازیں اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ امور،جو دراصل مباح ہیں مگر کسی عارضی امر سے حرام ہو جائیں،ان کا ارتکاب ایسی عارضی حالت میں موجب کفارہ ہے۔حالت حیض عارض ہونے سے جماع حرام ہوا تھا،لہٰذا اس میں کفارہ مقرر ہوا۔اور یہ امر موجب قیاس ہے۔اور دُبر میں عورت سے جماع کرنے میں کفارہ مقرر نہیں ہوا کہ یہ امر کبھی مباح نہیں ہوا اور اس امر کا قیاس حالت حیض کے جماع پر نہیں ہوسکتا اور نہ اس میں کفارہ کا معمول ہے۔اگر دبر میں جماع کرنے سے کفارہ واجب ہوتا،تو زنا و لواطت میں بطریق اُولیٰ کفارہ واجب ہوتا۔لہٰذا اس امر میں یعنی عورت کے دبر میں جماع کرنے سے کفارہ مقرر نہیں ہوا،کیونکہ یہ سخت قبیح فعل ہے اور بہت بڑا گناہ ہے،اور یہ امر کبھی مباح نہیں ہوا۔پس کفارات میں شارع کا یہی طریق ہے کہ جو امر مباح ہیں اور کسی عارضی امر سے حرام ہو جائیں،ان میں کفارات ہیں۔اور جو امر مدام حرام ہیں،ان میں حدود و تعزیرات ہیں۔اور یہ امر نہایت مطابق حکمت و

مصلحت کے ہے۔

قتل میں دو گواہ اور زنا میں چار گواہ مطلوب ہونے کی وجہ

قتل میں دو گواہوں پر اکتفا کرنا اور زنا میں چار گواہ مانگنا نہایت حکمت و مصلحت الٰہی پر مبنی ہے۔ کیونکہ شارع کا مقصود قصاص وخونریزی اور زنا کی حد مقرر کرنے میں احتیاط ہے۔ پس اگر قتل میں چار گواہ ہی مطلوب ہوتے، تو خونریزیاں بکثرت ہوتیں اور لوگ قتل کرنے میں زیادہ دلیر ہو جاتے اور اکثر مقتولوں کے قاتل قصاص سے بچ کر زیادہ خونریزی کا باعث بنتے۔

اور زنا میں چار گواہوں کا مطلوب ہونا اسکی پردہ پوشی پر مبالغہ کرنیکی وجہ سے ہے، کیونکہ خدا نے اسکی پردہ پوشی مقدر کی ہے۔ لہٰذا خدا کی شرع و تقدیر اسکی پردہ پوشی پر جمع ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کے متعلق ایسے چار گواہ مطلوب ہیں، جو فعل زنا و چشم دید واقعہ زنا ایسے طور پر بیان کریں، جس میں احتمال وگمان کا شائبہ نہ ہو۔ ایسا ہی اقرار زنا میں چار بار سے کم اقرار پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس میں بھی اس امر کی پردہ پوشی پر مبالغہ ہے، جسکا اظہار کرنا خدا تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اور اس امر شنیع و قبیح کی مومنوں میں اشاعت کرنے والے کیلئے خدا تعالیٰ دنیا و آخرت میں عذاب الیم و وعید شدید بیان فرماتا ہے۔

تین درہم کی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹنے کے حکم کا راز

تین درہم کی مقدار مخصوص تک چرانے پر چور کا ہاتھ کاٹنے کی وجہ یہ ہے کہ ضرور تھا کہ مال مسروقہ کے لئے ایک حد مقرر ہوتی، جس میں چور کا ہاتھ کاٹنا لازم ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر ناممکن تھا کہ ایک پیسہ یا گندم وغیرہ کا ایک دانہ یا ایک خُرما چرائے جانے پر چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم کیا جاتا۔ اور نہ شریعت اسلامیہ کی مصلحت اس مقدار حقیر کے چرائے جانے پر قطع ہاتھ کا حکم کرتی ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی مصلحت وحکمت اور اس کی رحمت و احسان اس امر کے مقتضی ہیں۔ پس بالضرور چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے ایک ضابطہ وحدّ چاہئے تھی۔ لہٰذا تین درہم جمع قلیل کا پہلا مرتبہ ہے اور وہ بھی کثیر میں شمار ہوتا ہے۔ لوگوں کی عادت ہے کہ اگر ان کے اموال میں سے حقیر و نہایت قلیل مقدار چرائی جائے، تو وہ پرواہ نہیں کرتے، کیونکہ ان کو ایسی مقدار کے گم ہونے سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔ اور تین درہم کی مقدار میں ہاتھ کاٹنے کی حکمت ظاہر ہے، کیونکہ میانہ خرچ کرنے والے ایک مرد اور اس کے عیال و اطفال کا ایک دن کا گذارہ تین درہم میں بخوبی ہو جاتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کو اپنے اہل وعیال کے دن رات کے گزارے کی فکر وخطر رہتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ **من اصبح منا فی سربه معافًی فی بدنه**

عنده قوت یومه فکانما حیزت له الدنیا بحذا فیرها ۔ترجمہ۔جس شخص نے ہم میں سے سلیم النفس وصحیح البدن ہونے کی حالت میں صبح کی اوراس کے پاس اس کے اس دن کا گذارہ موجود ہو،تو گویا اس کے لئے ساری دنیا کی دولت جمع ہوگئی۔

احناف کے نزدیک دس درہم چرانے پر چور کا ہاتھ کاٹنا چاہئے ، کیونکہ دس جمع کثیر کا پہلا عدد ہے۔بہرحال قطع دست کے لئے ایک حد کی تقرری ضروری تھی۔

شراب کا ایک قطرہ پینے سے حد کا واجب ہونا

اورکئی سیر پیشاب پینے وگندگی کھانے سے عدم وجوب حد کی وجہ

ا۔یہ امر شریعت اسلامیہ کی خوبیوں میں سے ہے اور مطابق عقول سلیمہ وموافق مصالح عامہ کے ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں بول (پیشاب) پینے وگندگی کھانے سے جبلی وطبعی نفرت و کراہیت رکھی ہوئی ہے اور یہ طبعی نفرت ہی انسان کو ایسے امور پر اقدام کرنے سے روکنے میں کافی ووافی ہے۔لہٰذا اس میں حد کی ضرورت نہ ہوئی۔البتہ شراب پینے کے لئے طبیعتوں کا زیادہ تر خواہشمند ہونے کے سبب ان کے لئے سخت سزا کا مقرر کرنا مناسب ہوا، تاکہ کم وبیش شراب پینے سے لوگ رک جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ زنا میں سخت سزا مقرر ہوئی۔اور چوری میں ہاتھ کاٹنا اور شرابخوری میں درّے لگانا مقرر ہوا۔اور تھوڑی سی شراب پینے سے بھی خواہ وہ نشہ آور نہ ہو، حد مقرر ہوئی، کیونکہ تھوڑی شراب پینا زیادہ کی طرف دعوت دینے کا باعث بن سکتا ہے۔

۲۔شراب پینے سے جو فساد وضرر خاص ومتعدی ہوتا ہے، وہ پیشاب پینے وگندگی کھانے کی بہ نسبت کئی چند زیادہ ہے، جو دوسروں تک پہنچتی ہے۔لیکن بول پینے یا گندگی کھانے کا ضرر اسی شخص تک محدود رہتا ہے جو پیتا یا کھاتا ہے۔

چور کا ہاتھ کاٹ کر تیل میں داغ دینے کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **اقطعوه ثم احسموه** ۔یعنی چور کا ہاتھ کاٹو، پھر اس کو تیل سے داغ دو۔داغ دینے کا حکم اس لئے ہے کہ قطع کرنے کا اثر اس کے جسم میں بیماری پھیلانے کا موجب نہ بنے ،جس سے وہ شخص ہلاک ہوسکتا ہے۔داغ دینے سے زخم خراب ہونے سے بچ جاتا ہے۔پھر حکم فرمایا کہ اس کا ہاتھ اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے تاکہ لوگ اس کا چور ہونا جان لیں۔اور ظلم اور حد کے قطع کرنے میں فرق ہوجائے۔

چور پر سزا کے ساتھ تاوان مقرر کرنے کی وجہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چوری میں، جو نصاب سے کم ہو، چور کو سزا دینے اور دو چند تاوان دینے کا حکم اس لئے دیا کہ چور کو اس کے اس فعل سے روکنا اور اس کو مالی و بدنی سزا دینا ضرور ہے۔ اس لئے کہ انسان کو بسا اوقات جسمانی تکلیف زیادہ تر باز رکھتی ہے۔ اگر مال مسروقہ کے برابر تاوان کا حکم ہوتا، تو چوری کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا۔ اس لئے دو چند سزائے تاوان دینے کا حکم کیا گیا کہ آئندہ کو کبھی چوری کا قصد نہ کرے۔

کثرت کلام سے ممانعت کی وجہ

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ **وھل یکب الناس علی مناخرھم الا حصائد السنتھم**۔ یعنی لوگوں کو کوئی چیز نتھنوں کے بل اوندھا نہ کرے گی، مگر جو ان کی زبان نے کاٹا ہے۔

زبان کے آفات اکثر اجنات اور سماحت اور عدالت تین خلل انداز ہوتے ہیں۔ کیونکہ کثرت کلام کرنا ذکر الٰہی سے غافل کرتا ہے۔ اور بیہودہ باتیں اور ان کے مثل باہم فساد ڈالتے ہیں۔ اور آدمی کی زبان سے جو کلام نکلتا ہے دل اس کی کیفیت سے متکیف ہو جاتا ہے، مثلاً جب غصے کا کلمہ اس کی زبان سے نکلتا ہے، تو دل کے اندر اس کا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور علیٰ ھذا القیاس۔ اور دل کے اندر اس کیفیت کو پیدا ہونا اس کیفیت کے متمثل ہونے اور اس کے تشبّہ کا سبب ہوتا ہے۔ لایعنی کلام کرنے والا جب خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو ذکر الٰہی میں اس کو کچھ حلاوت نہیں ہوتی۔ اور اذکار میں کچھ تدبر نہیں کرسکتا۔ یہی سبب ہے کہ بے فائدہ باتوں سے ممانعت کی گئی ہے۔ آفات لسان میں سے یہ امر بھی ہے کہ اس سے لوگوں میں فتنے وفساد پیدا ہوتے ہیں اور غیبت اور مجادلات اور لوگوں کو بہکانے کے اسباب اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ گالیاں بکنے اور عورتوں کے محاسن کا ذکر کرنے سے قوت سبعیہ اور شہویہ کے اثر سے نفس متاثر ہوتا ہے اور دل میں سے حلاقت عبادت وانکسار جاتا رہتا ہے۔

شراب کی حد میں حضرت عمرؓ کا چالیس درے پر چالیس درے بڑھانے کی وجہ

عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے شراب کی حد کے بارے میں مشورہ کیا اور فرمایا کہ لوگ شراب پینے میں تجاوز کرتے جاتے ہیں، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نشہ باز آدمی جب نشے میں ہوتا ہے، تو بکواس کرتا ہے اور بکواس کرنے سے افترا کرنے والا ٹھہرتا ہے۔ پس شراب کی حد کو افترا کی حد کے برابر کر دیجئے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے شرابی کی حد اسی (۸۰) درّے ٹھہرائے اور شراب

کی اصلی حد پر چالیس درّے زیادہ کردیئے۔ **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم** ۔(ترجمہ ازمرتب۔میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔تم ان میں سے کسی کی بھی پیروی کرتے ہو،تو ہدایت پاتے ہو) پس حضرت عمرؓ کا اس امر میں یہ شیوہ تھا کہ جب آپ کے پاس کوئی مدمن الخمر(پکا شرابی) پیش ہوتا تھا،تو اس کو اسی (۸۰) درّے لگواتے تھے اور جب کوئی گاہے بگاہے شراب پینے والا پیش ہوتا تھا،تو اس کو چالیس درے مارنے کا حکم فرماتے تھے۔اور یہی طریق حضرت عثمانؓ کا تھا۔

حقیقت مقادیر حدود

جیسے گناہوں کے فساد وضرر کم وبیش ہوتے ہیں،ایسا ہی انکی سزائیں بھی کم وبیش رکھی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ مضر ومفسد گناہ تین درجہ کے ہیں۔(۱)اصلی کفر وعارضی (۲)قتل (۳) زنائے محصن۔ ہر ایک عاقل غور کرے،تو اسکو معلوم ہو جائے گا کہ ان گناہوں کا فساد وضرر دنیا میں بہت بڑا ہے۔اور یہی وہ تین گناہ ہیں، جنکا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعود کے سوال پر فرمایا ہے۔عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ **یا رسول اللہ ایّ ذنب اعظم قال ان تجعل للہ نداً و ھو خلقک قال قلت ثم ایّ قال ان تقتل ولدک خشیة ان یطعم معک قال قلت ثم ایّ قال ان تزنی بحلیلة جارک فانزل اللہ عزو جل وَ الَّذِیۡنَ لَا یَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَ لَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لَا یَزۡنُوۡنَ** ۔ترجمہ۔یعنی یارسول اللہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔آپ نے فرمایا۔وہ یہ ہے کہ تو خداتعالیٰ کا کوئی شریک ٹھہرائے،حالانکہ خداہی نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ابن مسعود کہتا ہے کہ میں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ اسکے بعد بڑا گناہ کیا ہے۔فرمایا۔وہ یہ ہے کہ تو اپنے بیٹے کو اس خوف سے قتل کرڈالے کہ وہ تیرے ساتھ روٹی کھائے گا۔ابن مسعود کہتا ہے کہ پھر میں نے سوال کیا کہ اسکے بعد بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا۔وہ یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی جورو سے زنا کرے۔چنانچہ خداتعالیٰ بھی قرآن شریف میں اسی لحاظ سے ان گناہوں کا ترتیب وارذکر فرماتا ہے کہ خدا کے فرمانبردار بندے وہ ہیں،جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور جس انسان کا قتل کرنا حرام ٹھہرا ہے،اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے۔

بعدازیں اموال کی چوری کا ضرر اس سے کم تھا،لہٰذا چوری کی سزا جسم کے بعض اطراف کا قطع کرنا مقرر ہوا۔پھر قذف وتہمت لگانے کا فساد وضرر اس سے کم تھا،لہٰذا اس کی سزا اس سے بھی کم ہوئی اور وہ درّے لگانا ہے۔پھر منشّی چیز کے پینے کا ضرر اس سے بھی کم تھا،لہٰذا اس کی سزا ان گناہوں سے کم

رکھی گئی ہے۔علی ھذا القیاس۔اور گناہوں کے مفاسد وضرر کمی وبیشی شدت وضعف کے باعث مختلف و متفاوت ہوتے ہیں۔مثلاً اجنبی عورت کو دیکھنا اوراس سے بوس وکنار کرنا وغیرہ وغیرہ۔لہٰذا ایسے امور کی سزا بحسب مصلحت زمان ومکان وبحسب مجرم ائمہ اور والیان ملک وحکام کے اجتہاد ورائے پر چھوڑی گئی ہے۔اور جو شخص تمام ازمنہ وامکنہ واحوال میں یکساں سزا برتنے کی رائے دیتا ہے، وہ حکم شرع سے سخت ناواقف ہے۔یہی وجہ ہے کہ امر سزا وحدود میں صحابہ کرام کے اقوال وخلفائے راشدین کے فیصلے مختلف ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شرب کی حد میں چالیس سے زیادہ درّے لگوائے، حالانکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شرابی کو چالیس درے لگوائے۔اور حضرت عمرؓ نے بعض مجرموں پر وہ جرمانے و مالی تاوان مقرر کئے، جو نبی علیہ السلام نے نہیں کئے تھے اور لوگوں پر وہ احکام نافذ فرمائے،جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درگذر کیا تھا۔جو شخص حضرت عمرؓ کے امور واحکام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے معارض ومتناقص سمجھے،اس کا قصور فہم وقلت علم وناسمجھی ہے۔

حکمت حدود وکفارات

حدود وکفارے اس لئے مقرر ہوئے کہ گناہوں پر زجر وتوبیخ لوگوں کو ہوتی رہے، جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔لِيَـذُوقَ وَبَـالَ اَمْـرِهٖ ۔ترجمہ۔یعنی تا کہ اپنے کئے کا مزہ چکھے۔اگر حدود مقرر نہ ہوں،تو سرکش لوگ شرارتوں سے باز نہیں آتے اور سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔کفارات بھی اسی امر کے لئے ٹھہرائے گئے ہیں۔

وجہ تقرری قصاص

قصاص قتل وجنگ وفساد کو باز رکھنے کیلئے قرار دیا گیا ہے۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَـكُـمْ فِـى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا اُولِى الْاَلْبَابِ۔ترجمہ۔یعنی اے عقلمند وقصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

حرمت قتل کی وجہ

اگر باہمی لڑائیاں لوگوں میں رہیں،تو آبادیاں اور شہر خراب اور ویران ہو جائیں اور تمام امور معاش میں خلل پڑ جائے اور تمدنی زندگی میں خطرناک تباہیاں اور بربادیاں ظاہر ہوں،اس واسطے قتل اور مارنا پیٹنا حرام ہوا۔پس قتل اگر تجویز ہوگا،تو کسی بڑے قصاص وغیرہ کی مصلحت کی وجہ سے تجویز ہوگا۔کبھی لوگوں میں کینہ کا جوش پیدا ہوتا ہے اور قصاص کا ان کو اندیشہ وفکر ہوتا ہے۔اس لئے کھانے میں زہر ملا دیتے ہیں یا جادو سے قتل کر ڈالتے ہیں۔یہ بھی قتل کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔قتل تو برملا ہوتا

ہے،اس سے نجات بھی ممکن ہے لیکن اس سے تو بچنا مشکل ہے۔ بہر حال ایسے امور خرابی تمدن کے سبب اور پبلک میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔

حرمت سرقہ کی وجہ

معاش کے طریقے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے یہ قرار دیئے ہیں کہ مباح زمین سے کوئی چیز حاصل کریں۔اس میں مواشی چرائیں، کھیتی، باڑی، زراعت، تجارت، کیاری سے معاش کے ذرائع پیدا کریں۔شہروں و دیہات میں مذہب کا انتظام کریں۔ چوری و غصب، جن امور سے شہروں کی تباہی لازم آئے، اس سے پرہیز کریں۔ یہ ایسے امور ہیں کہ ان سے تمدن میں خلل آتا ہے اور امن عامہ میں اختلال کی صورت ہے۔ یہ امور خدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں، کیونکہ ان سے عالم کی خرابی لازم آتی ہے۔

حرمت زنا کی وجہ

ا۔فاسق و فاجر کا دل ٹٹولا جائے، تو صاف ظاہر ہوگا کہ وہ تدابیر نافع کے معتقد ہیں۔لیکن ان پر نفسانی خواہشات غالب آ جاتی ہیں، جو ان سے نافرمانیاں کراتی ہیں۔وہ خود خوب جانتے ہیں کہ ہم گناہگار ہیں اور لوگوں کی بہو بیٹیوں سے زنا کرتے ہیں۔اور اگر کوئی ان کی بیوی یا بہن سے ایسی حرکت کرے، تو غصے سے کانپنے لگیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ لوگوں پر ان برائیوں کا وہی اثر ہوتا ہے، جو ان پر ہوتا ہے۔اور ایسے ایسے اثروں اور امور کا ہونا انتظام تمدن کے لئے سخت مضر ہے۔لیکن خواہشات نفسانیہ ان کو اندھا کر دیتی ہیں۔

۲۔تمدن میں بہ نسبت عورتوں کے زیادہ دخل قوی مردوں کو ہوتا ہے۔اس واسطے بالہام الٰہی ان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہر شخص کی بیوی دوسرے سے علیحدہ ہو۔ اس میں دوسرا شخص کسی قسم کی مزاحمت نہ کرے۔ زنا کی اصل یہی ہے۔

۳۔زنا سے خلط نسب ہو جاتا ہے اور یہ قتل و فساد کا منبع ہے۔ یہ طریق نہایت قبیح اور بُرا ہے۔اس لئے خدا تعالیٰ اس کے منع کرنے میں فرماتا ہے۔لَا تَقْرَبُوْا الزِّنَا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَةً وَ سَاءَ سَبِیْلاً۔ ترجمہ۔یعنی ان اسباب کے نزدیک بھی نہ جاؤ، جن سے زنا تک نوبت پہنچے۔ کیونکہ زنا بے حیائی کا کام اور برا طریق ہے۔یعنی بیگانہ عورتوں کو نہ دیکھو اور نہ ان کے حسن و محاسن کی باتیں سنو، جن کو دیکھ کر تمہارے خیالات زنا کی طرف برانگیختہ ہوں اور جن سے زنا تک نوبت پہنچے۔

حرمت لواطت کی وجہ

ایسی عادت سے نسل انسانی کی بیخ کنی ہوتی ہے۔اس طریق سے گویا انسان اس نظام الٰہی کو بگاڑ کراس کے مخالف طریقہ سے قضائے حاجت کرتا ہے۔اس وجہ سے ان افعال کا بُرا و مذموم ہونا لوگوں کی طبیعتوں میں جم گیا ہے۔فاسق فاجر ایسے افعال کرتے ہیں،لیکن ان کا اقرار نہیں کرتے۔اگر ان کی طرف ایسے افعال کی نسبت کی جائے،تو شرم وحیا سے مرجانا گوارا کرتے ہیں۔ہاں جب منبع فطرت سے ہی جدا ہو گئے ہوں،تو ان کو کسی قسم کی حیا باقی نہیں رہتی اور برملا وہ ایسے افعال عمل میں لاتے ہیں۔

حد۔تعزیر۔کفارہ میں کیا فرق ہے؟

حد عربی لفظ ہے۔اس کے معنے باز رکھنے والا اور اندازہ کرنے کے ہیں۔اور اصطلاح شریعت میں کسی گناہ کی سزا دینے کا جو اندازہ خدا نے مقرر کر دیا اس کو حد کہتے ہیں۔مثلاً محصن زانی کو سنگسار کرنا اور غیر محصن کو درے لگانا اور چور کے ہاتھ کاٹنا وغیرہ۔

تعزیر وہ ہے کہ جس گناہ کی سزا میں خدا نے کوئی حد و کفارہ مقرر نہیں کیا، بلکہ اس کی سزا حسب حال زمان و مکان حکام کی رائے پر چھوڑی گئی ہے۔لغت میں تعزیر کے معنے ادب کرنا۔تعظیم کرنا آئے ہیں۔یہ امر خدا تعالیٰ کے احکام کی عزت و تعظیم برحال و برپا رکھنے کے لئے قائم کیا گیا ہے،تاکہ لوگوں کے دلوں میں احکام الٰہی کی عزت وشوکت قائم رہے۔اور ان کی ہتک عزت نہ ہو۔

کفارہ وہ ہے، جو کہ ان امور میں بدلہ وتاوان مقرر ہو، جو اصل میں مباح ہوں،مگر کسی عارضی سبب سے حرام ہو جائے۔مثلاً ماہ رمضان اور حالت احرام میں جماع کرنا۔اور ان کا کفارہ یہ ہے کہ ایک روزہ کے بدلے پے درپے دو ماہ روزے رکھے یا ساٹھ مساکین کو طعام کھلائے۔اور حالت احرام میں جماع کا کفارہ قربانی دے۔اعلام الموقعین میں لکھا ہے۔ **و اما التعزیر ففی کل معصیةٍ لاحَدَّ فیها و لا کفارة فان المعاصی ثلثة انواع . نوع فیه الحد و لا کفارة فیه و نوع فیه الکفارة و لا حد فیه و نوع لا حد فیه و لا کفارة . فالاول کالسرقة و الزنا و القذف . والثانی کالوطی فی نهار رمضان و الوطی فی الاحرام. والثالث قبلة الاجنبیة والخلوة بها و دخول الحمام بغیر میزر و اکل المیتة والدم و لحم الخنزیر و نحو ذالک . فاما النوع الاول فالحد فیه مغن عن التعزیر . واما الثانی فهل یجب مع الکفارة فیه تعزیر ام لا علی قولین . و اما الثالث ففیه التعزیر قولاً واحداً** ۔ترجمہ۔ تعزیر ان گناہوں میں مشروع ہے،جن میں کوئی حد اور کفارہ نہیں ہے۔کیونکہ گناہ کی تین اقسام ہیں۔ ایک وہ قسم ہے،جن میں حد مقرر ہے اور کفارہ مقرر نہیں ہے۔اور ایک وہ قسم ہے،جن میں کفارہ ہے اور

حد مقرر نہیں ہے۔ اور ایک وہ قسم ہے، جن میں نہ کوئی حد مقرر ہے اور نہ کفارہ ہے۔ پہلی قسم چوری۔ زنا۔ تہمت ہے، جن میں حد مقرر ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے، جن میں کفارہ مقرر ہے، مثلاً رمضان میں دن کے وقت اور حالت احرام میں جماع کرنا۔ اور تیسری قسم وہ ہے، جن میں نہ کوئی حد ہے اور نہ کفارہ ہے، ان کے لئے تعزیر ہے۔ مثلاً اجنبی عورت کو بوسہ دینا اور اس کے ساتھ علیحدہ مکان میں بیٹھنا۔ اور حمام میں بغیر ازار کے داخل ہونا اور مردار و گوشت خوک کھانا وغیرہ۔ اور پہلی نوع میں حد ہی تعزیر کی جگہ کافی ہے۔ اور دوسری میں بموجب دو اقوال کے تعزیر مع کفارہ واجب ہے۔ اور تیسری میں محض تعزیر ہے۔

وجہ حرمت وعدہ شکنی

عہد شکنی اس لئے حرام ہے کہ جس انسان کے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے، وعدہ شکنی سے اس کو ضرور تکلیف پہنچتی ہے۔ اسکو وعدہ کنندہ پر اعتبار و انتظار سارہتا ہے۔ جب وعدہ کنند دیدہ و دانستہ کسی کو ضرر و تکلیف پہنچانے کی غرض سے ناحق وعدہ توڑتا ہے، تو خطیرۃ القدس سے اس پر لعنت الٰہی برستی اور ملائکہ رحمت کی توجہ اس سے برگشتہ ہو جاتی ہے اور ملال وحزن کی صورتیں اس کے دامن گیر ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے **اُوْفُوْا بِالْعُقُوْد** کا امر فرمایا ہے، تا کہ انسان نقض عہد کی وجہ سے مستحق لعنت بھی نہ بنیں۔

اسلام میں ڈاڑھی رکھنے اور مونچھوں کے کٹوانے کی وجہ

ڈاڑھی ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے چھوٹے کی تمیز ہو سکتی ہے اور مردوں کے لئے ایک قسم کا جمال اور ان کی شکل کو پورا کرنے والی ہے۔ اس واسطے اس کا بڑھانا ضروری ہوا اور اس کا ترشوانا مجوس کا طریقہ ہے۔ اور اس میں خلق الٰہی کی تغییر بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاڑھی ترشوانے کی وجہ سے بڑے بڑے اور خاندانی لوگ رذیلوں میں شمار ہو جاتے ہیں۔ تمام انبیاء وصلحاء ڈاڑھی رکھتے آئے ہیں۔ اگر ڈاڑھی منڈوانے میں وہ مصلحت و فائدہ دیکھتے، تو وہ سب سے پہلے منڈواتے، کیونکہ ایسے لوگ تمام دنیا کے لئے بہتری و بھلائی کا نمونہ بن کر آیا کرتے ہیں۔

جس کی مونچھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں، جب وہ کچھ کھاتا ہے یا پیتا ہے، تو اس میں ملوث ہو جاتی ہیں اور میل کچیل میں آلودہ رہتی ہیں۔ اور یہ مجوس کا طریقہ ہے، جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **خالفوا المشرکین قصوا الشوارب و اعفوا اللحی** ۔ یعنی مشرکوں کی

مخالفت کرو۔ مونچھیں ترشواؤ اور ڈاڑھیاں بڑھاؤ۔

والدین کی نافرمانی حرام ہونے کی وجہ

والدین اولاد کی تربیت میں ایسے ایسے شدائد جھیلتے اور ان کی پرورش میں محنتیں اور مشقتیں اپنی جانوں پر برداشت کرتے ہیں، جو محتاج بیان نہیں ہیں۔ اس لئے والدین کی خدمت گذاری لازمی طریقہ قرار دیا گیا ہے۔

وجہ حرمت شطرنج۔ کبوتر بازی۔ بٹیر بازی۔ پتنگ بازی۔ تاش بازی وغیرہ

بعض لوگ غم غلط کرنے والی چیزوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے نفس کو دنیا و آخرت سے بے غمی ہو جاتی ہے اور اوقات ضائع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شطرنج اور کبوتر بازی و بٹیر بازی اور دیگر جانوروں کا لڑانا وغیرہ۔ کیونکہ انسان جب ان چیزوں میں مشغول ہو جاتا ہے، تو پھر اس کو کھانے اور پینے اور ضروریات کی خبر نہیں رہتی۔ بلکہ بسا اوقات پیشاب پاخانہ روکے بیٹھا رہتا ہے اور وہاں سے نہیں ٹلتا۔ پھر اگر ایسی چیزوں میں مشغول رہنے کا دستور عام ہو جائے، تو تمام شہر والے شہر پر بوجھ بن جائیں اور اپنی جان کی ان کو خبر نہ رہے۔ ایک بار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کو ایک کبوتر کے پیچھے جاتے دیکھا، تو فرمایا کہ ایک شیطان ہے، جو اپنے شیطان کے پیچھے جاتا ہے۔ ایسا ہی آنحضرتؐ نے جانوروں کے لڑانے سے منع فرمایا ہے۔

مردوں کو سونا و ریشم پہننا منع ہونے کی وجہ

ا۔ سونا ایک ایسی چیز ہے جس پر عجمی لوگ فخر کرتے ہیں۔ اور اگر سونے کا زیور پہننے کا عام دستور جاری ہو، تو کثرت سے طلب دنیا کی ضرورت پڑے بخلاف چاندی کے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی بابت تشدد فرمایا اور کہا و **لیکن علیکم بالفضة فا لعبوا بها** ۔تم چاندی کو اختیار کرو اور اس سے کھیلو۔

دوسری اصل یہ ہے کہ عورتوں کو آراستگی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، تاکہ ان کے خاوندوں کو رغبت ہو۔ یہی سبب ہے کہ تمام عرب و عجم میں بہ نسبت مردوں کے عورتوں کی آراستگی کا زیادہ تر دستور ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ عورتوں کو بہ نسبت مردوں کے زیادہ زینت کی اجازت دی جائے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **اُحِلَّ الذهب والحرير لاناث امتی و حرم علی ذكورها** . یعنی سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال ہوا اور مردوں پر حرام کیا گیا۔

ایک شخص کے ہاتھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی دیکھ کر فرمایا۔تم میں سے کوئی شخص آگ کے انگارے کا ارادہ کر کے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔چاندی کی انگوٹھی کو مردوں کے لئے آپ نے جائز فرمایا۔حریر (ریشم) کے متعلق فرمایا **من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسه یوم القیامة** ۔یعنی جس نے دنیا میں حریر پہنا، تو وہ قیامت کے دن اس کو نہ پہنے گا۔ایسا ہی سونے اور چاندی کے برتن میں پانی پینا منع فرمایا۔ **لا تشربوا فی آنیة الذهب و الفضة و لا تاکلوا فی صحافها فانها لهم فی الدنیا و لکم فی الآخرة** ۔ترجمہ۔سونے اور چاندی کے برتن میں مت پیو اور نہ اسکی رکابی میں کھاؤ، کیونکہ انکے لئے تو وہ دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے وہ آخرت میں ہیں۔

۲۔عورتوں کے لباس وتشبیہ کو مردوں سے متمیز کرنا ضروری تھا، لہٰذا سونا و چاندی و ریشم پہننا بالعموم عورتوں کے لئے مخصوص ہوا اور مردوں کے لئے حرام ہوا۔اس امر کی طرف حضرت ابن قیم بھی اشارہ فرماتے ہیں۔ **الذهب و الحریر علی الرجال حرم الله ذریعة التشبیه بالنساء و الملعون فاعله** ۔یعنی سونا اور ریشم مردوں پر اس لئے حرام ہوئے کہ یہ امر مردوں کو عورتوں سے تشبیہ پکڑنے سے ممانعت و رکاوٹ کا ذریعہ ہو۔کیونکہ عورت سے تشبیہ پکڑنے والوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔

۳۔خدا کو نہایت عیش پسندی ناپسند ہے۔حریر کا لباس پہننا اور سونا چاندی کے برتنوں کا استعمال کرنا۔یہ ایسے امور ہیں کہ انسان کو اسفل السافلین میں گرا دیتے ہیں اور فکروں کو تاریک رنگوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔نہایت درجہ کی عیش پسندی خراب امر ہے۔لیکن وہ ٹھیک باقاعدہ نہیں ہے کہ اسکے مواقع ظاہری نشانات سے متمیز ہوں، جن کی وجہ سے ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ سے باز پرس کر سکیں۔اور اس میں کسی کو شبہ نہ رہے کہ انہی امور میں عیش پسندی پائی جاتی ہے۔اور یہ امر معلوم ہے کہ عجمیوں کے عادات عمدہ سواریوں، بلند ایوانوں، فاخرہ لباس، قیمتی زیورات وغیرہ نہایت درجہ کی عیش پسندی تک پہنچ گئی تھیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ لوگوں کی حالت مختلف ہونے سے عیش پسندی کی بھی حالت یکساں نہیں ہوا کرتی۔ بعض لوگوں کے سامان عیش اوروں کی نظر میں تنگیٔ عیش ہوا کرتی ہے۔اور بعض لوگوں کی نظر میں جو شئے جیّد ہوتی ہے اوروں کی نظر میں وہی جید ناقص ہوا کرتی ہے۔اور یہ بھی معلوم ہے کہ منافع کا حصول جید شے سے بھی ہوتا ہے اور ردّی سے بھی ہوتا ہے۔لیکن ردی شے کا استعمال کرنا عیش پسندی نہیں ہے اور بلا مقصد جودت کسی جید شے سے منتفع ہونا یا اکثر اوقات میں کسی شخص کا جید اشیاء کا پابند ہونا عیش پسندی نہیں ہوسکتا۔اس وجہ سے شرع نے ہر صورت میں عیش پسندی کی خرابیاں بیان کیں اور ان اشیاء کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا کہ جن سے لوگ صرف عیش و آرام ہی کیلئے منتفع ہوا کرتے ہیں۔اور ان

سے عیش حاصل کرنے کی لوگوں میں عادت شائع ہوگئی ہے اور شرع نے عجمی اور رومی لوگوں کو ان اشیاء پر متفق پایا تھا۔ اس واسطے شرع نے کمال عیش و آرام کے مواقع ان امور کو قرار دے کر ان کو حرام کر دیا۔ اور بطریق قدرت جن اشیاء سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا اطراف ممالک میں انکی عادت ہے ان پر شارع نے کچھ التفات نہیں کیا۔ اسلئے حریر اور سونے چاندی کے برتن انہی محرم ابواب سے شمار کئے گئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **لا تاکلوا فی آنیة الذهب و الفضة و لا تشربوا فی صحافها فانها لهم فی الدنیا و لکم فی الآخرة** ۔اور فرمایا۔ **الذی یشرب فی آنیة الذهب و الفضة انا یجرجر فی بطنه نار جهنم** ۔ترجمہ۔ نہ کھاؤ سونے اور چاندی کے برتنوں میں اور نہ پیو سونے کے پیالوں میں، کیونکہ یہ برتن مخالفین اسلام کے لئے دنیا میں ہیں اور تم کو آخرت میں ملیں گے۔ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پیتا ہے، اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ داخل ہو کر جلائے گی۔ یہ حرمت کھانے اور پینے ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ساری وجوہات نفع کو شامل ہے۔ لہٰذا حلال نہیں ہے کہ چاندی سونے کے برتن کے ساتھ غسل اور وضو کرے یا ان سے تیل ملے یا سرمہ دانی بنائے۔

کتاب الجہاد

اسلامی جہاد کی فلاسفی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی خلق السموات و الارضین ثم برء و بث فیھن الانس و امرھم ان یسکنوا فیھن آمنین و دفع فساد بعضھم ببعض لانہ لو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض و لکن اللہ ذو فضل علی العالمین. ثم الصلوٰۃ و السلام علی خیرۃ خلقہ محمد ن المصطفیٰ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین الذین منعوا من الجور و العدوان علی احد من الناس و لو کان من الکافرین الدھر یین او المشرکین تعمیلا بکتاب اللہ الفرقان لقولہ تعالیٰ. وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللہِ ثُمَّ اَبْلَغہ، مَاْمَنَہ، ذَالِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ

اما بعد ۔واضح ہو کہ لفظ جہاد عربی زبان کا ہے، جو کہ جُہد سے مشتق ہے، جس کے معنے ہیں کوشش کرنا۔اور پھر مجاز کے طور پر دینی لڑائیوں کے لئے بولا گیا۔اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں، جو لڑائی کو یُدّ ہ کہتے ہیں، دراصل یہ لفظ بھی جہاد کے لفظ کا ہی بگڑا ہوا ہے۔وجہ یہ ہے کہ عربی زبان تمام زبانوں کی ماں ہے اور تمام زبانیں اسی میں سے نکلی ہیں۔اس لئے یُدّ ہ کا لفظ، جو سنسکرت کی زبان میں لڑائی پر بولا جاتا ہے، دراصل جُہد و جہاد ہے اور پھر جیم کو یاء کے ساتھ بدل دیا گیا۔اور کچھ تصرف کر کے تشدید کے ساتھ بولا گیا۔

جہاد کے مسئلہ کی فلاسفی اور اس کی اصل حقیقت ایک ایسا پیچیدہ امر اور دقیق نکتہ ہے کہ ہمارے مخالفین نے اپنی غلط فہمی کے باعث اسلام جیسے پاک اور مقدس مذہب کو، جو سراسر قانون قدرت کا آئینہ اور حیّ وقیّوم خدا کا جلال ظاہر کرنے والا ہے، مورد اعتراض ٹھہرایا ہے۔

اب ہم اس سوال کا جواب لکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کو جہاد کی کیوں ضرورت پڑی اور جہاد کیا

چیز ہے؟ سو واضح ہو کہ اسلام کو پیدا ہوتے ہی بڑی بڑی مشکلات کا سامنا پڑا تھا اور تمام قوتیں اس کی دشمن ہوگئی تھیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسا کہ انبیاء ورسولوں کی بعثت کی علت غائی یہ ہے کہ لوگوں کو اعتقادات صحیحہ واعمال صالحہ کی طرف دعوت کریں اور ان کی بعثت جب ہی ہوتی ہے جب دنیا میں غلط اعتقادات و بدعملیاں کثرت سے پھیل جائیں۔ پس انبیاء ورسول لوگوں کے اعتقادات شنیعہ و اعمال قبیحہ کی مذمت بیان کرتے اور ان کو نیکی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ ان کے اور ان کے گروہ کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہی اسباب تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں مشرکوں اور یہودیوں اور عیسائیوں کو نہ صرف حق کے قبول کرنے سے محروم رکھا، بلکہ سخت عداوت پر آمادہ کر دیا۔ لہٰذا وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کس طرح اسلام کو صفحہء دنیا سے مٹا دیں۔ اور چونکہ مسلمان اسلام کے ابتدائی زمانے میں تھوڑے تھے، اس لئے ان کے مخالفوں نے بباعث اس تکبر کے جو فطرتاً ایسے فرقوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا ہے، جو اپنے تئیں دولت میں، مال میں، کثرت جماعت میں، عزت اور مرتبہ میں، دوسرے فرقہ سے برتر خیال کرتے ہیں، اس وقت کے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام سے سخت دشمنی کا برتاؤ کیا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ آسمانی پودہ زمین پر قائم ہو۔ بلکہ وہ ان راستبازوں کے ہلاک کرنے کے لئے اپنے ناخنوں تک زور لگا رہے تھے اور کوئی دقیقہ ایذا رسانی کا اٹھا نہیں رکھا تھا۔ اور ان کو خوف یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مذہب کے پیر جم جائیں اور پھر ان کی ترقی ہمارے مذہب اور قوم کی بربادی کا موجب بن جائے۔ سو اس خوف سے، جو ان کے دلوں میں ایک ہیبتناک صورت میں بیٹھ گیا تھا، نہایت جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیاں ان سے ظہور میں آئیں اور انہوں نے دردناک طریقوں سے بے شمار مسلمانوں کو ہلاک کیا۔ اور ایک زمانہ دراز تک، جو تیرہ برس کی مدت تھی، ان کی طرف سے یہی کارروائی جاری رہی۔ اور نہایت بے رحمی سے خدا کے وفادار بندے اور نوع انسانی کے فخر ان شریر درندوں کی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور یتیم بچے اور عاجز و مسکین عورتیں کوچوں اور گلیوں میں ذبح کئے گئے۔ اس کے باوجود خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ تاکید تھی کہ شر کا ہرگز مقابلہ نہ کرو۔ چنانچہ ان برگزیدہ راستبازوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے خونوں سے کوچے سرخ ہوگئے، مگر انہوں نے دم نہ مارا۔ وہ قربانیوں کے دنبوں کی طرح ذبح کئے گئے پر انہوں نے اف نہ کی۔ خدا کے پاک رسول کو، جس پر زمین اور آسمان سے بے شمار سلام ہیں، بارہا پتھر مار مار کر خون سے آلودہ کیا گیا۔ مگر اس صدق اور استقامت کے پہاڑ نے ان تمام آزاروں کو دلی انشراح اور محبت سے برداشت کیا۔ اور ان صابرانہ اور عاجزانہ روشوں سے مخالفوں کی شوخی دن بدن بڑھتی گئی اور انہوں نے اس مقدس جماعت کو اپنا شکار سمجھ

لیا۔تب اس خدا نے، جونہیں چاہتا کہ زمین پر ظلم اور بے رحمی حد سے گذر جائے، اپنے مظلوم بندوں کو یاد کیا۔اور اس کا غضب شریروں پر بھڑکا اور اس نے اپنے پاک کلام قرآن شریف کے ذریعہ سے اپنے مظلوم بندوں کو اطلاع دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہیں آج سے مقابلہ کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔اور میں خدائے قادر ہوں، ظالموں کو بے سزا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ حکم تھا، جس کا دوسرے لفظوں میں جہاد نام رکھا گیا۔اور اس حکم کی اصل عبارت، جو قرآن شریف میں موجود ہے، یہ ہے۔اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر ۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِ ھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ ۔(سورہ حج) یعنی خدا تعالیٰ نے ان مظلوم لوگوں کی، جو قتل کئے جاتے ہیں اور ناحق اپنے وطن سے نکالے گئے ہیں، فریاد سن لی اور ان کو مقابلہ کی اجازت دی گئی۔اور خدا قادر ہے، جو مظلوم کی مدد کرے۔اور یہ حکم مختص الزمان والوقت تھا، ہمیشہ کے لئے نہیں تھا، بلکہ اس زمانہ کے متعلق تھا، جب کہ اسلام میں داخل ہونے والے بکریوں اور بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے۔ یہ ہے اسلامی جہاد، جس کی دفع شر کے لئے مسلمانوں کو اجازت دی گئی تھی۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں خود سبقت کر کے ہرگز تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ ایک زمانہ دراز تک کفار کے ہاتھوں دکھ اٹھائے اور اس قدر صبر کیا، جو ہر ایک انسان کا کام نہیں۔اور ایسا ہی آپ کے اصحاب بھی اسی اعلیٰ اصول کے پابند رہے۔اور جیسا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ دکھ اٹھاؤ اور صبر کرو، ایسا ہی انہوں نے صدق اور صبر دکھایا۔وہ پیروں کے نیچے کچلے گئے، مگر انہوں نے دم نہ مارا۔ ان کے بچے ان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، ان کو آگ اور پانی کے ذریعہ عذاب دیئے گئے، مگر وہ شرّ کے مقابلہ سے ایسے باز رہے کہ گویا وہ شیر خوار بچے ہوں۔کون ثابت کر سکتا ہے کہ دنیا میں تمام نبیوں کی امتوں میں سے کسی ایک نے بھی باوجود قدرت انتقام ہونے کے خدا کا حکم سن کر ایسا اپنے تئیں عاجز اور مقابلہ سے دستکش بنالیا، جیسا کہ انہوں نے بنایا۔کس کے پاس اس کا ثبوت ہے کہ دنیا میں کوئی اور بھی ایسا گروہ ہوا ہے، جو باوجود بہادری اور جماعت اور قوت بازو اور طاقت مقابلہ اور پائے جانے تمام لوازم مردی اور مردانگی کے پھر خونخوار دشمن کی ایذا اور زخم رسانی پر تیرہ برس تک برابر صبر کرتا رہا۔ ہمارے سید و مولیٰ اور آپ کے صحابہ کا یہ صبر کسی مجبوری سے نہ تھا، بلکہ اس صبر کے زمانے میں آپ کے جان نثار صحابہ کے وہی ہاتھ اور بازو تھے، جو جہاد کے حکم کے بعد انہوں نے دکھائے کہ بسا اوقات ایک ہزار جوانوں نے مخالف کے ایک لاکھ نبرد آزما سپاہیوں کو شکست دی۔ایسا ہوا تا لوگوں کو معلوم ہو کہ مکہ میں دشمنوں کی خونریزیوں پر جو صبر کیا گیا تھا، اس کا باعث کوئی بزدلی اور کمزوری نہ تھی۔ بلکہ خدا کا حکم سن

کرانہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بکریوں اور بھیڑوں کی طرح ذبح ہونے کو تیار ہو گئے تھے۔ بے شک ایسا صبر انسانی طاقت سے باہر ہے اور گو ہم تمام دنیا اور تمام نبیوں کی تاریخ پڑھ جائیں، تب بھی ہم کسی امت میں اور کسی نبی کے گروہ میں یہ اخلاق فاضلہ نہیں پاتے۔

سبحان اللہ اور وہ لوگ کیسے راستباز اور نبیوں کی روح اپنے اندر رکھتے تھے کہ جب خدا نے مکہ میں ان کو حکم دیا کہ بدی کا مقابلہ مت کرو خواہ ٹکڑے ٹکڑے کئے جاؤ، تو وہ اس حکم کو پا کر شیر خوار بچوں کی طرح عاجز اور کمزور بن گئے۔ گویا نہ ان کے ہاتھوں میں زور ہے، نہ ان کے بازؤں میں طاقت۔ بعض ان میں سے اس طور سے بھی قتل کئے گئے کہ دو اونٹوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے انکی ٹانگیں مضبوط طور پر ان اونٹوں سے باندھ دی گئیں۔ اور پھر اونٹوں کو مخالف سمتوں میں دوڑایا گیا۔ پس وہ ایک دم میں ایسے چر گئے، جیسے گاجر یا مولی چیری جاتی ہے۔

جب مخالفین نے اس حد تک زیادتیاں کیں، تو بالآخر ان کی شرارتوں کے دفع کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ امر الٰہی نازل ہوا اور مقابلہ کا حکم ہوا، تا کہ سلسلہ الٰہی دنیا سے نیست و نابود نہ ہو جائے۔ یہ ہے اسلامی جہاد، جس پر ہمارے مخالفین معترض ہوتے ہیں۔ ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو اسلام نے خدائی حکم سے تلوار اٹھائی، وہ اس وقت اٹھائی گئی کہ جب بہت سے مسلمان کافروں کی تلواروں سے قبروں میں پہنچ گئے۔ آخر خدا کی غیرت نے چاہا کہ جو لوگ تلواروں سے ہلاک کرتے ہیں، وہ تلواروں سے ہی مارے جائیں۔ خدا بڑا کریم اور رحیم اور حلیم ہے اور بڑا برداشت کرنے والا ہے، لیکن آخر کار راستبازوں کے لئے غیرت مند بھی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی شریعت اس بات کے لئے ہرگز جواب دہ نہیں ہوسکتی اور نہ کہیں خدا نے حکم دیا اور نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ ہم خواہ نخواہ بغیر ثبوت کسی جرم کے ایسے انسان کو کہ نہ ہم اسے جانتے ہیں اور نہ وہ ہمیں جانتا ہے غافل پا کر چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں یا بندوق سے اس کا کام تمام کر دیں۔ اسلامی شریعت ہرگز یہ سبق نہیں دیتی کہ کسی کافر کو خواہ مخواہ تہ تیغ کیا جائے۔ بلکہ اسلامی شریعت اپنے حاکموں، مسلم و غیر مسلم، کی اطاعت کا حکم اور عدل و احسان کا امر اور سرکشی سے منع کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ** ۔ ترجمہ۔ یعنی خدا تعالیٰ عدل و احسان اور قرابت داروں سے نیک سلوک کا حکم دیتا ہے اور فحاشی اور بدی اور بغاوت سے منع کرتا ہے۔

واضح رہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاد کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ

جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْن ۔ترجمہ۔ یعنی جہاد کرو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ راہ خدا میں ۔ یہ بات تمہارے لئے اچھی ہے اگر تم جانتے ہو۔ مالوں کا جہاد یہ ہے کہ ایسے سارے مصارف جن سے اسلام کو تقویت پہنچے،ان میں مال صرف کیا جائے۔تمام اعضاو جوارح بدنی کو تکمیل مرضات الٰہی میں لگا کر کوشش کرنے کا نام جانی جہاد ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ زبان سے وعظ ونصیحت وکلمات حقّہ بیان کئے جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔اَفْضَلُ جِهَادٍ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَان جَابِرٍ ۔یعنی ظالم وجابر بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا سب سے افضل جہاد ہے۔مفید عام کتابیں شائع کرنا اور حق کی طرف بلانے والے واعظین کی امداد کرنا مالی جہاد ہے۔دل ودماغ کی فکر وغور سے اور ہاتھوں کی محنتوں کے ساتھ تائید اسلام کے لئے فائدہ مند کتابیں تالیف کرنا،مفید عام علوم کولوگوں میں پھیلانا، یہ سب امور جانی جہاد میں داخل ہیں۔

وہ دفاعی جہاد، جو کفار کے ساتھ مختص الزمان والمکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام کے وقت میں واقع ہوا تھا،اس کے بالمقابل نفس کے سارے اخلاق رذیلہ کے زائل کرنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد اکبر کا نام دیا۔چنانچہ فرمایا۔ رَجَعْنَا مِنْ جِهَادِ الْاَصْغَرْ اِلٰى جِهَادَ الْاَكْبَرْ ۔ یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہیں۔

ہمارے مخالف آریہ وعیسائی، جو بزور شمشیر اسلام کی اشاعت کا الزام لگاتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل عہد ناموں کو ملاحظہ کریں، جو سراسر نور آشتی و ہمدردیءانسانی ورحمت ورافت سے مملو ومشحون ہیں۔

نقل عہد نامہ نبوی جو آنحضرتؐ نے نصاریٰ کی ذمہ داری وحفظ امن کیلئے لکھا

بسم الرحمن الرحيم. هذا كتاب كتبه محمدٌ بن عبد الله الى الناس اجمعين رسوله مبشرا و نذيرا و مؤتمنا علٰى وديعة الله فى خلقه لئلا يكون للناس حجة بعد الرسل و كان الله عزيزاً حكيماً. كتبه لاهل ملة النصارىٰ و لمن تخل دين النصرانية من مشارق الارض و مغاربها قريبها و بعيدها فصيحها واعجمها معروفها و مجهولها جعل لهم عهدا. فمن نكث العهد الذى فيه و جالفه الى غيره و تعدى ما امره كان لعهد الله ناكثا و لميثاقه ناقضا و بدينه مستهزيئا و للعنته مستوجبا سلطانا كان غيره المسلمين و ان احتمى راهب او سائح فى جبل او واد او مغارة او عمران او سهل او رمل او بيعة فانا اكون من ورائهم اذب عنهم من كل غيرة لهم بنفسى و اعوانى و

اهلـی و مـلتـی و اتباعی لانهم رعیتی و اهل ذمتی و انا اعزل عنهم الا ذی فی المؤن التـی یـحـمـل اهـل الـعهـد (کذا) من القیام بالخراج الا ما طابت له نفوسهم و لیس عـلیهـم جبرٌ و لا اکراه علیٰ شیء من ذالک و لا یغیر اسقف من اسقفیته و لا راهب مـن رهبـانیتـه و لا حبیس من صومعته و لا سائح من سیاحته و لا یهدم بیت من بیوت کـنائسهم و بیعهم و لا یدخل شئی من مال کنائسهم فی بناء مساجد المسلمین و لا فی بنا منازلهم فمن فعل شیئاً من ذالک فقد نکث عهد الله و عهد رسوله و لا یحمل عـلی الرهبان و الاساقفة و لا من یتعبد جزیة و لا غرامة و انا احفظ ذمتهم اینما کانوا مـن بـرّ او بحرٍ فی المشرق و المغرب و الجنوب و الشمال و هم فی ذمتی و میثاقی وامـانـی مـن کـل مـکـروه. و کـذالک مـن یتـفـرد بـالعبادة فی الجبال و المواضع الـمبـارکة لا یـلـزمهـم مـمـا یزرعونه لاخراج و لا عشر و لا یشاطرون لکونه برسم افواههم و لا یعاونون عند ادراک الغلة و لا یلزمون بخروج فی حرب و قیام یجبریة و لا مـن اصـحـاب الخراج و ذوی الاموال و العقارات و التجارات مما هو اکثر من اثـنـی عشر درهما بالجملة فی کل عام و لا یکلف احدمنهم شططا و لا یجادلون الا بـالتـی هـی احسن ویحفظونهم تحت جناح الرحمة یکف عنهم اذیة المکروه حیثما کـانـوا و حیثـما حلوا و ان صارت النصرانیة عند المسلمین فعلیه برضاها و یمکنها مـن الـصـلـوٰة فی بیعها و لا یحال بینها و بین هوی دینها و من خان عهد الله و اعتمد بالضد من ذالک فقد عصی میثاقه و رسوله و یعاونوا علی مرمة بیعهم و مواصعهم و تـکـون تلک مقبولة لهم علی دینهم و فعالهم بالعهد و لا یلزم احد منهم بنقل سلاح بـل الـمسـلـمـون یـذبـون عـنهم و لا یخالف هذا العهدابدا الی حین تقوم الساعة و تـنـقـضـے الدنیا . کتبت علی ابن ابی طالب و ضعت فی مسجد النبی صلی الله علیه وسـلـم فـی السـنة الثـانیة الهـجـرـة فـی الیـوم الثالث من محرم الحرام بحضور جم الـصـحـابة الـکـرام و فـی ذیلها اسماء کبار الصحابة و هی حسب ترتیبها فی صورة ذالک التقریر.

هاشم ابن عبید	سعد بن معاذ
ابو حنیفة بن عبید	سعد بن عباس
علی بن ابی طالب	ثابت بن نفیس (قیس)
ابو بکر بن ابی قحافة	زید بن ثابت
عمر ابن الخطاب	معطمة بن قرش
عثمان بن عفان	حارث بن ثابت
ابو الدرداء	عبد الصمد بن حسن
ابو ہریرة	عبد اللہ بن عمرو (عمر)
عبد اللہ بن مسعود	ابن عاصم
فضل بن عباس	ابن عباس
طلحة بن عبد اللہ	عارف ادریس

ترجمہ۔ یہ وہ عہد نامہ ہے جو محمد بن عبداللہ خدا کے بشیر ونذیر وامین برامانت خدا نے سب لوگوں کے لئے لکھا ہے، تاکہ لوگوں کو رسولوں کے بعد کوئی عذر معذرت کی دلیل نہ رہے۔ اور خدا تعالیٰ غالب وحکیم ہے۔ میں نے یہ عہد نامہ نصاریٰ اور ان لوگوں کے لئے لکھا ہے اور ان لوگوں کے لئے ہے، جو نصرانی ہو جاویں۔ خواہ اس ملک کے مشرق ومغرب میں ہوں، خواہ وہ نزدیک یا دور ہوں۔ خواہ وہ عرب کے رہنے والے یا عجمی ہوں، خواہ وہ معروف ہوں یا مجہول۔ میں نے ان کے لئے یہ عہد کیا ہے۔ پس جو شخص اس عہد نامہ کے لکھے ہوئے امور سے مخالفت اور مامور بہ سے تجاوز کرے اور وہ عہد خدا کا توڑنے والا اور وعدہ الٰہی کا ناقض اور اس کے دین کے ساتھ تمسخر کرنے والا اور لعنت الٰہی کا سزاوار ٹھہریگا، خواہ وہ بادشاہ ہو یا کہ عام مسلمانوں میں سے کوئی ہو۔ اور اگر کوئی درویش یا سیاح کسی پہاڑ یا کسی وادی یا کسی غار یا کسی آبادی یا کسی میدان یا کسی ریگستان یا کسی عبادتخانہ میں پناہ گیر ہو کر ٹھہرے۔ میں بنفس خود اپنے اعوان اور اپنے اہل اور اپنے ملت وتابعداروں کے ہمراہ ہو کر اس کی حمایت کروں گا، کیونکہ وہ میری رعیت اور میرے اہل ذمہ ہیں اور میں اس عہد والوں سے ان کے ادائے خراج سے ایذا رفع کروں گا۔ اور وہ خراج اس قدر دیں، جو ان کا دل چاہے۔ اور حصول خراج کے لئے ان پر کوئی جبر و اکراہ نہیں کیا جائے گا۔ اور کسی سردار پادری کو اس کے منصب سے ہٹایا نہیں کیا جائے گا۔ اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے اور کسی عابد کو اس کے عبادتخانے سے اور کسی سیاح کو اس کی سیاحت سے روکا نہیں

جائے گا۔اوران کے گرجوں اورعبادتخانوں کے مکانوں سے کوئی مکان برباد نہیں کیا جائے گا۔اوران کے گرجوں کے مال سے کوئی چیز مسلمانوں کی مسجدیں اور مکان بنانے میں داخل نہیں کی جائیگی۔اورجس نے یہ کام کیا،اس نے عہد خدااور رسول کوتوڑ ڈالا۔اورراہبوں وسرار پادریوں وعابدوں پر نہ کوئی جزیہ اور نہ کوئی تاوان ہوگا۔اور میں ان کے عہد کی حفاظت کروں گا،وہ جہاں ہوں،خواہ وہ جنگل میں یا دریا میں یا مشرق یا مغرب میں یا جنوب یا شمال میں ہوں۔اور وہ ہر مکروہ امر سے میرے عہد اور میرے وعدہ اور میرے امن میں ہیں۔اور ایسا ہی وہ اشخاص میرے ذمہ میں ہیں، جوعبادت کے لئے پہاڑوں اور مقامات مبارکہ میں گوشہ نشین ہوں۔اور جو کچھ وہ وہاں بوئیں،اس کاان پر کوئی خراج وعشر نہیں ہوگا(بلکہ جو بوئے،اسی کا مال ہوگا)اور جنگ میں نکلنا ان پر واجب نہیں کیا جائے گا اور نہ ان پر کوئی جبر ہوگا۔اور مالداروں وزمینداروں وتاجروں سے ہر سال بارہ روپیہ سے زیادہ خراج نہیں لیا جائے گا۔اور کسی پر جور وظلم نہ ہوگا۔اور اگر وہ اہل اسلام سے مذہبی امور میں مجادلہ چاہیں گے،تو بطریق احسن ان کے ساتھ مجادلہ ہوگا۔اور بازوئے رحمت کے تحت میں ان کی حفاظت کی جائے گی۔اور وہ جہاں ہوں ان سے ایذا رفع کی جائے گی۔اور اگر کوئی عیسائن مسلمانوں کے پاس آجائے،تو اس کو اس کی رضامندی پر رہنے دیا جائے گا اور وہ اپنے عبادتخانہ میں نماز گذار سکے گی اور اس کے دین میں کوئی امر حائل نہیں کیا جائے گا۔ اور جس نے اس عہد خدا میں خیانت کی اور اس کے برخلاف پر اعتماد کیا،تو اس نے عہد خدا و رسول کی نافرمانی کی۔اور ان کے عبادت خانوں کی مرمتی میں ان کی امداد کی جائے گی۔ان کے دین میں یہ بات حسب ان کے عہد کے مقبول ہے اور ان کے کسی فرد پر ہتھیار اٹھانا لازم نہیں کیا جائیگا، بلکہ مسلمان ان کی حمایت وحفاظت کریں گے۔اور اس عہد کی قیامت تک مخالفت نہ کی جائے گی۔

عہد نامہ حضرت عمر ابن خطاب جو آپ نے نصاریٰ کے حفظ امن کیلئے لاٹ پادری صفر و نیوس کو لکھ کر عطا کیا تھا

بسم الله الرحمن الرحيم. الحمد لله الذى اعزنا بالاسلام و اكرمنا بالايمان و رحمنا بنبيه محمد صلى الله عليه وسلم و هدانا من الضلالة و جمعنا به بعد الشتات و الفت قلوبنا و نصرنا على الاعداء و مكن لنا من البلاد و جعلنا اخوانا متحابين و احمدوا الله عباد الله على هذه النعمة. هذا كتاب عمر ابن الخطاب لعهد و ميثاق اعطى الى البطرک المبجل المكرم و هو صفر و نيوس بطرک الملة الملكية فى

طور الزيتون بمقام القدس الشريف فى الاشتمال على الرعايا و القسوس و الرهبان وا لراهبات حيث كانوا و اين وجدوا يكون عليهم الامان و ان الذمى اذا حفظ احكام الذمة وجب له الامان و الصون منا نحن المومنين و من يتولى بعدنا و ليقطع عنهم اسباب جوانحهم كحسب ماقد جرى منهم من الطاعة و الخضوع و لكن الامان عليهم و على كنائسهم و دياراتهم و كافة زياراتهم التى بيدهم داخلا و خارجا وهى القمامة و بيت لحم مولد عيسىٰ عليه السلام كنيسة الكبرى وا لمغازة ذات الثلاثة ابواب قبلى و شمالى و غربى بقية اجناس النصارىٰ الموجودين هناک و هم الكرج والحبش و الذين ياتون للزيارة من القبط و الافرنج والسريان و الارمن النساطرة واليعاقبة و الموارنة تابعين البطرک المذكور و يكون متقدما عليهم لانهم اعطوا من حضرة النبى الكريم والحبيب المرسل من الله و شرفوا بختم يده الكريم و امر بالنظر اليهم و الامان عليهم كذالک نحن المومنين نحن اليهم اكراما لمن احسن اليهم و ليكونوا معافين من الجزية و الخفاوة و المواجب و مسلّمين من البلايا كافة فى البر و البحر وفى دخولهم الى القمامة و بقية زياراتهم لا يؤخذ منهم شئى و اما الذين يقبلون الى زيارة القمامة فهودى النصرانى الى البطرک درهما و ثلث من الفضة و كل مومن و مومنة يحفظ ما امرنا به سلطان او حاكم او وال يجرى حكمه فى الارض غنى او فقير من المسلمين المومنين و المومنات و قد اعطے لهم مرسومنا هذا بحضور جم الصحابة الكرام عبد الله و عثمان بن عفان و سعد بن زيد و عبد الرحمن ابن عوف و يقية الاخوة الصحابة الكرام فليعتمد على ما شرحنا فى كتابنا هذاو يعمل به و يبقى فى يدهم .و صلى الله تعالىٰ على سيدنا محمد و اله و اصحابه و الحمد لله رب العلمين. حسبنا الله و نعم الوكيل فى عشر ين من شهر ربيع الاول سنة ١٥ للهجرة النبيوية .و كل من قرء سومنا هذا من المؤمنين و خالفه من الآن الى الدين فيلكن لعهد الله ناكثا و لرسوله الحبيب مبغضاً .

ترجمہ۔صفت وشکر ہے اس خدا تعالیٰ کے لئے ،جس نے ہم کو اسلام کے ساتھ معزز اور نعمت ایمان سے مکرم کیا اور ہم کو گمراہی سے نکال کر راہ ہدایت پر لایا اور پراگندگی کے بعد ہم کو اکٹھا کیا۔اور ہمارے دلوں میں الفت ڈالی اور دشمنوں پر ہم کو نصرت دی اور شہروں کو ہمارا مسخر کیا اور ہم کو آپس میں

بھائی ومحبّ بنایا۔اے بندگان خدا اس نعمت الٰہی کا شکر کرو۔

یہ عہد نامہ منجانب عمر ابن خطاب ہے جو مکرم و معظم لاٹ پادری صاحب صفرونیوس کو لکھ کر دیا گیا جو کہ طور زیتون واقع قدس شریف یعنی بیت المقدس میں رعایا مذہب نصاریٰ اور پادریوں اور راہب مردوں و عورتوں کا افسر و سردار ہے۔ وہ جہاں ہوں ان پر امن ہوگا۔اور اس عہد نامہ والے جب شرائط عہد نامہ کی حفاظت کریں گے، تو ہم مومنوں اور ہم سے بعد کے حاکموں کی طرف سے ان کو امن دیا جائے گا اور ان کی حفاظت کی جائے گی۔اور ان سے اسباب ایذا و تکلیف ان کی اطاعت و فرمانبرداری کے موافق قطع کئے جائیں گے۔اور ان پر اور ان کے گرجوں اور ان کے گھروں اور ان کی زیارتوں پر اندر اور باہر، جو ان کے ہاتھ میں ہیں، امن ہو۔اور وہ قبہ اور بیت اللحم مولد عیسیٰ علیہ السلام اور بڑا گرجا اور مشرقی و شمالی و مغربی دروازوں والی غار ہے۔اور باقی نصاری کردی اور حبشی اور جو زیارت کے لئے قبطی اور فرنگی اور سریانی اور ارمنی اور انسطوری اور یعقوبی اور مورانی جو تابعداران لاٹ پادری صاحب مذکور ہیں ان سب کو امن دیا جائے گا۔اور ان پر وہ مقدم ہوں گے۔ کیونکہ ان کو حضرت نبی کریم حبیب خدا و مرسل من اللہ علیہ الصلوۃ والسلام سے امن ملا اور آنحضرت کی مہر دست مبارک سے مشرف ہوئے ہیں اور ان کے لئے خاص مہربانیوں اور امن کا امر فرمایا۔اسی طرح ہم مومن ان لوگوں سے احسان کریں گے جو ان سے احسان کریں اور ان کو جزیہ و مواجب معاف ہوگا۔اور وہ سب کے سب بر و بحر میں آفات و بلیات سے مامون و محفوظ رہیں۔اور قبہ میں داخل ہونے اور باقی زیارتوں میں ان سے کچھ نہ لیا جائے۔ اور جو لوگ زیارت قبہ کو آئیں وہ لاٹ پادری کو ایک روپیہ تین قرازے دیں۔اور ہر ایک مومن مرد و عورت اس ہمارے امر کی حفاظت کرے، خواہ وہ بادشاہ ہو یا حکم ہو یا والی ہو۔اپنے ملک میں اس امر کو جاری کرے، دولتمند ہو یا مفلس۔اور ہمارا یہ عہد نامہ ان کو صحابہ کرام کے گروہ کثیر کے روبرو دیا گیا۔ اسمائے صحابہ موجودین۔عبداللہ و عثمان بن عفان و سعد بن زید اور عبدالرحمٰن بن عوف اور باقی صحابہ کرام۔جو کچھ ہم نے اس عہد نامہ میں لکھا ہے اس پر اعتماد ہو اور اس پر عمل کیا جائے۔اور یہ عہد نامہ ان کے پاس رہے۔**و صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ و الحمد للہ رب العالمین . حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔**

مورخہ ۲۰ ربیع الاول ۱۵ ہجری النبوی

جو مومن ہمارے اس عہد نامہ کو پڑھ کر اس کی اس وقت سے قیامت تک مخالفت کرے، وہ عہد خدا کا توڑنے والا اور حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ٹھہرے گا۔"

یہ عہد نامے آج کل مملکت شاہ روم کے مندرجہ ذیل مقامات و کتب و دفاتر میں مل سکتے ہیں۔(۱) قاموس الادارۃ والقضا۔(۲) مجموعۃ منشات سلاطین (۳) فریدون بک (۴) الہلال (۵) دیرطورسینا۔

یہ عہد نامے بالکل درست اور مطابق کلام الٰہی کے ہیں۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَ اِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَه' بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُوْنَ** ۔ترجمہ۔یعنی اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تیرے پاس آ کر طالب پناہ ہو،تو اس کو امن دے تاکہ وہ کلام خدا کو سنے۔ پھر اس کو جائے امن میں پہنچا دے۔ کیونکہ مشرک بے علم لوگ ہیں۔

یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ حضرت امام محمد مہدی علیہ السلام آئیں گے،تو کسر صلیب کریں گے اور مخالفین اسلام یعنی مشرکین وغیرہ کو بزور شمشیر دین اسلام میں داخل کریں گے، یہ بات قرآن کریم، سنت نبوی و داب صحابہ کے سراسر برخلاف ہے۔اگر ایسا کام دین اسلام میں جائز ہوتا،تو پوری قوت و شوکت کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نصاریٰ کو یہ عہد نامہ لکھ کر نہ دیتے۔جبکہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام وصحابہ کرام نے کسی انسان کو بجبر واکراہ مسلمان نہیں بنایا۔تو امام محمد مہدی علیہ الصلوۃ والسلام کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام کے اسوہء حسنہ کی مخالفت کر سکتے ہیں۔

کتاب الفرائض

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی قرر نصیباً من المیراث لکل احد من الرجال والنساء لیصون الناس من الاعتداء علی حقوق الاقرباء و الصلوۃ والسلام علی رسولہ خاتم الانبیاء و علی الذین اتبع الھدیٰ

جائداد میں حقداروں کے حصے مقرر کرنیکی وجہ

امّا بعد ۔واضح ہو کہ(۱)۔اسلام نے میت کی جائداد میں حقداروں کے حصے اس لئے معین و مقرر کئے ہیں کہ حقداروں کے حقوق محفوظ رہیں۔اگر میت کے اقرباء اور والیوں میں سے کل جائداد کا ایک ہی شخص کو اختیارِ کُل دیا جائے اور دوسرے اقرباء کے حصے اس میں مقرر نہ ہوں،تو اکثر ایسے افراد ہوتے ہیں کہ جائداد کو اپنے ذاتی اغراض میں اڑا دیتے ہیں اور اپنے فوائد و اغراض وعیش کے سوا دوسرے حقداروں کی غور و پرداخت اور ان کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتے اور جائداد میں ظالمانہ تصرف شروع کر دیتے ہیں،حتیٰ کہ سارے ترکہ کو اپنی عیش وعشرت میں خورد برد کر دیتے ہیں۔لہٰذا خدا تعالیٰ نے ان ظالمانہ کاروائیوں کو روکنے اور ان کی انسداد کے لئے جائداد میں ہر ایک حقدار کے حصے معین فرما دیئے تا کہ اگر ساری جائداد کا ایک ہی شخص کو حاکم مقرر کیا جائے،تو وہ دوسرے حقداروں کے حصوں کو اپنے اغراض میں خورد برد نہ کر سکے، بلکہ حصوں کے مطابق جائداد کی پیداوار و آمد سے حقداروں کی غور و پرداخت کرتا رہے۔

۲۔جب کسی جائداد کے حصے دار وحقدار معین ہو جائیں،تو اس میں جو حاکم ومختار ہوگا،وہ اس کو اس وجہ سے خورد برد نہ کر سکے گا کہ اس کو اس بات کا علم ہوگا کہ اس میں دوسرے حقداروں کے حقوق و حصے معین ومقرر ہیں اور بے جا تصرف سے ہر ایک حقدار اس سے مؤاخذہ ومحاسبہ کرے گا۔

۳۔اگر اسلام ایسا نہ کرتا اور ہر ایک حقدار کا حق معین ومشخص نہ کیا جاتا اور کل جائداد کا ایک ہی شخص کو مالک بنایا جاتا،تو میت کے باقی اقرباء کی معاش کی بڑی بڑی دقتیں وتنگیاں پیدا ہوتیں۔کیونکہ سارے نفوس انسانی میں اقرباء کی ہمدردی یکساں نہیں ہوتی۔بعض سارے ترکہ کو اپنے ہی اغراض و

مقاصد میں صرف کر دینے کے درپے رہتے ہیں اور دوسرے حقداروں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کی غور و پرداخت پر بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اسلام نے ایک خاص حد تک ہر ایک حقدار کے حصے مقرر و معین کر دیئے، تاکہ مختار و متصرف کو حقداروں کا بھی لحاظ و خیال رہے اور جائداد میں ظالمانہ تصرف نہ ہو سکے۔ چنانچہ میراث کے حصے مقرر ہونے کی فلاسفی خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بیان فرمائی ہے کہ اقربائے میت کے حقوق ضائع ہو کر خورد و برد نہ ہو جائیں۔ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُو الْقُرْبٰی وَالْيَتَامٰی وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوْفاً . وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَا فًا خَافُوْ عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوْا اللهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا . اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلُوْنَ سَعِيْراً . يُوْصِيْكُمُ اللهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلَ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ . (سورہ نساء) ترجمہ۔ جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت ناتے والے اور یتیم اور محتاج، تو ان کو اس میں سے کچھ دیدو اور ان کو بھلی بات کہو۔ اور جائداد کے مختار و حاکم و مینیجر و تقسیم کرنے والے چھوٹے و کمزور حقداروں کے حقوق میں بیجا تصرف کرنے سے خدا سے ڈرتے رہیں کہ اگر ایسا ہی ان کی اولاد چھوٹے چھوٹے بچے ان کے پیچھے رہ جائیں اور ان کے حقوق میں کوئی بیجا تصرف کرے، تو ان کے لئے کتنا بڑا خطرہ ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کا انجام ایسا ہی ہوگا۔ چاہئے کہ مختار اور تقسیم میراث کرنے والے خدا سے ڈریں اور حقداروں کے متعلق سیدھی و باانصاف بات کہیں۔ جو لوگ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ ڈالتے ہیں اور عنقریب وہ دھکتی ہوئی اور جلن والی آگ میں پہنچیں گے۔ یعنی اس آگ کی سوزش یہاں ہی سے ان کے اندر شروع ہو جائیگی۔

اس جگہ یتامیٰ کا ذکر اس لئے فرمایا کہ بسا اوقات میت کے چھوٹے چھوٹے بچے پیچھے رہ جاتے ہیں اور بڑے بیٹے یا میت کے دوسرے اقربا سارے مال کو خورد برد کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کرنے میں سخت وعید وارد ہوئی۔ اور ہر ایک کا حصہ مقرر کیا گیا، تاکہ چھوٹوں و کمزوروں کے حقوق میں بڑے و قوی لوگ دست اندازی نہ کریں۔ چنانچہ تقرری حصص کے لئے مذکورہ بالا آیات کے آگے یوصیکم اللّٰہ کی عبارت شروع ہوتی ہے، جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

۴۔ کسی بڑی سے بڑی جائداد، ریاست، سلطنت میں بھی کئی حصے داروں کے حقوق و حصے معین و مشخص ہونا اس کے لئے حفاظت و استحکامی کا باعث ہے، کیونکہ ایک ایک حصہ دار اپنے متعین حقوق و حصہ کی وجہ سے اس مشترکہ جائداد کی بہتری و بہبودی کے لئے سعی کرے گا۔ پس جس ریاست کے حقدار

زیادہ ہوں، اسی قدر اس کے لئے استحکامی کا باعث ہے۔

۵۔ اسلام نے یہ کہیں حکم نہیں دیا کہ جائدادِ میّت کو اس کے مرنے کے بعد فی الفور خواہ مخواہ بانٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ بلکہ حقداروں کی رضامندی وخوشی پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ آپس میں سے ایک متدین شخص کو کل جائداد مشترکہ کا اپنا امام وحاکم مختار بنا کر اپنے حصوں کے مطابق جائداد کی پیداوار آمد اس کے ذریعہ حاصل کریں۔ اور اگر وہ اپنے مختار ومتصرف میں خیانت اور ظالمانہ حرکات وتصرفات بیجا دیکھیں، تو بوجہ تقرری ءحقوق خود خائن وظالم کا حصہ جائداد سے الگ کر کے اس کو معزول کر دیں اور کسی دوسرے کو بوجہ شراکت حقوق حقداروں میں سے یا تنخواہ دار کو اپنا مختار بنا سکیں۔

۶۔ اگر جائداد میں حصے مقرر ومعین نہ ہوتے، تو میت کے والیوں میں بڑے بڑے جھگڑے و تنازعات پیدا ہوتے اور ہر ایک حقدار اپنا حصہ دوسرے حقداروں سے زیادہ چاہتا۔ مثلاً بڑا بیٹا چھوٹے سے زیادہ طلب کرتا یا جن حقداروں کو کم حصہ آتا ہے، وہ سب کے ساتھ برابری چاہتے۔ لہٰذا الٰہی تقسیم نے سب کو ساکت کر دیا۔ کچھ تعجب نہیں کہ کئی ایسے انسان بھی ہوں گے، جو کہیں گے کہ اسلامی احکام کی وجوہات وحکمتیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ حکم الٰہی آ گیا، ہم نے اس کو مان لیا۔ مگر اس کو ہم معذور سمجھتے ہیں، کیونکہ اس وقت اسلام کے مخالفین جہالت سے اسلام پر جو اعتراض کر رہے ہیں اور نادانوں کی گمراہی کا باعث ہو رہے ہیں، وہ ان سے بے خبر ہیں۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک انگریزی اخبار میں کسی نے اس امر کے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا کہ قرآن نے جو تقسیم میراث کا مسئلہ پیش کیا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ تقسیم وراثت سے سلطنتوں اور ریاستوں میں کمزوری وضعف آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس پر تمام اخبارات ہند و پنجاب نے بہت کچھ لکھا تھا۔ معترضین حقداروں کی تقرری حصص کی فلاسفی سے ناواقف ہیں۔ اس لئے وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ دنیا میں ایسے نادان انسان بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو خدا تعالیٰ کو بھی کہتے ہیں کہ اس سے فلاں کام میں چوک ہو گئی۔ وہ عدالتوں میں روزمرہ حقداروں کے حقوق میں بے جا تصرف وخیانت کرنے والوں پر مقدمات دائر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ان کے نتائج سے بھی آگاہ ہوتے رہتے ہیں، مگر پھر بھی خدا تعالیٰ پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اگر خدا کے کلام کا علم نہ ہو یا اس میں کسی طرح کا شک وشبہ ہو، تو اس کے متعلق خدا کا کلام، جو ہر وقت پیش نظر ہے، اس سے اس کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔

اے دو چشمے بستہ از انوار او	چوں نہ بینی روئے او درکارِ او
آں رخے کاں فعلِ حق بنمودہ است	درحقیقت روئے حق آں بودہ است

۷۔شریعت اسلام نے جو امامت نماز مقرر کی ہے، وہ اسی امر کی طرف ایماء ہے کہ ہر امرِ مہم میں لوگ ایک شخص کو اپنا امام وحاکم مقرر کر کے اس کے ماتحت رہیں۔اس مسئلہ کی فلاسفی "اسرار شریعت" جلد اول میں مفصل لکھی گئی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

۸۔علم طبعی سے بھی تقسیم ترکہ میت کی شہادت ملتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے، جیسا کہ خدا نے قرآن کریم میں ظاہر فرمایا ہے۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس عالم کے اس ابتدائی عنصر یعنی پانی پر نظر کرو، جس سے جہاں کے اجزائے صغار و کبار تیار ہوئے ہیں کہ جب پانی میں سے کچھ پانی الگ کیا جاتا ہے، تو اردگرد سے اور پانی آ کر اس جگہ کو پُر کر دیتا ہے اور اس جگہ کو خالی نہیں رہنے دیتا۔یہ نہیں ہوتا کہ کچھ جگہ خالی رہتی ہے اور کچھ پُر ہو جاتی ہے اور پھر پانی بھی وہی اس جگہ کو آ کر پُر کرتا ہے، جو نزدیک تر ہو۔ایسا ہی میت کے اقربا، جن کا میت سے جسمانی قرابت اور ملاپ نزدیک تر ہے، وہ اسی مسئلہ کی رو سے بھی اس کے ترکہ میں سے حسب مراتب قرب سب حصہ دار ٹھہرتے ہیں۔اور اسی قانون قدرت وشرع کونی نے اقتضا کیا کہ میت کے سارے اقرباء کو اس کے ترکہ کا حصہ دیا جائے۔اور اس قانون فطرت کے مطابق جائداد میں تعین حصص کا حکم قرآن کریم میں نازل ہوا۔

پھر پانی کے بعد اس عالم کے باقی سارے عناصر سے از روئے علم طبعی یہی مشاہدہ ہو رہا ہے کہ میت کے ورثاء کو اسکے ترکہ میں سے حسب مراتب قرب حصہ ملنا چاہئے۔وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اس عالم میں وحدت منظور ہے اور وحدت جب ہی قائم رہتی ہے کہ اس عالم کے اجزاء کو بہ ترتیب طبعی قائم رکھا جائے۔لہٰذا اس وحدت کو قائم رکھنے کیلئے خدا نے تمام بسائط کو گول شکل پر پیدا کیا ہے، تا کہ خدا کے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ناقص نہ ہوں۔اسی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ زمین کی شکل بھی گول ہے، کیونکہ دوسری شکلیں کمال تام کے مخالف ہیں اور جو چیز خدا کے ہاتھ سے بلا واسطہ نکلی ہے، اس میں مناسب حال مخلوقیت کے کمال تام ضرور چاہئے، تا کہ اسکا نقص خالق کی نقص کی طرف عائد نہ ہو۔اور پھر اسلئے بسائط کو گول رکھنا خدا نے پسند کیا کہ گول میں کوئی جہت نہیں ہوتی اور یہ توحید کے بہت مناسب حال ہے۔دیکھو آسمان سے بارش کے قطرات گول گرتے ہیں، ستارے گول دکھائی دیتے ہیں، آگ کا شعلہ گول ظاہر ہوتا ہے۔سارے نظام شمسی وقمری کو غور سے دیکھو کہ گول وکروی الشکل دکھائی دیتے ہیں۔اگر خدا تعالیٰ میں عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق تثلیث ہوتی، تو سارے بسائط واجرام شمسی وقمری مثلث نما ہوتے۔

و فی کل شئی لہ آیۃ　　　تدل علی انہ واحد

یعنی خدا نے اس عالم کی ہر چیز میں ایسی علامتیں رکھی ہیں، جو اس کی وحدت پر دلالت کریں۔

غرض صنعت کا کمال مدور شکل سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔اس میں انتہائی نقطہ اس قدر اپنے کمال کو دکھلاتا ہے کہ پھر اپنے مبداء کو جاملتا ہے۔کیونکہ کمال ہر چیز کا استدارت کو چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میت کی اولاد کو میت کے والدین کی نسبت تر کہ میت سے زیادہ حصہ ملتا ہے اور اگر اولاد نہ ہو تو والدین یا ان کے قائم مقام میں تقسیم ہوتا ہے۔گویا از روئے مسئلہ استدارت فرع کا رجوع اپنے اصل کو ہو جاتا ہے۔

حقیقت تقسیم میراث

ا۔ میراث کا مدار تین امور پر ہے۔ایک تو میّت کے بعد اس کی جگہ،اس کی عزت اور مرتبہ ہیں اور جو باتیں اس قسم کی ہیں،ان میں اس کا قایم مقام ہو،کیونکہ انسان کی اس بات میں بڑی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی قایم مقام رہے۔

۲۔ دوسرا خدمت اور غمخواری اور محبت اور شفقت اور جو باتیں اس قسم کی ہیں۔

۳۔ تیسرا قرابت،جو ان دونوں باتوں پر بھی مشتمل ہے اور تینوں میں زیادہ تر۔اس تیسری بات کا اعتبار زیادہ تر مقدم ہے۔اور پورے طور پر ان سب کا محل وہ شخص ہے،جو نسب کے عمود یعنی بنیاد میں داخل ہے۔جیسے باپ اور دادا،اور بیٹا اور پوتا۔یہ لوگ سب سے زیادہ وراثت کے مستحق ہیں۔مگر وضع طبعی کے اعتبار سے،جس پر قرناً بعد قرن عالم کی بنا ہے،بیٹا باپ کا قائم مقام ہوتا ہے اور اسی کی لوگوں کو تمنا اور امید ہوا کرتی ہے۔اسی کی خاطر نکاح کرتے ہیں اور اولاد کے پیدا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔اور باپ کا بیٹے کی جگہ قایم ہونا وضع طبعی کا مقتضی نہیں ہے،اور نہ لوگوں کو اس کی آرزو اور تمنا ہوتی ہے۔اور اگر بالفرض کسی شخص کو اس کے مال میں اختیار دیا جائے،تو اس کے دل پر اولاد کی غمخواری باپ کی غمخواری پر غالب ہوگی۔اس واسطے تمام لوگوں کا دستور ہے کہ اولاد کو باپ پر مقدم سمجھتے ہیں۔اور پھر قایم مقام ہونے کا احتمال بیٹے کے بھائیوں میں ہے اور پھر جوان کی مانند بمنزلہ قوت بازو کے ہیں،اور پھر اس کی قوم اور اس کے نسب اور مرتبہ کے ہیں۔باقی رہی خدمت اور شفقت،تو یہ دونوں قرابت قریبہ کے مظّنات ہیں۔اور سب سے زیادہ ماں اور بیٹی اس امر میں اس کی مستحق ہیں اور جوان کی مانند ہیں اور نسب کے عمود میں داخل ہیں۔اور بیٹی بھی فی الجملہ باپ کی قائم مقام ہوتی ہے۔اور اس کے بعد ہمشیرہ اور اس کے بعد وہ ہے،جس سے زوجیت کا علاقہ ہے،پھر ماں کی اولاد۔

عورتوں کے اندر حمایت اور قایم مقامی کے معنے نہیں پائے جاتے،کیونکہ عورتیں بسا اوقات غیر قوم میں نکاح کر لیتی ہیں۔اور اسی قوم میں داخل ہو جاتی ہیں۔مگر بیٹی اور بہن میں کسی قدر یہ معنے پائے جاتے ہیں۔لیکن عورتوں کے اندر محبت اور شفقت کے معنے کامل طور پر پائے جاتے ہیں اور اس امر کا

مظنہّ بہت قریب کی قرابت میں ہے، جیسے ماں اور بیٹی میں کامل طور پر پائے جاتے ہیں، اوران کے بعد بھائی اور چچا میں، اور دوسرے معنے سب سے زیادہ باپ میں، اوراس کے بعد بیٹے میں۔ پھر عینی بھائی میں، پھر اضافی بھائی میں پائے جاتے ہیں اور قرابت قریبہ کا مظنہّ ہے نہ بعیدہ کا۔ اس وجہ سے جو چچا کا حکم ہے، وہ پھوپھی کے لئے حکم نہیں ہے۔ کیونکہ پھوپھی بھی مصیبت کے وقت کام نہیں آ سکتی، جس طرح چچا کام آتا ہے، اور پھوپھی قرابت میں ہمشیرہ کے برابر نہیں ہے۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ جب مرد اور عورت ایک ہی درجہ کے ہوں، تو ہمیشہ مرد کو عورت پر ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ عزت کی حمایت کے لئے مرد ہی مخصوص ہیں۔ اور وجہ یہی ہے کہ مردوں پر نفقے بہت ہوتے ہیں۔ پس یہ زیادہ تر مستحق ہیں کہ ان کو وہ مال، جو بمنزلہ مفت کے ہے، دیا جائے، بخلاف عورتوں کے کہ یہ اپنے خاوندوں یا باپوں یا بھائیوں پر بار و بوجھ ہوتی ہیں۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ جب وارثوں کی ایک جماعت پائی جائے، تو اگر وہ سب وارث ایک مرتبہ کے ہیں، تب تو اس ورثہ کی تقسیم ان پر ضروری ہے، کیونکہ ایک کو دوسرے پر تقدم نہیں ہے۔ اور اگر ان کے درجے مختلف ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو سب ایک نام اور ایک جہت میں داخل ہیں۔ اور اس میں قاعدہ یہ ہے کہ قریب بعید کا حاجب ہو کر بعید کو ورثہ سے محروم کر دیتا ہے۔ کیونکہ توارث معاونت پر رغبت دلانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور قرابت اور تعاون سب میں پایا جاتا ہے۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ سہام، جن سے حصوں کی تقرری و تعیین ہوتی ہے، ان کے اجزا ظاہر ہوں کہ محاسب و غیر محاسب ظاہر میں ان کی تمیز کر سکیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول مبارک میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اِنَّا اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَ لَا نَحْسِبُ ۔یعنی ہم امّی لوگ ہیں، نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں۔ کیونکہ جس چیز سے تمام مکلفین کو خطاب کیا جائے اس میں یہ بات ضروری ہے کہ ایک تو حساب کرنے میں تعمق و غور کی حاجت نہ ہو اور دوسرے ظاہر نظر میں کمی بیشی کی ترتیب اس میں معلوم ہو جائے۔ لہٰذا شرع نے سہامات میں دو قسم کے سہام اختیار کئے ہیں۔ ایک تو ثلثیں یعنی دو ثلث اور ثلث اور سدس۔ اور دوسرے نصف۔ ربع۔ ثمن۔ کیونکہ ان دونوں کا مخرج اصلی اولاً اعداد ہیں۔ اور ان میں تین مرتبے پائے جاتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ وہ نسبت ہے، جو ایک شی کو اپنے اوپر دو چند کے ساتھ اور اپنے نیچے نصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ کمی و بیشی کے ظاہر اور محسوس ہونے کا یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ پھر جب ایک زیادتی کا دوسری زیادتی کے ساتھ اعتبار کیا جائے، تو اور نسبیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو باب توریث میں ضروری ہیں۔ مثلاً اگر نصف پر کچھ بڑھایا جائے

اور کل سے کم رہے، تو دو ثلث ہوں گے۔ اور نصف سے جب کم کیا جائے اور ربع کم رہے، تو ثلث ہو گیا اور خمس اور سبع کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ اس واسطے کہ ان کی مخرج کی تخریج میں دقت ہے اور اس میں گھٹانے و بڑھانے سے حساب میں غور و تعمیق کی ضرورت پڑتی ہے۔

میت کے والد کے اقرباء کی موجودگی میں والدہ کے اقرباء کا میراث سے محروم رہنے کی وجہ

اس میں والد کے اقرباء کی فضیلت کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ مرد کو بہ نسبت عورت کے مال کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور مرد عورتوں پر حاکم ہوتے ہیں۔ اور مرد عورت کی بہ نسبت میت کے لئے زندگی میں بھی زیادہ نافع تھا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے جہاں حقداروں کے حصوں کی تفاوتیں بیان فرمائی ہیں، وہاں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ **آبَاؤُكُمْ وَ اَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا** ۔یعنی تمہارے باپ اور بیٹے، جو میراث میں حقدار ہیں، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے تمہارے لئے کون از روئے نفع و فائدہ پہنچانے کے نزدیک تر ہے۔ جب کہ مرد بہ نسبت عورت کے زیادہ مفید اور مال کا محتاج ہوتا ہے۔ تو اس کو میراث میں بھی سبقت دی گئی ہے۔

مرد کا حصہ عورت سے دو چند ہونے کی وجہ

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ** ۔ترجمہ۔ یعنی سکھاتا ہے تم کو خدا تعالیٰ تمہاری اولاد میں (میراث بانٹنا) کہ مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ پھر اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں، تو ان کے لئے میت کے ترکہ کا دو ثُلث ہے۔ اور اگر ایک ہے، تو اس کے لئے نصف ہے۔ مرد کا حصہ عورت سے دو چند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَ بِمَا نَفَقُوْا** ۔ترجمہ۔ یعنی مرد عورتوں پر قوی اور حاکم ہیں، اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے بعض کو بعض پر بزرگی دی ہے اور اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی عورتوں کی حاجتوں پر مال خرچ کئے۔

اکیلی بیٹی کو نصف حصہ میراث ملنے کی وجہ

اکیلی بیٹی کے لئے نصف ترکہ مقرر ہوا، کیونکہ جب بیٹا اکیلا ہوتا ہے، تو اس کو سارا مال ملتا ہے۔

لہٰذااس حساب سے اکیلی بیٹی نصف میراث کی مستحق ہے۔

دواوردو سے زیادہ بیٹیوں کو دوثلث ملنے کی وجہ

دو بیٹیوں کا حکم بالا جماع تین کا ہے۔اور دوثلث ان کو اس لئے ملتے ہیں کہ اگر بیٹی کے ساتھ بیٹا ہو،تو اس بیٹی کوثلث ملتا ہے۔اس لئے دوسری لڑکی کا حق بطریق اولیٰ ثلث سے کم نہ ہونا چاہئے۔

میت کی اولاد ہوتو اس کے والدین میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ مقرر ہونیکی وجہ

خداتعالیٰ فرماتا ہے۔**وَ لِاَبَوَیۡهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنۡ کَانَ لَه‘ وَلَدٌ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّه‘ وَلَدٌ وَوَرِثَه‘ اَبَوَاهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنۡ کَانَ لَه‘ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ.**
ترجمہ۔ یعنی میت کے والدین میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہے اس مال میں سے جو میت چھوڑ کر مرے بشرطیکہ اس کی اولاد ہو۔پس اگر میت کی اولاد نہیں ہے،تو میت کی والدہ کا تیسرا حصہ میراث میں سے ہے اور اگر میت کے بھائی موجود ہیں،تو میت کی والدہ کو چھٹا حصہ ترکہ میں سے ملتا ہے۔
یہ بات تم پر واضح ہو چکی ہے کہ بہ نسبت والدین کے اولاد ورثہ کی زیادہ مستحق ہے۔اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کو دوثلث اور والدین کو ایک ثلث دیا جائے۔اور باپ کا حصہ ماں سے اس لئے زیادہ مقرر نہیں کیا گیا کہ بیٹے کے قایم مقام ہونے اور اس کی معاونت کے اعتبار سے عصبہ کے ساتھ باپ کی فضیلت کا ایک مرتبہ اعتبار ہو چکا ہے۔

میت کی اولاد نہ ہو،تو سارا ترکہ والدین کو ملنے کی وجہ

جس صورت میں میت کی اولاد نہ ہو،تو والدین سے زیادہ تر کوئی حقدار نہیں ہے۔لہٰذا سب ترکہ والدین کو ملے گا۔اور باپ کو ماں پر فضیلت ہوگی۔ان مسائل میں جس فضیلت کا اعتبار کیا جاتا ہے وہ فضیلت تضعیف ہے۔

میت کی ماں و بھائی ہوں،تو ماں کو چھٹا حصہ ملنے کی وجہ

اگر ماں اور بھائی وارث ہوں اور بھائی ایک سے زیادہ ہوں،تو ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر بھائی عصبہ نہیں ہیں اور عصبات اس سے بعید ہیں،تو عصبیت اور شفقت ومحبت برابر ہے۔

نصف ان کو اور نصف انکو ملے گا اور وہ نصف ماں اور اسکی اولاد پر تقسیم ہوگا۔ لہٰذا اس حساب سے ماں کو بلا شک چھٹا حصہ دلایا جائیگا اور اس سے کم نہ ہوگا۔ اور باقی ان سب کو دلایا جائیگا۔ اور اگر بھائی عصبات ہیں، تو ان میں قرابت قریبہ وحمایت دونوں پائی جاتی ہیں اور بسا اوقات انکے ساتھ اور وارث بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً بیٹی اور بیٹے اور خاوند۔ پھر اگر ماں کو چھٹا حصہ نہ دلایا جائیگا، تو اسکو تنگی و دقت ہوگی۔

ترکہ زوجہ سے بشرط عدم اولاد خاوند کو نصف و بشرط اولاد چوتھا حصہ ملنے کی وجہ

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ ۔ترجمہ۔ یعنی تم کو تمہاری بیویوں کے ترکہ کا نصف حصہ ملے گا، بشرطیکہ انکی اولاد نہ ہو۔ اگر انکی اولاد ہو، تو تم کو تمہاری بیویوں کے ترکہ میں سے چوتھا حصہ ملے گا۔ انکی وصیت تجہیز و تکفین وخیرات و ادائے قرض کے بعد۔

ترکہ خاوند سے زوجہ کو چوتھا حصہ اور بشرط اولاد آٹھواں حصہ ملنے کی وجہ

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ ۔ترجمہ۔ یعنی تمہاری بیویوں کو تمہارے ترکہ میں سے، اگر تمہاری اولاد نہ ہو، تو چوتھا حصہ ہے۔ پھر اگر تمہاری اولاد ہے، تو بیویوں کو تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ بعد اس وصیت کے، جو تم نے کی ہے، اور بعد ادائے قرض کے۔ خاوند کو ورثہ اس لئے ملتا ہے کہ اس کو بیوی اور اس کے مال پر قبضہ ہوتا ہے۔ پس بالکل مال کو اس کے قبضہ سے نکالنے میں اس کی ضرر رسانی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ خاوند اپنا مال اس کی سپردگی میں رکھتا ہے۔ اور اپنے مال میں اس کو امین سمجھتا ہے۔ اس خیال سے کہ بیوی کے مال میں اس کا بڑا حق ہے اور بیوی خاوند سے خدمت اور ہمدردی اور حق محبت لیتی ہے۔ لہٰذا خاوند کو بیوی پر فضیلت ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ پھر اس بات کا بھی اعتبار کیا گیا ہے کہ خاوند بیوی کو زیادہ حصہ دینے سے اولاد پر تنگی نہ ہو۔

ہمیں سخت تعجب آتا ہے ان لوگوں پر کہ جب کوئی بیوہ عورت نکاح کر لیتی ہے، تو بشرط عدم اولاد جو وہ چوتھے حصہ اور بشرط اولاد آٹھویں حصہ کی مالک ہوتی ہے، اس سے وہ لے لیتے ہیں۔ حالانکہ از روئے قانون و شرع اسلام وہ اختیار رکھتی ہے کہ نکاح کرنے کے وقت اپنا حصہ بیچ ڈالے یا اپنے پاس رکھے اور قابض رہے۔ ایسا ہی سخت غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو بیوہ اور مطلقہ عورت سے دیا

ہوا زیور واپس لے لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا آتَیْتُمُوْهُنَّ ۔ ترجمہ۔ یعنی تم کو حلال نہیں ہے کہ مطلقہ و بیوہ عورتوں سے دیا ہوا مال واپس لو۔ سوائے بشرط خلع کہ اس میں عورت مال دے کر خاوند سے فارغ خطی حاصل کرتی ہے۔

لا ولد میت کے وارثوں کو کم و بیش حصے ملنے کی وجوہات

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَ لَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ وَ اِنْ کَانُوْا اَکْثَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَهُمْ شُرَکَاءُ فِی الثُّلُثِ ۔ ترجمہ۔ یعنی اگر وہ شخص جس کا ورثہ تقسیم ہوتا ہے کلالہ ہو یعنی اس کی اولاد اور باپ نہ ہو اور اس کا بھائی یا بہن ہو، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ زیادہ ہوں تو وہ سب ثلث میں شریک ہوں گے۔

یہ آیت ماں کی اولاد کے بارے میں ہے۔ اس لئے شفقت کے لحاظ سے اگر ان میں ماں ہے، تو اس کو نصف ملے گا اور نصف معاونت و حمایت کے اعتبار سے۔ اور اگر ماں نہیں ہے، تو دو ثلث اس کا ہے اور ثلث ان کا ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَکَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَ لَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَکَ وَ هُوَ یَرِثُهَا اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ وَ اِنْ کَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَاءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۔ ترجمہ۔ یعنی تجھ سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں لا ولدیت کے ترکہ کے متعلق۔ کہہ دے کہ خدا تعالیٰ تم کو لا ولد میت کے ترکہ کے متعلق یہ فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد مر جائے، جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو، تو اس کی بہن کو اس مرد کے ترکہ کا نصف حصہ ملے گا اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا، اگر اس کی اولاد نہیں ہے۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں، تو ان دونوں کو اس کے ترکہ میں سے دو ثلث ملے گا۔ اور اگر میت کے بھائی و بہن ہوں، تو مرد کو عورت سے دو چند ملے گا۔ یہ آیت بالاجماع باپ کی اولاد کے بارے میں ہے۔ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کا باپ ہو نہ اولاد ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ فرمودہ لیس لہ ولد کلالہ کی جزوی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کلالہ کی تقسیم حصص کی حقیقت بھائی اور بہن کے حصوں کی فلاسفی میں ظاہر کی گئی ہے۔

میت کے چچا کی اولاد کا مستحقِ وراثت ہونا اور اس کی خالہ کا ورثہ سے محروم ہونیکی وجہ

میت کے چچا کی اولاد کا مستحق وراثت ہونا اور اسکی خالہ، جو اسکی ماں کی طرف سے ہوتی ہے، اس کا میراث میت میں سے محروم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ چچا کی اولاد میں میت کی پشتی وطرفداری وحمایت وامداد اور مولات زندگی میں زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا میت کے باپ کے بیٹے تو اسکے والی اور طرفدار وحمایتی ہوتے ہیں۔ اور والدہ کے رشتہ دار اجنبیوں کی طرح ہیں۔ وہ تو اپنے باپوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ بمنزلہ بیٹیوں کے اقرباء کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے اس امر کے متعلق ایک شعر لکھا ہے۔

بنونا بنو ابنائنا و بناتنا   بنوهن ابنا الرجال الاباعد

ترجمہ۔ یعنی ہمارے بیٹے تو ہمارے بیٹوں کے بیٹے اور ہماری بیٹیاں ہوتی ہیں۔ اور بیٹیوں کے بیٹے تو اجنبی مردوں کے بیٹے ہوتے ہیں۔

ریاست وسلطنت کو وارثوں میں تقسیم نہ کرنے کی وجوہات

سوال ۔ جب کہ تم نے وراثت میں حقداروں کے حقوق جتا کر ان کے حصص بیان کر دیئے ہیں، تو سلطنت کو اس کے وارثوں میں کیوں تقسیم نہ کیا جائے؟

جواب ۔ کسی وراثت میں حقداروں کے حقوق مشخص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خواہ مخواہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ اور نہ یہ اسلام کا مقتضٰے ہے کہ ایسا کیا جائے۔ بلکہ اسلام ہر عظمت والی چیز کو عظمت دینا چاہتا ہے۔ اور کسی چیز کی عظمت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اس کے اجزاء پراگندہ و منتشر نہ ہوں۔ پس سلطنت ومملکت کا نام تب ہی قائم رہ سکتا ہے کہ اس کے اجزاء کو الگ الگ نہ کیا جائے۔ اور سارا خاندان سلطنت ایک ہی شخص کے ماتحت رہ کر ترقی و بہبودی سلطنت کا انتظام ونسق کریں۔ اور اس کے ہر امر کا انصرام اسی کے ذریعہ سے ہو۔ اسلامی شریعت اور قانون قدرت کا بھی یہی مقتضٰے ہے کہ ہر امر ذی شان کا اہتمام وانتظام بہت سے آدمی مل کر کریں۔ اور جب وہ ایسا کریں تو پہلے اپنا ایک امیر وافسر مقرر کر لیں۔ ورنہ وہ کام ابتر و ناتمام و بے سرانجام رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت کی عظمت وشکوہ قایم رکھنے کی وجہ سے اس کی تقسیم قبیح شمار کی گئی ہے۔ کیونکہ جب عظیم کے ٹکڑے کئے جائیں، تو وہ عظیم نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ہر جزو صغیر کہلائیگا۔ اور عدم تقسیم کی وجہ سے اس کے وہی اجزاء صغار بجائے خود ہر ایک عظیم کہلائیگا۔ ہم اس امر کی فلاسفی "اسرار شریعت" جلد اول میں "امامت نماز" کے عنوان کے تحت مفصل لکھ چکے ہیں۔ اور اب بطور اختصار معروض ہیں کہ پہاڑوں کی طرف نگاہ کرو۔ پہاڑ کا لفظ ہی انسان کے اندر ایک عظمت اور شوکت اس کے نام کی پیدا کرتا ہے۔ مگر اصل کیا ہے؟ ذرات صغار کا مجموعہ ہے۔ اب اگر ذرات پراگندہ اور منتشر حالت میں ہوتے ہیں، تو کیا ہم ان کا نام پہاڑ رکھ

سکتے ہیں، ہرگز نہیں۔ یہی ذرات حالت منتشرہ میں بے شمار تعداد میں تھلوں وریگستانوں میں موجود ہوتے ہیں۔کیا کوئی کہتا کہ یہ پہاڑ ہیں۔کبھی نہیں۔پس اگر یہ ذرات حالت منتشرہ میں ہوتے،تو تھلوں سے زیادہ ان کی شوکت اور وقعت نہ ہوتی۔اور وہ مفاد اور منافع،جو اس ہیئت مجموعی میں،جو پہاڑ کی ہے، دنیا کو پہنچتے ہیں، نہ پہنچ سکتے۔حالت اجتماعی میں پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔دریا بہتے ہیں۔ندی نالوں کا سلسلہ جاری ہوسکتا ہے۔عجیب عجیب قسم کی لکڑیاں اور دوائیوں کے سامان پہاڑوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مقامات میں بڑی بڑی گرانقدر کانیں سونے اور چاندی وغیرہ کی نکلتی ہیں۔غرض ہر قسم کی راحت اور آسائش اور تمول کا سامان اس طرح پہاڑ سے حاصل ہوتا ہے۔اور بالمقابل انفرادی حالت تھلوں کی دیکھ لو کہ ریت اڑتی ہے، نہ پیداوار ہوسکتی ہے، نہ کوئی درخت ہی پیدا ہو سکتا ہے۔یہی حال اس سلطنت کا ہے، جو اس کے وارثوں میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

اس بیان سے ہماری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ قرآن کریم میں میراث کے حصے حقداروں کے مقرر فرمائے ہیں ان میں کچھ تغیر و تبدل یا کمی وبیشی کی جائے، بلکہ ان مشترکہ حصص یعنی ایک بڑی سے بڑی سلطنت کا انتظام بغیر تقسیم سارے حقدار ملکر کریں۔اور اس کا انتظام بطریق احسن تب ہی ہوسکتا ہے کہ سب منتظمین پر ایک حاکم مقرر ہو۔اور میراث میں بہت آدمیوں کے حقوق اس لئے مقرر ہوئے کہ انسانوں میں الفت ومواسات پیدا ہو اور کسی پر ظلم و تعدی نہ ہو۔اور ان کی ہمدردی اور غور و پرداخت کا خیال ایک دوسرے کے دل میں متمکن رہے اور بنی آدم میں سلسلہ تعاون وتناصر کا منقطع نہ ہو۔چنانچہ اس بیان کو ہم " کتاب الفرائض" کے ابتداء میں بیان کر چکے ہیں اور بقدر کفایت اب پھر لکھا جاتا ہے کہ مصلحت وحکمت الٰہی کا تقاضا یوں ہے کہ لوگوں میں باہم معاونت اور مناصرۃ اور غمخواری کا طریق دائر وسائر رہے اور ہر شخص دوسرے کے نفع ونقصان کو بمنزلہ اپنے نفع ونقصان کے سمجھے۔اور یہ امر جب ہی ہوسکتا ہے کہ ان کی جبلت میں یہ بات داخل ہو کہ اسباب عارضہ بھی اس کے معین و مددگار ہوں۔لہٰذا اس مصلحت وحکمت الٰہی سے صاف نمایاں ہو رہا ہے کہ جس سلطنت و ریاست کے جس قدر زیادہ تر ذوی الفروض اور حقدار ہوں گے اسی قدر اس کی استحکامی کا باعث ہوگا۔کیوں کہ جس مال میں کسی کا حصہ ہوتا ہے وہ اس کو اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا اور اس کا نگران رہتا ہے۔کیونکہ یہ بات طبعی اور فطرتی ہے کہ جس قدر اس کی حفاظت کا خیال حقداروں اور ذوی الفروض کو ہوتا ہے اس قدر دوسرے اشخاص کو ہرگز نہیں ہوتا۔پس اس سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ جس سلطنت کے حقدار و ذوی الفروض اور حقیقی خیر خواہ تھوڑے ہوں گے،اسی قدر اس کے لئے نقصان اور باعث کمزوری ہے۔

جائداد سے لڑکیوں کو حصہ نہ دینے والوں کے لئے

دنیا میں رسوائی کا باعث اور آخرت میں عذاب شدید کی وجہ

(۱) قانون قدرت کا یہ خاصہ ہے کہ جب کسی چیز کی کسی جزو کو من وجہ الحقیقت پھیر دیا جائے، تو وہی جزو اس کے کل کے لئے ضعف و کمزوری کا باعث ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں جائدادوں میں جیسے لڑکوں کے حصے مقرر کئے ہیں، ایسے ہی لڑکیوں کے حصے بھی مقرر فرمائے ہیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اکثر مقامات میں جائدادوں کو صرف لڑکوں پر بانٹ دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو محروم رکھا جاتا ہے۔ جب سے مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کے احکام میں تفریق کی، تب سے ان کے فرقے فرقے اور ٹکڑے ہو کر ان میں ضعف آ گیا۔ قرآن کریم سے بطور اشارۃ النص ثابت ہو رہا ہے کہ جس خاندان و قوم میں الٰہی احکام کی تفریق ہوئی اس میں ضعف آ گیا اور نصرت الٰہی اس کے شامل حال نہیں رہتی۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذَالِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ. اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرُوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ ترجمہ۔ یعنی کیا تم خدا تعالیٰ کے بعض حکموں کو مانتے اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ پس جو لوگ ایسا کام کریں، ان کی سزا دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت میں وہ سخت ترین عذاب میں دھکیلے جائیں گے۔ اور خدا تعالیٰ ان کے عملوں سے بے خبر نہیں ہے۔ ایسے لوگ آخرت کے بدلہ میں دنیا کی زندگی کے خریدار ہوتے ہیں۔ پس ان سے عذاب تخفیف نہ ہوگا اور نہ ان کو مدد ملے گی۔

یہ بات مشہور و متعارف اہل زمانہ ہے کہ جو غلام اپنے مالک کے کچھ حکموں کی تعمیل کرتا ہے، مگر اس کے بعض حکموں کو دیدہ دانستہ ٹال دے اور عمداً ان کی تعمیل سے گریز کرے، تو بالآخر اس کا مالک اس کو سخت ترین سزا دیتا اور اس کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، تا کہ اس میں سے رعونت و سرکشی و نافرمانی کی صفت زائل ہو جائے اور غلامی و عبودیت اور عجز و انکسار کی صفات اس میں پیدا ہوں۔

واضح رہے کہ ایسی باتیں لوگوں سے بطریق حرص و ہوائے نفسانیہ و استکبار صادر ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو بات ان کی خواہش کے مطابق ہو، اس کو مان کر اس پر عمل کر لیتے ہیں اور جو ان کی خواہش کے برخلاف ہو، اس کی تعمیل سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی باتیں ان کے لئے دارین میں موجب

خزلان وخسران ہیں۔دراصل مسلمانوں نے جب سے حدودالٰہیہ سے تجاوز کرنا شروع کیا،تب سے ان میں ضعف وکمزوری آ گئی ہے۔

نظم

اطع ربک الجبار اهل الاوامر

و خف قهره و اترک طريق التجاسر

و کيف على نهار النهابر تصبر

و انت تاذى عند الهواجر

و حب الهوى و الله صل مدبر

کملمس افعى نائم فى النواظر

فلا تختر و الطغوى فان الهنا

غيور على حرماته غير قاصر

و لا تحسن ذنبا صغيرا کهين

فان وداد المم احدى الكبائر

و آخر نصحى توبة ثم توبة

و موت الفتىٰ خير له من مناکر

ترجمہ۔اپنے پروردگار جبار اور صاحب حکومت کی اطاعت کرو۔اور اس کے قہر سے ڈرو اور طریق دلیری چھوڑ دو۔اور مصیبتوں کی آگ پر تو کس طرح صبر کر سکے گا،حالانکہ تو دوپہر کی گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔خدا کی قسم حرص وہوس کی محبت ہلاک کرنے والا سانپ ہے،جس کی چمڑی باہر سے صاف و ملائم دکھائی دیتی ہے۔پس حدودالٰہی سے گذرنا اختیار نہ کرو۔کیونکہ خداوندتعالیٰ اپنے حرمات پر غیرت مند ہے اور مجرموں کو معذور نہ سمجھے گا۔چھوٹے گناہ کو آسان مت سمجھو۔کیونکہ چھوٹے گناہ سے محبت کرنا بڑا گناہ ہے۔میری آخری نصیحت یہی ہے کہ گناہوں سے توبہ کرو۔دراصل انسان کا مرجانا گناہ کرنے سے بہتر ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب فلسفۃ الاسلام

بسم الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی الہ و اصحابہ مع التسلیم

اما بعد۔ واضح ہو کہ امور شرعیہ کو عقلی رنگ میں بیان کرنے کے متعلق ہم پر کچھ سوالات وارد ہوئے ہیں، جن کے جوابات مع اندراج سولات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جو کہ ناظرین کے لئے موجب ازدیادبصیرت ہوں گے۔

عقلی قیل وقال سے فیصلے اور سچائیوں کی پرکھ

سوال ۔کیا عقلی قیل وقال سے فیصلے اور سچائیوں وصداقتوں کی پرکھ ہوسکتی ہے۔معجزہ وکرامت سچائی کی پرکھ کا معیار ہیں اور بس۔

جواب ۔دنیامیں فیصلے اکثر قیل وقال سے ہی ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ صرف باتوں کے ثبوت یاعدم ثبوت کے لحاظ سے ایک شخص کو عدالت اطمینان کے ساتھ پھانسی دے سکتی ہے اور ایک شخص کو تہمت خون سے بری کرسکتی ہے۔قیل وقال سے حقیقتوں کے انکشاف اور واقعات کے ثبوت یاعدم پر تمام مقدمات فیصلہ پاتے ہیں۔کسی فریق سے یہ سوال نہیں ہوتا کہ کوئی آسمانی نشان دکھلا دے،تب ڈگری ہوگی۔یافقط اس صورت میں مقدمہ ڈسمس ہوگا کہ جب مدعاعلیہ سے کوئی کرامت ظہور میں آئے گی۔یاایک کاغذ کا کبوتر بنا کر عدالت میں اڑادے،تو حاکم صرف ان وجوہات کے رو سے اس کو ڈگری نہیں دے سکتا۔جب تک باقاعدہ صحت دعویٰ ثابت نہ ہواور واقعات وحقائق پرکھے نہ جائیں۔

بے شک معجزہ وکرامت اپنے موقعہ پر شناخت صداقت کے لئے ایک بڑی کارآمد چیز اور معیار خالص ہے۔مگر اس کی شناخت میں بھی عقل و باریک بینی کی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا کہنا پڑتا ہے۔قرآن کریم میں تین قسم کے مُردے زندہ کرنے کا ذکر آیا ہے۔

اول۔خدا تعالیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا۔دوسرا۔انبیاء واولیاء کا مُردوں کو زندہ کرنا۔تیسرا۔کفار و

فجار ساحروں وشعبدہ بازوں کا زندہ کرنا۔ پس ان تینوں قسم کے احیائے موتیٰ میں خدا تعالیٰ نے فرق رکھا ہے، جس کی عقل وقیاس کے ذریعہ تمیز ہوسکتی ہے۔ ورنہ تینوں کو ایک ہی ٹھہرانا پڑے گا۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو عقل اسی لئے عطا فرمائی ہے کہ انسان اس کے ذریعہ حق وباطل میں تمیز کر سکے۔

انسان کو جو خدا تعالیٰ نے قوت نطق ومکالمہ کا شرف اور نعمت عقل کا روشن چراغ عطا کیا ہے، اس کی علت غائی پر غور کرو گے، تو صاف نمایاں ہوگا کہ عقل کو اگر اس عالم کے سارے انسانوں سے ایک پہر کے لئے خدا تعالیٰ علیحدہ کرے، تو وہ اسی وقت ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر فناہ ہو جائیں۔ اور کارخانہ عالم بگڑ جائے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عقل عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنے اونٹ کے گھٹنے باندھنے کے ہیں۔ پس قوت عقل سے انسان کی قوت بہیمیہ وسبعیہ اور وحوشت باندھی جاتی ہے اور اسی قوت ملکی یعنی عقل کے ذریعہ انسان اشیائے عالم میں علی وجہ الحقیقت تصرف کرتا ہے، جس سے نظام عالم میں خلل نہیں پڑتا۔ جب انسان سے قوت عاقلہ مفقود ہو جاتی ہے، تو وہ دیوانہ اور پاگل ہو جاتا ہے اور جب تک اس کو باندھا نہ جائے، تب تک وہ ہر کسی کو ضرر وایذا دیتا اور اپنی جان کو مہلکات میں ڈالنے کے درپے رہتا ہے۔ اس امر کی تصدیق ملک کے مختلف پاگل خانوں کو دیکھ کر ہوسکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قوت عاقلہ، جو خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے، اس کے ذریعہ قوت بہیمیہ وسبعیہ کو باندھ کر عالم میں علی حسب مناسبت خود تصرف کرتا اور اسی کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں وفضلوں کا مورد بنا اور اسی کے وسیلہ جملیہ سے وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ کا شرف خطاب خدا تعالیٰ سے پا کر معزز وممتاز ہوا ہے۔

و افضل قسم الله للمرء عقله	فليس من الخيرات شئی يقاربه
اذا اکمل الرحمٰن للمرء عقله	فقد کملت اخلاقه و ماربه
يعيش الفتی فی الناس بالعقل انه	علی العقل يجری علمه و تجاربه
تزين الفتیٰ فی الناس صحة عقله	و ان کان مخطورا عليه مکاسبه
يشين الفتی فی الناس قلة عقله	و ان کرمت اعرافه و مناسبه

ترجمہ۔ اور خدا کی تقسیم سے آدمی کے لئے سب سے افضل آدمی کی عقل ہے۔ اچھی چیزوں میں سے کوئی چیز عقل کے برابر نہیں ہے۔ جب کسی آدمی کو خدا پوری عقل عطا کرتا ہے، تو اس میں اس کے اخلاق اور مقاصد پورے ہو گئے۔ جوان آدمی لوگوں میں عقل کے سبب زندگی بسر کرتا ہے۔ عقل ہی سے اس کا علم چلتا ہے اور اس کو تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ لوگوں میں جوان مرد آدمی عقل کی درستی سے صاحب زینت ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس کے افعال اس کے لئے ناجائز ہوں۔ جوان مرد کو لوگوں میں اس کی کم عقلی عیب دار کر دیتی ہے اور اگرچہ اس کی اصلیں اور نسبتیں بڑی ہوں۔

جب آخرت میں مکافات اعمال ہوگا، تو انسان کا جو فعل موافق عقل صحیح ہوگا اس سے اس کو سکھ و

چین حاصل ہوگا اور جو اس کے برخلاف ہو وہ موجب ایذا ہوگا۔

اعلم انک ستعارض باعمالک و اقوالک و افکارک و سیظهر علیک من کل حرکة فعلیة او قولیة او فکریة صور روحانیة فان کانت تلک الحرکة عقلیة صارة الصورة مادة لملک تلتذ بمنادمته فی دنیاک و تهتدی بنوره فی اخراک و ان کانت تلک الحرکة شهویة او غضبیة صارت تلک الصورة مادة لشیطان یوذیک فی حال حیاتک و عجبک عن ملاقات النور بعد وفاتک.

ترجمہ۔ واضح ہو کہ تمہارے اعمال واقوال وافکار کا محاسبہ ہوگا اور تم پر تمہاری حرکات فعلی وقولی وفکری سے روحانی صورتیں ظاہر ہوں گی۔ پس اگر وہ حرکت عقلی ہوگی، تو اس صورت سے ایک فرشتہ پیدا ہو جائے گا، جسکے ساتھ انسان دنیا و آخرت میں محظوظ ہوتا اور آخرت میں اس کے نور کے ساتھ راہ پاتا ہے۔ اور اگر وہ حرکت شہوانی یا غضبی ہو، تو اس صورت میں ایک شیطان بن جاتا ہے، جو اس کو اس دنیا میں ایذا دیتا اور مرنے کے بعد ملاقات نورِ حقیقت سے محجوب کر دیتا ہے۔

البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محض عقل سے کوئی شخص دین الٰہی کے حقائق کو معلوم نہیں کر سکتا جب تک نورِ نبوت ممد نہ ہو۔

حضرت مجد الدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

رایت النبی صلی الله علیه وسلم فی المنام فقلت له ما تقول فی ابن سینا . فقال هو الرجل الذی اراد ان یصل الی الله بلا واسطتی فحجبته بیدی هکذا فسقط فی النار۔ (ترجمہ از مرتب)۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ابن سینا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے، جس نے میرے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہا۔ سو میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے اس طرح روک دیا۔ اور وہ آگ میں جا گرا۔

احکام شریعت میں عقل کا دخل جائز وناجائز ہونے کی وجوہات

سوال ۔ کیا شریعت میں عقل کا دخل جائز ہے؟

جواب ۔ جبکہ شریعت کا خطاب ہی عقل پر ہے، تو پھر عقل کا دخل شریعت میں کیوں جائز نہ ہو گا۔ اگر شریعت میں عقل کا دخل ناجائز ہوتا، تو انسانوں کے سوا دیگر حیوانات پر بھی شریعت کا نزول ہوتا۔ انسان مکلّف ہی عقل کی وجہ سے ہے۔ شریعت کا بوجھ اور شریعت کا سہارا ہی عقل پر ہے۔ شریعت کو اٹھانے والی ہے، تو بس عقل ہی ہے۔ اگر شریعت کا خطاب عقل پر نہ ہوتا، تو دیوانے ونابالغ سب مکلّف ہوتے۔

سوال ۔ اگر شریعت میں عقل وقیاس کا دخل ہوتا، تو خدا تعالیٰ قرآن کریم میں یہ نہ فرماتا۔ وَ مَا

اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَئِيٍ فَحُكْمُه، اِلٰى اللّٰهِ ۔یعنی جس بات میں تم آپس میں اختلاف کرو۔تو اس کا فیصلہ خدا تعالیٰ کی طرف لے جاؤ۔

بارہا شد بر تو ثابت کایں عقول　　مبتلا ہستند بر سہو و ذہول
بارہا دیدی بعقل خود فساد　　بارہا زیں عقل ماندی بے مراد
باز نخوت میکنی بر عقل خویش　　وز دلیری میروی نادیدہ پیش
ہست بر اسرار اسرار دگر　　تا کجا تازد خر فکر و نظر
ایں چراغ مردہ از زور ہوا　　چوں رہ باریک بنماید ترا
وحی یزدانی ز راہ آگاہ کند　　تا بمنزل نور را ہمراہ کند
عقل بے وحیش بتے داری براہ　　بت پرستی ہا کنی شام و پگاہ
عقل تو مغلوب صد حرص و ہواست　　تکیہ بر مغلوب کار اشقیا است

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَئِيٍ فَرَدُّوْهُ اِلٰى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْكُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ. ترجمہ۔یعنی اگر تم کسی چیز میں تنازع کرو،تو اس کو خدا اور رسول کی طرف لے جاؤ،اگر تم خدا تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔حضرت ابن قیم لکھتے ہیں۔

اجمع المسلمون على ان الرد الى الله سبحان هو الرد الكتابه و الرد الى الرسول هو الرد فى حضوره فى حياته و الى سنته فى غيبته و بعد مما ته ان الله سبحانه انما ردنا الى كتابه و سنة رسوله و لم يردنا الى قياس عقولنا و آرائنا قط بل قال تعالىٰ لنبيهٖ صلى الله عليه وسلم وَ ان احكُمَ بينهم بما انزل اللّٰه و قال اِنَّمَا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ و لم يقل بما رايت. و قال وَ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. و قال اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ و قال وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابُ تِبْيَاناً لِكُلِّ شَئِيٍ و قال اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ قال قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَ اِنْ اهْتَدَيْتُ فِيْمَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ فلو كان القياس هدى لم ينحصر الهدىٰ فى الوحى و قال فَلَا وَ رَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ فنفى الايمان حتى يؤخذ بحكمه و هو تحكيمه فى حال حياته و تحكيم سنة فقط بعد وفاته و قال يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

ای لا تقدموا حتی یقول.

ان اللہ سبحانہ اخرجنا من بطون امہاتنا لا نعلم شیئا و انزل علینا کتابه و ارسل الینا رسوله یعلمنا الکتاب و الحکمة فما علمنا و بینه لنا فهو من الدین و ما لم یعلمناه و لا بین لنا انه من الدین فلیس بضرورة و کل ما لیس من الدین فهو باطل فلیس بعد الحق الا الضلال و قد قال تعالیٰ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ فالذی اکمله اللہ سبحانہ و بینه هو دیننا لا دین لنا سواہ و لو کان القیاس حجة لما تعارضت الاقسیة و ناقص بعضها بعضا. و قال تعالیٰ وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡهِ مِنۡ شَیۡئٍ فَحُکۡمُه‘ اِلٰی اللہِ و لم یقل الی قیاساتکم و آرائکم و لم یجعل اللہ آراء الرجال و اقسیتهم حاکمة بین الامة ابدا. و قال تعالٰی وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَ لَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضٰی اللہُ وَ رَسُوۡلُه‘اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَهُمُ الۡخَیۡرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ فانما منعهم من الخیرہ عند حکمه و حکم رسوله عند آراء الرجال و اقسیهم و ظنونهم و الرسول صلی اللہ علیه وسلم لم یدع امته الی القیاس بل قد صح عنه انه انکر علی عمر و اسامة محض القیاس فی شان الحلیتین اللتین ارسل بهما الیها فلبسها اسامة قیاسا للبس علی التملک و للانتفاع و البیع و کسوتها لغیر وردها عمر قیاسا لتملکها علی لبسها فاسامة اباح و عمر حرم قیاسا فابطل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کل واحد من القیاسین و قال لعمر انما بعثت بها الیک لتستمتع بها و قال لاسامة انی لم ابعثها الیک لتلبسها و لکن بعثتها الیک لتشققها خمر النسائک و النبی صلی اللہ علیه وسلم انا تقدم الیهم فی الحریر بالنص علی تحریم لبسه فقاسا قیاسا اخطاء فیه فاحدهما قاس التلبس علی الملک و عمر قاس التملک علی اللبس و النبی صلی اللہ علیه وسلم بیّن انما حرمه من اللبس لا یتعدی الی غیرہ و ما اباحه من التملک لا یتعدی الی اللبس و هذا عین ابطال القیاس ان اللہ تعالٰی اقسم بنفسه علی نفی الایمان عن العباد حتی یحکموا رسوله فی کل ما شجر بینهم من الدقیق و الجلیل و لم یکتف فی ایمانهم بهذا التحکیم بمجردہ حتی ینتفی عن صدورهم الحرج و الضیق عن قضائه و حکمه و لم یکتف منهم ایضا بذالک حتی یسلموا تسلیما و ینقادوا انقیادا و قال یَا اَیُّهَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡهَرُوۡا لَه‘ بِالۡقَوۡلِ کَجَهۡرِ

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ فاذا كان رفع اصواتهم فوق صوته سببا لحبوط اعمالهم فكيف تقديم آرائهم و عقولهم و اذواقهم و سياساتهم و معارفهم على ما جاء به و رفعها عليه اليس هذا اولىٰ ان يكون محبطا لاعمالهم۔

ترجمہ۔ مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اس آیت میں حکم الٰہی کو خدا کی طرف پھیرنے سے مراد رسولؐ کی زندگی میں اس کے حضور میں اور اس کی وفات کے بعد اس کی سنت ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو دینی احکام کے لئے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرنے کے لئے توجہ دلائی۔ اور ہم کو اپنے عقول کے قیاسوں و تخمینوں و آراؤں کی طرف رجوع نہیں دلایا، بلکہ اپنے نبی علیہ السلام کو فرمایا کہ لوگوں میں حکم کر اور فیصلہ کر خدا تعالیٰ کی اتاری ہوئی وحی پر۔ اور پھر فرمایا۔ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے ضرورت حقہ پر، تا کہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان ساتھ اس وحی کے ، جو دکھائی تجھ کو خدا نے ، اور یہ نہیں فرمایا، جو تو نے دیکھا۔ اور فرمایا جو کوئی خدا تعالیٰ کے اتارے ہوئے حکم پر فیصلہ نہ کرے، وہ لوگ بدعہد و عہد شکن ہیں۔ اور فرمایا پیروی کر واس حکم کی، جو اتارا گیا تجھ پر تمہارے پروردگار کی طرف سے۔ اور فرمایا ہم نے اتاری تیری طرف کتاب بیان کرنے والی ہر چیز کو۔ اور فرمایا کیا ان کو کافی نہیں ہے کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری، جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ اس میں رحمت الٰہی اور نصیحت ہے مومنوں کے لئے۔ اور فرمایا کہہ دے اگر میں بھول گیا تو اپنی جان پر بھولوں گا۔ اور اگر میں ہدایت پاؤں، تو خدا کی وحی پر ہدایت پاتا ہوں۔

پس اگر قیاس میں ہدایت ہوتی، تو ہدایت کو وحی الٰہی پر منحصر و موقوف نہ کیا جاتا۔ اور فرمایا اے نبیؐ تیرے پروردگار کی قسم کہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھ کو منصف و حاکم نہ ٹھہراویں درمیان اس بات کے، جس کا ان میں اختلاف ہو۔ اس آیت میں خدا نے ظاہر فرمایا کہ جب تک کسی دینی امر متنازعہ فیہ میں نبیؐ کے حکم کی سند پر لوگ عمل نہ کریں، ان کا ایمان خدا اور سول پر کوئی نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ نبیؐ کی زندگی میں اس امر کا حکم نبیؐ سے پوچھ لیا جائے۔ اور اس کی وفات کے بعد اس کی سنت پر فیصلہ ہو۔ اور فرمایا اے ایماندارو خدا اور سول سے آگے نہ بڑھو، یعنی جب تک وہ خود نہ فرمائے، تم اس سے آگے نہ بڑھو۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اور ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس نے ہم پر اپنی کتاب اتاری اور اپنا رسول بھیجا، جس نے ہم کو وہ کتاب اور اس کی سمجھ و دانائی سکھائی۔ پس، جو کچھ ہم کو اس نے سکھایا اور ظاہر کیا، وہ دین ہے اور جو کچھ ہم کو اس نے نہیں دکھایا اور نہ ہمارے لئے ظاہر کیا، اسکی ضرورت نہیں ہے۔ پس جو چیز دین میں سے نہیں ہے، وہ باطل ہے۔ پس حق کے بعد گمراہی

کے سوا اور کیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے فرمایا آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا۔ پس جس کو خدا نے کامل کر کے ظاہر فرما دیا، وہی ہمارا دین ہے۔ اس کے سوا ہمارا کوئی دین نہیں ہے۔ اور اگر قیاس حجت دین میں سے شمار ہوتا، تو لوگوں کے قیاسوں میں اختلافات اور تناقضات نہ ہوتے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے، جس بات میں تم آپس میں اختلاف کرو، اس کا محاکمہ خدا کے پاس کرو۔ اور یہ نہیں کہا کہ اس کا فیصلہ اپنے قیاسوں اور راؤں سے کرلو۔ اور نہ خدا نے لوگوں کی راؤں اور قیاسوں کو امت نبوی میں کبھی محاکم بنایا۔ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے، کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو نہ چاہئے کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کریں، تو اس میں اپنے اختیارات نکالیں۔ اس جگہ لوگوں کو خدا و رسول کے حکم پر اپنے اختیار سے منع فرمایا اور لوگوں کے قیاسوں اور راؤں وگمانوں کے وقت اختیار سے منع نہیں فرمایا۔ اور خدا کی امت نبوی کو قیاسات پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت ہے کہ آپ نے دو کپڑوں میں حضرت عمر و اسامہ کے محض قیاس پر انکار فرمایا۔ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ارسال فرمائے تھے۔ پس اسامہ نے کپڑے کو ملکیت و نفع اٹھانے اور دوسرے کو پہنانے کے قیاس پر خود پہن لیا۔ اور حضرت عمر نے کپڑے کو پہننے کی بہ نسبت ملکیت کے قیاس پر گمان کرلیا۔ پس قیاس کی بنا پر حضرت اسامہ نے کپڑے کو مباح اور حضرت عمر نے حرام ٹھہرایا۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے قیاسوں کو باطل قرار دیا اور حضرت عمر کو فرمایا کہ میں نے یہ کپڑا تجھ کو اس لئے بھیجا تھا کہ تو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اور اسامہ کو فرمایا کہ میں نے یہ کپڑا تجھ کو اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تو اس کو خود پہن لے۔ بلکہ اس لئے بھیجا تھا کہ تو اس سے اپنی عورتوں کی اوڑھنی (دوپٹہ) بنا لے۔ اور نبی علیہ السلام نے ان کو محض ریشم پہننا پہلے حرام بتایا ہوا تھا۔ پس ان دونوں نے جو قیاس کیا، اس میں انہوں نے خطا کی۔ ایک نے ملکیت پر پہننے کا قیاس کیا۔ اور حضرت عمر نے پہننے کی بہ نسبت مِلک کا قیاس کیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمایا کہ جو چیز خود پہننی حرام ہو، اس کی حرمت دوسرے تک متجاوز نہیں ہوتی۔ یعنی عورتوں کو تو ریشم پہننا جائز ہے۔ اور جس کی مِلک مباح ہو، اس کی ملکیت سے اس کو خود پہننا جائز نہیں ہو جاتا۔ خدا تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر بندوں سے ایمان کی نفی فرما دی جب تک وہ اس کے رسول کو محاکم نہ ٹھہرائیں ہر ایک اس بات میں، جس کا ان کے درمیان آپس میں چھوٹی بڑی چیز کا اختلاف ہو، اور انکے اس محاکمہ کے ایمان پر اکتفا نہیں کیا، جب تک کہ ان کے سینہ سے رسول کے حکم پر حرج وتنگی نکل نہ جائے۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ بالکل حکم رسول کے آگے گردن نہاد ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اے ایماندارو اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اور اسکو

آپس میں ایک دوسرے کے پکارنے کی طرح نہ پکارو کہ اس سے تمہارے عمل نابود ہو جائیں گے۔ اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی۔ پس جبکہ نبیؐ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا عملوں کے نابود ہونے کا سبب ہے، تو پھر اپنی راؤں اور اپنی عقلوں اور اپنے ذوقوں اور اپنی سیاستوں اور اپنے معارف کو نبی کے لائے ہوئے احکام الٰہی پر بلند کرنے سے کیونکر حبط اعمال کا سبب نہ ہوگا۔ کیا یہ امر بالاولیٰ حبط اعمال کا سبب نہیں ہے۔

جواب ۔ وہ امور واحکام الٰہی، جن میں وحی جلی وخفی قرآن واحادیث کا نص صریح وارد ہو چکا ہے، عقل وقیاس کے ساتھ ان کی مخالفت کرنی یا ایسی اشیاء کو قیاس وعقل کی بنا پر شریعت میں داخل یا خرج کرنا، جس سے قرآن واحادیث کی مخالفت لازم آئے، ممنوع ہے۔ پس خوب یاد رکھو کہ جس قیاس و عقل سے وحی جلی وخفی کی مخالفت آجائے، وہ قیاس وعقل غلط ہے۔ ورنہ اگر محض قیاس وعقل کو احکام الٰہی کے وجوہات وعلتوں کے معلوم کرنے میں دخل دینا منع ہوتا اور احکام الٰہی سے ان نظائر کا عقل وقیاس سے استنباط واستخراج حرام ہوتا، تو شریعت کا خطاب ہی عقل پر نہ ہوتا اور نہ خدا تعالیٰ بار بار اہل عقول کو قرآن میں یوں خطاب فرماتا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ... تَتَفَكَّرُوْنَ اور نہ خدا تعالیٰ معقولی دلائل کو قرآن کریم میں بکثرت بیان فرماتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قیاس صحیح عقل سلیم کے عطیہ کا نزول بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ ایک عارف ربانی کہتا ہے۔

گر خرد پاکیزہ رائے آورد آں نہ از خود بل زجائے آورد

آنچہ گہ گہ مے رسد ہم از خداست منتہائے عقل تعلیم خداست

پس بات صرف اتنی ہے کہ شریعت میں حکم الٰہی مقدم ہے اور اگر کسی امر میں نص صریح نہ ملے، تو اس کی نظیر شریعت میں قیاس وعقل سے تلاش کی جائے۔ پس وہ بھی شریعت میں داخل ہے۔ کیونکہ خدا نے دین کی تکمیل اس طرح فرمائی ہے کہ تمام وہ مسائل، جن کے لئے وقتاً فوقتاً ہر زمانہ کے لوگوں کو حاجتیں پیش آتی رہتی ہیں، ان کو احکام میں بالاجمال وجیز ومدلل کلمات میں مندرج فرما کر ان کے استنباط واستخراج کے لئے اہل عقول کو اشارات فرما دیئے اور ان کے لئے علامات مقرر کئے۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمْ کا اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ عقل کا کسی مجمل امر کی ایسی تشریح کرنی، جس کی نص سے مخالفت نہ ہو، تکمیل دین کے برخلاف نہیں ہے۔

پس بلاشبہ شریعت کو اٹھانے والی عقل ہے۔ اور شرط یہ ہے کہ عقل حامل اور شریعت محمول ہو۔ کون نہیں جانتا کہ سوار اپنے مَرکب سے افضل ہوتا ہے۔ ایسا ہی شریعت عقل سے افضل واوّل ہے۔ اگر عقل کے لئے امور شریعت میں مداخلت بیجا خیال کی جاتی، تو خدا تعالیٰ عقلی دلائل اور نظائر قران کریم

میں بیان فرما کر انسانوں کے قیاسات عقلیہ کی طرف توجہ نہ دلاتا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ مِثْلُ الَّذِیْنَ کَفِرُوْا کَمِثْلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَ نِدَاءً . صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ. ترجمہ۔ اور منکروں کی مثال اس شخص کی ہے، جو ایک جانور کو ہانکتا ہے، جو سوائے پکارنے اور چلانے کے کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ ان کو عقل نہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِائَۃُ حَبَّۃٍ وَ اللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۔ترجمہ۔ مثال ان کی، جو اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ، جس سے سات بالیں اگتی ہیں اور ہر بال میں سو سو دانہ ہے۔ اور خدا بڑھاتا ہے جس کیلئے چاہئے اور خدا کشائش والا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

ایسا ہی اور بہت احادیث میں نظیریں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میرا باپ بوڑھا ہے، وہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتا اور اس پر حج فرض ہے۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا۔ اگر تمہارے باپ پر قرض ہو اور تو اس کی طرف سے قرض ادا کرے، تو ادا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا ہاں ادا ہو سکتا ہے۔ تو آپ نے اس کو فرمایا فَدَیْنُ اللّٰہِ اَحَقُّ اَنْ یُّقْضٰی یعنی خدا کا فرض زیادہ تر اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو ادا کیا جائے۔

نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔ فی بضع احدکم صدقة قالو یا رسول اللہ او یاتی احدنا شھوته و یکون له فیھا اجرا قال ارایتم لو وضعھا فی حرام ایکون علیه وزر قالوا نعم قال فکذالک اذا وضعھا فی الحلال یکون له اجر ۔ترجمہ۔ تم میں سے کسی کا اپنی عورت سے وطی کرنا صدقہ ہے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ اگرچہ ہم میں سے کسی پر شہوت غالب ہو اور وہ وطی کرے تو بھی اس کو ثواب ہوگا۔ فرمایا اگر کوئی شخص شہوت کو حرام جگہ میں صرف کرے، تو اس کو گناہ ہوگا یا نہیں۔ صحابہ نے کہا۔ بے شک گناہ ہوگا۔ فرمایا اسی طرح جب شہوت کو حلال میں صرف کرے گا، تو اس کو ثواب ہوگا۔

و ھذا من قیاس العکس الجلی البین و ھو اثبات نقیض حکم الاصل فی الفرع لثبوت ضد علته فیه ۔ترجمہ۔ یہ ظاہر و باہر عکسی قیاس کی قبیل سے اور فرع میں اصلی حکم کی نقیض ثابت کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ اس میں اس کی علت کی ضد ثابت ہے۔

حضرت ابن قیم لکھتے ہیں۔ ان الصحابة قدموا الصدیق فی الخلافة و قالورضیه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لدیننا فلا نرضاه لدنیانا فقاسوا الامامة الکبری علی

امامة الصلوۃ ۔ترجمہ۔صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلافت کے لئے پیش کیا اور کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو ہمارے دین کے لئے پسند کیا، تو کیا ہم اس کو اپنی دنیا کے لئے پسند نہ کریں۔پس انہوں نے نماز کی امامت پر جواز امامت کبریٰ کا قیاس کیا۔

عن عکرمہ ان عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ شاور الناس فی حد الخمر و قال ان الناس قد شربوھا و اجترؤا علیھا فقال لہ علی کرم اللہ وجھہ ان السکران اذا سکری ھذی و اذا ھذی افتری فاجعلہ حد الفریۃ فجعلہ عمر حد الفریۃ ثمانین ۔ترجمہ۔عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں سے شراب کے متعلق مشورہ کیا اور کہا کہ لوگ شراب پینے میں دلیر ہو رہے ہیں۔تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرابی جب مخمور ہوتا ہے تو بکواس کرتا ہے۔اور بکواس میں افتراء بھی کرتا ہے۔لہٰذا شرابی کی حد کو افتراء کرنے والے کی حد کے برابر ٹھہراؤ۔پس حضرت عمرؓ نے شرابی کی حد اسی درے ٹھہرائے۔

شریعت میں اور ایسا ہی صدہا نظائر حقہ ہیں، جن کا استنباط قیاس کے ساتھ ہوا۔مثلاً غسل احتلام کو وجوب **لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ** سے اور حدیث اصفر یعنی وضو کے ٹوٹنے کا قیاس آیت **اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِنْکُمْ مِنَ الْغَائِطِ** سے اور حضر میں رہن کے جواز کا قیاس سفر کے رہن سے ہوا ہے۔

قال المزنی الفقھاء من عصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا و ھلم جرا استعملوا المقائیس فی الفقہ فی جمیع الاحکام فی امر دینھم . قال و اجمعوا بان نظیر الحق حق و نظیر الباطل باطل فلا یجوز لاحد انکار القیاس لانہ التشبیہ بالامور و التمثیل علیھا ۔ترجمہ۔مزنی کہتا ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ سے لے کر ہمارے زمانہ تک فقہائے اسلام سارے احکام فقہ کے اندر اپنے امور دینیہ میں قیاسات کو استعمال کرتے رہے اور کہتا ہے کہ عقلا و فضلائے امت کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ سچ کی نظیر سچی اور باطل کی نظیر باطل ہے۔پس کسی کو جائز نہیں ہے کہ قیاس سے انکار کرے۔کیونکہ قیاس سے امور مطلوبہ میں تشبیہ و تمثیل بکار ہوتی ہے۔اور فطرت انسانی کا بھی یونہی تقاضا ہے کہ جب تک اس کو قیاسات عقلیہ و مثالات محسوسہ پیش نہ کی جائیں، وہ باریک و دقیق باتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

کیا شریعت میں کچھ نقص باقی ہے، جس کو انسانوں کے قیاسات عقلیہ سے پورا کیا جاتا ہے

آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ شاہد ہے کہ شریعت میں کوئی نقص باقی نہیں ہے۔ سارے احکام آ چکے ہیں۔ انسان کی فطرت و جبلّت یوں واقع ہوئی ہے کہ جب تک قیاسات عقلیہ و امثلہ محسوسہ اس کو پیش نہ کی جائیں، وہ بارک و دقیق باتوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اسلامی احکام جو صاحب اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمْ کی زبان سے نکلے ہیں، ان کے اندر تمام دقیق حقائق و نظائر اور قیامت تک مسائل و حادثات واقع ہونے والے جمع ہیں، جن کو سمجھنا نعمت خداداد و عقل الٰہی سے ہوتا ہے۔ یعنی احکام شریعت منزلہ من اللہ میں خدا کی طرف سے یہ امر مودّع ہے کہ جہاں جہاں شریعت اسلامیہ کے نظائر حقہ کے اجزاء وقوع حوادث سے اپنا ظہور و انکشاف چاہیں، ان کو قیاسات صحیحہ و عقول سلیمہ کے منور چراغوں کی تشریحات و تفصیلات سے طالبان راہ حق کی راہوں کو منور کرنا خدا نے مقدر رکھا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں آیا ہے۔ حُرِمَ عَلَیْکُمْ اُمَّهَاتِکُمْ وَ بِنَاتِکُمْ (الآیۃ) یعنی تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں حرام کی گئی ہیں۔ تو قیاس و عقل یہ سمجھاتے ہیں کہ ماؤں و بیٹیوں وغیرہ اقرب عورتوں کے حرام ہونے سے مراد ان سے نکاح کی حرمت ہے اور یہ حرمت مراد نہیں کہ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یا ان سے کلام کرنا حرام ہے۔ ایسی ہی اور امثلہ بے شمار ہیں۔

اس بات کی کیونکر تصدیق ہو کہ انسانی قیاس بھی خدا کے فرمودہ کے مطابق صحیح ہوتا ہے

اگر بعض انسانی قیاسات و عقول خدا تعالیٰ کے فرمودہ کے مطابق صحیح نہ ہو سکتے، تو ان کی صحت کے لئے صدہا صلحاء کی شہادتیں دنیا میں خدا تعالیٰ پیش نہ کرتا۔ چنانچہ اس امر کے بارے میں علامہ ابن قیم صحابہ کرام کے متعلق لکھتے ہیں۔ **قد کان احدهم یری الرائی فینزل القرآن بموافقته کما رای عمر فی اُساری بدران تضرب اعناقهم فنزل القرآن بموافقته . و رای ان تحجب نساء النبی صلی الله علیه وسلم فنزل القرآن بموافقته وری ان یتخذ من مقام ابراهیم مصلے فنزل القرآن بموافقته و قال نساء النبی صلی الله علیه وسلم لما اجتمعن فی الغیرة علیه عسیٰ ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجا خیرا منکن مسلمات مؤمنات فنزل القرآن بموافقته و لما توفی عبد الله ابن ابی قام رسول الله صلی الله علیه وسلم لیصلی علیه فقام عمر فاخذ بثوبه فقال یا رسول الله انه منافق فصلی علیه الرسول الله صلی الله علیه وسلم فانزل الله علیه و لا تصل علی احدمنهم مات ابدا و**

لاتقم علی قبرہ. ترجمہ۔جب صحابہ کرام میں سے کوئی شخص رائے پیش کرتا تھا،تو قرآن کریم میں اسی رائے کے موافق حکم نازل ہوجاتا تھا،جیسا کہ اسیران بدر کے متعلق حضرت عمرؓ نے رائے ظاہر کی کہ ان کو قتل کیا جائے،تو قرآن میں اس کے موافق حکم نازل ہوا۔اور نبی علیہ السلام کی عورتوں کے پردہ کے متعلق رائے دی،تو قرآن میں اس کے موافق حکم نازل ہوا اور مقام ابراہیم کو جائے نماز ٹھہرانے کی رائے پیش کی،تو حکم الٰہی اسی کے موافق اترا۔اور نبی علیہ السلام کی عورتوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غیرت سے اجتماع کیا،تو حضرت عمر نے ان کو کہا کہ خداتعالیٰ تم کو شاید طلاق دلوا کر تمہارے بدلہ میں اس کو بہتر اور مسلمان عورتیں پیدا کردے گا،تو حکم الٰہی اسی کے موافق نازل ہوا۔جب عبداللہ بن ابی مرگیا،تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جنازہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔حضرت عمر نے آنحضرت کو کپڑے سے پکڑ کر کہا۔یا رسول اللہ یہ شخص منافق تھا۔مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جنازہ پڑھ دیا،تو خداتعالیٰ نے آنحضرتؐ پر اس کے بارے میں یہ حکم نازل فرمایا کہ منافقوں میں سے کسی کا جنازہ ہرگز نہ پڑھو اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہو۔

بتدریج احکام آسمانی نازل ہونے کی وجوہات

سوال ۔خداتعالیٰ نے تمام حقیقتوں کو قرآن کریم میں کیوں یک دفعہ ہی واضح نہ کردیا کہ لوگوں میں نہ اختلافات ہوتے اور نہ اس کو قیاسات کی حاجت پڑتی۔

جواب ۔(۱) واضح ہو کہ خداتعالیٰ نے انسان کو دوسرے حیوانات کی طرح اس وضع فطرت پر پیدا نہیں کیا کہ اس کا علم چند بدیہی اور محسوس باتوں میں محسوس اور محدود ہے،بلکہ اس کو یہ استعداد بخشی ہے کہ وہ نظر اور فکر سے غیر متناہی علوم میں ترقیات کرتا رہے۔اور اس غرض سے اس کو عقل کا گوہر شب چراغ،جو دوسرے حیوانات کو نہیں ملا،عطا کیا۔ظاہر ہے کہ اگر یہ تمام عجائب غرائب الٰہی بدیہی طور پر واضح ہوتے،جن میں نظر اور فکر کی کچھ بھی حاجت نہ ہوتی،تو پھر انسان جسکا کمال اس کی قوت نظریہ کی تکمیل پر موقوف ہے،کن چیزوں میں نظر اور فکر کرتا۔اور اگر نظر اور فکر نہ کرتا،تو پھر کیونکر اپنے کمال کو پہنچتا۔سو چونکہ تمام انسانیت انسان کے استعمال قوت نظریہ سے وابستہ ہے،اس لئے اس حکیم مطلق نے اکثر دقائق اور حقائق کو ایسے طور پر مخفی رکھا ہے کہ جب تک انسان اپنی خداداد قوت کو بکمال اجتہاد استعمال میں نہ لائے،تو ان دقائق کا انکشاف نہیں ہوتا۔اس سے حکیم مطلق کا یہ ارادہ ہے کہ ترقی کرنے کا راستہ کھلا رہے اور جس سعادت کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے،اس سعادت تک وہ پہنچ جائے۔غرض خدا کے جتنے کام ہیں،وہ صرف موٹی صفت پر ختم نہیں ہوسکتے،بلکہ جس قدر کھودتے جاؤ،ان میں زیادہ سے

زیادہ باریکیاں نکلتی ہیں۔ پس جبکہ ان تمام چیزوں کی نسبت، جو خدا کی طرف سے ہیں، یہ عام قانون ثابت ہو چکا کہ وہ سب نکات دقیقہ اور اسرار عمیقہ سے پُر ہیں، تو اسی قانون قدرت کی متابعت سے یہ بھی ہر ایک عاقل کو ماننا پڑا کہ خدا کا کلام اور اس کے علوم بھی نکات دقیقہ سے خالی نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ خدا کے کلام میں سب سے زیادہ لطائف ہونے چاہئیں، کیونکہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اور حکیم مطلق کے علوم کا قدیم مخزن ہے، جس کو خدا نے اس بات کا آلہ بنایا ہے کہ تمام قوانین قدرتیہ، جو فی السموات والارض پائے جاتے ہیں، ان کی اصلاح کے لئے ان میں سامان موجود ہو۔ پس اگر وہ ناقص ہو، تو اتنے بڑے کام اس سے کیونکر انصرام ہو سکیں۔ اگر وہ تمام غلطیوں سے انسانوں کو پاک نہ کرے، تو پھر صرف بعض غلطیوں سے پاک کرنا حقیقت میں ایسا تھا کہ گویا منزل تک پہنچانے سے پہلے راستہ میں ہی چھوڑ دیتا۔ غرض جب خدا کا قانون قدرت ہر ایک چیز میں، جو اس کی طرف سے صادر ہو، یہی ثابت ہوا کہ ان سب میں خدا تعالیٰ نے دقائق عمیقہ بھی ضرور رکھے ہیں۔ صرف موٹی باتوں پر ختم نہیں کیا۔ تو اس تحقیق سے جھوٹ ان لوگوں کا کھل گیا، جن کا دعویٰ ہے کہ خدا کے کلام میں صرف چند احکام سریع الفہم چاہئیں اور لطائف دقیقہ اس میں نہیں چاہئیں اور نہ ہیں۔ اس جگہ انہوں نے اپنے اس وہم کو مضبوط کرنے کی غرض سے ایک دلیل بنائی ہے اور وہ یہ ہے کہ کتب الہامیہ کم علموں اور کم فہموں یا اُمّیوں اور بَدّؤوں کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ پس اس کی تعلیم ویسی ہی ہونی چاہئے، جو کہ بقدر عقول ان لوگوں کے ہو۔ کیونکہ امّی اور ناخواندہ آدمی نکات دقیقہ سے منتفع نہیں ہو سکتے اور نہ ان پر مطلع ہو سکتے ہیں۔

لیکن واضح ہو کہ یہ وہم محض کوتہ اندیش آدمیوں کا ہو سکتا ہے اور اس سے پست اور نہایت ناچیز خیال کے درجہ سفاہت اور جہالت کی بدبو آتی ہے۔ کاش کہ وہ کلام الٰہی کو غور سے دیکھتے، تا کہ انہیں معلوم ہوتا کہ خدا کے مقدس اور کامل کلام پر ایسا گمان کرنا گویا چاند پر خاک ڈالنا ہے۔ اور اب بھی ایسے لوگ اگر اس کتاب کو ذرا آنکھ کھول کر پڑھیں اور وہ صدہا دقائق عمیقہ اور حقائق دقیقہ کلام الٰہی کو بنظر تامل وتیقظ مشاہدہ کریں، تو ان کا خیال فاسد ایسا دور ہو جائے گا، جیسا کہ آفتاب کے نکلنے سے تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ امر محسوس اور مشہود کے مقابلہ میں کسی قیاس کی پیش نہیں جاتی۔ جب متواتر تجربے سے ایک چیز کی کوئی خاصیت معلوم ہو گئی، تو پھر مجرد قیاس کو اپنی دستاویز بنا کر اس امر واقعی سے، جو بپایہ ثبوت پہنچ چکا ہے، انکار کرنا اس کا نام جنون اور سودا ہے۔ اگر وہ عقل خداداد کو ذرا کام میں لائیں، تو ان پر ظاہر ہو کہ خود وہ قیاس ہی فاسد ہے۔ اور بعینہ وہ ایسا مقولہ ہے جیسے کوئی نباتات کے خواص دقیقہ سے انکار کر کے یہ کہے کہ خدا نے بالارادہ خلق کی نفع رسانی کی غرض سے یہ کام کیا ہے کہ انسان کی

شفا کے لئے نباتات و جمادات وغیرہ میں طرح طرح کے خواص رکھے ہیں، تو پھر ان خواص کو اس قدر تہہ در تہہ کیوں چھپایا کہ ان کی ناواقفیت کے سبب ایک زمانہ دراز تک لوگ بے علاج مرتے رہے اور اب تک جمیع خواص مخفیہ پر احاطہ نہ ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ بعد تحقیق خدا کے عام قانون کے، جو کہ زمین و آسمان میں ایک ہی طرز پر پایا جاتا ہے، ایسے شبہات میں مبتلا ہونا انہی لوگوں کا کام ہے، جو قوانین قدرتیہ میں ذرا غور نہیں کرتے۔ اور قبل اس کے کہ خدا کی صفات اور عادات کو، جس طرز سے وہ آئینہ فطرت میں ظاہر ہو رہی ہیں، بخوبی دریافت کریں، پہلے ہی اس کی ذات اور اس کی صفات کا حلیہ لکھنے کو بیٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ اگر انسان ذرا بھی آنکھ کھول کر ہر طرف نظر ڈالے، تو عادت کسی ایک یا دو چیزوں میں محصور نہیں اور نہ ایسی پوشیدہ ہے، جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ بلکہ یہ بات اجلی بدیہات میں سے ہے کہ جواہر لطیف اور مصنوعات عالیہ تو ایک طرف رہے، ایک ادنیٰ مکھی بھی، جو حقیر اور ذلیل اور مکروہ جانور ہے، اس قانون قدرت سے باہر نہیں، تو پھر نعوذ باللہ کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ خدا کا کلام کہ جو اس کی ذات کی طرح مقدس اور کمال رنگ سے رنگین ہونا چاہئے، ایسا ادنیٰ اور ارزل ہے کہ دقائق مخفیہ میں ایک مکھی کے مرتبے تک بھی نہیں پہنچتا۔ اور اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ خدا نے ضروریات دین سے کسی امر کا اخفا نہیں کیا۔ اور دقائق عمیقہ وہ دقائق ہیں، جو ماسوا اصل اعتقاد کے بالائی امور ہیں اور ان نفوس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، جن میں صلاحیت اور استعداد تحصیل کمالات فاضلہ کی پائی جاتی ہے۔ اور جو لوگ ہر ایک غبی اور بلید کی طرح ان مسائل پر کفایت کرنا نہیں چاہتے، وہ بذریعہ ان دقائق کے حکمت اور معرفت میں ترقی کرتے ہیں اور حق الیقین کے اس بلند مینار تک پہنچ جاتے ہیں، جو انسانی استعدادوں کے لئے اقصیٰ مراتب میں سے ہے۔

(۲) اگر اسرار علمیہ سارے کے سارے بدیہات ہی ہوتے، تو پھر دانا اور نادان میں فرق کیا ہوتا۔ اس طور سے تو سارے علوم ہی برباد ہو جاتے اور جو عمدہ معیار استعدادوں کی شناخت کے لئے ہے اور جس کے ذریعہ سے انسان کی قوت نظریہ بڑھتی ہے اور استکمال نفس ہوتا ہے، وہ مفقود ہو جاتا اور جب وہ ذریعہ ہی مفقود ہو جاتا، تو پھر انسان کن امور میں نظر و فکر کرتا۔

(۳) اگر انسان نظر و فکر کرتا تو ایک حد معلوم اور محدود پر اس کو بھی مثل جانداروں کے ٹھہرنا پڑتا اور ترقیات غیر متناہی کی قابلیت نہ رکھتا۔ پس اس صورت میں جس سعادت کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اس سعادت سے محروم رہ جاتا۔ سو جس خدا نے انسان کو نظر و فکر کرنے کی قوتیں عنایت کی ہیں اور اس کو ایک کمال حاصل کرنے کی استعداد بخشی ہے، اس کی نسبت یہ کیونکہ بدگمان کیا جائے کہ وہ اپنی

کتاب نازل کر کے انسان کو کسی کمال تک پہنچانا نہیں چاہتا۔

خدا نے سارے عقول کو کیوں یکساں پیدا نہیں کیا؟

سوال ۔ اگر فہم و عقل کے مراتب کو خدا تعالیٰ یکساں پیدا کرتا، تو نہ لوگوں میں اختلافات پیدا ہوتے اور نہ وہ آپس میں لڑتے اور جھگڑتے اور نہ ان میں تکفیر بازی کی نوبت آپس میں پہنچتی۔

جواب ۔ اگر خدا عقول کو برابر پیدا کرتا، تو اس سے بھی وہی فساد لازم آتا، جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اس سے ترقی کے دروازے مسدود ہو جاتے، فضیلت و شرافت کے مراتب ضائع ہو جاتے، بزرگی و جلالت شان اور ذہانت و بلادت و غباوت کی تمیز درمیان سے اٹھ جاتی اور امتحان الٰہی کی حکمت گم ہو جاتی۔

تعلیم و تعلم و تجارب سے عقول بڑھتی رہتی ہیں۔ پس جو لوگ بغیر حصول تعلیم کامل و تجارب صحیحہ اور بغیر حکم نص صریح کسی امر پر رائے قائم کریں، ان کی رائے میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ کیونکر نہ ہو، جب کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء بلکہ انبیاء و رسولوں سے بھی اجتہادی غلطی و سہو کا صادر ہونا ممکن ہے۔ تو پھر دوسرے لوگوں کے قیاسات و آراء کس حساب و شمار میں ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ یاد کرو، جو قرآن کے پارہ ۱۵ سے شروع ہو کر ۱۶ میں ختم ہوتا ہے۔ اس میں تین بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اعتراضات کو اجتہادی غلطی قرار دے کر بنص صریح وحی الٰہی ثابت کر دیا کہ ان کے اعتراضات بے جا ہیں۔ پس ما و شما کس شمار و قطار میں ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہی حکم الٰہی ہے کہ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی استدعا خدا تعالیٰ سے کرتے رہیں۔ اور کلام الٰہی کے مقابل پر اپنی عقل کے گھوڑوں کو قابو میں رکھیں۔

حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ قرآن کریم کی سورہ انبیاء میں درج ہے، جس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے اس فیصلہ میں اجتہادی غلطی صادر ہوئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے صحیح فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے متعلق قرآن کریم میں خدا تعالیٰ یوں ذکر فرماتا ہے۔ **وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ کُنَّا لِحُکْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ . فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَ عِلْمًا وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَ کُنَّا فٰعِلِیْنَ** ۔ ترجمہ ۔ یعنی داؤد اور سلیمان جب فیصلہ کرنے لگے کھیتی کا جھگڑا، جب روندھ گئی تھیں اس کو رات میں ایک لوگوں کی بکریاں اور ان کا فیصلہ ہمارے روبرو ہوا۔ پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو اور ان دونوں کو ہم نے حکم دیا۔ اور سمجھ دی تھی اور تابع کئے ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ اور

پرندے، جوخدا کی پاکی بیان کیا کرتے تھے، اور یہ ہم نے کیا تھا۔

اس کھیتی اور فیصلہ کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں۔ **انہ کان بستان عنب و ھو المسمیٰ بالکرم و النفش رعی الغنم لیلا فحکم داؤد بقیمۃ المتلف فاعتبر الغنم فوجدھا بقدر والقیمۃ فدفعھا الی صاحب الحرث اما لانہ لم یکن لھم دراھم و تعذر بیعھا او رضوا بدفعھا و رضی اولئک باخذھا بدلا عن القیمۃ و اما سلیمان فقضیٰ بالضمان علی اصحاب الغنم و ان یضمنوا ذالک بالمثل بان یعمرو البستان حتی یعود کما کان و لم یضع علیھم مغلۃ من حین الاتلاف الی حین العود بل اعطے صاحب البستان حاشیۃ اولئک لیاخذوا من نمائھا بقدر نماء البستان فیستوفوا من نماء عنھم نظیر ما فاتھم من نماء حرثھم و قد اعتبر النمائین فوجد ھما سواء و ھذا ھو العلم الذی خصہ اللہبہ و اثنیٰ علیہ بادراکہ** ۔ترجمہ۔ یعنی ان کا ایک باغ تھا، جس کو عربی زبان میں کرم کہتے ہیں۔اس کو ایک قوم کے لوگوں کی بکریاں رات کو روندھ گئیں۔نفش کے معنے بکریوں کا رات کے وقت چرنے کے ہیں۔پس حضرت داؤد علیہ السلام نے تلف شدہ کھیتی کی قیمت بکری والوں کو ادا کرنے کا حکم فرمایا۔جب بکریوں کو دیکھا، تو وہ اسی قیمت کی مقدار پر تھیں، جس قدر کھیتی ضائع ہوئی تھی۔پس بکریاں کھیتی والوں کو دے دی گئیں۔یا تو اس وجہ سے کہ بکری والوں کے پاس روپے نہ تھے اور بکریوں کو مول میں کوئی نہ لیتا تھا۔پس وہ بکریاں کھیتی والوں کو دینے پر رضامند ہو گئے اور کھیتی والے بکریوں کو کھیتی کی قیمت کے بدلے میں لینے پر راضی ہو گئے تھے۔

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے بکری والوں کو باغ کی مثل کا ضامن بننے کا حکم فرمایا کہ باغ کی کھیتی کو ازسرنو آباد کریں۔حتیٰ کہ وہ اسی طرح تروتازہ و بارآور ہو جائے، جس طرح پہلے تھا اور باغ والوں کا تلف باغ کے وقت سے اس کے درست ہونے تک بند رہنے سے کچھ نقصان نہیں کیا، بلکہ مالکان باغ کو بکریاں دی گئیں، تا کہ بکریوں کے دودھ اوران کے جننے والے بچوں سے فائدہ اٹھائیں اور اپنا حق بکریوں کے نمو سے اس نظیر کے موافق، جوان کی کھیتی میں ضائع ہوا، پورا کر لیں۔پس جب وہ دونوں نمو یعنی کھیتی اور بکریوں کی ترقیاں بالآخر دیکھی گئیں، تو وہ آپس میں دونوں برابر تھیں۔یہ وہ علم ہے جسکے ساتھ خدا تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو مخصوص کیا اور دریافت حق پر انکی تعریف فرمائی۔

قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصے کے علاوہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کا قصہ مسائل کی دقائق فہمی اور ان کے سہو کے متعلق علمائے امت محمدؐیہ کی عبرت و

نصیحت کے لئے لکھا کہ ان سے وہ سمجھ جائیں کہ حضرت موسیٰ و داؤد علیہما السلام باوجود عظیم الشان نبی ہونے کے فیصلے میں غلطی کر بیٹھے اور خدا تعالیٰ نے خضر و سلیمان علیہما السلام کو سچے فیصلہ کا طریق سمجھایا۔

پس جبکہ اجتہادی غلطیوں کا صدور صاحب وحی انبیاء سے سرزد ہونا بھی ممکن ہے، تو ہم تم کس شمار و قطار میں ہیں کہ اگر ہم سے غلطی سرزد ہو، تو اس سے رجوع نہ کریں اور اپنے لئے کورانہ زیست قبول کر کے گڑھے میں گرتے جائیں۔ بلکہ بسا وقات ایسا ہوتا ہے کہ بیٹوں کو وہ کمالات و فضیلتیں دی جاتی ہیں، جن کو باپ دادوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوتا۔

چھوٹوں کو ہے خدا بڑائی دیتا   آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

سوال ۔ اگر صاحب وحی سے بھی غلطی کا ہونا ممکن ہے، تو پھر ان کی عصمت اور صداقت کا کیا اعتبار رہا۔ کیا اس سے انبیاء کی ہتک نہیں لازم آتی؟

جواب ۔ ہم "اسرار شریعت" جلد اول میں اس امر کو مفصل لکھ چکے ہیں۔ دوسرا اس میں یہ راز ہے، تا کہ لوگ ان کی پرستش نہ کرنے لگیں۔ انبیاء کی عصمت کا مضمون "اسرار شریعت" جلد سوم سے تعلق رکھتا ہے، وہاں پر ملاحظہ کرو۔ انبیاء سے شرعی گناہ ہرگز نہیں ہوسکتا، مگر شرعی اجتہادی غلطی کا ان سے سرزد ہونا ممکن ہے۔ اور پھر بھی اس غلطی پر ان کو مدام قائم نہیں رکھا جاتا، بلکہ بذریعہ وحی ان کو اس پر مطلع کیا جاتا ہے۔ بیان مذکور سے ہمارے نظرین پر یہ مسئلہ واضح تر ہو چکا ہے کہ اختلافات عقول و فہوم کے باعث ادراک حق میں اختلافات فرعیہ کا انسانوں سے صادر ہونا ممکن ہے، تو پھر ہمیں آج کل کے اپنے بعض علمائے اسلام کی حالت دیکھ کر سخت افسوس آتا ہے کہ وہ آپس میں تھوڑے تھوڑے اختلافات کے باعث تکفیر بازی کرتے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ ایک غیر مقلد، جو اپنے تئیں اہل حدیث کہلاتا ہے، ائمہ اربعہ کے مقلدین کا نام بدعتی اور فیج اعوج رکھتا ہے اور صحابہ کرام کے طریق سے ان کو باہر سمجھتا ہے اور جماعت سلف کا ان کو مخالف خیال کرتا ہے۔ ایسا ہی ایک حنفی تمام موحّدین غیر مقلدین کو بد مذہب اور سنت و جماعت کے احاطہ سے باہر یقین رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل سنت و الجماعت کہلانا آج کل کسی خاص فرقہ کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہر ایک فریق اپنے خیال و زعم میں اہل سنت ہے اور دوسروں کو اس سے خارج کر رہا ہے۔ مگر یہ ایسا جھگڑا نہیں، جس کی عنداللہ کچھ قدر ہو۔ جزئیات کے اختلافات کی وجہ سے کسی کو جھٹ پٹ کافر کہہ دینا اور ہمیشہ کے جہنم کا سزاوار اس کو ٹھہرانا یہ امر درحقیقت عنداللہ کوئی سہل اور معمولی بات نہیں، بلکہ بہت بُرا ہے اور جائے تعجب ہے کہ ایک شخص کلمہ گو ہو اور اہل قبلہ اور موحّد اور اللہ و رسول کو ماننے والا اور ان سے سچی محبت رکھنے والا اور قرآن پر ایمان

لانے والا ہو، اور پھر کسی جزئی اختلاف کی وجہ سے اس کو کافر ٹھہرانا بڑا ظلم ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بڑے بڑے اختلافات تھے اور ان میں سے کوئی بھی اختلاف سے بچ نہیں سکا۔ نہ حضرت صدیقؓ نہ حضرت فاروقؓ نہ دوسرا کوئی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ بلکہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اپنی اس جلالت وشان کے، جو علماء میں مسلّم ہے، دینی امور میں تمام جماعت صحابہ سے پچاس مسئلوں میں اختلاف رکھتے تھے۔ اور یہ مخالفت اس کمال تک پہنچ گئی تھی کہ بعض ایسے امور کو وہ حلال جانتے تھے، جن کو سارے صحابہ حرام قطعی بلکہ صریح فسق سمجھتے تھے۔ ازانجملہ حِلّت متعہ کا مسئلہ ہے۔ سارے صحابہ متعہ کو حرام اور حضرت ابن عباس حلال جانتے تھے۔ اور حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ان کے گروہ کے لوگ معراج اور رویت باری میں بکلّی مخالف تھے۔ مگر کوئی کسی کو کافر نہیں کہتا تھا۔

ائمہ اربعہؒ اور ان کے شاگردوں کا اختلاف فقہ کے فرعی مسائل میں ظاہر و باہر ہے۔ چنانچہ حضرت امام محمد و امام ابو یوسف و امام زفر کے اختلافات اپنے استاد و مرشد حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، جو جزوی مسائل فقہ میں واقع ہوئے ہیں، وہ کتب فقہ میں درج ہیں۔ مگر کسی نے اختلاف جزوی کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق نہیں کی۔ بلکہ باوجود آپس میں اس قدر اختلافات کے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا کھاتے اور ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ان میں نفسانیت و انانیت نہیں تھی۔ ان کے اختلافات محض دریافت وادراک حق کے لئے للہ تھے۔ آج کے زمانہ میں علماء کا نفسانی عناد و فساد و انانیت کا طوفان ایسے زور شور پر ہے کہ ایک مسلمان کو ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے کافر کہہ دینا اور اس کو ہمیشہ کے لئے جہنمی قرار دینا، انہوں نے ایک ایسی سہل بات سمجھ لی ہے کہ جیسے کوئی پانی کا گھونٹ پی لے۔ گویا کسی کو دوزخ یا بہشت میں پہنچانا آج کل کے اکثر علماء کے اختیار میں ہے۔ دوزخ اور بہشت کی کنجیاں انہی کے ہاتھوں میں ہیں۔ افسوس کہ ایسے لوگ خدا اور رسول کو کیا منہ دکھائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **من صلی صلاتنا و استقبل قبلتنا و اکل ذبیحتنا فذالک المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسوله فلا تخفروا فی ذمة الله** ۔ ترجمہ۔ یعنی جو پانچوں نمازیں ہمارے قبلہ بیت الحرام کی طرف منہ کر کے پڑھے اور ہمارا ذبوحہ کھائے وہ مسلمان ہے۔ خدا اور اس کا رسول اس شخص کے ضامن ہیں۔ پس تم اس شخص کو کافر کہہ کر خدا تعالیٰ کی ضمانت میں رخنہ اندازی نہ کرو۔ کسی قوم کا اپنے افراد کے ادنیٰ ادنیٰ اختلافات کے باعث آپس میں لڑنا جھگڑنا و تکفیر و تفسیق بازی کرنا اس قوم کے ضعف کا باعث ہے۔ سو

اے علمائے اسلام تم ایسا کام نہ کریو۔

کیا خداتعالیٰ اوراس کے دین کومثالوں میں بیان کرنا جائز ہے؟

سوال ۔خداتعالیٰ فرماتا ہے **لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَ مْثَال** ۔ترجمہ۔یعنی خداتعالیٰ کے لئے مثالیں نہ بیان کرو۔حضرت علامہ ابن قیم لکھتے ہیں۔**قد نهى الله تعالى عن ضرب الامثال له فكما لا تضرب له الامثال لا تضرب لدينه** ۔ترجمہ۔یعنی خداتعالیٰ نے اپنے لئے مثالیں بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔پس جیسا کہ خدا کے لئے مثالیں بیان کرنا ممنوع ہے،ایسا ہی اس کے دین کے لئے مثالیں بیان کرنا منع ہے۔

جواب ۔خداتعالیٰ نے اپنے لئے جن امثلہ کا بیان کرنا منع کیا ہے وہ امثلہ تشبیہہ ہیں۔کیونکہ خدا کوکسی چیز کے ساتھ مشابہت ومماثلت نہیں ہے۔چنانچہ وہ فرماتا ہے۔**لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ وَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** ۔ترجمہ۔لہٰذا خدا کیلئے جوصفات قرآن کریم میں علیم۔سمیع۔بصیر۔مَلک۔مالک۔ید۔وجہ وغیرہ آئی ہیں، وہ سب تنزیہ ہیں اورانسانوں کی صفات کی طرح نہیں ہیں۔بلکہ ادھرادھر کوئی مماثلت ومشابہت نہیں ہے۔اسلئے ایسی امثلہ کا خدا کے بالمقابل لانا منع کیا گیا ہے۔وگرنہ دینی احکام کو مثالوں میں بیان کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔بلکہ دینی احکام کی امثلہ قرآن واحادیث میں بکثرت موجود ہیں۔چنانچہ جسکے ذمہ حج ہواسکی مثال مقروض آدمی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔چونکہ دینی احکام انسانوں کیلئے اترے ہیں اسلئے ضرورتھا کہ احکام الٰہی میں ایسی مشابہتیں موجود ہوں،جن سے انسانی عقول متنبہ ہوکرعبرت پذیر ہوسکیں اورانکی حقیقتوں سے واقف ہوں۔خداشناسی کے بارے میں وسط کی شناخت یہ ہے کہ خدا کی صفات بیان کرنے میں نہ توانسان نفی صفات کے پہلو کی طرف جھک جائے اور نہ خدا کوجسمانی چیزوں کا مشابہ قراردے۔یہی طریق قرآن شریف نے صفات باری تعالیٰ میں اختیار کیا۔چنانچہ وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ خدا سنتا، جانتا، بولتا،کلام کرتا ہےاورپھرمخلوق کی مشابہت سے بچانے کیلئے فرمایا۔**لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ. فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰہِ الْاَمْثَالُ** ۔یعنی خداتعالیٰ کی ذات کوتشبیہہ اورتنزیہ کے بین بین رکھنا یہی وسط ہے۔ان مسائل کی مفصل تشریح اسرارشریعت جلدسوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

اسرارشریعت (جلدسوم)

"اسرارشریعت" جلدسوم میں زیر بحث آنے والے مضامین میں سے چندایک کوبطورنمونہ یہاں پردرج کیا جارہا ہے۔(۱) حقیقت ایمان اوراس پرثواب ملنے کی وجہ (۲) حقیقت اسلام اوراس کی وجہ تسمیہ (۳) دلائل بروجود باری تعالیٰ (۴) خالق کی طرف سے مخلوق کوتبلیغ حق کے لئے انبیاء مبعوث ہونے کی حکمت (۵) حقیقت ملائکہ (۶) پیدائش شیطان کی حکمت (۷) وجہ تسمیہ شیطان (۸) مغفرت الٰہی وحبط اعمال کا فلسفہ (۹) حقیقت مکافات اعمال (۱۰) خداتعالیٰ کا زمین وآسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کی حقیقت (۱۱) خداتعالیٰ کا عرش پرقرار پکڑنے کی حقیقت (۱۲) دنیا میں سات یوم مقرر ہونیکی حکمت (۱۳) آدم کی پسلی سے پیدائش حوا کی حقیقت (۱۴) اس آدم سے پہلے دولاکھ آدم ہوگذرے ہیں (۱۵) پیدائش عالم کی وجہ (۱۶) حدوث عالم پر دلائل (۱۷) عالم برزخ یعنی عذاب وثواب قبر کی حقیقت (۱۸) قبر میں منکر ونکیر کے آنے کا راز اوران کے ناموں کی وجہ تسمیہ (۱۹) جواب اس سوال کا کہ جبکہ خداتعالیٰ مجسم نہیں ہے، تو قیامت میں اس کا تخت پر بیٹھنا اورانسانوں کا اس کے روبروحاضر ہونا کس طرح ہوگا (۲۰) حقیقت پل صراط (۲۱) قیامت قائم ہونے کی گھڑی کا کسی کوعلم نہ ہونے کی وجہ (۲۲) اس جہان کے فنا ہونے پر دلائل عقلیہ (۲۳) قیامت قائم ہونیکی وجوہات (۲۴) شرک سے ممانعت اور اسکی مذمت کی وجہ (۲۵) حقیقت معجزات انبیاء (۲۶) حقیقت قانون قدرت و عالم اسباب (۲۷) حقیقت شفاءانبیاء (۲۸) حقیقت معراج نبویؐ (۲۹) حقیقت وحی اوراس کے نزول کی وجہ (۳۰) حقیقت ختم نبوت (۳۱) جواب اس سول کا کہ نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں ختم ہوگئی (۳۲) حقیقت لوح محفوظ (۳۳) حقیقت تقدیر ازلی الٰہی (۳۴) ابطال تثلیث والوہیت وکفارہ مسیح ابن مریم علیہ السلام (۳۵) حوروں کی حقیقت (۳۶) ابطال تناسخ (۳۷) نزول مسیح ابن مریم ومہدی آخرزمان (۳۸) خروج دجال (۳۹) تسلط یاجوج و ماجوج (۴۰) تحقیق قوم یاجوج و ماجوج کے متعلق خاکسار مؤلف کا علمائے مصروشام سے استفتا اوران کا اس پر جواب (۴۱) حقیقت روح اوراس کی پیدائش کا زمانہ (۴۲) انسان وحیوان کی روح میں فرق (۴۳) انسان کے مرنے کے بعداس کی روح کے باقی رہنے پر دلائل (۴۴) آخرشب میں آسمان پر نزول الٰہی کی حقیقت (۴۵) معصومیت انبیاء (۴۶) نسخ کتب وتبدیل احکام الٰہی کی حکمت (۴۷) توریت وانجیل سے افضلیت قرآن کی وجہ (۴۸) حقیقت معجزات انبیاء (۴۹) حقیقت عالم بعث ونشر پر حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک زبردست تقریر

اردو ترجمہ

فتوحات مکیّہ

مؤلفہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی علیہ الرحمۃ

مترجم مولوی محمد فضل خانؒ

حضرت شیخ اکبر ساتویں صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ علم تصوّف اور اسلامی فلسفہ کو آپ ہی نے زندہ کیا تھا، اسی لئے دنیا میں آپ محی الدین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس کتاب میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے باریک در باریک اشارات اور نکات اور علوم لدنیہ الٰہیہ کے اسرار اور علم تصوف کے راز درج ہیں۔ خالق عالم کی صنعت کے بھید اور اس کی عجیب وغریب مخلوق کے ہر ذرہ سے لیکر انسان اور اس کے نیچے کی ہر مخلوق اور دنیا اور آخری جہان اور زمین و آسمان کے ابتدائی و انتہائی پیدائش کے اسرار اور احکام الٰہیہ کی حکمتیں لکھی ہیں۔ الغرض یہ کتاب ذخیرہء جواہرات اور علم الٰہیہ کا بحر ذخار اور علم تصوف کی دنیا میں سب سے بڑی مستند انمول کتاب ہے۔

موجودہ ترجمہ ابتداء سے لیکر باب تیس کے آخر تک ہے، جس کی مجموعی ضخامت اندازاً سات سو صفحے ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اور عرصہ دراز سے ناپید ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس کا ایک نہایت خوبصورت ایڈیشن بہت جلد قارئین کی خدمت میں پیش کریں۔ شائقین کرام اپنے آرڈر ابھی سے بھیج سکتے ہیں۔ اس کا نیا ایڈیشن بیک وقت امریکہ اور جرمنی سے شائع ہوگا۔ وباللہ التوفیق۔

ناشر۔ فضلی بکس۔ کمرفیلڈ۔ جرمنی

fazli@gmx.net

مولوی محمد فضل خانؒ

ایک عالم ربانی کی سوانح حیات

مصنفہ

منیرالدین احمد

حضرت مولوی محمد فضل خان چنگویؒ (۱۸۶۸ء۔۱۹۳۸ء) عربی زبان کے جید عالم تھےاور آپ کا شمار ہندوستان میں بیسویں صدی کے نامور مصنفین میں ہوتا ہے۔آپ کے قلم سے بیش بہا کتب اسلامی موضوعات پر نکلیں،جن کا سلسلہ "مکتوبات محمدؐیہ" سے شروع ہوا،جوحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات کے اردو ترجمہ پر مشتمل تھا۔آپ کی دوسری کتاب "خزینۃ الاسرار" فی زمانہ ناپید ہے۔جب کہ تیسری کتاب "تحفۃ الصوفیہ" تواتر سے دہلی اور لاہور سے چھپتی رہی ہےاور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے اقوال پر مشتمل ہے،جن کا ترجمہ اردو اور فارسی میں نثر و نظم میں کیا گیا ہے۔ "اسرار شریعت" (تین جلدوں میں) آپ کی اہم ترین تصنیف ہے،جو پون صدی کے بعد دوبارہ شائع کی جارہی ہے۔مصنف اس کتاب کوعربی میں بھی شائع کرنا چاہتے تھے،چنانچہ اس کی پہلی عربی جلد آپ کی کتاب "نہج المصلی" کے نچلے نصف پر چھپی تھی۔آپ نے ابن عربیؒ کی کتاب "فتوحات مکیہ" کا اردو میں ترجمہ کیا اوراس کی تشریح لکھی،جو آج تک مستند حیثیت کی حامل ہے۔"ہدایات الزوجین" نامی کتاب کا مسودہ بدقسمتی سے تلف ہو گیا تھا۔آپ نے ایک رسالہ تفسیر سورۃ فاتحہ کے موضوع پر اور ایک کتابچہ ردعیسایت کے بارے میں بھی شائع کیا تھا۔آپ صوفی مسلک اور صاحب کشوف والہام تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک ضخیم مسودہ اپنی یادگار چھوڑا ہے،جو "الہامات الٰہیہ" کے عنوان کے تحت انشاء اللہ کتابی صورت میں پیش کیا جائیگا۔

ناشر۔فضلی بکس۔کمرفیلڈ۔جرمنی fazli@gmx.net